سیّد الاحرار

مُصنّف

سیّد اشتیاق اظہر

مولانا حسرت موہانی کی آخری آرامگاہ جو علماء فرنگی محل کے تاریخی قبرستان مولانا انوار کے باغ میں واقع ہے۔

مُصنّف

اِشتیاق اظہر

مولانا حسرت مُوہانی میموریل سوسائٹی

ST-9/C بلاک اے متصل جامع مسجد نارتھ ناظم آباد (کراچی)

فون: 678308-686149

طبع ثانی ــــــــ ۱۰۰۰

قیمت ــــــــ ۱۲۵/- روپے

سن طباعت ــــــــ ۱۹۸۸ء

طابع ــــــــ سیّد وصی الحسن رضوی

مطبع ــــــــ گلوری پرنٹرز
۷۲۲۵۴۸

ملنے کا پتہ

مولانا حسرت موہانی میموریل سوسائٹی کراچی

فون: 686149

دیباچہ

مولانا محمد جمال الدین عبدالوہاب فرنگی محلی

مجھے یہ معلوم کر کے اطمینان بھی ہوا اور مسرت بھی کہ حسرت موہانی میموریل سوسائٹی کی جانب سے "سید الاحرار" کی اشاعت دوئم کا اہتمام کیا جارہا ہے اور سید الاحرار مولانا سید فضل حسن حسرت موہانی کی حیات اور کارناموں سے متعلق یہ تصنیف دوبارہ ہماری نوجوان نسل کی اطلاع کے لئے پیش کی جارہی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں اردو اکادمی بہاولپور نے شائع کی تھی اور ۲۰۰ صفحات پر مشتمل تھی اس میں مولانا حسرت موہانی کی ذاتی زندگی ازدواجی زندگی اور سیاسی زندگی کے بارے میں خاصی تفصیلی معلومات مہیا کی گئی تھیں۔ اور ان معلومات کے ساتھ سودیشی تحریک سے متعلق مولانا حسرت موہانی کی وابستگی اور مولانا رحمتہ اللہ علیہ کی گرفتاریوں اور نظر بندیوں اور قیدوں کی روئیداد بھی پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی تھی مولانا نے انڈین نیشنل کانگریس، آل انڈیا مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، انجمن خدام کعبہ، انجمن خدام الحرمین اور تحریک پاکستان کے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ان کا بھی "سید الاحرار" میں ایک مفصل جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ اور اس کتاب میں ان کی صحافتی خدمات کا بھی جستہ جستہ ذکر کیا گیا تھا اور ہماری قومی تحریکات آزادی کے حوالے سے ان تمام امور کا تذکرہ اس تاریخی تسلسل کو برقرار رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے جس سے خود قوموں کی تاریخی زندگی کے عمل کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔

اب جو "سید الاحرار" کی اشاعت ثانی کا اہتمام کیا جارہا ہے اس میں مولانا حسرت موہانی کی مذہبی زندگی کا باب بھی شامل کیا جارہا ہے اور اس باب کی شمولیت سے نہ صرف یہ کہ مولانا حسرت موہانی کی ہمہ جہتی زندگی کے ایک اہم ترین پہلو پر روشنی ڈالی جائے گی بلکہ اس میں مولانا حسرت موہانی کے حضرت مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی کے ساتھ عقیدت و محبت اور مولانا عبدالوہاب فرنگی محلی اور میرے والد محترم مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ نیازمندانہ تعلقات کا احاطہ کرنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے ان عظیم روحانی بزرگوں

نے مولانا حسرت موہانی کی زندگی پر جو گہرے اثرات ڈالے ہیں ان کا تفصیلی تذکرہ تو اب بھی قبل از وقت ہے لیکن خود مولانا حسرت موہانی نے اس بارے میں اپنے کلام میں جو جابجا اشارے کئے ہیں ان سے بھی بعض حقیقتوں کا اظہار ہوتا ہے جس سے ارباب معرفت و بصیرت خود رائے قائم کر سکتے ہیں۔

یہ امر بھی باعثِ اطمینان ہے کہ "سید الاحرار" کی اشاعتِ ثانی میں تین ضمیمے بھی شامل کئے گئے ہیں ان میں ایک تو وہ مضمون شامل کیا گیا ہے جس کی بناء پر ۱۹۰۸ء میں مولانا حسرت موہانی کو پہلی قیدِ فرنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ مضمون مصر میں انگریزوں کی پالیسی اور اس قبیل کا ایک اور مضمون مصنفہ اشتیاق اظہر جو جنوبی ایشیا میں کمیونسٹ پارٹی کے قیام کے سلسلے میں مولانا حسرت موہانی کی کوششوں اور سرگرمیوں کا ایک جائزہ پیش کرتا ہے شاملِ اشاعت ہو رہا ہے۔ یہ مضمون دراصل اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ مولانا حسرت موہانی نے اپنی قیدِ ثالث میں ایک ایسی جماعت کے قیام کا فیصلہ کیا تھا جو جنوبی ایشیا کو فرنگی تسلط سے آزاد کرنے کے لئے عدم تشدد کے علاوہ بھی دیگر ممکنہ طریقوں سے کام لینے پر آمادہ ہو۔ اس ضمن میں مولانا حسرت موہانی کا وہ خطبۂ استقبالیہ بھی پہلی بار اہلِ پاکستان کے مطالعے کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ جو کانپور کی پہلی کمیونسٹ کانفرنس میں صدر مجلس استقبالیہ کی حیثیت سے مولانا حسرت موہانی نے گرین پارک کانپور کے اجتماع میں پیش کیا تھا اور جو اس دور کے مغربی کمیونسٹ نواز انقلابی پوری طرح ہضم نہ کر سکے۔ اس مضمون کی اشاعت سے کمیونسٹ تحریک کے بارے میں مولانا حسرت موہانی کے حقیقی نظریات و افکار کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔ تیسرا ضمیمہ بیگم حسرت موہانی کے سفرنامۂ عراق پر محیط ہے جس سے اس عظیم شخصیت کے روحانی اور فکری نظریات کی ترجمانی کا ایک اہم فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کے مفاد میں حسرت موہانی نے تقسیم ہند اور پاکستان کے قیام کے بارے میں جو اسکیم پیش کی تھی اس کا بھی "سید الاحرار" میں پورا تفصیلی تذکرہ موجود ہے اور انھوں جمعیۃ العلمائے کانپور کے قیام میں جو کردار ادا کیا ہے اس کا بھی "سید الاحرار" میں تذکرہ موجود ہے یہ ان کی ہی شخصیت اور کارناموں کا اثر تھا کہ ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بنانے کی کوششوں کا آغاز ہوا تو ہم جیسے کارکنان مسلم لیگ اور مسلم لیگ کے بہی خواہ جلسوں میں یہ بات نہایت بیباکی سے

کہا کرتے تھے کہ حضرت قائدِ اعظم کو مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان اور مولانا شوکت علی جیسے عظیم رہنما اپنا قائد اور رہبر مانتے ہیں اور خود قائدِ اعظم نے بھی اکثر و بیشتر مواقع پر اور خود میری اپنی موجودگی میں مولانا حسرت موہانی کی مسلمانوں کے مفاد کے ساتھ غیر متزلزل وابستگی اور جنوبی ایشیا کی آزادی کے سلسلے میں ان کی بے لوث اور بے غرض ایثار اور قربانیوں کا برملا تذکرہ فرمایا اور ان تمام لوگوں کو جو مولانا حسرت موہانی کی نیت پر تبصرہ کرنے کی جرأت کرتے تھے۔ سختی کے ساتھ مولانا حسرت موہانی کی شان میں کسی قسم کی گستاخی سے منع کیا اور خود مولانا حسرت موہانی بھی ہر طرح حضرت قائدِ اعظم کی قابلیت اور خدمات کے معترف تھے دراصل مولانا حسرت موہانی جنوبی ایشیا کے قائدین میں ایک ایسے ممتاز اور منفرد مقام پر فائز تھے جس کا اعتراف ہر ایک کو ہے

جہاں تک "سید الاحرار" کے مصنف کا تعلق ہے میں نے خود بھی کئی موقعوں پہ کہا ہے کہ جناب اشتیاق اظہر ان کے سچے قدردانوں کی صف میں شامل ہیں انہوں نے سید الاحرار کی تدوین و ترتیب کے علاوہ مولانا حسرت موہانی کے مقالات اور اداریوں کی ترتیب کا فریضہ سرانجام دیکر ایک تاریخی ضرورت کی تکمیل کی ہے اور مولانا نصرت موہانی مرحوم کے اشتراک سے مولانا حسرت موہانی کی ذاتی زندگی سے متعلق ایک کتابچے کی اشاعت اور ان کے کلام کے انگریزی ترجمے کی دوبارہ اشاعت کو بھی ممکن بنایا۔

اگر جناب اشتیاق اظہر مولانا حسرت موہانی کی صحافتی خدمات اور ان کے سلسلہ سخن کے بارے میں بھی کسی تصنیف کی ترتیب و تدوین کا فریضہ سرانجام دیں تو مجھے یقینی طور پر بڑی خوشی ہوگی۔ مولانا حسرت موہانی کے کردار و عمل اور افکار و خیالات کی اشاعت سے نہ صرف جنوبی ایشیا کی تاریخ میں ان کے صحیح مرتبے کی نشاندہی ممکن ہے بلکہ اس بارے میں جو کچھ بھی منظرِ عام پر لایا جائے گا اس سے خود پاکستان کی نوجوان نسل کے کردار و عمل کی استواری میں بڑی مدد ملے گی مولانا حسرت موہانی کی زندگی ایک ایسے گلدستے کی مانند ہے جس کے ذریعے خود ہماری قومی زندگی میں ایک ایسا نکھار پیدا کیا جا رہا ہے جو ہمارے اندر ایثار و اخلاص کے جذبات ہی کو پروان نہیں چڑھایا جائے گا بلکہ ہم میں اصولوں سے محبت اور حق گوئی کو اپنا شعار اور ملی فریضہ بنانے کا جوش اور جذبہ بھی پیدا کرے گا۔

دیباچہ

حصہ اوّل: ذاتی زندگی

صفحہ نمبر		نمبر شمار
	مذہب و مشرب - زیارت حرمین - شادی	۱
۱۷	اولاد - شاعری میں تلمذ - آخری ایام	۲
تا	حلیہ اور اوصاف - تصنیف و تالیف - حسرت پر مطبوعہ کتابیں	۳
۴۶	ان شعرا کی فہرست جن پر حسرت نے کام کیا	۴
	ذاتی زندگی سے متعلق چند حقائق اور تبصرہ۔	۵

حصہ دوم: ازدواجی زندگی

صفحہ نمبر		نمبر شمار
	محترمہ نشاط النسا بیگم	۱
۴۷	ابتدائی حالات - سیاسی رفاقت	۲
	جرأت و ہمت - تصوف و ادب	۳
تا	کانپور کانگریس - سودیشی اسٹور	۴
	شادی کے بعد احمد آباد کو روانگی	۵
۱۴۳	پونا جیل کا ایک واقعہ حسرت اور ہمت - آخری علالت اور انتقال	۶
	مولانا کا رنج و افسوس	۷
	کشن پرشاد کول کے تاثرات - سید سلیمان کے تاثرات	۸
	جناب ضیاء الدین برنی کی گواہی - حبیب الرحمٰن جبیب کا بیان	۹
	دوسری بیگم کے حالات اور اولاد کا احوال اور اہل خاندان	۱۰

نمبر شمار		صفحہ نمبر
۱۱	سیرت کی جھلکیاں	
	حصہ سوئم مذہبی زندگی	۱۴۵
۱	مذہب و مشرب۔ عقائد	تا
۲	بیعت۔ رُوحانی مرتبہ۔ سلسلۂ طریقت	
۳	خلافت، سلسلۂ چشتیہ سے ارادت۔ طرزِ طریقت	۱۸۵
۴	سری کرشن سے عقیدت۔ تزکیۂ نفس	
۵	دُنیا کے بھی بادشاہ اور آخرت کے بھی بادشاہ۔ ڈائری کے اقتباسات	
۶	خاندانِ فرنگی محلی۔ خاندانی شجرہ۔ حالات اکابر	
۷	شجرۂ روحانی۔	
	حصہ چہارم: سیاسی زندگی	
۱	کانگریس میں شمولیت۔ "اُردوئے معلیٰ" کے ذریعے قومی خدمت۔	۱۸۷
۲	نرم دل اور گرم دل پر بحث۔ عمل کا وقت آن پہنچا۔ مقدمے کی رُوداد	
۳	آغازِ قید کا حال۔ قیدِ فرنگ کی رُوحانی برکتیں۔ جیل کی سختیاں۔	تا
۴	جیل کے انتظامات۔ عزم و استقلال۔ جیل سے رہائی کے بعد	
۵	اُردوئے معلیٰ کی اہمیت۔ تلک سے عقیدت	
۶	مسٹر اروبندو گھوش پانڈیچری میں۔ سودیشی تحریک	۲۹۷
۷	خلافت سودیشی اسٹور۔ اُردوئے معلیٰ پریس کی ضبطی	
۸	مسلم یونیورسٹی کی تحریک۔ دوسری گرفتاری	
۹	میموریل گرفتاری کی وجہ	
۱۰	دُنیا بدل چکی تھی	
۱۱	رُولٹ ایکٹ۔ ترکِ موالات	
۱۲	آزادیٔ کامل۔ مخالفت کے اسباب	

صفحہ نمبر		نمبر شمار
	عدم تشدد کی مخالفت	۱۳
	تحریکِ خلافت - حجاز کا مسئلہ - حج ٹیکس کی مخالفت	۱۴
۱۸۷	سائمن کمیشن - مسلم کانفرنس - کانگریس کی قراردادِ آزادی	۱۵
	ہندو مسلم اختلافات کے خاتمے کے لئے سہ نکاتی تجویز	۱۶
	حالاتِ حاضرہ کا تجزیہ - مسلم کانفرنس کی بے راہ روی	۱۷
	مولانا خود کیا چاہتے ہیں؟ گول میز کانفرنس کے دعوت نامے	۱۸
تا	مولانا خود کیوں سامنے نہیں آتے؟......	۱۹
	شاردا ایکٹ کی خلاف ورزی - سائمن کمیشن کی رپورٹ	۲۰
	آزادیٔ کامل سے عشق	۲۱
۴۹۷	مسلم لیگ کے قیام کا پس منظر	۲۲
	نوجوان مسلمان کیوں مسلم لیگ کے مخالف تھے؟ مولانا کا اظہارِ خیال	۲۳
	سرسید کی پالیسی سے انحراف	۲۴
	میثاقِ لکھنؤ - احمد آباد میں مسلم لیگ کا اجلاس - مولانا کا خطبۂ صدارت	۲۵
	تیسری گرفتاری۔	۲۶
	مسلم لیگ کی نشاۃِ ثانیہ - فلسطین کانفرنس میں شرکت۔	۲۷
	حج کا مسئلہ	۲۸
	قراردادِ پاکستان - پس منظر	۲۹
	مولانا حسرت موہانی کے نظریات	۳۰
	مولانا کا تصورِ پاکستان	۳۱
	گاندھی کے متضاد رویے پر مولانا کا تبصرہ	۳۲
	ایک متحدہ پاکستان - اجلاسِ الٰہ آباد کا حال	۳۳
	پاکستان کا دستور تیار کرنے کا مطالبہ	۳۴
	قائدِ اعظم اور مولانا کے روابط - تقسیم کے بعد ہندوستان میں قیام	۳۵
	سقوطِ حیدر آباد پر اظہارِ خوشی سے انکار۔	۳۶

نمبر شمار		صفحہ نمبر
۳۷	دستورِ ہندوستان پر دستخط سے انکار	
۳۸	پاکستان کے معاملات سے دلچسپی اور لاہور میں آخری انٹرویو۔	

حصہ پنجم

ضمیمے

نمبر شمار		صفحہ نمبر
۱	مصر میں انگریزوں کی پالیسی (الف)	۴۹۴
۲	اسلامی اشتراکیت اور حسرت موہانی (ب)	۵۰۳
۳	سفرنامہ عراق (ج)	۵۳۵

نوٹ: (ایک خط جو کہ محترمہ نشاط النساء کے نام حسرت موہانی نے تحریر کیا تھا سفرنامہ عراق کے بعد شائع کیا گیا ہے)

نوٹ: آخر کے دو ضمیموں میں ایک وہ خط شامل ہے جو مولانا محمد علی نے مولانا حسرت موہانی کو لکھا تھا اور دوسرے ضمیمے میں مولانا حسرت موہانی کا وہ خطبۂ صدارت شامل ہے جو انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس احمد آباد میں پیش کیا تھا اور جو بعد میں فرنگی حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔

حصّہ اوّل

حصہ اوّل

ذاتی زندگی

سیدالاحرار مولانا حسرت موہانی کا نام سید فضل الحسن اور تخلص حسرت تھا۔ آپ قصبہ موہان ضلع اناؤ یوپی کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد کا نام سید اظہر حسن بن سید مہر الحسن بن سید مظہر حسن تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام سیدہ شہر بانو بنت سید نیاز حسن تھا آپ کا سن ولادت ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء ہے اور مولانا عارف ہسوی نے اپنی کتاب "حالاتِ حسرت موہانی" میں یہی سن تحریر کیا ہے لیکن بعض کتابوں میں ۱۸۷۵ء اور بعض میں ۱۸۷۸ء درج ہے۔ مولانا جمال میاں نے ۱۸۷۸ء تجویز کیا ہے اور پرنسپل عبدالشکور نے بھی یہی سن تحریر کیا ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں مولانا عارف ہسوی کا تجویز کردہ سن زیادہ قرین قیاس ہے مولانا کی تاریخ پیدائش کا کسی کو علم نہیں۔ آپ کی وفات ۱۳ رمئی ۱۹۵۱ء میں ہوئی اور لکھنؤ میں اپنے پیر کے پائینتی مولانا انوار کے باغ میں جو علمائے فرنگی محل کا آبائی قبرستان ہے دفن ہوئے، سیدالاحرار نے ابتدائی تعلیم موہان، کوڑہ جہان آباد فتح پور ہسوہ میں پائی یہ ابتدائی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی۔ آپ نے قرآن شریف اردو اور فارسی کی کتابیں میاں جی غلام علی اور میاں جی بلاقی موہانی سے پڑھیں۔ بعد میں موہان کے مڈل اسکول میں داخل ہوئے جس کے ہیڈ ماسٹر پنڈت لچھمی نرائن مولانا پر بے حد مہربان تھے۔ آپ نے ۱۸۹۴ء میں وہیں سے مڈل کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور پورے صوبۂ یوپی میں اوّل آئے۔ آپ نے ۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول فتح پور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی اور وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ علی گڑھ تشریف لے گئے جہاں سے آپ نے ۱۹۰۳ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی اس امتحان میں عربی اور ریاضی کے خاص مضامین تھے۔ آپ کے قابلِ ذکر اساتذہ میں مولانا سید ظہورالاسلام مولانا نور محمد، مولانا حبیب الدین، مولانا نیاز فتحپوری کے والد محمد امیر خان (فتحپور) پروفیسر جے سی چکرورتی، صاحب زادہ آفتاب احمد خان، ڈاکٹر ضیاالدین اور مولانا خلیل احمد اسرائیلی (علی گڑھ) کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

مذہب و مشرب

حضرت سید الاحرار مذہباً حنفی اور مشرباً قادری تھے۔ آپ نے خود تسلیم کیا ہے کہ آپ قدامت پسند سنی اور صوفی ہیں آپ کو حضرت امام موسیٰ کاظم اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بھی خصوصی عقیدت تھی۔ آپ کا پورا خاندان حضرت شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی کا ارادت مند تھا اور آپ خود بھی بچپن میں ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے تھے، بعد میں آپ نے ان کے صاحبزادے اور جانشین حضرت مولانا عبدالوہاب فرنگی محلی سے بیعت کی اور اس کے بعد آپ کو ان کے صاحبزادے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے باقاعدہ خلافت ملی اور بعض افراد کو باقاعدہ مرید بھی کیا۔

زیارت حرمین

مولانا جمال میاں نے لکھا ہے کہ سید الاحرار نے مالی عسرت کے باوجود گیارہ حج کئے اور بارہ مرتبہ مدینہ منورہ میں حاضری دی۔ آپ پر مدینہ منورہ کے قیام کے دوران عجیب قسم کا کیف طاری ہوتا تھا۔ مسجد نبویؐ میں نماز ختم ہوتے ہی دعا کا انتظار کئے بغیر آپ مواجہ اقدس میں حاضر ہو کر اشعار پیش کرتے۔ آپ جب پہلی بار حج کو گئے اور یہ غالباً ۱۹۳۲ء کا زمانہ تھا تو آپ نے حضرت شیخ عبدالباقی ایوبی رحمتہ اللہ علیہ سے سلاسل حدیث کی اجازت لی تھی آپ اپنی دونوں بیگمات کو بھی کئی بار حج کے لئے اپنے ہمراہ لے گئے۔ ایک حج کے دوران آپ کے نواسے رضوان الحسن بھی ہمراہ تھے۔

پہلی غزل

آپ نے پہلی غزل ۱۸۹۳ء میں کہی جو کلیاتِ حسرت کے مجموعے میں شامل ہے۔

شادی

آپ نے پہلی شادی ۱۹۰۱ء میں کی۔ آپ کی زوجہ محترمہ کا نام نشاط النساء بیگم تھا جن کا تفصیلی تذکرہ آگے آئے گا۔ محترمہ نشاط النساء بیگم کو برصغیر کی سیاسی زندگی میں

ایک نمایاں مقام تھا۔ آپ نے ۱۸ اپریل ۱۹۳۶ء میں وصال فرمایا۔ بیگم حسرت کے انتقال کے بعد آپ نے ۱۹۳۸ء میں اپنے خاندان کی ایک بیوہ حبیبہ بیگم کے ساتھ دوسرا عقد کیا جو حضرت سید الاحرار کی وفات کے بعد خاصے عرصے حیات رہیں۔

اولاد

محترمہ نشاط النساء بیگم کے بطن سے آپ کی بڑی صاحبزادی نعیمہ بیگم ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئیں جن کی ۱۹۲۳ء میں حضرت مولانا کے ایک عزیز سید عبد السمیع نصرت موہانی سے شادی ہوئی۔ جناب عبد السمیع اپنی بیگم کے ہمراہ کراچی میں مقیم ہیں آپ شاعر بھی ہیں اور مولانا حسرت موہانی ہی نے آپ کا تخلص نصرت تجویز کیا تھا۔

آپ کی دوسری صاحبزادی خالدہ بیگم آپ کی زوجہ ثانی کے بطن سے بمقام کانپور میں پیدا ہوئیں دونوں صاحب زادیوں کا انتقال ہو چکا ہے۔

شاعری میں تلمذ

آپ نے سب سے پہلے اپنا کلام سید فخر الحسن فطرت موہانی کو دکھایا۔ اس کے بعد آپ حضرت امیر اللہ تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہو گئے آپ کا سلسلۂ سخن شاہ حاتم دہلوی سے جا ملتا ہے۔ جو ولی دکنی کے مستند شاگرد تھے۔

آخری ایام

مولانا جمال میاں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت سید الاحرار کو اپنی وفات کا یقین ہو چکا تھا آپ نے ۱۹۵۰ء میں آخری بار سفر حج کیا اور براہ کراچی و لاہور کانپور واپسی کا قصد کیا مولانا جمال میاں کہتے ہیں کہ "مدینہ منورہ میں دو تین مرتبہ کی حاضری کے بعد آپ نے واپسی کا قصد کیا اور مجھ سے فرمایا کہ وہ جلد از جلد کراچی اور لاہور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچ جائیں گے کیونکہ انہیں اب زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہنا ہے۔" اس سال ان کی ذاتی ڈائری کا بیشتر حصہ بیماری اور علاج کی تفصیلات پر مشتمل تھا آخری روزنامچہ ۱۶ مارچ ۱۹۵۱ء کو تحریر کیا گیا۔ مولانا جمال میاں نے آگے چل کر لکھا ہے

کو ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو ساڑھے تین بجے ان کے داماد سید عبدالسمیع نصرت موہانی نے مجھے خبر دی کہ
مولانا کی حالت بے حد نازک ہے۔ جب میں پہنچا تو پلنگ کے ارد گرد ان کے اعزا گریہ وزاری میں
مصروف تھے۔ مولانا کی سانس اکھڑ رہی تھی مولانا نے مجھے پہچانا اور اعزا کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے بمشکل کہا کہ ان سے کہیئے! "یہ کوئی نئی بات نہیں ہو رہی ہے۔" یہ ان کا آخری کلام تھا اس
کے بعد صرف ورد دیا استغفار پڑھنے کا اندازہ ان کے لبوں کی جنبش سے ہوتا تھا اسی دن دوپہر
کو انہوں نے رحلت فرمائی بعد مغرب باغ مولانا انوار میں نمازِ جنازہ ہوئی اور وہیں دفن ہوئے

حُلیہ اور اوصاف

ان کا قد چھوٹا اور رنگ گندمی۔ آنکھیں بڑی تھیں اور چہرہ پر چیچک کے داغ نمایاں تھے
آبائی ورثہ میں ان کو جو جائیداد ملی تھی اس کا ایک حصہ انہوں نے اپنے جد شاہ وجیہہ
اور ایک حصہ اپنے مرشد مولانا عبدالوہاب فرنگی محلی کے اعراس کے لئے وقف کر دیا تھا اور ایک
حصہ وقف علی الاولاد کر دیا تھا جس کا منافع ان کی صاحب زادی نعیمہ بیگم کو ملتا تھا وہ خود
اس سے مستفید نہیں ہوتے تھے ایک قلیل سرمایہ تجارتی کمپنیوں میں لگا ہوا تھا جو بعد کو
ان کے ورثا میں تقسیم ہوا اور کچھ رقم جو ان کو یوپی اسمبلی اور مجلس دستور ہند کے رکن کی حیثیت
سے ملی تھی وہ انہوں نے اردو کی ترقی کے لئے بذریعہ حبیب بنک کراچی منتقل کر دی تھی
جو وضع انہوں نے اول دن اختیار کی اس پر آخر تک قائم رہے شیروانی، ترکی ٹوپی اور
پائے جامہ عموماً پہنتے تھے آواز باریک تھی اور جوانی میں کافی مترنم تھی۔ جوانی میں داڑھی
منڈایا کرتے تھے مگر ایک بار ان کے ایک مخلص دوست عبدالباری خاں وفا نے ان سے
وعدہ لے لیا کہ داڑھی کبھی نہیں منڈوائیں گے اس کے بعد انہوں نے داڑھی رکھ لی اور
پھر اسے کبھی نہ منڈوایا۔ ترکی ٹوپی کے وہ پابند نہیں تھے لیکن ان کے سودیشی اسٹور کے
بچے ہوئے سامان میں بہت سی ترکی ٹوپیاں تھیں اس لئے جب تک یہ چلتی رہیں
مولانا انہیں پہنتے رہے بعد میں انہوں نے دوسری ٹوپیاں بھی استعمال کیں مولانا رات
کو سوتے وقت سر پر کوئی کپڑا باندھ لیتے تھے صبح سویرے بیدار ہوتے تھے، جلد
ناشتہ کرتے۔ کھانا اول وقت ہی کھا لیتے تھے کھانے پینے میں کسی چیز کے پابند نہیں تھے
جو مل گیا وہ بخوشی تناول کر لیتے تھے البتہ ترش چیزیں یہاں تک کہ دہی تک استعمال

نہیں کرتے تھے۔ پان تو خیر کھا لیتے تھے لیکن تمباکو، سگریٹ وغیرہ سے انہوں نے ہمیشہ اجتناب کیا اور سرمہ لگانا کبھی نہیں چھوڑا۔ اخبار بڑی پابندی سے اور شروع سے آخر تک پڑھتے تھے۔ زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ سیاسی امور پر جب مباحثہ ہوتا اور ان کو جوش آ جاتا تو اور بات تھی۔ سیاسی اختلافات کی بنا پر وہ سخت تنقید میں تامل نہیں کرتے تھے مگر انہیں ذاتی طور پر کسی سے عداوت یا عناد نہیں تھا۔ اپنے عقائد میں بے حد مضبوط تھے مگر ان کے احباب کے دائرے میں بلا امتیاز مذہب و ملت ہر قسم کے لوگ تھے اپنے ذاتی کام سے کبھی کسی امیر اور حاکم کے پاس نہیں گئے مگر ضرورت مندوں کے لئے ارباب ثروت سے سفارش کرنے میں انہیں کوئی تامل نہیں تھا۔ ارباب غرض اپنے کاموں کے لئے انہیں وزرا یا حکام کے پاس لے جاتے تھے تو وہ بے تکلف چلے جاتے طبیعت میں بے حد انکسار تھا۔ کسی شاعر کی مذمت یا تذلیل نہیں کرتے تھے بلا ضرورت اپنے علم کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بہت اصرار کیا جاتا تو اپنے اشعار سنا دیتے تھے اپنی تقریر یا گفتگو میں انہوں نے کبھی کوئی شعر نہیں پڑھا۔ ان کی زندگی درویشانہ بلکہ قلندرانہ تھی اور مزاج میں حد درجہ استغنا تھا انہوں نے کبھی لیڈر بننے کی کوشش نہیں کی اور نہ کسی بڑے لیڈر سے کبھی مرعوب ہوئے۔ دنیاوی اعتبار سے وہ بڑی مختصر تمنائیں رکھنے والے انسان تھے اس لئے ان پر کبھی مایوسی کی کیفیت طاری نہیں ہوئی ان کی زندگی صحیح معنوں میں مجاہد کی زندگی کا پرتو تھی۔ وہ محشر خیال نہیں۔ بلکہ محشر عمل تھے۔

صحافتی زندگی

مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۰۳ء میں اردوئے معلی کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ جاری کیا۔

۱۔ اس کا پہلا دور جولائی ۱۹۰۳ء تا جون ۱۹۱۳ء ہے۔ یہ رسالہ اس دور میں مئی ۱۹۰۸ء سے کر ستمبر ۱۹۰۹ء تک ان کی اسیری کی وجہ سے بند رہا۔

۲۔ اردوئے معلی کا دوسرا دور جنوری ۱۹۲۵ء سے مارچ ۱۹۴۲ء تک جاری رہا

۳۔ اس کے علاوہ انہوں نے تذکرۃ الشعراء کے نام سے جولائی ۱۹۱۴ء میں ایک

سہ ماہی رسالہ جاری کیا جس کے کل سات شمارے شائع ہوئے۔

۴۔ اس کے بعد انہوں نے ۱۹۲۸ء میں کانپور سے ایک روزنامہ مستقل جاری کیا جو ایک سال بعد روزانہ کی بجائے دو روزہ پھر سہ روزہ اور بعد میں ہفتہ وار ہو گیا۔ ۱۹۳۲ء سے مستقل نے ماہنامہ کی شکل اختیار کر لی اور ۱۹۳۶ء سے یہ اردوئے معلیٰ کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع ہونے لگا آپ نے ۱۹۲۱ء میں استقلال کے نام سے بھی کانپور سے ایک اخبار نکالا تھا

سیاسی زندگی

حضرت سید الاحرار نے ۱۹۰۴ء ہی سے سیاسی زندگی میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور آخر تک اس میدان میں جرأت اور قیادت کے جوہر دکھاتے رہے جس کا تفصیلی تذکرہ آگے پیش کیا جائے گا۔

کلامِ حسرت

مولانا حسرت موہانی کا پہلا دیوان ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔ اور کلیات کے عنوان سے ان کا کلام پہلی دفعہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ ان کی زندگی میں کلیات حسرت موہانی کی آخری اشاعت انتظامی پریس حیدر آباد دکن میں ۱۹۴۳ء میں ہوئی تھی اس میں ان کے بارہ دیوان اور دو ضمیمے شامل تھے۔ ان کا تیرھواں دیوان ۱۹۵۱ء میں ان کی وفات سے کچھ قبل لکھنؤ سے شائع ہوا تھا یہ ۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۰ء کے کلام پر مشتمل تھا۔ موجودہ کلیات میں تیرہ دواوین اور دو ضمیمے شامل ہیں۔ پہلے پہل ۱۹۵۵ء میں اسے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے شائع کیا۔ اس کے بعد اس کے کئی ایڈیشن لاہور سے شائع ہوئے۔ ابھی حال ہی میں لاہور سے ایک اور کلیاتِ حسرت شائع ہوا ہے جس کا مقدمہ مولانا جمال میاں فرنگی محلی کا ترتیب شدہ ہے۔

اردوئے معلیٰ اور قدیم اردو گلدستے

مولانا حسرت موہانی جس والہانہ انداز میں سیاست اور صحافت و ادب کی خدمت کرتے رہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا آپ کے رسالے اردوئے معلیٰ میں اردو

زبان کے پانچ قدیم گلدستے شائع کیے گئے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ گلدستۂ شعرا ضمیمہ انوار الاخبار لکھنؤ — ستمبر ۱۹۱۱ء
۲۔ گلدستۂ ریاض خیرآبادی — اکتوبر نومبر ۱۹۱۱ء
۳۔ پیامِ یار لکھنؤ — مئی تا اگست ۱۹۱۲ء
۴۔ فتنہ و عطر گورکھپور — جنوری ۱۹۱۳ء

تصنیف و تالیف

آپ کی تصنیف و تالیف کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ کلیات حسرت موہانی۔ طبع اوّل ۱۹۱۳ء
۲۔ دیوانِ غالب مع شرح۔ طبع اوّل ۱۹۰۵ء طبع دوم ۱۹۰۶ء
۳۔ مشاہداتِ زنداں۔ اردوئے معلی دسمبر ۱۹۰۹ء تا جنوری ۱۹۱۱ء کتابی شکل میں ۱۹۱۸ء میں جیل پور سے شائع ہوا۔
۴۔ نکاتِ سخن۔ پہلے پہل ۱۹۱۹ء میں تذکرۃ الشعراء میں اور بعد میں اردوئے معلی میں اور پھر کتابی شکل میں
۵۔ اربابِ سخن۔ کانپور ۱۹۲۹ء
۶۔ انتخابِ سخن۔ گیارہ جلدوں میں انتخابِ سخن کے نام سے دو سو اردو شعرا کے دواوین کے منتخبات شائع کئے گئے۔
۷۔ مختلف رسالے اور پمفلٹ
۸۔ حدیقہ معرفت۔ رئیس المطابع ٹیکا پور کانپور ۱۹۳۲ء جس میں مولانا حسرت موہانی کا صوفیانہ کلام درج ہے۔
۹۔ بیگم حسرت موہانی۔ مرتبہ مولانا حسرت موہانی۔ رئیس المطابع ٹیکا پور۔ کانپور
۱۰۔ سفرنامہ عراق۔ مرتبہ بیگم حسرت موہانی۔ شائع کردہ مولانا حسرت موہانی ۱۹۴۷ء
۱۱۔ انتخاب اردوئے معلی۔ مرتبہ مولانا حسرت موہانی۔ اردو پریس علیگڑھ
۱۲۔ تبصرہ نہرو رپورٹ۔ مرتبہ شاہ بدر عالم۔ شائع کردہ حسرت موہانی ۱۹۲۹ء
۱۳۔ شہادت نامہ سید الشہداء۔ مرتبہ سید اولاد حسن موہانی۔ شائع کردہ حسرت موہانی اردو پریس علیگڑھ

کلامِ حسرت کا انگریزی ترجمہ

مولانا حسرت موہانی کے کلام کا انگریزی ترجمہ سب سے پہلے بیگم حسرت موہانی نے ۱۹۲۲ء میں مرکنٹائل پریس کانپور سے شائع کیا۔ اس کے بعد یہ ترجمہ معہ اضافہ کے حیدرآباد میں سندھ ٹائمز پریس سے جناب اشتیاق اظہر اور جناب نصرت موہانی نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا

حسرت پر مطبوعہ کتابیں

۱۔ حالاتِ حسرت، عارف ہسوی مطبوعہ صدر دفتر انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام دہلی شائع شدہ ۱۹۲۷ء

۲۔ حسرت کی سیاسی زندگی عبدالقوی رضوی حلقۂ احباب دسینہ پٹنہ

۳۔ حسرت موہانی طبع اول، طبع دوم، طبع سوئم۔ پرنسپل عبدالشکور۔ اثاریک ڈپو

۴۔ حسرت کی کہانی نعیمہ کی زبانی۔ نعیمہ بیگم سعید آرٹش حیدرآباد۔ سندھ

۵۔ حسرت موہانی۔ حکیم محمد سعید۔ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کراچی ۱۹۷۷ء

۶۔ یادِ حسرت۔ ماجد الباقری۔ بزمِ احباب بہاولپور۔

۷۔ حسرت کی غزل۔ مرتبہ مسرور کیفی دارالادب انارکلی لاہور۔

۸۔ مطالعۂ حسرت۔ عطا کاکوی عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ ۱۹۷۷ء

۹۔ حسرت کی شاعری۔ ڈاکٹر محمد یوسف حسین خان جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۷۱ء

۱۰۔ مولانا حسرت موہانی۔ اشتیاق اظہر۔ نصرت موہانی۔

۱۱۔ حسرت موہانی نمبر۔ اردو ادب علی گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء

۱۲۔ حسرت موہانی نمبر۔ نگار لکھنؤ۔ جنوری۔ فروری ۱۹۵۲ء

۱۳۔ حسرت موہانی حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر احمد لاری ادبستان گورکھپور ۱۹۷۱ء

۱۴۔ تذکرۃ الشعرا از حسرت موہانی۔ مرتبہ ڈاکٹر احمد لاری ادبستان گورکھپور ۱۹۷۱ء

۱۵۔ مجلہ حسرت موہانی۔ مرتبہ حسرت موہانی میموریل سوسائٹی ۱۹۷۸ء

۱۶۔ لیڈرانِ اسلام حصہ اوّل۔ مرتبہ قاضی محمد رفیق۔ اسلام بک ایجنسی بجنور۔

۱۷۔ اسپاٹ لائٹ آن حسرت۔ مرتبہ محمد اسحٰق خان۔ ایم۔ ایل۔ اے نسیم پریس نظیرآباد۔ لکھنؤ

۱۸۔ قیدِ فرنگ۔ شائع کردہ مکتبہ راہی کراچی۔ ۱۹۵۸ء

حسرت پر تحقیقی کام

ڈاکٹر خالد حسن قادری نے لندن سے اور ڈاکٹر احمد لاری نے گورکھپور سے حضرت مولانا کی زندگی اور ان پر تحقیقی کام کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

انتخاب کلام حسرت

مولانا کے کلام کا انتخاب دوبارہ شائع ہوا ہے

۱۔ انتخاب حسرت۔ مرتبہ جلیل قدوائی۔ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی ۱۹۵۳ء

۲۔ انتخاب کلام حسرت۔ مرتبہ مسعود الحسن صدیقی مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی ۱۹۶۰ء

ان شعراء کی فہرست جن پر حسرت موہانی نے کام کیا

۱۔ آباد عظیم آبادی۔ مطبوعہ اردوئے معلیٰ کانپور۔ جنوری ۱۹۳۱ء

۲۔ امجد دکنی " " " "

۳۔ آبرو لکھنوی پنڈت بشن نرائن درد " " " "

۴۔ ابرو۔ شاہ مبارک " " فروری تا جون ۱۹۳۱ء

۵۔ اثر عظیم آبادی " " جولائی تا اگست ۱۹۳۱ء

۶۔ احسن مارہروی " " علی گڑھ فروری تا مارچ ۱۹۲۲ء

۷۔ احسن۔ مرزا احسن علی " " " ۱۹۱۱ء

۸۔ اختر۔ قاضی محمد صادق " مجموعہ مثنوی سراپا سوز، اسرار محبت مرتبہ حسرت موہانی ۱۹۱۱ء

۹۔ ازل لکھنوی۔ اردوئے معلیٰ۔ علی گڑھ۔ نومبر ۱۹۰۳ء

۱۰۔ اسد میرانی " " " مارچ ۱۹۱۱ء

۱۱۔ اشرف کھنڈری " " " ستمبر ۱۹۰۴ء و نیز دیوان اشرف مرتبہ حسرت موہانی ۱۹۱۴ء

۱۲۔ آشفتہ دہلوی۔ اردوئے معلیٰ علی گڑھ۔ اپریل ۱۹۱۱ء

۱۳۔ آشفتہ رام پوری اردوئے معلیٰ۔ علی گڑھ۔ اپریل ۱۹۱۱ء

۱۴۔ امیر۔ نواب محمد یار خان " " " "

۱۵۔ انور دھلوی " " مئی

۱۶۔ بقا۔ بقا اللہ خان مطبوعہ تذکرۃ الشعراء حصہ اوّل جزو دوم اکتوبر ۱۹۱۴ء

۱۷۔ مبارک۔ شاہجہان پوری اردوئے معلیٰ۔ علی گڑھ اکتوبر ۱۹۱۲ء

۱۸۔ بے خود بدایونی " " " " اپریل ۱۹۱۲ء

۱۹۔ بیدار۔ میر محمدی " " " " دسمبر ۱۹۰۳ء

۲۰۔ تاباں۔ عبدالحیٔ " " " " " ۱۹۱۰ء

۲۱۔ تسکین۔ میر حسن " " " جنوری ۱۹۱۳ء

۲۲۔ تسلیم لکھنوی " " " جولائی ۱۹۱۱ء اگست ۱۹۱۱ء دسمبر ۱۹۱۱ء تین قسطوں میں ہیں

۲۳۔ تنویر دھلوی " " " " جون ۱۹۱۱ء

۲۴۔ تنہا محمد یحییٰ " " جولائی ۱۹۰۷ء

۲۵۔ ثاقب اکبرآبادی۔ تذکرۃ الشعراء حصہ اوّل جزو دوم جولائی ۱۹۱۵ء

۲۶۔ ثاقب بدایونی " " " اوّل ۱۹۱۴ء

۲۷۔ جرأت۔ مطبوعہ انتخاب دیوان جرأت مرتبہ حسرت بدایونی ۱۹۱۴ء

۲۸۔ چکبست لکھنوی اردوئے معلیٰ۔ کانپور۔ اپریل، مئی۔ جون ۱۹۴۶ء

۲۹۔ حاتم۔ شاہ " " علی گڑھ اکتوبر ۱۹۰۳ء نیز اردوئے معلیٰ گڑھ نومبر ۱۹۰۹ء

۳۰۔ حاذق دا ڑوری۔ اردوئے معلیٰ علی گڑھ جنوری ۱۹۱۲ء

۳۱۔ حالی۔ مطبوعہ تذکرۃ الشعراء حصہ اوّل جزو دوم جولائی ۱۹۱۵ء

۳۲۔ حبیب کنتوری۔ اردوئے معلیٰ۔ علیگڑھ جنوری ۱۹۰۸ء

۳۳۔ حزیں۔ میر محمد باقر " " فروری۔ مارچ ۱۹۰۷ء

۳۴۔ حسرت۔ مرزا جعفر علی انتخاب دیوان حسرت مرتبہ حسرت موہانی ۱۹۰۴ء

۳۵۔ حسرت۔ میر محمد حیات۔ مطبوعہ اردوئے معلیٰ علیگڑھ فروری، مارچ ۱۹۰۷ء

۳۶۔ حسن بریلوی " " " جون ۱۹۱۲ء

۳۷۔ حسن لکھنوی اردوئے معلی علی گڑھ مارچ ۱۹۱۱ء

۳۸۔ حسن۔ میر 〃 〃 〃 〃 اپریل ۱۹۰۷ء انتخاب میر حسن مرتبہ حسرت موہانی ۱۹۱۱ء

۳۹۔ خیال فخر الدین 〃 〃 〃 〃 نومبر ۱۹۱۱ء

۴۰۔ ذوق دہلوی 〃 〃 〃 〃 فروری ۱۹۱۰ء

۴۱۔ راسخ عظیم آبادی 〃 〃 〃 〃 مئی ۱۹۰۷ء

۴۲۔ راقم دہلوی 〃 〃 〃 〃 مارچ ۱۹۱۱ء

۴۳۔ رسالہ حیات بخش تذکرۃ الشعراء حصہ اول جز اول جولائی ۱۹۰۴ء

۴۴۔ رضی۔ قاضی محمد حسین مجموعہ سلام ہائے رضی مرتبہ حسرت موہانی ۱۹۱۲ء

۴۵۔ رند۔ امیر محمد خان۔ اردوئے معلی علی گڑھ نومبر ۱۹۰۴ء

۴۶۔ رنگین۔ سعادت یار خان اردوئے معلی علی گڑھ فروری ۱۹۰۴ء

۴۷۔ رنگین لکھنوی 〃 〃 〃 مارچ ۱۹۱۱ء

۴۸۔ رونق ٹونکی 〃 〃 〃 نومبر ۱۹۱۲ء

۴۹۔ سالک دہلوی محمڈن اینگلو اورینٹل میگزین علی گڑھ اپریل ۱۹۰۴ء

۵۰۔ سحر لکھنوی۔ اردوئے معلی علی گڑھ ستمبر ۱۹۰۷ء

۵۱۔ سودا 〃 〃 〃 اکتوبر ۱۹۰۳ء

۵۲۔ سوز۔ انتخاب دیوان سوز۔ مرتبہ حسرت موہانی ۱۹۰۵ء

۵۳۔ شاعر۔ خواجہ کمال الدین۔ مطبوعہ اردوئے معلی علی گڑھ فروری مارچ ۱۹۰۷ء

۵۴۔ شبلی نعمانی تذکرۃ الشعراء حصہ اول جز چہارم اپریل ۱۹۱۵ء

۵۵۔ شعلہ بخاری اردوئے معلی علی گڑھ ستمبر ۱۹۱۴ء

۵۶۔ شگفتہ۔ خیراتی لال 〃 〃 اگست ۱۹۰۴ء

۵۷۔ شمس۔ مرزا آغا علی۔ مجموعہ مثنوی سراپا سوز۔ اسرار محبت و شمس مرتبہ حسرت موہانی ۱۹۱۱ء

۵۸۔ شوق۔ قدرت اللہ مجموعہ اردوئے معلی علی گڑھ اپریل ۱۹۱۱ء

۵۹۔ شوق۔ قدرت اللہ مجموعہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ اکتوبر ۱۹۱۱ء

۶۰۔ شہیدی، کرامت علی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 جولائی ۱۹۰۷ء

۶۱۔ شیفتہ 〃 〃 〃 〃 〃 اکتوبر ۱۹۰۳ء

نیز دیوان شیفتہ کامل مرتبہ حسرت موہانی ۱۹۰۹ء وار اردوئے معلیٰ کانپوری مئی جون ۱۹۳۵ء

۶۲۔ صبا۔ میر وزیر علی۔ مطبوعہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ اگست ۱۹۰۷ء

۶۳۔ صفت مراد آبادی 〃 〃 〃 〃 جولائی اگست ۱۹۱۲ء

۶۴۔ طالب رام پوری 〃 〃 〃 〃 مئی ۱۹۱۱ء

۶۵۔ ظفر دہلوی 〃 〃 〃 〃 جنوری ۱۹۱۱ء

۶۶۔ ظفر دہلوی 〃 〃 〃 〃 جون ۱۹۱۱ء

۶۷۔ عاشق لکھنوی۔ مرزا محمد بیگ 〃 〃 〃 نومبر ۱۹۱۱ء

نیز مثنوی نیرنگ خیال مرتبہ حسرت موہانی اردوئے معلیٰ کانپوری اپریل نومبر ۱۹۳۳ء

۶۸۔ عرشی مطبوعہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ دسمبر ۱۹۱۱ء

۶۹۔ عیشی طالب علی خان۔ مطبوعہ مخزن لاہور جنوری ۱۹۰۱ء اردوئے معلیٰ علیگڑھ دسمبر ۱۹۰۷ء

۷۰۔ غالب مطبوعہ اردوئے معلیٰ گڑھ اکتوبر ۱۹۰۵ء

۷۱۔ غفلت رامپوری 〃 〃 〃 مئی ۱۹۱۱ء

۷۲۔ قائم 〃 〃 〃 〃 جنوری ۱۹۰۳ء

۷۳۔ قلق۔ آفتاب الدولہ 〃 〃 〃 جنوری ۱۹۰۷ء

۷۴۔ قلق دہلوی۔ حکیم غلام 〃 〃 دسمبر ۱۹۱۰ء

۷۵۔ کرم رامپوری 〃 〃 مئی ۱۹۱۱ء

۷۶۔ کمال ناگپوری 〃 〃 اپریل ۱۹۱۱ء

۷۷۔ کیف لکھنوی 〃 〃 〃 〃 اپریل ۱۹۰۸ء

۷۸۔ گستاخ رامپوری تذکرۃ الشعراء حصہ دوم جزو دوم وسوم جولائی اگست ۱۹۱۹ء

واردوئے معلیٰ کانپور اپریل ۱۹۲۵ء

۷۹۔ لطف۔ مرزا علی۔ مطبوعہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ اگست ۱۹۱۰ء

۸۰۔ ماہر فخر الدین 〃 〃 〃 〃 دسمبر ۱۹۰۷ء

۸۱۔ مائل دہلوی۔ مرزا محمد تقی بیگ تذکرۃ الشعراء حصہ اوّل جز دوم اکتوبر ۱۹۱۴ء
وار دوئے معلیٰ کانپور دسمبر ۱۹۳۱ء

۸۲۔ مائل میر محمدی مطبوعہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ اپریل ۱۹۱۱ء

۸۳۔ مجذوب دہلوی " " " " " مارچ ۱۹۱۱ء

۸۴۔ مجذوب میر مہدی " " " " اگست دسمبر ۱۹۰۵ء

۸۵۔ محب دہلوی مطبوعہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ مارچ ۱۹۱۱ء

۸۶۔ محبت۔ نواب محبت خان۔ مجموعہ مثنوی سراپا سوز۔ اسرار محبت
مرتبہ حسرت موہانی ۱۹۱۱ء

۸۷۔ مذنب لکھنوی۔ مطبوعہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ مارچ ۱۹۱۱ء

۸۸۔ مذاق بدایونی " " " ۱۹۱۰ء

۸۹۔ مست بنارسی۔ تذکرۃ الشعراء حصہ اوّل جز پنجم جولائی ۱۹۱۵ء

۹۰۔ مصحفی۔ مطبوعہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ جون ۱۹۰۶ء

۹۱۔ مظہر۔ مرزا جان جاناں " " " فروری۔ مارچ ۱۹۰۷ء

۹۲۔ معروف۔ دہلوی " " " " جولائی ۱۹۱۰ء

۹۳۔ معین بدایونی " " " " مارچ ۱۹۱۱ء

۹۴۔ منظر۔ نذر الاسلام " " " " " جولائی ۱۹۰۶ء

۹۵۔ منیر شکوہ آبادی۔ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میگزین علی گڑھ جولائی ۱۹۰۴ء

۹۶۔ مونس۔ مطبوعہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ مئی ۱۹۰۵ء

۹۷۔ مہر لکھنوی، عبداللہ " " " " ستمبر ۱۹۱۰ء، اکتوبر ۱۹۱۰ء

۹۸۔ ناصر۔ سعادت خان " " " " مارچ ۱۹۱۱ء

۹۹۔ نثار دہلوی۔ محمد امان۔ تذکرۃ الشعراء حصہ اوّل جز دوم اکتوبر ۱۹۱۴ء

۱۰۰۔ نثار دہلوی۔ منشی اردوئے معلیٰ علی گڑھ مارچ ۱۹۱۱ء

۱۰۱۔ نسیم بھرتپوری " " مئی ۱۹۱۲ء

۱۰۲۔ نسیم دہلوی " " جنوری ۱۹۰۷ء

۱۰۳۔ نصیر دہلوی شاہ " " " دسمبر ۱۹۰۹ء

۱۰۴- نظم طباطبائی — اردوئے معلٰی کانپور — مئی، جون ۱۹۲۳ء

۱۰۵- نواب بدایونی — مطبوعہ اردوئے معلٰی علی گڑھ — اپریل ۱۹۱۰ء

۱۰۶- نوح ناروی — " — " — " — فروری ۱۹۱۱ء

۱۰۷- وفا رامپوری — " — " — کانپور — مارچ ۱۹۲۵ء

۱۰۸- یقین۔ انعام اللہ — " — " — علیگڑھ — مارچ ۱۹۰۷ء

<u>ان اساتذہ کی فہرست جن کا تذکرہ مولانا حسرت کے رسائل میں دوسروں کا برادیا کیا</u>

۱- بیان۔ احسن اللہ۔ از مولوی عبدالحق۔ مطبوعہ اردوئے معلٰی علی گڑھ — دسمبر ۱۹۰۵ء

۲- محمد لکھنوی از بلگرامی — " — " — " — " — مئی ۱۹۰۷ء

۳- حیرت۔ محمد سعید از سید علی بتیاب عظیم آبادی — " — " — " — ستمبر ۱۹۰۷ء

۴- اکبر مارہروی۔ از احسن مارہروی — " — " — " — فروری، مارچ ۱۹۱۳ء

۵- ذبیح پھپھوندوی (خود نوشت) — " — " — کانپور، مارچ ۱۹۲۶ء

۶- شاکر۔ سید عبدالرزاق۔ یکے از نامہ نگاران اردوئے معلٰی علی گڑھ دسمبر ۱۹۱۲ء

۷- شرف۔ مجددی (خود نوشت) — " — " — کانپور مئی جون ۱۹۲۳ء

۸- عیش مارہروی۔ از احسن مارہروی اردوئے معلٰی علی گڑھ — اپریل ۱۹۱۳ء

۹- عیش۔ شیخ فدا علی۔ از فدا حسن لکھنوی — " — " — " — مارچ ۱۹۰۵ء

۱۰- قدر بلگرامی۔ از وصل بلگرامی — " — " — " — اکتوبر ۱۹۰۷ء

۱۱- کاہش جونپوری۔ از ارادۃ الحق اردوئے معلٰی علی گڑھ — جون ۱۹۰۵ء

۱۲- منشا۔ مرزا احمد۔ از سید علی سجاد عظیم آبادی — " — " — جنوری ۱۹۰۵ء

۱۳- منیر شکوہ آبادی — " — " — " — فروری ۱۹۰۵ء

۱۴- نساخ۔ عبدالغفور۔ رضا علی وحشت کلکتوی — " — " — " — اکتوبر، نومبر ۱۹۰۷ء

۱۵- ہجر شاہجہان پوری۔ از حسرت رسالہ — " — " — مئی جون ۱۹۱۳ء

ذاتی زندگی کے بیان حقائق اور تبصرے

مولانا حسرت موہانی کے ایک پرانے رفیقِ کار اور محقق سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ مولانا اپنی نگرانی پر بھی برا نہیں مانتے تھے بلکہ کبھی از راہ تفنن ان کے ساتھ مذاق فرماتے۔ یعنی اگر کانپور تک جانا مقصود ہے تو لکھنؤ تک کا ٹکٹ لیا اور کانپور اُتر گئے یا اگر دلی کا ارادہ ہے تو امرتسر کا ٹکٹ لے لیا جب دلی پہنچے تو چپکے سے اُتر گئے اب سی۔ ڈی۔ آئی کے ارکان کی بدحواسی کا تصور کیجئے کہ جب گاڑی لکھنؤ یا امرتسر کے اسٹیشن پہنچی اس لئے کہ مولانا کے ٹکٹ لیتے ہی فوراً ٹکٹ نمبر اور جس جگہ کا ٹکٹ ہوتا نوٹ کر کے متعلقہ حلقوں کو اطلاع کر دی جاتی۔ اب جب ان اسٹیشنوں پر نہ پہنچتے تو ایک زلزلہ سا آجاتا تھا اور پھر اسٹیشن پر مولانا کی تلاش شروع ہو جاتی اسی طرح کبھی ایسا بھی ہوتا۔ کہ مولانا نے اثنائے سفر اپنے کسی شریکِ سفر سے ٹکٹ تبدیل کر لیا۔ اور جب مولانا والا ٹکٹ لئے ہوئے وہ شریکِ سفر اپنی منزل مقصود پر اترتا تو اس سے طرح طرح کے سوالات شروع ہو جاتے۔ سرکار کی طرف سے دوران سفر اس بات کا بھی اہتمام رہتا کہ مولانا کا ٹکٹ چیک کیا جائے اور ایک بار سے زیادہ چیک کیا جائے تاکہ ریل گاڑی میں مولانا کی موجودگی کا مسلسل پتہ رکھا جائے ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ٹکٹ چیکر جب ٹکٹ چیک کرنے آیا تو مولانا دوسری طرف نکل گئے۔ لہٰذا ٹکٹ چیکر کو مطلوبہ ٹکٹ چیک کرنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ ظاہر ہے کہ اس پریشانی کے عالم میں لوگوں کے ٹکٹ بار بار چیک کرنے پڑے اور مولانا ہر مرتبہ طرح دے جاتے۔ اب آخر جب انہوں نے ٹکٹ چیکر کو اچھی طرح دق کر لیا تو پھر فوراً اس کے پاس گئے اور فرمایا بھائی کیا اس ٹکٹ کی جانچ تو نہیں کرنی ہے اور اس کو اپنا ٹکٹ دکھایا تو ٹکٹ چیکر کی جان میں جان آئی۔ اسی طرح جب کوئی ضرورت پیش آتی تو ان سی۔ بے طلب اور بلا تنخواہ ملازموں سے کام بھی لئے جاتے چنانچہ اس قسم کے ایک واقعہ کا ایک ذکر بھی سید سلیمان ندوی نے "حسرت کی سیاسی زندگی" میں کیا ہے مولانا ندوی فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ خدا جانے کسی

جلسہ کی تقریب کے سلسلہ میں میں اور وہ دونوں دلی میں تھے۔ مغرب کے بعد حسرت نے نے کہا چلو کامریڈ کے دفتر میں جو کوچہ چیلان میں واقع ہے چلیں۔ راستہ نہ انہیں یاد تھا نہ مجھے۔ فرمایا چلو ایک رہبر ساتھ ہے اس سے پوچھیں۔ انھوں نے ایک صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ چھپ چھپ کر کیوں چل رہے ہو۔ ساتھ چلو۔ ذرا کامریڈ کا دفتر تو بتا دو۔ اب وہ صاحب آئے تو میں نے دیکھا کہ عربی کے طالب علم کے لباس میں ایک صاحب ہیں بے تکلف آگے چلے اور ہم لوگ پیچھے۔ حسرت نے کہا کہ یہ میرے ہمزاد ہیں یہ یا ان کے بھائی ہمیشہ میرے ساتھ رہتے ہیں اور ایسے مشکل وقتوں میں کام آتے ہیں اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ مولانا آزاد سبحانی کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے فرماتے ہیں کہ یہ حسرت عجیب فطرت کا آدمی ہے۔ سنو تو یہ حسرت نے جس شخص کے لئے فرمایا کہ تم سودا لادو۔ ہمارا آدمی نہیں۔ یہ تمہاری سی۔ آئی۔ ڈی کا ایک بڑا مسلمان افسر ہے جو حسرت کی ۲۴ گھنٹہ نگرانی کے لئے مقرر ہے۔ اور یہ کانپور سے باہر کا ہے اس لئے اس کو کوئی بھی نہیں پہچانتا۔ اس لئے اس نے حسرت کی کافی سے زیادہ خوشامد کر کے حسرت سے قریب رہنے کی یہ ترکیب نکالی کہ پہلے تو حسرت کی شاعری کی فرضی تعریف میں مبالغہ کی کمر توڑ دی۔ اس کے بعد اس نے کانپور آنے کا یہ سبب بتایا کہ میں حضور سے اپنے کلام پر اصلاح لینے کے جذبہ سے حاضر ہوا ہوں اور عین طلاق محل کے پاس شاندار بلڈنگ میں اس کا قیام ہے حسرت جو شاگردی کے نام سے چڑتے تھے وہ کاہے کو شاگرد اور اصلاح کے جھگڑے میں پڑتے۔ مگر یہ حسرت ہی کا دماغ ہے کہ جو تاڑ گیا کہ ہو نہ ہو یہ شخص سی آئی ڈی کا آدمی ہے اس لئے حسرت نے معاً ایک پروگرام طے کر کے اس شخص کو اپنا شاگرد بنا لیا اور اس سے دن رات خادم اور چپراسی کا کام لینا شروع کر دیا اور سی آئی ڈی کا یہ گدھا چوبیس گھنٹہ حسرت کے قرب کو اپنی ملازمتی کامیابی سمجھ کر ہر معمولی سی معمولی خدمت بجالاتا رہا۔[۷]

قلندرانہ شان

مولانا کی زندگی میں ان کی قلندرانہ شان کا بار بار ذکر آنا ضروری ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نہ اخذ کرنا چاہیئے کہ وہ واقعی مفلس تھے جس شخص نے ۱۹۰۲ء میں علی گڑھ

سے بی۔اے کیا ہو وہ نہ تو مفلس خاندان کا ایک فرد ہو سکتا ہے اور نہ اسے مستقبل میں مفلسی کی جاحت ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ان کی اچھی خاصی زمینداری ضلع فتحپور میں تھی۔ مگر پہلے سفر حج سے قبل وہ اس کے تین حصے کر گئے تھے ایک حصہ کی آمدنی انہوں نے اپنے مورث اعلیٰ شاہ وجیہہ الدین کے عرس کے لئے۔ دوسرے حصے کی آمدنی اپنے مرشد عبدالوہاب فرنگی محلی کے عرس کے لیے اور تیسرا حصہ انہوں نے اپنی لڑکی نعیمہ بیگم کے نام کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی قلندرانہ زندگی ان کے اپنے مزاج کا خاصہ تھی اور انہوں نے خود اس کو اختیار کیا تھا۔ انتقال کے وقت کراچی کے حبیب بنک میں ان کا ۱۵ ہزار روپیہ موجود تھا اور متعدد کمپنیوں میں ان کے پندرہ ہزار کے قریب حصص تھے مولانا اس رقم کو اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کا اظہار نہ صرف انہوں نے اپنے اعزا بلکہ مرحوم جسٹس ظہیر الحسنین لاری سے بھی کیا تھا مگر وہ اس بارے میں کوئی خاص واضح وصیت نہیں چھوڑ گئے تھے۔ مولانا کو دراصل پیسہ سے کوئی لگاؤ نہیں تھا جب ۱۹۲۸ء میں ان کے کلام کا انتخاب جامع بک ڈپو سے شائع ہوا۔ تو انہوں نے اس کی آمدنی جامعہ ملیہ کو بخش دی۔ اس سے بڑھ کر لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کا واقعہ ہے کہ ایک پروگرام کے خاتمے پر مولانا نے ریڈیو والوں کے سخت اصرار پر صرف ۱۳ آنہ کی رقم لینا منظور فرمائی اور باقی رقم یہ کہہ کر واپس کر دی کہ وہ اتنی بڑی رقم لے کر کیا کریں گے فرمانے لگے کہ کانپور ریلوے اسٹیشن تک پیدل گئے ریل میں خفیہ پولیس کی بدولت برف کے ڈبے میں آرام سے سفر کیا۔ لکھنؤ ریلوے اسٹیشن سے موٹر میں سوار ہو کر ریڈیو اسٹیشن آئے اور اب اسی موٹر میں واپس اسٹیشن تک پہنچ جاؤں گا۔ لہٰذا صرف تیرہ آنے لکھنؤ سے کانپور تک ریل کا کرایہ کافی ہے۔

نذرِ عقیدت

جناب غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ مولانا حسرت موہانی کی وفات کو اٹھارہ سال (جب یہ مقالہ تحریر کیا گیا) ہو رہے ہیں اسی طرح دن مہینے۔ مہینے اور سال صدیاں بنتی جائیں گی زمانہ کی گردش جب تک جاری رہے۔ دنیا جب تک قائم رہے بے اندازہ

آدمی پیدا ہوتے رہیں گے تاہم مولانا حسرت مرحوم جیسی ہستیاں نہ روزانہ وجود پذیر ہوتی ہیں اور نہ آئندہ ایسی بے بہا ہستیاں نظر آئیں گی بلکہ مجھ کو تو یہ محسوس ہوتا ہوتا ہے کہ ان بلند پایہ اقدار حیات کی تربیت و پرورش کے لئے موزوں فضا ہی باقی نہ رہی ہے جن کے ایک نادر مجموعہ کا نام سید فضل الحسن حسرت موہانی تھا عموماً کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کی وفات سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ کبھی پُر نہ ہوگی۔ یہ بیان بھی ایک رسم عام کی حیثیت اختیار کر گیا ہے تاہم مولانا حسرت واقعی ایسی شخصیت تھے جن کی خالی کی ہوئی جگہ اب تک پُر نہ ہوسکی اور آئندہ اس کے پُر ہونے کے امکانات بہت ہی کم رہ گئے ہیں میں کیا کہوں کہ مولانا حسرت موہانی کن کن نادر اوصاف و خصائص کا مجموعہ تھے۔ شجاعت و مردانگی میں بے مثل۔ عزم و ہمت میں یگانہ۔ ایثار و قربانی میں اس درجہ بلند کہ نظر اٹھا کر ان کے مقام کو دیکھنا چاہیں تو نہ دیکھ سکیں۔ علم و فضل کے اعتبار سے مشرق و مغرب کے بہترین جواہر پاروں کے جامع۔ حسن خلق کا پیکر۔ سادگی اور آزادروی میں اب تک کوئی ایسا نمونہ نظر سے نہیں گذرا۔ پھر اس دور میں اعلیٰ مقاصد ملی وملکی کے لئے وہ میدان جہاد میں اتر آئے جب ہماری وسیع سرزمین جو اب دو مملکتوں وادر اب تین مملکتوں میں منقسم ہے، شاید چند افراد کو ایسی سرگرمیوں کا مبہم ہی سا احساس ہو گا سب سے بڑھ کر یہ کہ کبھی برائے نام بھی خیال نہ ہوا۔ کہ وہ کوئی بڑا اور نادر کارنامہ انجام دے رہے ہیں یا اہل وطن کے ساتھ کردار عالیہ کا ایسا مرقع پیش کر رہے ہیں جس کے نظائر ناپید ہیں۔ اس راستے میں جو مشکلیں جو صعوبتیں اور جو سختیاں اٹھائیں ان کا تصور بھی آج بڑے بڑے مدعیان حریت کو لرزہ براندام کر دینے کے لئے کافی ہے لیکن مرحوم ومغفور حسرت کے لئے یہ سب کچھ اس طرح واجبات میں شامل تھا جس طرح کھانا۔ پینا۔ سونا اور سانس لینا شامل تھا بلکہ وہ کھانا پینا ترک کر سکتے تھے ان واجبات کی بوجہ احسن بجا آوری میں غافل نہیں ہو سکتے تھے جنہیں وہ زندگی کے حقیقی تقاضے سمجھتے تھے۔ پھر جواں مرد ایسے کہ انہوں نے اپنے دل کی بات ہر مجلس میں برملا کہہ دی نہ کسی شہرہ آفاق لیڈر کی حاضری انہیں مرعوب کر سکی جس کی ہر بات پر خواہ وہ صحیح تھی یا غلط عوام جانیں چھڑکنے کے لئے تیار تھے اور نہ اصل

مجلس کے رُجحان عام سے کبھی مُتاثر ہونا گوارا سمجھا، ان کے معاصرین میں بڑی بڑی شخصیتیں موجُود تھیں جن کی شہرت سے فضا گونج رہی تھی اور اب تک گونج رہی ہے مگر حسرت مرحوم کچھ کہنے کے لئے کھڑے ہوتے تو اختلاف کے باوجود سب کی گردنیں احترام سے جُھک جاتیں یہ مولانا کے ظاہری رعب کا اثر نہ تھا یہ ان کے کردار، ان کے ایثار، ان کے عزم و عظمت کی شہنشاہی کا پرتو تھا۔ کیا آپ تصوّر فرما سکتے ہیں کہ حسرت مرحوم ڈیل ڈول، وضع قطع، لباس اور تراش خراش دولت وثروت یا پیروؤں اور ہمرائیوں کی فراوانی وغیرہ میں سے کوئی چیز موجود تھی۔ بلکہ جو کچھ تھا وُہ ان سب کے برعکس تھا تاہم وہ جدھر کا رخ کرتے ان کے لئے دلوں کے دروازے بے توقف کھل جاتے تھے حسرت کی ایک شان ایسی تھی جس میں کوئی دوسرا لیڈر ان کی برابری کا دم نہ بھر سکا۔ یعنی انتہائی سادگی اور ہر نوع کی دنیوی ٹیپ ٹاپ سے کامل بے نیازی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ النانیت عالیہ کی نگہداشت میں اس درجہ منہمک تھے کہ جس کے باعث وہ ہر دوسری شے سے بے نیاز ہو گئے تھے تکلف و تصنع کی بے پرواہی نہیں بلکہ فطری اور طبعی بے پرواہی ایسی بے پرواہی جو ان کی حیات شعار کا ویسا ہی جزو لاینفک تھی جیسا سانس لینا۔ میں نے ان کا نام پہلے پہل اس زمانہ میں سنا تھا۔ جب اسکول میں پڑھتا تھا۔ جب تک تعلیم سے فارغ ہو کر سیاسی کاموں میں شریک نہ ہوا۔ ان کی زیارت سے بہرہ مندی کی نوبت نہ آئی پر ان سے نیاز مندی کا رشتہ رفتہ رفتہ استوار ہوتا گیا۔ میں نے انہیں جس وضع میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا، آخری دم تک اسی وضع پر قائم پایا۔ اپنی وفات سے چند ہفتے یا چند ماہ پیشتر وہ اچانک ایک بارات کے ساتھ لاہور آئے یہ بارات حافظ محمد صدیق کے چھوٹے صاحب زادے اور کراچی کے سابق میئر مرحوم شیخ محمد توفیق کے بھائی شیخ محمد عتیق کی تھی، مجھے یا مرحوم سالک کو خبر تک نہ تھی کہ وہ لاہور آ رہے ہیں۔ یکایک سالک مرحوم کی چٹ ملی کہ مولانا حسرت آئے ہیں زیارت کے لئے فوراً پہنچ جاؤ میں حیران کہ کہاں مولانا حسرت اور کہاں لاہور، سالک صاحب کے یہاں پہنچا تو دیکھا کہ مولانا حسرت گل افشانی فرما رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ بارات آ رہی تھی ہم نے سوچا چلو دوستوں سے مل آئیں چنانچہ آ گئے غرضیکہ

دو گھنٹہ کے قریب بیٹھے باتیں کرتے رہے یہ ان کی نیاز مندی کی شان تھی جس میں زندگی بھر فرق نہیں آیا۔ مولانا کے علمی کارناموں پر گفتگو کا یہ موقعہ نہیں یہ گفتگو بجائے خود ایک مستقل مقالے کی متقاضی ہے مولانا ہر اعتبار سے ایک نادر روزگار شخصیت تھے۔ یورپ تک کے سفروں میں ان کا کل سامان ایک چھوٹی سی پوٹلی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا خاصے بڑے بڑے امیروں کی آنکھیں بھی ان کے لئے فرش راہ بننے پر آمادہ رہتی تھیں لیکن حسرت مرحوم کو امیروں کی فضا میں دم لینا بھی دو بھر معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے نیاز مندوں کے ساتھ رہنا اور انہی سے خاصی میل جول رکھنا پسند فرماتے تھے۔ بے تکلفی سے پیار تھا اور جو طمطراق سے یک قلم پاک تھے اور آتے تھے تو ہمیشہ برادر مکرم الحاج شیخ مبارک علی کے ہاں ٹھہرتے۔ تشریف آوری کی اطلاع کبھی نہ دیتے۔ چپ چاپ چلے آتے۔ ایک موقعہ پر تو انہوں نے کمال ہی کر دیا۔ ٹرین سے اترتے ہی شیخ مبارک علی کی دوکان واقع اندرون لوہاری گیٹ پر پہنچ گئے۔ صبح کا وقت تھا اور دوکان بند تھی اپنی پوٹلی دکان کے بیرونی تختوں پر رکھ کر بیٹھ گئے۔ خاصے عرصے کے بعد شیخ مبارک علی دوکان کھولنے کے لئے آئے تو مولانا کو دیکھ کر حیران رہ گئے بار بار کہتے تھے کہ مولانا آپ نے کیا کیا۔ مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔ گھر پر کیوں نہ آ گئے۔ غرض مولانا حسرت موہانی ہر اعتبار سے ایک نادر شخصیت تھے وہ وطن اور ملی سیاست میں درجۂ اوّل کے لیڈر تھے۔ لیکن ہار کبھی نہیں پہنے جلوس نکلوانے پر کبھی راضی نہ ہوتے۔ ہر معاملہ کے متعلق سوچی سمجھی رائے بے تکلفی سے پیش کر دیتے تھے کسی کے کہنے سننے سے کبھی رائے نہیں بدلی۔ جس رائے سے اختلاف مناسب سمجھا اختلاف کیا خواہ وہ کتنی بڑی شخصیت کی رائے ہی کیوں نہ ہو۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ سے انہیں شدید اختلاف تھا وہ سید الاحرار تھے لیکن مسلم لیگ کی اس شاخ سے وابستہ رہے (شفیع لیگ) جو سائمن کمیشن کے رُو برُو شہادت دینے ہی میں مسلمانوں کا فائدہ سمجھتی تھی۔ مولانا سے شعر تو بارہا سُنے لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی آواز بھی سریلی ہے۔ ۱۹۳۰ء کی خلافت کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لئے لاہور آئے تو چند احباب نے انہیں حبیبیہ ہال میں بٹھا لیا

اور اصرار کیا کہ اپنی غزلیں گا کر سنائیں۔ چنانچہ مولانا نے دو تین غزلیں اس لے میں پڑھیں کہ اس مجلس کی یاد اب تک دل میں تازہ ہے۔ آہ

جس کے آوازے سے لذت گیر اب تک گوش ہے
وہ برس کیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

پختہ طبیعت

جناب نیاز فتحپوری نے لکھا ہے کہ حسرت بڑی پختہ طبیعت کے انسان تھے اور جس سے جو تعلق ایک بار قائم کر لیا اسے کبھی قطع نہیں کیا۔ وہ بڑے خوش مزاج منکسر طبیعت، صلح کل اور سادہ وضع کے انسان تھے اور آخر عمر میں تو سالہا سال تک انہوں نے حج ترک نہیں کیا لیکن زاہدانہ فخر ان میں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ انسان ہونے کی حیثیت سے وہ بڑی چیز تھے اور شعر و انسانیت کا جیسا دلکش امتزاج حسرت کے یہاں پایا جاتا ہے اس کی نظیر بھی متقدین میں بھی نہیں ملتی متاخرین کا کیا ذکر ہے۔

ہمہ گیر ذات

پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے کہ حسرت اور ان کی شاعری کو ملک کی تاریخی قوتوں اور تحریکوں سے الگ کر کے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ شاید ہی کوئی معاشرتی تنظیم یا سیاسی تحریک ایسی ہو جس کو حسرت نے ملک کے حق میں صحتمند نہ سمجھا ہو اور اس میں جی جان سے (مال کا سوال نہیں تھا) شریک نہ رہے ہوں۔ حسرت کی ذات ایک ہمہ گیر ذات تھی وہ شاعر کے علاوہ بہت کچھ تھے اور جو کچھ وہ زندگی کی دوسری سمتوں میں تھے اس سے ان کی شاعری نے بھی نہایت گہرے اور مستقل اثرات قبول کئے جو شخص برطانوی سامراج کے سفاکانہ مظالم کو اس لذت کے ساتھ برداشت کر رہا ہوں وہ معشوق کی جفاؤں اور عشق کی آزمائشوں کے مقابلہ میں کیا شکست کھاتے اس اعتبار سے وہ ہندوستان کے مایۂ ناز اور شہرۂ آفاق شاعر ٹیگور سے بھی ممتاز نظر آتے ہیں۔

حیرت انگیز شخصیت

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے "حسرت کی جو حیثیت میرے لئے حیرت انگیز ہے اور جس سے میں متاثر ہوں وہ ان کی عجیب وغریب شخصیت ہے ان کی شکل وصورت، وضع قطع، رہن سہن، طور طریقے، بات چیت، ان کی شکل کشی، دنیا طلبی اور ان سب پر فوق ان کی غزل ادائی۔ کون جانے اور کون کہہ سکے کہ انہوں نے جب ہوش سنبھالا اور جب تک اس جہان سے اٹھ نہ گئے وہ زندگی کے جہنم میں رہے یا جنت میں کبھی خیال آتا ہے کہ انہوں نے شاید اسی دنیا کے جہنم میں اپنے لئے کوئی جنت تعمیر کر لی تھی اور کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ انہوں نے اس دنیا کی جنت میں کوئی جہنم بنا لیا تھا جس میں وہ سوتے جاگتے تھے کھاتے پیتے تھے لڑتے جھگڑتے تھے خلوص برتتے تھے شاعری کرتے تھے خود خوش ہوتے تھے ہم آپ کو سب کو خوش رکھتے تھے پھر سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ حسرت کی نہ کوئی جنت تھی نہ جہنم۔ وہ اپنی درویشی میں ہر جنت وجہنم سے بے نیاز، مست اور مگن تھے نہ اپنے سے باہر کسی بات کی خوشی یا غم مناتے تھے نہ اپنے اندر رنج وراحت کے لئے کوئی جگہ رکھتے تھے شادی وغم کی ان کے یہاں شاید کوئی اہمیت نہ تھی وہ ان کو فطرت کے ان مظاہر سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے جو شام وسحر کی طرح آتے اور چلے گئے۔ آتے رہیں گے اور جاتے رہیں گے۔ نہ ان کو معلوم کہ وہ کیا ہیں، کیوں ہیں کیونکر ہیں۔ کہاں کے ہیں اور کب تک رہیں گے جس طرح حلقہ شام وسحر میں ہم اسیر ہیں حلقۂ حسرت میں شاید رنج وراحت۔ نفع وضرر اور خیر وشر اسیر تھے کہیں ایسا تو نہیں کہ حسرت کی دنیا وعقبیٰ حسرت خود تھے اور کوئی اپنی دنیا وعقبیٰ نہیں ہے ان کی گول چھدری ڈاڑھی ان کی باریک آواز۔ ان کی چھوٹی نال کی عینک بغیر پھندنے کے پرانی ترکی ٹوپی۔ گھسی پٹی چپل۔ موزے سے کوئی سروکار نہیں۔ موٹے کھدر کی پیوندلگی کا داک کی شیروانی جس کے اکثر بٹن ٹوٹے یا غائب، ہاتھ میں بدرنگ سا جوٹ کا جھولا۔ دری تکیہ اور موٹی ململی چادر کا مختصر بستر۔ ٹیڑھا اور پرانا چھوٹا سا ایک ٹرنک۔ یہ تھے حسرت۔ لیکن کس قیامت کا یہ آدمی تھا۔ محشر خیال نہیں۔ محشر عمل

بس بات کو اپنے نزدیک حق سمجھتا تھا اس کو بغیر کسی تامّل کے بغیر گھٹائے بڑھائے
بغیر ہموار کئے بغیر مصلحت یا موقعہ کا انتظار کئے۔ زبان، قلم سے بغیر ملک جھپکائے
مخاطب افلاطون ہو یا فرعون اس کے سامنے کہہ ڈالنا حسرت کے لئے معمولی بات
تھی۔ الیا نڈر، سچا، محبّت کرنے والا اور محبت کے گیت گانے والا اب کہاں سے آئے
گا کسی سے نہ دبنے والا۔ ہر شخص پر شفقت کرنے والا۔ زبان کا نبّاض، شاعروں
کا والی۔ غزل کا باوا آدم۔ ادب کا خدمت گذار کیسی سچی بات ایک عزیز نے کہی کہ سیاست
کوئلہ کا کاروبار ہے جس میں سبھی کا ہاتھ تھوڑا بہت کالا ہوتا ہے سوا حسرت۔ دنیا
کی تمام عقل و حکمت، دولت و اقتدار۔ فریب و فتن کیسی ہی ایجاد کیوں نہ کر
ڈالیں ایسے سرپھروں کا کیا کرلیں گے جیسے کہ حسرت تھے جو شخص رنج و راحت
جینے مرنے۔ نفع و نقصان کی پرواہ نہ کرتا ہو۔ اس کا آٹیم بم کیا کرے گا۔ فطرت
نے انسان کے نفع و ضرر کے کتنے سامان فراہم کردیئے ہیں انسانی معاشرہ نے زندگی
کو استوار و خوش گوار بنانے کے لئے کیسی کیسی سہولتیں اور آسائشیں اکٹھا کرلی ہیں
لیکن حسرت کا کیا علاج جن کو ان میں سے کسی ایک کی پرواہ نہیں نہ مجبور رہنے کا
غم نہ ممتاز ہونے کی خواہش۔ فرض اور فن دونوں کا امین۔ فن کی خوشی۔ فرض
کا افتخار۔ انسان کی یہی عبادت بھی اور بغاوت بھی۔ انگریز دشمنی میں حسرت
علی گڑھ سے نکالے گئے علی گڑھ ہی میں سودیشی کی دکان کھولی۔ غالب پر
حاشیہ لکھا اردوئے معلیٰ کی ایڈیٹری کرتے رہے اور ان مشغلوں سے جو کچھ
روکھا پھیکا میسر آجاتا اس پر اکتفا کرتے اور دنیا کی تمام عیش و کامرانی پر مسکراتے
رہتے۔ کسی صاحب دولت و اقتدار کا یارا نہ تھا کہ تمت و مسکنت کے اس بوریہ
نشین سے آنکھ ملا سکے۔ دیسی کھردرے مٹیالے کاغذ پر اردو کے مشاہیر نیز کم نصیب
گوشہ گیر اور تقریباً بھلائے ہوئے شعراء کے کلام کا انتخاب شائع کرتے رہے۔ کتنے
شعراء کے کارناموں کو حسرت نے ہر طرح کی مجبوری و بے سرو سامانی کے باوجود دوام
بخشا۔ اس کا اندازہ آج اردو کے اس دور ابتلا و آزمائش میں کرتا ہوں۔ تو حسرت
کی یاد میں دل بے قرار ہو جاتا ہے وہ زمانہ علی گڑھ کالج کے بڑے دبدبہ اور طنطنہ
کا تھا کیسے کیسے علماء یہاں تھے جو بڑے بڑے کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ حسرت کے لئے

کالج کی سرزمین شجرِ ممنوعہ تھی اور خود حسرت نے کبھی کالج کا رُخ نہیں کیا حسرت
سے اس زمانہ میں کسی قسم کا تعلق حکومت کے قہر و عتاب کا موجب ہوتا تھا۔ لیکن
یہاں سے اچھے سے اچھے طالب علم حسرت کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے
ضرور حاضر ہوتے۔ اور اس پر فخر کرتے کہ حسرت نے ان کو اپنے بوریے پر بٹھایا شفقت
اور محبت کی باتیں کیں اپنا کلام سنایا۔ اساتذۂ سخن اور شعر و ادب کے نکات سے
آشنا کیا۔ گذشتہ ۳۵ سال میں جو لوگ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر (۱۹۵۱ء)
پبلک لائف میں داخل ہو چکے ان میں سے غالباً کوئی ایسا نہیں جس کو میں نہ جانتا
پوچھتا ہوں۔ علی گڑھ میں رہتے بستے ایک عمر ہوئی یہاں کی زندگی کا کون سا پہلو ہے
جو نظر سے نہ گذرا ہو اور کون سی نعمتیں ہیں جو یہاں میسر نہ آئیں لیکن اس وقت
صرف دو ہستیاں ایسی یاد آتی ہیں جو یہاں سے نکالے جانے کے بعد بھی علی گڑھ کے
حامی و ناصر رہے اور جنہوں نے کبھی بھی علی گڑھ کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا کہ یہ
دو ہستیاں مولانا حسرت موہانی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہیں۔ اردو پی۔ ایچ۔ ڈی کا
زبانی امتحان لینے حسرت علی گڑھ تشریف لائے اس سج دھج سے جس کا ذکر اوپر ہو
چکا ہے سفر خرچ کا بل منظوری کے لئے پیش کیا گیا۔ تو بولے یہ فرسٹ کلاس
کا ٹکٹ کیسا۔ میں تو تھرڈ کلاس میں سفر کرتا ہوں۔ اور در اصل میں دلی جا رہا ہوں
پروگرام ایسا رکھا کہ یہاں پر اتر پڑوں۔ اور امتحان لے کر آگے بڑھ جاؤں۔ مجھے یہ کرایہ
کیسا اور ٹھہرنے کا الاؤنس کیوں؟ طعام و قیام تو آپ کے یہاں رہا۔ بڑی دیر تک بڑے
مزے کی باتیں ہو رہی اور علی گڑھ سے اپنی اُلفت کا اظہار کرتے رہے حسرت پارلیمنٹ
کے ممبر تھے لیکن ان کے انداز درویشانہ میں کوئی فرق نہ آیا نہ ممبران کی آرام کشادہ
اور پُر فضا قیام گاہ نہ ٹیلی فون نہ موٹر۔ نہ تفریح۔ نہ دعوت۔ نہ دید و باز دید۔ تنہا
دلی کی ایک غیر معروف شکستہ مسجد میں چٹائی پر قیام رہتا۔ فرش پر آس پاس اخبارات
کا غذات اور رفاملیں، وقت آیا تو کسی دکان پر جا کر کھانا کھا لیا کاغذات تھیلے
میں ڈالے اور پارلیمنٹ پہنچ گئے۔ راستہ اکثر پیدل ہی چلتے اور موقعہ آن پڑتا تو
پارلیمنٹ میں ایسی دو ٹوک اور بے لاگ تقریر کرتے کہ در و بام کو ہلا کر رکھ دیتے پاکستان
اور ہندوستان کے بڑے بڑے عہدہ داروں کا دلی میں ایک سرکاری اجتماع تھا۔ بعد

اہم اور نازک مسائل زیرِ بحث تھے شام کو عصرانہ تھا اعیان واکابر جمع تھے حسرت بھی مدعو تھے ایسے مواقع پر ایسی پارٹیاں صرف چائے پینے پلانے کے لئے نہیں ہوتیں اور باتیں بھی مدِ نظر ہوتی ہیں آرائش وزیبائش، جاہ وحشم، ساز وسامان، تکلف و تواضع، صاحبان ثروت، ماہرینِ سیاست، اکابر علم وحکمت، اپنے اپنے دبدبہ ووقار کے ساتھ اور خواتین مع اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے موجود تھیں۔ فضا آراستہ، صحن پیراستہ۔ اتنے میں ایک طرف سے حسرت نمودار ہوئے۔ اس سج دھج سے جو صرف ان کی تھی اس وقار درویشی اور انداز قلندری سے جو ان کا مسکن تھا اور اس شعلہ سامانی وشبنم افشانی کے ساتھ جو ان کی زندگی تھی مجمع میں ایک لہر سی دوڑ گئی ہر شخص نے بڑے لطف واحترام سے حسرت کی پذیرائی کی اور دیکھتے دیکھتے وہ سب کے تپاک اور توجہ کا مرکز بن گئے۔ شائستہ فقرے لطف کی باتیں، عقیدت و محبت کی پیش کش۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ جیسے یہ تقریب حسرت کے خیر مقدم کے لئے منعقد ہوئی ہو۔ فرمائش شروع ہو گئی حسرت نے شعر سنانے شروع کر دیئے سارے اکابر حسرت کے گرد جمع ہو گئے اور محفل کا رنگ ہی بدل گیا تھوڑی دیر تک ذہن میں کچھ اور باتیں آتی رہیں اور اپنا نقش چھوڑتی چلی گئیں۔ سارا گرد وپیش جو دولت، امارت اور نفاست کا ترجمان اور آئینہ دار تھا ایک شخص کی موجودگی سے کیا سے ہو گیا اور اس مردِ درویش کے جلال اور اس کی شاعری کے جمال میں گرد وپیش کا سارا اہتمام کس درجہ سطحی اور ضمنی معلوم ہونے لگا کتنی ایسی باتیں ذہن میں آئیں جن کو باضابطہ وبامعنی تحریر کا جامہ پہنانا ناممکن معلوم ہونے لگا۔ یکایک اقبال کی مسجد قرطبہ کے نقوش ابھرنے لگے اور بے اختیار یاد آنے لگا کہ اقبال نے اس موقعہ پر کیا کہا تھا۔

شاعری اور چکی کی مشقت

جناب شیخ ممتاز حسن جونپوری نے لکھا ہے کہ حسرت موہانی کی طرح کے انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں حسرت مرحوم نے سیاسی اور قومی لیڈر کی حیثیت سے جیل کے باہر رہ کر اور جیل کے اندر بھی شاعری اور تخیل کا در بند نہیں کیا

جیل میں چکی پیسے جاتے تھے شعر بھی کہتے جاتے تھے میں نے ایک بار حسرت مرحوم سے پوچھا کہ اے بھائی ایسی مصیبت میں بھی پسنے والے گیہوں کے ساتھ تخیل کو سنوارنے میں آپ کیسے انتظام کرتے تو فرمایا کہ شاعری نے غم غلط کرنے اور صبر وشکر کی عادت ڈالنے اور اخلاق سنوارنے میں میرا ساتھ دیا۔ اگر شاعر نہ ہوتا تو جیل میں گیہوں پینا دوبھر ہوتا۔ گیہوں تو خود بخود پسا چلا جاتا تھا اور بعض لوگ شعر سننے کے لالچ میں میرا گیہوں بھی پیس دیا کرتے تھے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ حسرت زندگی کے لئے ایک معمہ تھے لیکن زندگی حسرت کے لئے معمہ نہ تھی زندگی نے انہیں نہ سمجھا لیکن انہوں نے زندگی کو خوب سمجھا تھا دنیا ان کو برت نہ سکی لیکن انہوں نے دنیا کو خوب برتا۔ غالب دنیا کو نظریاتی طور پر بازیچۂ اطفال کہتے تھے لیکن حسرت اس پر عمل بھی کرتے تھے وہ زندگی پر حاوی تھے انہوں نے اس پر اس طرح قابو پا لیا تھا کہ اس کی گرفت ڈھیلی نہیں ہو سکتی تھی ان کی زندگی کامیاب زندگی نہیں تھی لیکن وہ اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے تھے کیونکہ کامیابی کا پیمانہ ان کے نزدیک مختلف تھا وہ زندگی کی روایتی قدروں کے قائل نہ تھے اگر باتوں سے نئی قدروں کی تخلیق ہوتی تو وہ نئی دنیا بھی تعمیر کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ تنہا تھے لیکن ان کی یہ تنہائی ایک مستقل انجمن تھی۔ حسرت نے کانگریس تحریک کا بچپن دیکھا تھا اور جب جوانی کے دن انہیں عام ہوتے نظر آئے تو آگے بڑھ کر انہوں نے اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی لیکن کانگریس بھی ان دنوں متوسط طبقہ کے چند تعلیم یافتہ لوگوں کی جماعت تھی۔ پیش نظر چند حقوق حاصل کرنا تھا لیکن انقلابی کیفیت اس وقت اس جماعت میں نام کو بھی نہ تھی اور ایک زمانہ تک نہ رہی لیکن وقتاً فوقتاً اس جماعت میں بعض حقیقت پسندوں کی طرف سے انقلابی خیالات کا اظہار ہوتا رہا۔ کانگریس نے جو نقشہ بنایا تھا اس میں ان لوگوں نے انقلابی رنگ بھرنے کی کوشش کی حسرت بھی ان حقیقت پسندوں میں سے ایک تھے ان کے مزاج میں جو انتہا پسندی تھی وہ انہیں انقلاب اور بغاوت کے خواب دکھاتی تھی چنانچہ وہ آگے بڑھنا چاہتے تھے اور ان کی تمنا تھی کہ دوسرے بھی ان کے ساتھ

اس میدان میں آگے بڑھیں مصلحت کوشی کے وہ قائل نہیں تھے خلوص۔ بیباکی اور صاف گوئی سے کام لینا ان کے نزدیک ضروری تھا اس ماحول سے حسرت کو کئی چیزیں ملیں تغیر کا صحیح احساس ان کے اندر پیدا ہوا۔ زندگی کو بہتر طریقے پر بسر کرنے کی خواہش ان کے یہاں پیدا ہوئی۔ اپنے تہذیبی ورثہ کو از سرِ نو زندہ کرنے کا جذبہ ان کے یہاں نمودار ہوا۔ زندگی میں قول و عمل کا جو تضاد تھا اس کی حقیقت ان پر واضح ہوئی اور انہوں نے کھلم کھلا اس کی مخالفت کی رفتار حیات میں شدت و تیزی پیدا کرنے کا شعور ان کے یہاں ابھرا۔ اور ان ہی تمام اثرات کے نتیجہ میں حسرت کی وہ شخصیت ہمارے سامنے آئی جو نڈر اور بے باک تھی جو حق پسند اور صاف گو تھی۔ جو زندگی کا گہرا شعور رکھتی تھی۔ جو ایک انقلاب چاہتی تھی جو کسی کی پرواہ نہیں کرتی تھی جو اپنی لفظی چیزوں کو از سرِ نو زندہ کرنا چاہتی تھی۔

حسرت دیوانہ

پنڈت کشن پرشاد کول نے لکھا ہے آج جب کہ زبانوں کے قفل ٹوٹ گئے ہیں حکومت کا جا و بیجا بدنام و مطعون کرنا بلکہ اس کے خلاف زہر اگلنا بھی بچوں کا کھیل بن گیا ہے انقلاب زندہ باد کے نعرے گلی کوچوں میں ہر کہ و مہ کی زبان پر ہیں۔ مظاہرے۔ ہنگامے۔ ہڑتالیں اور مرن برت بھی زندگی کا روزمرہ ہو رہا ہے جیل جانا تو معمولی سی بات ہے جس پر یہ ٹھپا نہیں لگا۔ اس کے لئے تو پبلک لائف میں کوئی جگہ ہی نہیں لہٰذا جن لوگوں نے اس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اس فضا میں پرورش پائی ہے ان کے لئے اس کیفیت کا اندازہ کرنا جواب ہے تقریباً ۵۰ برس پہلے ملک پر چھائی ہوئی تھی اور ان لوگوں کی اولوالعزمی اور جانبازی کا اندازہ لگانا جنہوں نے سوئی ہوئی قوم کو جگایا۔ آسان بات نہیں ہوگی۔ میں اسی بات کا ذکر کر رہا ہوں کہ جب کانگریس دھیمی چال سے تدریج کی منزل کی طرف قدم بڑھا رہی تھی نرم دل والے کانگریس میں برسرِ اقتدار تھے گرم دل کا شیرازہ اس وقت تک بندھا نہیں تھا تقسیم بنگال نے البتہ بنگال میں شورش و ہنگامہ برپا کر دیا تھا اور وہاں قوم بدحواس ہو رہی تھی بڑے بڑے

جانبازی کے کرشمے دیکھنے میں آئے مہاراشٹر میں تلک کی ذات سے گرم پارٹی کا بول بالا ہو رہا تھا اور لالہ لاجپت رائے کی شخصیت نے پنجاب میں کچھ ایسی ہلچل مچائی کہ انگریز سرکار بدحواس ہونے لگی مگر یو۔پی کے صوبہ میں امن وامان اور سکون تھا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اور گنگا پرشاد ورما بشن نرائن در اور آخر میں پنڈت موتی لال نہرو کانگریس کے لیڈر تھے اور کانگریس اپنی پرانی روش سے خفتہ خاموش چلی جا رہی تھی بالخصوص مسلمانوں میں کانگریس کے نام لیوا خال خال تھے جن کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ لکھنؤ میں حامد علی خان بیرسٹر مرزا سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ نواب صادق محمد خان تعلقہ دار شیش محل اور بعد میں خواجہ عبدالمجید بیرسٹر علی گڑھ اور مرزا سمیع اللہ بیگ ایڈووکیٹ لکھنؤ کانگریس کے سربرآوردہ حامی تھے یہاں ایک نام اور رہ گیا ہے یعنی حافظ عبدالرحیم وکیل علی گڑھ کا جو بڑے پرانے کانگریسی تھے اور آخر دم تک انہوں نے اپنی وضع کو نبھایا یہ معدودے چند مسلمان تھے جو کانگریس کے نام لیوا تھے ورنہ تمام ملت علی گڑھ کی تحریک کی شریک تھی اور کانگریس کی مخالفت اس کا سیاسی دین اور ایمان تھی اس گدلی فضا میں حسرت موہانی نے آزادی کا چرچا دلیری اور بے باکی سے شروع کیا۔ اور کس طرح

رسم جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حب وطن مست خواب دیکھئے کب تک رہے

دل پہ رہا مدتوں غلبۂ یاس و ہراس
قبضۂ شرم و حجاب دیکھئے کب تک رہے

تا بہ کجا ہو دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی رگوں پہ تاب دیکھئے کب تک رہے

پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب کا
خلق خدا پر عذاب دیکھئے کب تک رہے

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بہ زیر نقاب دیکھئے کب تک رہے

دولت ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

ہے تو کچھ اکھڑا ہوا بزم حریفاں کا رنگ
اب یہ شراب و کباب دیکھئے کب تک رہے

حسرت آزاد پر جور غلامان اثر
از رہ بغض عتاب دیکھئے کب تک رہے

اور یہ آواز اسی صوبہ میں اٹھی علی گڑھ سے۔ لازم تھا کہ سرسید کی ملت سراسیمہ اور

پریشان ہوا اور ٹھیک بھی تھا۔

ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

پنڈت کشن پرشاد کول نے جو بعد میں اودھ چیف کورٹ کے جج بھی ہوئے مولانا حسرت کی وفات پر نذر عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ "حسرت نے اپنی زندگی کا نصف حصہ وطن کی خدمت میں جاں نثاری سے گذارا اور نصف حصہ اپنی ملت کی پُر جوش خدمت و حمایت میں مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جو قدر ملک و ملت کو ان کی کرنی چاہیے تھی دونوں میں سے کسی نے نہ کی۔ غالباً وجہ یہ تھی کہ حسرت اپنا ڈھنڈورہ آپ پیٹنا نہیں چاہتے تھے کہ جو آج کل کے زمانہ کا رنگ اور خاصہ ہے خیراب وہ یادگار ہستی دنیا سے اُٹھ گئی۔ رہا ان کی موت کا ماتم سوا نہیں کے شعر کو بار بار دہرایئے اور دل بھر کر کہیئے۔

شاید جہاں سے حسرت دیوانہ چل بسا ہاں ہاں جبھی تو چشم جنون اشکبار ہے

اضطرابِ مسلسل

مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے ایک مضمون میں جو نگار کے حسرت نمبر جنوری و فروری ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا لکھا ہے کہ دو لفظوں میں سمجھئے کہ وہ گاندھی جی سے پرانے کانگریسی اور جناح صاحب سے پرانے مسلم لیگی تھے ہندوستان کے سارے اشتراکیت پسندوں سے پرانے اشتراکی اور سارے آزادی چاہنے والوں سے پہلے مبلغ تھے وہ سرتاپا جدو جہد تھے جو ہر استبداد سے مقابلہ کرتے رہے۔ ایسے با عمل تھے جن کا ہر لمحہ ایک بلند مقصد کے لئے صرف ہوا۔ وہ ایک اضطراب مسلسل تھے جس کی انتہا شاید موت بھی نہ کر سکے اور آج شوق ہی ان کے درجے بلند کر رہی ہو۔

جانِ حسرت کے لئے مایۂ نازش ہے یہی اضطراب دل دیوانہ مبارک باشد

اربابِ صداقت

مولانا عبدالمالک آروی نے لکھا ہے کہ "تاریخ بتاتی ہے کہ زمانہ نے ہمیشہ ارباب حق کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ حضرت ذکریا، حضرت مسیح، سید مولانا مہاتما گاندھی

اور حسرت ایک ہی نشۂ حق کے سرشار تھے ان کا انجام بھی ملتا جلتا تھا اس میں شک نہیں کہ حسرت کو نہ تو سقراط کی طرح زہر کا پیالہ پینا پڑا اور نہ شمس تبریز کی طرح وہ اہل دنیا کی نظر میں قابل گردن زدنی ٹھہرے۔ سید مولا اور گاندھی کی طرح وہ خاک و خون میں لوٹے بھی نہیں پھر بھی حقیقت بیں نگاہیں جانتی ہیں کہ حسرت نے زندگی کا سارا دور زہر ہی پی پی کر گذارا۔

خلافت کانفرنس

جناب ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ جب ۱۹۲۳ء میں مولانا خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے بمبئی تشریف لائے تو اس وقت بھی انہوں نے تیسرے درجہ کا ٹکٹ لیا اور اسی درجہ میں سفر کیا حالانکہ مولانا شوکت علی کہتے ہی رہ گئے کہ وہ کم از کم دوسرے درجہ میں بی۔اماں کے ساتھ خلافت کے خرچ پر سفر کریں۔ یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے مگر مولانا برابر اپنے اصول پر قائم رہے اور تیسرے درجے ہی میں سفر کیا اور خلافت کمیٹی سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔ یہی برنی صاحب آگے چل کر مولانا کی جرأت اور بے خوفی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک ثقہ راوی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب کہ دلی میں چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی اور مسلمانوں پر زندگی حرام ہو رہی تھی مولانا دن کو کسی نہ کسی طرح کیناٹ پیلس پہنچ جاتے تھے اور تن تنہا ادھر ادھر گھومتے پھرتے تھے خدا جانے ان کے دل میں اس وقت کیا خیالات موجزن رہتے ہوں گے۔ دلی کی حکومت نے خفیہ طریقے سے سی۔آئی۔ڈی کے چند سپاہیوں کو ان کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کر دیا تھا جو ہر جگہ ان کی حفاظت کرتے تھے۔ کانپور میں ہندو مسلم فسادات کے زمانہ میں بھی وہ بے دھڑک ہندو محلوں میں جا کر سودا سلف خرید کر لایا کرتے تھے۔ انھیں خطرہ میں رہ کر زندگی بسر کرنے میں لطف آتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ خطرات سے متاثر ہونے کے عادی نہ تھے۔

آل انڈیا ریڈیو

جناب شوکت تھانوی نے لکھا ہے کہ میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھا

اور لکھنؤ اسٹیشن پر تعینات تھا اس زمانہ میں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے اسٹیشن ڈائرکٹر مسٹر سومنات چپ تھے۔ معلوم نہیں یہ شوق خود چپ صاحب کو ہوا۔ یا آل انڈیا ریڈیو کے ہیڈ کوارٹر کی یہ ہدایت تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو مولانا حسرت کو ریڈیو پر لا کر خود ان ہی سے ایک غزل پڑھا کر ریکارڈ کر لی جائے۔ چپ صاحب نے یہ خدمت میرے سپرد کی کہ میں کانپور جا کر مولانا حسرت موہانی کو جس طرح بھی ہو لکھنؤ لے آؤں کانپور پہنچ کر میں سیدھا اس سڑک پر پہنچا جو حسرت روڈ کہلاتی تھی خیال تھا کہ اپنے نام کی سڑک پر کہیں بستے ہوں مگر اس نام کا کوئی آدمی نہیں ملا لوگوں سے دریافت کیا اور پتہ چلا کہ ایک اور محلہ میں ایک مسجد کے پاس مولانا کا مکان ہے۔ پوچھتا ہوا اس پتہ پر پہنچا اور ایک مسجد سے ایک شخص کو پانی کا ایک بھرا ہوا گھڑا لے کر نکلتے ہوئے دیکھا اور غور سے دیکھ کر پہچان لیا کہ مسجد کے نل سے پانی بھرنے والا یہی وہ شخص ہے جس کو دنیا سید الاحرار کہتی ہے اور دنیائے شعر میں یہی شخص رئیس کہلاتا ہے۔

حافظ صاحب کا واقعہ

جناب محمد شریف خان نے نوائے وقت کی اشاعت میں مورخہ ۴ ار جولائی ۱۹۷۰ء میں لکھا ہے کہ میرے ایک عزیز جو حافظ قرآن تھے ملازمت کے سلسلے میں کانپور تبدیل کر دیے گئے مجھے معلوم ہوا کہ حافظ صاحب کا وہاں جی نہیں لگتا اور وہ اداس ہیں ان کے حافظ قرآن ہونے کی وجہ سے مجھے ان سے دلی لگاؤ تھا اس لئے میں نے حوصلہ افزائی کے لحاظ سے انہیں خط لکھا کہ انہیں گھبرانا نہیں چاہیئے انہیں اس شہر میں رہنے کا فخر ہے جسے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ایک خاص مقام حاصل ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ وہ ایک درویش صفت لیکن آزادیٔ وطن کے لئے پیہم سامراجیوں کے خلاف بے تیغ لڑنے والے مجاہد حسرت موہانی کے شہر میں مقیم ہیں انہوں نے اب تک مولانا حسرت کو نہیں دیکھا تھا اس لئے اپنے دوست سے ان کے متعلق دریافت کیا دوست نے انہیں بتایا کہ مولانا کا مکان تو ان کی رہائش گاہ کے بالکل متصل واقع ہے انہوں نے مولانا کو ضرور دیکھا ہوگا حافظ صاحب نے جواب دیا کہ انہیں اب تک تو

حسرت موہانی کو دیکھنے کا اتفاق تو نہیں ہوا۔ البتہ سامنے والے مکان سے صاحبِ خانہ کا ملازم جو ملگجے کپڑوں میں ملبوس ہوتا ہے اکثر صبح کے وقت ایک ٹوکری ہاتھ میں لیکر سبزی ترکاری خریدنے کے لئے جاتا ہوا ضرور دیکھتا ہوں دوست نے جواب دیا کہ وہی تو ہیں حسرت موہانی ہیں جناب امید فاضلی ڈبائیوی نے لکھا ہے کہ ۱۹۴۳ء کی بات ہے کہ میں علی گڑھ سے یونیورسٹی کی تعطیلات میں وطن آیا ہوا تھا۔ کڑی دھوپ کی تپش اور لو کے جھلسا دینے والے جھکڑوں کی وجہ سے گھر ہی نے زندان کی صورت اختیار کرلی تھی۔ دن قیدِ بے زنجیر کا حکم بن کر اور شام میں اذنِ رہائی کا حکم بن کر آتی تھیں اواخر مئی کی ایک شام کو یونہی بے راہ کوچہ گردی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ ابھی چند قدم کا فاصلہ ہی طے کر پایا تھا کہ ایک یکہ قریب آ کر رک گیا اور ایک باریک سی نحیف آواز نے متوجہ کر لیا نگاہ اٹھا کر جو دیکھا تو ایک مجہول الحال بزرگ عجیب ہیت کذائی میں نظر آئے ڈاڑھی کے الجھے ہوئے بال شانِ بے نیازی کا اعلان کر رہے تھے۔ لباس بے سلیقگی کا مظہر، سر پر بے چھیدنے کی میل میں اٹی ہوئی ترکی ٹوپی۔ آنکھوں کی عینک آثارِ قدیمہ کی یادگار، سراپا گرد و غبار میں اٹا ہوا۔ پرانی سی چھتری ہاتھ میں اور ان کے قریب ہی کھدر کے لباس میں ایک اور صاحب ریش بزرگ تابع کی طرح تشریف فرما تھے۔ حیران تماشا بنا تھا پھر اس منمناتی ہوئی آواز کو مخاطب پایا میاں وہ فاروق امید فاضلی کا مکان اور میں بجائے کچھ جواب دینے کے ان محترم کو مع ان کے تابع مہمل کے گھر لے آیا مغرب کا وقت ہو چکا تھا یہ دونوں حضرات قریب کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے اور میں چائے وغیرہ کے انتظام میں لگ گیا یوں تو بڑے بڑے شاعر و ادیب۔ سیاسی اور غیر سیاسی شخصیتوں کی میزبانی کا شرف حاصل ہو چکا تھا لیکن اس وضع قطع اور سج دھج کے آدمی سے جس کی ہیت کذائی اذنِ تبسم بلکہ دعوتِ خندہ دے رہی ہو کبھی واسطہ نہ پڑا تھا نماز پڑھ کر یہ قلندر نما درویش صفت حضرات تشریف لائے اور چائے نوشی کے دوران مسلسل سوالات داغنے شروع کر دیئے۔ کیا کرتے ہیں۔ کہاں تعلیم پاتے ہیں۔ میٹرک کہاں سے کیا۔ علی گڑھ ہوسٹل میں رہتے ہیں یا ڈے اسکالر ہیں ہو۔ طویل فرصت کے ان ایام میں کیا مشغلہ ہے اور میں برابر مرعوب کن انداز میں اس طرح جواب دیتا رہا۔ جیسے مخاطب کی شخصیت

بہت معمولی اور غیر اہم ہے اور میں اٹھارہ سال کا طالب علم علی گڑھ یونیورسٹی کے
سال اوّل کا امتحان دیتے ہی بہت اہم اور غیر معمولی شخصیت بن گیا ہوں میرے
لہجہ میں علی گڑھ سے نسبت کا ایک فخریہ اور مخاطب کو متاثر کرنے کا ایک انداز تھا
مگر سوالات کا سلسلہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اب میرے اندر کے شوخ و شریر
طالب علم نے انگڑائی لی اور شرارتوں نے اکسایا کہ کچھ چھیڑ ہی چلے جواب دینے کی
بجائے اپنی طرف سے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ مگر ان بزرگ محترم
کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرا حوصلہ پست ہو گیا سوچنے لگا کہ آج میری جسارت کو کیا ہو گیا اور
طاقت و گفتار کہاں گئی بدلہ سنجی نے کون سا روپ دھار لیا یہ شخص آخر ہے کون جس میں نہ کوئی
وجاہت نہ دلکشی نہ چہرے پر رعب نہ آواز میں گھن گرج مگر پھر بھی میں مرعوب و متاثر ہوتا چلا جا
رہا ہوں
یہ بھی کوئی بات ہے اخلاق و آداب کے تقاضے اپنی جگہ پر ہیں
مگر یہ کیا ایک شکستہ حال اور دو آنکھوں کے سوالیہ انداز کے سامنے میری جسارت ہتھیار ڈال دیئے جانے کا
ایک گھونٹ لیا جو اس جمع کئے ماتھے پر خواہ مخواہ غور و فکر کی تیوریاں ڈالیں۔ ایک ہاتھ سے کرتے کے بٹنوں
کو گھمایا اور چہرہ کا زاویہ بدل کر ایک سوال داغ دیا حضرت قبلہ آپکی تعریف اور حضرت قبلہ تو چپ رہے مگر
تابع مہمل صاحب سینہ تان کر اور بڑے فخریہ انداز میں بولے کہ میاں صاحبزادے آپ مولانا حسرت موہانی ہیں اور
بس تھن سے ایک آواز آئی چائے کی پیالی ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹ چکی تھی اور میں بھونچکاں سا گم سم ہو کر
رہ گیا اور زیر لب مولانا کا نام دہرا کر غالب کے مصرع کی تصویر بن کر رہ گیا کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
اور اب میں وہاں کہاں تھا میں تو ورطۂ حیرت میں ڈوب چکا تھا۔ گہری فکر میں گم ہو چکا تھا۔

جناب عشرت رحمانی نے لکھا ہے کہ علی گڑھ کے تعلیمی دور میں حسرت کے ہم
جماعتوں میں ملک کے سر برآوردہ سیاسی رہنما اور ادیب تھے ان میں قابل ذکر حضرات
مولانا شوکت علی اور کرامت اللہ گستاخ رام پوری تھے مولانا حسرت کو جب میں نے
پہلی بار دیکھا تو اس زمانہ میں اکثر انہیں گستاخ مرحوم کو باتیں کرتے یا شعر پڑھتے
سنا۔ مجھے کوئی خاص علمی ذوق یا ادبی شعور نہیں تھا مگر ان کی گفتگو سے جو
تاثر میرے احساس نے قبول کیا اس کا مجھے اتنا اندازہ ضرور تھا کہ ان کی علمی فضیلت
کے ساتھ سادگی۔ سچائی اور معصومیت کا میرے دل پر گہرا نقش قائم تھا۔ میں
ان کی علمی ادبی گفتگو سن کر مرعوب ضرور ہوتا تھا مگر نہ جانے کیوں ان کو

ایک معصوم بچے کی طرح تصور کرتا تھا اور جوں جوں میرا شعور پختہ ہوتا گیا اور حسرت کے فضائل سمجھنے کی مجھ میں اہلیت پیدا ہوتی گئی ان کی تمام صفات کے اعتراف کے ساتھ ان کی سادگی اور معصومیت کا نقش اپنی جگہ حسین و جمیل شخصیت میں سچائی کا رنگ بھرتا گیا۔ ان کی مستقل مزاجی اور اصابت رائے، بچوں کی ضد کی طرح اٹل اور بے لوث مگر مفکر کے انداز میں ٹھوس دلائل پر مبنی ہوتی تھی جناب حشرت رحمانی نے ایک جگہ مولینا کے بارے میں لکھا ہے کہ مولانا کی حیات صادقہ کو تین اہم حیثیتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یوں تو ان کے گوناگوں خصائص بے شمار ہیں لیکن پہلی خصوصیت ایک دیندار انسان کی ہے جس میں قلندری و درویشی کو خاص دخل ہے دوسری خاصیت سیاسی مفکر و علمبردار حریت کی ہے اس شان میں انہوں نے علم و عمل کے میدان میں انسانیت کے اعلیٰ جوہر آشکارا کئے اور ملک و ملت کو تابانی بخشی۔ تیسری بڑی کیفیت قادر الکلام شاعر اور رئیس   کی ہے جس میں ان کی حکمت سخن۔ جدت فکر اور ندرت خیالی نے سرمایۂ اردو کو دولت کمال سے مالا مال کر کے ادب کو نئی زندگی بخشی۔ حسرت اپنی ہر شان میں انفرادیت کے مالک اور نئی آن بان کے انداز دکھاتے نظر آتے ہیں۔

سچے مسلمان کی خوبی

جناب ابراہیم جلیس نے لکھا ہے کہ ایک بار میرے ایک عیسائی دوست نے مجھ سے کہا کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں میں نے عیسائی دوست کو مشورہ دیا کہ مولانا احتشام الحق کے پاس جاؤ وہ تمہیں مسلمان بنا دیں گے لیکن اگر تم سچے اور اچھے مسلمان بننا چاہتے ہو تو مولانا حسرت موہانی کی زندگی کا غور سے مطالعہ کرو۔ اور ان کے نقوش قدم پر چلنے کی سعادت حاصل کرو۔ پیغمبروں اور خلفائے راشدین کی زندگی سے قطع نظر عام انسانوں کی زندگی میں مجھے صرف دو آدمی ایسے نظر آتے ہیں جو غریبوں کی بلکہ فقیروں کی سی زندگی گذارنے کے باوجود دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں سے بھی زیادہ بڑے تھے یہ دو بڑے غریب آدمی حسرت موہانی اور گاندھی جی تھے اور ان دونوں میں مولانا حسرت کو ہر اعتبار سے شرف اولیت

اس لئے حاصل ہے کہ گاندھی جی کی طرح مولانا حسرت دروغ مصلحت آمیز کے بالکل ہی قائل نہ تھے مولانا حسرت موہانی نے غریب انسان کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ راستہ نیا نہیں ان کا اپنا دریافت کردہ نہیں ہے بلکہ غریب انسان کی عظمت کا یہ راستہ خدا کے سب سے زیادہ محبوب بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں سے پھوٹا تھا۔ پھر اس راستہ کو عظمت خلفائے راشدین نے عطا کی تھی اور میں نے اپنی زندگی میں صرف مولانا حسرت موہانی کو اس راستہ پر گامزن دیکھا ہے۔ اس راستہ پر بھی حضرت عمر اپنے اس اونٹ کی مہار پکڑے گذرے تھے جس اونٹ پر ان کا غلام سوار تھا اور اسی راستوں پر صدیوں بعد مولانا حسرت موہانی اپنا بستر اپنے ہاتھ میں اٹھائے دیکھے گئے مولانا حسرت موہانی کے بعد مجھے اس راستہ پر پھر کوئی دوسرا بڑا آدمی نظر نہ آیا۔

حبیب الرحمٰن حبیب کہتے ہیں کہ

حسرت اپنی قدر وقیمت خود پہچانتا ہے کوئی دوسرا اس کی قیمت نہیں لگا سکتا یہی ہے کہ وہ نہ تو تعریف وستائش کا متمنی ہے اور نہ وہ اس کی پرواہ کرتا ہے وہ خود رہبر ہے کوئی دوسرا اس کا راہبر نہیں وہ خود قاصد ہے کوئی دوسرا اس کا قاصد نہیں۔ اس کے ارادے اس کے اصول اٹل ہیں زمانہ میں تغیر و تبدل ہوتا رہا۔ ہندوستان کی سیاسی فضا راگ اور نغمہ کے اتار چڑھاؤ کی طرح قائم رہی راہبر معمولی راہ رو اور راہرو راہبر ہو گئے۔ مہا سبھائی کانگریسی اور کانگریسی مہاسبھائی ہو گئے۔ لیکن حسرت کے جو بنیادی اصول اور عقائد شروع میں تھے وہی آخر وقت تک قائم ہیں۔ مصائب کی آندھیاں آئیں۔ مخالفتوں کے طوفان اٹھے۔ غیظ و غضب کے بادل گرجے اور برسے لیکن حسرت کے ایمان۔ اس کے اصول و عقائد پر اثر انداز نہ ہو سکے جو حسرت آج سے ۲۰ برس تھا وہی حسرت آج بھی ہے حسرت کا عزم ہٹلر کا عزم حسرت کا استقلال کمال کا استقلال اور حسرت کی جائز ہٹ مسولینی کی ڈکٹیٹری ہے۔ زمانہ مخالف ہو لیکن جس چیز کو انہوں نے ملک وملت کے بہتر خیال کیا وہ اس سے شمہ برابر بھی پیچھے نہیں ہٹے۔ یگانے بیگانے

احباب اغیار اور ساتھی دشمن ہو گئے۔ لیکن حسرت جو پہلے کہتا تھا وہی اب بھی کہتا ہے اب بھی وہ آنے والے خطرے سے ملک و قوم کے رہنماؤں کو آگاہ کر رہا ہے۔ مخالفت کے زیچ دھارے میں حسرت وہ شخص ہے جس نے کانگریس کے کھلے اجلاس میں زعمائے قوم کو للکارا۔ اور کانگریس کی غلط پالیسی کی مذمت کی تھی۔ یہ ہی وہ ہستی ہے جس نے گاندھی اور ان کے پیروؤں کی غلط روش کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ایک مستحکم دیوار سامنے لاکھڑی کر دی حسرت کو حصول مقصد کے لئے متواتر اور پے در پے زکیں اٹھانی پڑیں لیکن ایک محب قوم کی حیثیت سے وہ حق گوئی سے کبھی باز نہ آیا۔ حسرت ہندوستان کی نجات اور آزادی کا ہمیشہ خواہش مند اور دل سے اس کا کوشاں رہا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

اے کہ نجات ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمت سربلند سے یاس کا انسداد کر

اچھے برے کی تمیز، مصلحت اور دور اندیشی کی کسوٹی خود اس کی عقلِ سلیم ہے لوگوں کے اقوال نہیں۔

قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنئ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

اس کا ایمان ہے کہ جس کام اس نے بیڑہ اٹھایا ہے اس کو مرکر چھوڑنا چاہیئے راستی سے محض مصلحت اور دور اندیشی کی بنا پر منہ موڑنا اور اس سے گریز کرنا اور پیچھے ہٹنا بزدلوں اور غداروں کا شیوہ ہے غور سے سنیئے وہ کیا کہتا ہے۔

حق سے بعذر مصلحت وقت یہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر

حسرت خود اپنی قوتِ بازو پر تکیہ اور بھروسہ کرنے کا قائل ہے غیر کی امداد اور کل کی امید پر وہ جینے کا قائل نہیں۔ جو کچھ کرو۔ اپنے بل بوتے پر اپنے پاؤں پر چلو اور اپنے ہاتھوں نوالہ توڑو۔ اس کے مذہب میں غیروں کے وعدے وعید اور بل بوتے پر ناز کرنا حرام ہے۔ خود طاقت ور بنو اور اپنی حفاظت آپ کرو۔ دیکھیئے تو سہی وہ کیا تلقین کرتا ہے۔

غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوشش ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

یہی حبیب الرحمٰن صاحب حبیب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ جس طرح اقبال کا ایک خاص پیغام ہے۔ اسی طرح حسرت کا بھی ایک خاص پیغام ہے۔ اور وہ پیغام حریت ہے اس کے دل میں درد ہے اور وہ مسلمانوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے وہ کہتا ہے کہ اپنی قوت اور اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرو۔ دنیا میں اسے اپنا ایمان سب سے پیارا ہے اور اسی دین مبین کی خدمت کے لئے وہ آزادی کا علمبردار اور پیغامبر ہے۔

کر سکتے ہیں خاموش بھی ہم دین کی خدمت
یعنی یہ نہیں شورشِ اغیار پہ موقوف

قوموں کی ترقی کے ہیں کچھ اور ہی اسباب
جو ڈاک پہ موقوف نہ ہیں تار پہ موقوف

قوت کی جو پوچھو تو یہ رہتی ہے ہمیشہ
اقوام میں افراد کے ایثار پہ موقوف

کچھ شک نہیں اس پر کہ وطن کی ہے ترقی
ہم رشتگیِ سبحہ و زنار پہ موقوف

حسرت کبھی حق گوئی سے نہیں چوکے۔ پھانسی کے تختہ پر بھی ان کی زبان سے کلمۃ الحق نکلے۔ وہ صرف خدا سے ڈرتے ہیں اور کسی سے نہیں۔ تسلیم و رضا ان کا شیوہ ہے۔ حسرت کا ایمان ہے۔

پیرو مسلکِ تسلیم و رضا ہوتے ہیں
ہم تیری راہِ محبت میں فنا ہوتے ہیں

حسرت کا مسلک دین کی پیروی اور تسلیم و رضا ان کا ایمان ہے وہ دنیا بیچ کے دین کا سودا کرتے ہیں۔

ہر حال میں ہوں خوش کہ ہر اک بات میں لازم
پابندیِ تسلیم و رضا میرے لئے ہے

خوشنودی کفار کے پیرو ہیں یزیدی
تقلید شہ کرب و بلا میرے لئے ہے
زنہار اگر اہلِ ہوس تجھ پہ فدا ہوں
یہ مرتبہ صدق و صفا میرے لئے ہے
دشمن کے مٹانے سے مٹا ہوں نہ مٹونگا
اور یوں تو میں فانی ہوں فنا میرے لئے ہے
میں غلبہ اعدا سے ڈرا ہوں نہ ڈرونگا
وہ مرتبہ بخشا ہے مجھے شیرِ خدا نے

سہارنپور کا تجربہ

جناب حافظ بشیر احمد غازی آبادی نے لکھا ہے کہ میری سید الاحرار سے پہلی ملاقات سہارنپور میں ہوئی۔ مسلم لیگ صوبائی اسمبلی کے ایک ضمنی الیکشن (۱۹۳۸ء) میں حصہ لے رہی تھی۔ مسلم لیگ کے امیدوار کو کامیاب بنانے کے لئے ملک کے مختلف حصوں سے مسلم لیگ کے زعما تشریف لا رہے تھے۔ ایک رضا کار کی حیثیت سے راقم بھی اس الیکشن میں حصہ لینے کے لئے گیا ہوا تھا۔ کارکنوں کا مشورہ ہوا کہ مولانا حسرت موہانی سے استدعا کی جائے کہ وہ بھی اس الیکشن میں اعانت کے لئے تشریف لائیں چنانچہ بذریعہ تار مولانا کو کانپور سے مدعو کیا گیا جواب آیا کہ فلاں دن فلاں وقت بذریعہ ٹرین سہارنپور پہنچوں گا سہارن پور سٹی مسلم لیگ نے خوب زور و شور سے پروپیگنڈہ کیا کہ سید الاحرار تشریف لا رہے ہیں اور عوام سے اپیل کی کہ استقبال کے لئے مقررہ وقت پر اسٹیشن پہنچ جائیں چنانچہ مسلمان ہزاروں کی تعداد میں اسٹیشن پہنچ گئے گاڑی آئی اور فضا حسرت موہانی زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی کارکنوں اور مقامی لیڈروں نے ساری گاڑی تلاش کی مگر مولانا نظر نہیں آئے مجبوراً سب لوگ واپس لوٹے۔ جب ہم لوگ مسلم لیگ آفس پہنچے تو دیکھا کہ ایک صاحب میلی ٹوپی پہنے۔ ہاتھ میں ایک تھیلا لئے جس میں پہننے والے کپڑے

تھے اور کئی اخبار ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں. نیاز مند نے اس سے پہلے مولانا کو کبھی نہیں دیکھا تھا اس لئے کوئی توجہ نہیں دی اور ادہر جانے لگا. ایک کمزور سی آواز آئی. اے میاں لڑکے کیا یہ مسلم لیگ کا دفتر ہے احقر نے لاپرواہی سے جواب دیا کہ جی ہاں یہی ہے فرمایا میرا نام حسرت موہانی ہے اور میں کانپور سے آیا ہوں یقین جانیئے کہ چند منٹ تک تو حیرت کا سا عالم رہا اور پھر چونکہ سادگی کے واقعات مولانا کے متعلق سن لئے تھے. فوراً یقین ہو گیا چنانچہ زیادہ عرصہ نہ لگا کہ سب لوگ جمع ہو گئے. مولانا کا تھیلا جسے آپ چاہیں سامان بھی کہہ سکتے ہیں حفاظت سے مولانا کے کمرہ میں رکھا گیا اور پھر درخواست کی گئی کہ آج شام کو جلسہ ہے اور اس میں حضور تقریر کریں مولانا نے امیر احمد سے دریافت کیا کہ ضلع سہارنپور میں کتنی پرائمری لیگیں ہیں. ممبران کی تعداد کیا ہے. ضلع لیگ میں کتنے ممبر ہیں اور اس کا دفتر کہاں ہے. جواب میں عرض کیا گیا کہ ابھی ضلع میں مسلم لیگ کی تنظیم نہیں کی گئی ہے. تمام کارکن الیکشن میں مصروف ہیں. سید الاحرار نے فرمایا پھر یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہمیں ذاتی پروپگنڈہ کے لئے بلوایا گیا ہے اور آپ نے لیگ کا لیبل صرف آسانی کی خاطر لگا لیا ہے. میں چار یوم قیام کروں گا اور ہر دن تقریر کروں گا. آپ اس عرصہ میں الیکشن کا کام چھوڑ کر مسلم لیگ کی تنظیم کریں چنانچہ بہ عجلت تمام لیگ کی تنظیم کی گئی اور جب مولانا حسرت مرحوم ومغفور مطمئن ہو گئے تو انہوں نے تقریر کی اور مسلم لیگ نے سہارنپور کا الیکشن جیتا.

اِفتتاحی کلمات

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حسرت ایک طرفہ طبیعت کے مالک تھے جس کا ذکر انہوں نے خود اپنے ایک شعر میں کیا.

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت میں

لیکن واقعہ یہ ہے کہ طبیعت کا یہ طرفہ تماشا صرف دیوان اور زندان تک

محدود نہیں بلکہ زندگی کے تمام گوشوں میں ان کی فطرت اس طرح ہے ایک طرف وہ ایک انتہاپسند سیاسی لیڈر تھے گاندھی سے بھی زیادہ پرانے اور مہاراج ملک کے رفیق کار اور بندر گھوش کے دوست ساتھی تو دوسری طرف وہ نماز روزہ کے پابند ایک طرف اصول معاشیات میں وہ کمیونزم کے دلدادہ تو دوسری طرف رات کے پچھلے پہر تہجد کی نماز میں سجدہ ریز. شاید سیاسی لیڈروں میں تہجد کا ذوق رکھنے والی تنہا ذات انہی کی تھی. ایک طرف وہ کٹر مذہبی انسان۔ دوسری طرف. بیوی کے معاملہ میں پردہ کے مخالف. ایک طرف سیاست میں گہری دلچسپی دوسری طرف روحانیت سے لگاؤ اور مُرشد سے اس درجہ محبت کہ اپنی زرعی املاک کا ایک تہائی حصہ ان کے عرس کے لئے ہمیشہ کے لئے وقف. غرض مولانا کی ذات صرف جامعہ صفات ہی نہیں جامع کمالات بھی تھی اور بقول پنڈت گووند بلبھ پنتھ وہ کمیونسٹ بھی تھے اور کیمونسٹ بھی. ان کے مجموعہ صفات کا ذکر کرنے کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں کے سوا اتنا جامعہ صفات اور کوئی لیڈر مسلمانوں میں پیدا نہیں ہوا۔ جامع سے مراد یہ ہے کہ انگریزی۔ اردو۔ عربی فارسی پھر نظم و نثر تقریر و تحریر، مذہب. سیاست، تاریخ. کمیونزم. معرفت. صحافت اور معاشرت. ان سب باتوں میں یکساں دخل کے ہوتا ہے پھر جامع کمالات میں تو ان کا جواب ہی نہیں. شاعر اور ادیب بھی ہیں. اور نمازی و پرہیزگار بھی. سیاسی لیڈر بھی اور تہجد نواز بھی. کیمونسٹ بھی اور صوفی بھی. متشرع بھی اور رند و قلندر بھی. بے مایہ درویش بھی اور امراء کے ہم رکاب بھی. کمال درجہ کے خوددار بھی اور انتہائی بے تکلف بھی یہ ایک طرف تماشا طبیعت کے مظاہرے نہیں تو پھر کیا ہیں. میدان حریت میں انہیں اوّلیت کا شرف طغا تخاسو ل کر رہا وہ اوّل دن ہی سے مومن و مسلم تھے یعنی ایسا نہیں تھا کہ پہلے وہ غلامی پسند اور استبداد دوست ہوں اور بعد میں واقعات نے انہیں تبدیلی رائے پر مجبور کر دیا ہو۔ وہ زمانہ کی کسی انقلابی طاقت سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ خود انہیں کے حالات و کیفیات نے انقلابی صورت پیدا کر دی اور ہمارا ملک ان

نئے انقلابی نظریات سے متاثر ہوا۔ مولانا نے جس نہج اور جس اصول پر اپنی پچاس سالہ سیاسی زندگی کی بنیاد رکھی وہ آخر دم تک اسی نہج پر قائم رہی۔ وہ جہاں پہلے دن کھڑے تھے وہیں آخری دن بھی موجود تھے اور لوگ رفتہ رفتہ ترقی کرکے ان کی صف میں شامل ہونے پر مجبور ہوئے لیکن ان مجاہدات اور ریاضتوں کے باوجود جن کا ان کی ذاتی زندگی میں تذکرہ آیا یا آئندہ ازدواجی اور سیاسی زندگی میں تذکرہ آنے لگا ہے مولانا نے اپنی شخصیت کو کبھی بھی ایک لیڈر کی حیثیت سے منوانے یا نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ کبھی پیشوائی اور قیادت کی عزت قوم سے طلب کی جس کے حصول میں سینکڑوں خانہ ساز لیڈر بن گئے۔ البتہ قیادت نے لبا اوقات ان کے قدم چومے۔ اور ان سے عزت و شوکت حاصل کی۔ انہوں نے نہ کبھی اس کی خواہش کی کہ ان کی صدارت میں جلسے منعقد ہوں اور ان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جائیں۔ نہ دل سے سستی شہرت کے خلاف تھے انہوں نے کبھی ان خیالات کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی۔ حسرت صاحب پبلک جلسوں میں گئے تو ہمیشہ تھرڈ میں سفر کیا ایسی تھرڈ کلاس نہیں جس میں گاندھی جی سفر کرتے تھے وہ معمولی سودیشی لباس اور معمولی غذا کے قائل تھے۔ لیکن قوم نے انہیں عزت بھی دی اور صدارت بھی۔ لاڑکانہ جیسے دور دراز کے علاقوں سے ان کو صدارت کی دعوت موصول ہوتی تھی۔ ان کے نام سے برصغیر میں عمارتوں، سڑکوں، اداروں اور آبادیوں کو عزت حاصل ہوئی۔ ان کے انتقال پر غم والم کا اظہار بھی کیا گیا اور ان کی یاد ہر سال پاکستان و ہندوستان میں یکساں طور پر منائی جاتی ہے مگر یہ عزت و احترام انہوں نے خود طلب نہیں کیا۔ بلکہ ان کی قربانی، ایثار اور خلوص کی وجہ سے انہیں از خود حاصل ہوا انہوں نے اپنے کردار و عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ اسوۂ رسول پر چودہ سو برس بعد بھی عمل کیا جا سکتا ہے اور اگر انسان چاہے۔ تو اپنے قول و فعل سے مثال قائم کر سکتا ہے ایسی مثال جس پر رہتی دنیا تک فخر کیا جا سکے سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ سید فضل الحسن حسرت موہانی کی زندگی کے واقعات پر نظر کرکے ان کی شان حضرت ابوذر غفاری اصحابی

کی سی آتی ہے جن کی نسبت رسُولِ اللہؐ نے فرمایا کہ "ابُوذر سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن نہیں چمکی" سچ تو یہ ہے کہ اس عہد پر فریب میں حسرت سے زیادہ حق گو پر آفتاب کی کرن نہیں چمکی۔ اسی طرح حضرت ابوذر کے بعد یہ قول نبوی بھی ان پر پوری طرح صادق آتا ہے کہ ابُوذر کی حق گوئی نے اس کو زندگی میں تنہا چھوڑ دیا اس کا کوئی ساتھی نہ رہا۔ اور اس لئے اس عہد میں اس مقدس فقرہ کا صدور بھی حسرت کی ذات تھی۔ حسرت کا دماغ خدا جانے کتنے رُوپ میں جلوہ گر ہوا۔ مگر اس کا دِل بزرگوں کی عقیدت کی خاک سے بنا تھا۔ مرتے دم تک پیر کے آستانے پر جان دی اور انہی کی ابدی خوابگاہ میں آرام کیا۔ مولانا انوار صاحب کے باغ میں جہاں فرنگی محل کے خدا جانے کتنے خزانے مدفن ہیں حسرت بھی اپنی تمناؤں کے خزانے کے ساتھ مدفن ہوئے حسرت تو تنہا آیا تھا۔ تنہا رہا۔ تنہا گیا۔ البتہ تیری نیکی۔ تیری شرافت، تیرا اخلاص اور حسنِ عقیدت کے اعمال تیرے ساتھ ہیں اور وہی تیرے رفیق آخرت ہیں بارِ الٰہی اس کی حق گوئی کی بے کسی کی شرم رکھ لیجئے اور اس کو اپنی رفاقت سے نوازیئے۔

اس باب کا اختتام مولٰینا کے بیاض کے ان دو قطعات پر کیا جاتا ہے

روزِ محشر عاشقاں را با قیامت کار نیست   کارِ عاشق جز تماشائے جمالِ یار نیست
سالہا جسم فریں بر بستر غم خفتہ است   اے طبیبا گوشۂ چشمت برایں بیمار نیست

حیاتی گیلانی

نسیم بادہ بدہ صبح گلفروش آمد   پیالہ گیر کہ مشرق سبو بدوش آمد
سرے پر از مے وجائے پر از ہوائے نشاط   بیا کہ مرغ ہوا نیز در خروش آمد

حصّہ دوّم

(حصہ دوئم)

ازدواجی زندگی

مولانا نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی ۱۸۹۰ء میں محترمہ نشاط النسا بیگم کے ساتھ اور دوسری شادی ۱۹۳۸ء میں محترمہ حبیبہ بیگم کے ساتھ۔ دونوں بیگمات سے ایک ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ محترمہ نشاط النساء بیگم کے بطن سے محترمہ نعیمہ بیگم اور محترمہ حبیبہ بیگم کے بطن سے خالدہ بیگم۔ جناب غلام احمد فرقت کاکوروی جو مولانا ظفر الملک علوی ایڈیٹر "الناظر" کے بھتیجے ہوتے ہیں نے اپنے مضمون میں جو "نوائے وقت" مورخہ ۲۲، ستمبر ۱۹۶۲ء میں چھپا ہے لکھا ہے کہ محترمہ نشاط النساء بیگم کی مولانا حسرت موہانی سے شادی ۱۸۹۹ء میں اس وقت ہوئی جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ مولانا کی صاحبزادی نعیمہ بیگم کے خیال میں بھی یہی سن ٹھیک ہے لیکن جناب حبیب الرحمان حبیب نے "علی گڑھ میگزین" بابت جنوری ۱۹۳۹ء میں جو مضمون حسرت سیاست داں اور حسرت شاعر کے عنوان سے تحریر کیا ہے اس میں مولانا کی شادی کا سن ۱۹۰۳ء بتایا گیا ہے جناب جلیل قدوائی نے لکھا ہے کہ بیگم نشاط النساء حسرت سید شبیر حسن موہانی مرحوم وکیل رائچور ریاست حیدر آباد دکن کی صاحبزادی اور مولانا کی پھوپھی زاد بہن تھی غالباً ۱۹۰۱ء میں پندرہ سولہ برس کی عمر میں مولانا کے نکاح میں آئیں لیکن بہتر یہی ہے کہ جناب غلام احمد فرقت کاکوروی کے بیان کو صحیح سمجھا جائے اس لئے کہ محترمہ نعیمہ بیگم بھی اسی سن کو صحیح سمجھتی ہیں۔

محترمہ نشاط النساء بیگم

مولانا کی پہلی بیگم محترمہ نشاط النساء بیگم کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ پروفیسر عبدالشکور نے رہبر نسواں کانپور نومبر ۱۹۳۴ء کے حوالہ سے لکھا ہے۔ کہ آپ غالباً ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئیں شادی کے وقت آپ کی عمر ۱۵، ۱۶ سال

تھی اور مولانا کی عمر ۴۰ سال بتائی جاتی تھی۔ مولانا اس زمانہ میں علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے۔ محترمہ نعیمہ بیگم نے لکھا ہے کہ والدہ رشتہ میں والد کی ماموں زاد بہن تھیں۔ خود مولانا نے اردوئے معلیٰ بابت اگست دسمبر ۱۹۳۷ء میں تفصیل کے ساتھ ان کے نام، خاندان اور شجرۂ نسب کو تحریر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان سے قرابت داری ہے۔ مولانا کی یہ تحریر مندرجہ ذیل ہے۔

نشاط النسا نام بنت حافظ سید بشیر حسن موہانی۔ اصل ان کی قصبہ موہانی نواح لکھنؤ کے نیشا پوری خاندانِ سادات سے تھی جن کا سلسلۂ نسب حضرت امام علی موسیٰ رضا تک پہنچتا ہے۔ ان کا مزار مشہد مقدس میں اس وقت مرجع جمہور اسلام ہے اور جن کے زمانۂ حیات میں نیشا پور کو ان کے وطنِ مبارک ہونے کا شرف حاصل تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ان کی اولاد میں سید محمود نیشا پوری نے ترک وطن کر کے موہان میں سکونت اختیار کر لی۔ انہیں سید محمود کی دسویں پشت میں حضرت شاہ وجیہہ الدین محمد قدس سرہٗ العزیز ۱۱۰۸ھ میں میں پیدا ہوئے۔ آپ کا وصال ۱۷ شوال کو ہوا۔ عرس شریف آپ کا ہر سال تاریخ مقررہ پر موہان میں ہوتا ہے جس کے اخراجات کے لئے راقم الحروف نے اپنی موروثی جائداد کا ایک حصہ بقدرِ ضرورت وقف کر دیا ہے۔

حضرت شاہ وجیہہ الدین تحصیل علوم کے لئے دلی میں حضرت سید حسن رسول نما کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور ہمیشہ کے لئے اپنی اولاد کو مسلک تصوف سے وابستہ کر گئے۔ آپ کی تین بیویوں میں زوجۂ اول کی صرف ایک صاحب زادی زوجۂ دوئم کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں اور زوجۂ سوئم کے دو بیٹے تھے۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

موجودہ مشاہیر سادات موہان شاہ وجیہہ کے

انہی صاحب زادوں کی اولاد میں سے ہیں۔

تفصیلی شجرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ حسرت اور بیگم حسرت کے درمیان اس قرابت عام کے علاوہ کہ یہ دونوں حضرت شاہ وجیہہ کے دو صاحبزادوں سید محمد اور شاہ غلام ابراہیم کی اولاد ہیں بعض خاص رشتہ ہائے مؤدت بھی موجود ہیں۔ مثلاً اوّل یہ کہ بیگم حسرت کے دادا حافظ سید نیاز حسن کی بہن ولایت النساء حسرت کے دادا سید مہر الحسن سے منسوب تھیں۔ دوئم یہ کہ حسرت کے والد سید اظہر حسن کی بہن سیدہ منصور النساء بیگم حسرت کے والد سید شبیر حسن کی زوجہ تھیں سوئم یہ کہ بیگم حسرت کے والد سید شبیر حسین کی بہن سیدہ شہر بانو حسرت کے والد ماجد سید اظہر حسن کی زوجہ تھیں۔ چہارم یہ کہ جس طرح سید اظہر حسن کے بیٹے حسرت موہانی کی شادی سید شبیر حسن کی بیٹی سیدہ نشاط النساء کے ساتھ ہوئی اسی طرح سید اظہر حسن کی ایک بیٹی سیدہ نسیمہ کا نکاح سید شبیر حسن کے بڑے بیٹے سید قائم الحسن کے ساتھ ہوا اور ان کے چھوٹے بیٹے سید ناصر الحسن کو بیگم حسرت نے لڑکپن سے اپنے ساتھ اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد اپنی اولاد کی مانند رکھا۔ پنجم یہ کہ بیگم حسرت کی دادی سید نیاز حسن کی زوجہ مولانا سید آل نبی کی بیٹی تھیں وہ حسرت کی حقیقی نانی تھیں یعنی بیگم حسرت کی دادی اور حسرت کی نانی حضرت مولانا احمد سعید، مولوی شریف الحسن اور مولوی لطف حسن کی حقیقی بہن تھیں اور اس لئے مولوی حیات الحسن اور مولوی ابن الحسن صاحب بسمل موہانی کی حقیقی پھوپھی تھیں۔

اپنے زمانۂ حیات میں بیگم حسرت کبھی کبھی راقم کے مقابلہ میں بطریق مزاح اپنی نسبتی فضیلت کا دعویٰ کرتی تھیں جس کا انہیں حق بھی تھا اس لئے کہ وہ شاہ وجیہہ کی پانچویں پشت میں تھیں جب کہ مولوی حیات الحسن اور مولوی ابن الحسن کے سوا ان کے تمام معاصر چھٹی اور ساتویں پشت میں تھے علاوہ بریں حضرت شاہ وجیہہ کی تیسری بیوی جن کی اولاد میں بیگم حسرت تھیں سیدہ تھی جب کہ دوسری دونوں بیویاں سیدہ نہیں تھیں۔

تفصیل یہ ہے

شاہ وجیہہ

سید محمد	شاہ غلام ابراہیم
سید غلام علی	سیّد نیاز حسن
سید منظہر حسین	سیّد شبیر حسن
سید مہر الحسن	نشاط النساء بیگم
سید اظہر حسن	
حسرت موہانی	
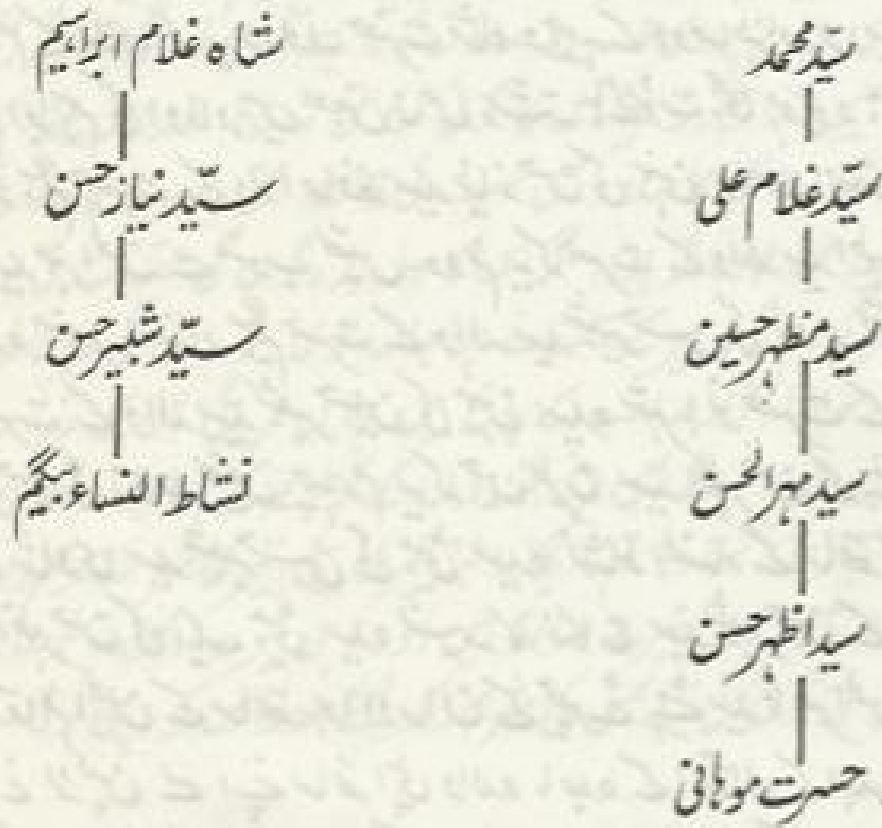
ابتدائی حالات

بیگم حسرت کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں البتہ پرنسپل عبدالشکور نے لکھا ہے کہ حسرت کے حالات کی تکمیل ناممکن ہے اگر ان اوراق میں مرحوم بیگم حسرت موہانی کا ذکر نہ کریں جو عرصۂ دراز تک حسرت کی رفیقۂ حیات رہیں۔ مرحومہ حسرت کی سیاسی اور ادبی و علمی جد و جہد میں پورے استحکام اور جوش و خروش کے ساتھ شریک کار رہتی تھیں بعض واقف کار اصحاب کا تو یہاں تک خیال ہے کہ حسرت کے عقائد کی استواری اور عمل کی چہل سالہ ہم آہنگی میں مرحومہ کا بہت کچھ دخل تھا۔ رہبر نسواں کانپور (نومبر ۳۲ء) میں ان کی ابتدائی زندگی کا حال ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے محترمہ نشاط النسا بیگم غالباً ۸۸۵ء میں موہان ضلع اناؤ میں ایک معزز ترین خاندان سادات

میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد سید شبیر حسن موہانی رائے چور ریاست حیدرآباد میں وکیل ہائی کورٹ تھے۔ چونکہ سادات موہان میں علم و فضل کا چرچہ شروع سے رہا ہے اس لئے محترمہ نشاط النساء بیگم قصبات اودھ کی عام لڑکیوں کی طرح زیورِ تعلیم سے محروم نہ رہ سکیں۔ آپ کو مذہبی تعلیمات کے علاوہ اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی معقول تعلیم دلائی گئی۔ جناب جلیل قدوائی نے بھی یہی لکھا ہے کہ بیگم حسرت کو اردو، فارسی اور عربی سے خاصی واقفیت تھی۔ جب آپ دوشیزہ تھیں آپ کا خاص مشغلہ یہ تھا کہ اپنے پسماندہ قصبہ کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں اور اگر آج موہان میں تعلیم نسواں کی جھلک نظر آتی ہے تو محترمہ نشاط النساء بیگم کی کوشش اور مالی بھی ایثار کا ثمرہ ہے۔ محترمہ رابعہ بیگم نے لکھا ہے کہ "دیہاتی ماحول میں پلی ہوئی یہ لڑکی نہایت جری، باحوصلہ اور ہر طرح سے حسرت کی رفاقت کے لئے موزوں ثابت ہوئی"۔

میاں بیوی میں محبت

جہاں تک ازدواجی زندگی کا تعلق ہے میاں بیوی دونوں میں بے انتہا محبت تھی۔ محترمہ رابعہ بیگم نے لکھا ہے کہ بیوی سے ان کو محبت تھی بلکہ کسی قدر ڈرتے بھی تھے بیوی کو بھی مولانا سے بہت محبت تھی اور جب مولانا قید میں رہتے تو کوشش یہی کرتیں کہ ان کی قربت رہے۔ شادی کے بعد عام طور پر علی گڑھ میں قیام رہتا تھا پھر جب کاروبار کے سلسلہ میں مولانا نے کانپور کو اپنا مستقر قرار دیا۔ تو بیگم حسرت بھی ساتھ گئیں۔ مولانا نے مالی اعتبار سے کبھی فراغت و اطمینان کو محسوس نہیں کیا۔ چنانچہ ان کی رفیقۂ حیات بھی ہمیشہ عیش و آرام سے محروم رہیں۔ لیکن کبھی بھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائیں۔ ہر کٹھن موقع پر انہوں نے مولانا کی سچی رفاقت پر فخر کیا ہے۔ اگرچہ میاں بیوی میں ہمیشہ ہی اچھے تعلقات رہے لیکن کبھی کبھی پُر لطف نوک جھونک ہو ہی جاتی تھی بیگم صاحبہ مولانا کی شاعری پر اکثر تبصرہ فرماتی رہتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ یہ اشعار تم نے فلاں کے عشق میں لکھے ہیں مولانا خود بعض مرتبہ انہیں چھیڑتے

اور ان سے کچھ سننے کی خاطر انہیں غزلیں سناتے اور کہتے کہ یہ اشعار کس کی یاد میں کہے گئے ہیں۔ بس مولانا کا یہ کہنا ہی انہیں بے چین کر دیتا۔ فوراً برس پڑتیں مگر ان لڑائیوں میں بالکل جان نہیں ہوتی۔ اور نہ ایسی ہی کوئی غلط فہمی پیدا ہوتی بس یوں ہی ایک دوسرے کو چھیڑنا اور ستانا مقصود ہوتا۔ پرنسپل عبدالشکور نے لکھا ہے کہ "۱۵، ۱۶ برس کی عمر میں شادی ہوگئی حسرت کے ساتھ پہلے علیگڑھ میں مقیم رہیں اور آخر زمانہ میں حسرت نے اور آپ نے کانپور کو اپنا مستقر بنا لیا۔ جب تک آپ زندہ رہیں حسرت کی حقیقی معنوں میں شریک حیات رہیں ان کے شوہر نامدار کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا کہ انہوں نے اپنی رُوح کی پُوری قوت کے ساتھ اس میں شرکت نہ کی ہو۔

سیاسی رفاقت

مرحومہ آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ممبر تھیں جلسوں میں ہمیشہ حسرت کے ساتھ شریک ہوتیں اور آپ کی اصابت رائے اور جوش عمل سے آپ کے رفقائے کار کو ہمیشہ تقویت اور استحکام حاصل ہوتا۔" خود مولانا نے ان کے حوصلہ اور کردار کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "گرفتاری کے وقت راقم الحروف کی شیر خوار لڑکی نعیمہ حد درجہ علیل تھی اور اتفاق رائے سے مکان میں والدہ نعیمہ اور ایک خادم کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا لیکن ان کی ذات سے اس نازک وقت میں بربنائے سیادت و تائید ربانی حیرت انگیز حوصلہ و استقلال کا اظہار ہوا خود پریشان ہوکر راقم کو بھی مغموم کرنے کی بجائے انہوں نے دوسرے ہی دن بذریعہ سپرنٹنڈنٹ جیل ایک ایسا ہمت افزا خط بھیجا جسے دیکھ کر جملہ کارپردازان جیل بھی متحیر رہ گئے۔ راقم کا دل بفضلہ امر حق میں یوں ہی قوی تھا لیکن ان کی یہ تحریر کہ تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔ خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو تقویت مزید کا باعث ہوا۔ بھائی صاحب کو تار دے کر انہوں نے بلوا لیا تھا۔ جن کے ہمراہ وہ مجھ سے ملنے کے لئے آئیں اور جب تک مقدمہ چلتا رہا

ہر ہفتہ آیا کیں اور آخر وقت تک جرأت وہمت میں ان کے ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔"

جرأت وہمت

جناب غلام احمد فرقت کاکوروی نے اپنے مضمون میں جس کا پہلے حوالہ دیا جا چکا ہے لکھا ہے کہ "جب مولانا حسرت تحریک آزادی کے سلسلہ میں پہلی بار گرفتار ہوئے تو اس وقت ان کی شیر خوار بچی نعیمہ سخت علیل تھی اور اس پر سکرات کا عالم طاری تھا۔ حالات اس درجہ نازک تھے کہ گھر میں سوائے مولانا۔ اور ان کی اہلیہ کے کوئی تیسرا شخص تیمار داری کے لئے موجود نہ تھا اس موقعہ پر جب گرفتاری کا وارنٹ آیا تو بڑے سے بڑا شیر دل اور بہادر انسان بھی ہوتا تو اس کے قدم ڈگمگا جاتے۔ مگر اس بہادر خاتون کے ماتھے پر شکن نہیں آئی اور اس نے خندہ پیشانی کے ساتھ شوہر کو رخصت کر دیا مولانا اگرچہ بچی کی علالت سے حد درجہ ملول اور متفکر تھے اور جیل پہنچ کر بھی ان کو خیال رہا۔ کہ گھر میں بچی اور ماں پر نہ جانے کیا گذر رہی ہوگی لیکن گرفتاری کے تیسرے ہی دن بیگم حسرت کا خط سپرنٹنڈنٹ جیل کی معرفت پہنچا جس میں بیگم نے مولانا کو تشفی اور دلاسہ دیتے ہوئے لکھا تھا اگر لڑکی یا گھر کی محبت میں ذرا بھی پائے استقامت میں لغزش آئی تو سمجھ لینا کہ اس گھر میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اس بہادرانہ جذبہ کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں صرف ایک اور جگہ ملتی ہے اور وہ اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی وراثتی جنگ میں دارا شکوہ کی شکست کے بعد جب ایک راجپوت جنرل نے اپنے گھر میں پناہ لینی چاہی تو اس کی بیوی نے یہ کہہ کر گھر کے دروازے بند کر لئے کہ شکست خوردہ انسان کے لئے گھر میں بھی کوئی پناہ نہیں۔"

تصوف وادب

مولانا جمال میاں نے تحریر فرمایا ہے کہ "مولانا کے تمام سیرت نگاروں

نے تسلیم کیا ہے کہ ان کی سیرت کی تعمیر اور ان کی سیاسی اور ادبی خدمات میں بڑا حصہ مرحومہ بیگم حسرت کا ہے۔ وہ تصوّف کے ذوق اور ادبی مذاق دونوں میں مولانا حسرت کی شریک تھیں انہوں نے جس دلیری، بہادری، استقلال اور صبر سے مشکلات کا مقابلہ کیا اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ مولانا کی قید کے زمانہ میں ان کے مقدمات کی پیروی، اردوئے معلی کی اشاعت، پریس کا بندوبست، تجارت کی نگرانی دواوین کی ترتیب وطباعت سب کام ان محترم خاتون نے انجام دیا وہ حقیقی معنوں میں مولانا کی شریک حیات تھیں "

ناگپور کانفرنس

سیاسی معاملات میں بھی وہ مولانا کی مشیر اور شریک تھیں جناب غلام احمد فرقت کاکوروی نے اس مضمون میں تحریر کیا ہے کہ مولانا حسرت کی طرح وہ بھی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ممبر تھیں۔ اور سیاسی جلسوں میں مولانا حسرت کے ساتھ شریک ہوتی تھیں۔ کانگریس کی ہر تحریک میں وہ پیش پیش رہیں۔ ان کی جرأت وہمت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو اس میں مسٹر گاندھی کے علاوہ اس دور کے تمام بڑے بڑے لیڈر شریک ہوئے یہ اجلاس ان معنوں میں بڑی اہمیت رکھتا تھا کہ اس میں برصغیر کی آزادی کے بارے میں ایک تجویز پاس کرکے حکومتِ برطانیہ کو بھیجی جانے والی تھی چونکہ ہندوستان کی تحریک آزادی اس منزل تک نہیں پہنچی تھی جس میں حکومتِ برطانیہ سے کامل آزادی کا مطالبہ کیا جاتا۔ لہٰذا تمام کانگریسی رہنما آئینی حدود میں رہ کر ہندوستانیوں کے زیادہ سے زیادہ حقوق کے مطالبہ کی تائید میں تھے مولانا حسرت موہانی کی اس جرأت وہمت کی داد دیجئے کہ اس دور میں جب کہ برطانوی حکومت اپنے پورے شباب پر تھی اور آزادیٔ وطن کا نام لینا بھی جرم تھا۔ جب برطانوی سامراج کی تلواریں سروں پر لٹک رہی تھیں اور آزادی کا لفظ زبان پر لانا اپنے آپ کو آلام ومصائب میں مبتلا کرنا تھا۔ مولانا حسرت نے کامل آزادی کا ریزولیشن پیش کیا۔ جس وقت یہ تجویز پیش ہوئی تو پورے اجلاس میں سناٹا چھا گیا

"سیاسی زندگی میں اس واقعہ کی پوری تفصیل ملے گی، اور ہر فرد ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگا۔ مولانا حسرت کو جب پنڈال میں کوئی شخص اس تجویز کی تائید کرنے والا نہ ملا تو بیگم حسرت نے کھڑے ہوکر ان کی تجویز کی تائید کی اور اس سلسلے میں ایک پرجوش تقریر کرتے ہوئے صدر سے مطالبہ کیا کہ وہ اس پر اجلاس کی رائے طلب کریں۔"

کانپور کانگریس

اس طرح جب ۱۹۲۵ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس کانپور میں منعقد ہوا جس کی صدارت مسز نائیڈو نے کی تو مولانا حسرت اور بیگم حسرت نے مزدوروں اور کسانوں کے ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے پنڈال میں داخل ہونا چاہا۔ تو سیوادل کے رضاکاروں نے جن کی قیادت پنڈت جواہر لال نہرو کر رہے تھے مزاحمت کی اور پنڈت جی نے حکم فرمایا کہ اگر جلوس پنڈال میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو اس پر لاٹھی چارج کیا جائے اس پر بیگم حسرت کو غصہ آگیا اور انہوں نے پنڈت جی کے منہ پر طمانچہ لگایا اور اس نادر شاہی حکم پر انہیں سرزنش کی تو پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جناب غلام احمد فرقت کاکوروی نے بھی اپنے اس مضمون میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے فرماتے ہیں کہ "۱۹۲۵ء کی کانپور کانگریس میں جو مسز سروجنی نائیڈو کی زیر صدارت ہوئی تو اس میں رضاکاروں کے کمانڈر پنڈت جواہر لال نہرو تھے مولانا حسرت اور ان کی بیگم مزدوروں کی قیادت کر رہے تھے وہ اپنا جتھا لے کر اجلاس میں داخل ہونا چاہتی تھیں تو پنڈت نہرو نے رضاکاروں کو حکم دیا کہ اگر مزدور نہ مانیں تو ان پر لاٹھی چارج کر دیا جائے یہ سنتے ہی بیگم حسرت آگ بگولہ ہو گئیں اور انہوں نے بڑھ کر پنڈت نہرو کے منہ پر طمانچہ مار دیا۔ بعد میں پنڈت نہرو کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ تو انہوں نے بیگم حسرت سے معافی مانگی اور مزدور پنڈال میں داخل ہو گئے مگر اس واقعہ کے عینی گواہ جناب سردار علی صابری مرحوم نے "انجام" کراچی مورخہ ۸ جون ۱۹۶۳ء میں ایک تفصیلی مضمون تحریر کیا جس کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے

"نو بجے دن کے قریب مزدور اور کسان ڈیلیگیٹوں اور کمیونسٹ کارکنوں کے دستے سیدالاحرار مولانا حسرت موہانی کی زیرِ قیادت کانگریس پنڈال کی طرف بڑھے بیگم حسرت موہانی اپنے نامور شوہر کے دوش بدوش تھیں اور ان سے آگے کامریڈ جگدمبا سرخ جھنڈا سنبھالے ہوئے تھے بے بنیاد افواہوں کی بناپر کانگریس نگر میں کھلبلی تو ساری رات مچی رہی تھی۔ مزدور اور کسان دستوں کے آگے بڑھتے ہی پنڈت جواہر لال کی زیرِ کمان کئی ہزار کانگریسی رضا کار حرکت میں آگئے۔ انہوں نے تین جانب سے گھیر کر کانگریسی پنڈال کے پھاٹک کے سامنے بیدردی سے لاٹھی چارج کر دیا جس سے ۲۰، ۲۵ مزدور ساتھی بہت مجروح ہوئے۔ علم بردار کی حیثیت سے کامریڈ جگدمبا ہم سب سے آگے تھے پنڈال کے اندر جو لٹھ بکف رضا کار باہر نکلے انہوں نے جگدمبا صاحب کو بری طرح زدوکوب کیا کہ وہ سر سے پاتک خون میں نہا گئے اور بیہوش ہو کر گر گئے اس طوفان بدتمیزی اور بھگدڑ میں اندیشہ تھا کہ جگدمبا کچل کر مر جائیں گے مسٹر اکبر علی صدیقی نے جو خود بھی کافی لحیم شحیم تھے بے ہوش جگدمبا کو اپنے شانے پر اٹھا لیا اور مجمع کو چیرتے ہوئے باہر لے گئے۔ میں اور ریاست اندور کے ایک کمیونسٹ ساتھی جو بعد کو بہت مشہور ہوئے مگر جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا غالباً جمنا پرشاد نام تھا محترمہ بیگم حسرت موہانی کو اپنے ہاتھوں کے حلقہ میں لئے ہوئے تھے۔ کامریڈ جگدمبا کو بے ہوش اور خون میں لہولہان دیکھ کر سیدالاحرار مولانا حسرت موہانی غصہ اور رنج سے بے تاب ہو گئے۔ اس وقت ان میں بلا کی طاقت آگئی تھی کانگریسی رضا کاروں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے اندر پنڈال میں گھس گئے اور بہت بلند آواز میں چیخ کر کہا کہ میں حسرت موہانی ہوں۔ اہنسا کے جھوٹے پجاریوں نے مزدور اور کسان ڈیلیگیٹوں پر بے جرم وخطا لاٹھی چارج کیا ہے کئی آدمی بہت زخمی ہو گئے ہیں جگدمبا کی حالت نازک ہے سن لو اگر جگدمبا مر گیا تو اپنے ہاتھوں سے کانگریس کے پنڈال کو آگ لگا دوں گا مولانا حسرت کا یہ مجاہدانہ نعرہ سن کر سارے پنڈال میں کھلبلی مچ گئی بڑے بڑے کانگریسی لیڈر روک تھام کے لئے ڈائس سے اتر کر گیٹ

کی طرف بڑھے دوسری طرف حضرت مولانا حسرت موہانی کی تنہائی کے احساس نے ان لوگوں کو جو باہر تھے بے چین کر دیا اور ہم نے کانگریسی رضاکاروں کو دھکیل دھکال کر پنڈال میں گھسنے کی کوشش کو تیز تر کر دیا اتنے میں رضاکاروں کے کمانڈر انچیف پنڈت نہرو ہمارے دائیں طرف نمودار ہوئے اور گھوڑے سے اتر پڑے اور حیرت انگیز دلیری کے ساتھ ہجوم کو کسی امتیاز کے بغیر دونوں ہاتھوں سے دھکے دے دے کر ہٹانے لگے۔ اور ہم مشتعل ہجوم میں جان پر کھیل کر کسی نہ کسی طرح پنڈال کے اندر جانا چاہتے تھے۔ بالکل گیٹ کے قریب میں اور ریاست اندور والے ساتھی (غالباً جمنا پرشاد) بیگم حسرت موہانی کو اپنے حلقے میں لئے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ادھر پنڈت نہرو ہجوم کو چیرتے پھاڑتے دھکیلتے گیٹ تک پہنچے اور انہوں نے افراتفری کے عالم میں بالکل غیر شعوری طور پر محترمہ بیگم حسرت موہانی کو دھکیلا۔ چھوٹے سے قد کی دبلی پتلی مگر غضب کی ہمت رکھنے والی یہ شخصیت پنڈت جی کا ہاتھ لگتے ہی غصہ سے بے تاب ہو گئیں اور آؤ دیکھا نہ تاؤ پنڈت جواہر لال نہرو کے منہ پر چٹاخ سے طمانچہ جڑ دیا اور بولیں شرم نہیں آتی ؛ بے غیرت مجھے ہاتھ لگاتا ہے۔ یہ سنی سنائی کہانی نہیں واقعہ ہے میرا چشم دید واقعہ ہے کہ گال پر طمانچہ پڑتے ہی پنڈت نہرو چونک پڑے۔ دیکھا سامنے بیگم حسرت موہانی غصہ سے کانپ رہی تھیں اور جانے کیا کیا الٹی سیدھی سنا رہی تھیں پنڈت جی کی مزاج کی تیزی بڑھاپے تک قائم رہی وہ تو ان کی جوانی کا عالم تھا یہی کوئی ۳۲-۳۳ کی عمر ہو گی۔ مگر پنڈت نہرو کی شرافت کی قسم کھانی چاہیے کہ بیگم حسرت موہانی کی صورت دیکھتے ہی وہ پانی پانی ہو گئے اور ہاتھ جوڑ کر بولے "آپ میری ماں ہیں مجھے اور ماریے، سزا دیجئے، بھول ہو گئی ماں مجھے معاف کرو۔"

پنڈت جی کی اس شرافت کے مظاہرے سے ہم میں بہت سے لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ خود محترمہ بیگم حسرت موہانی نے بھی پنڈت جی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اتنے میں کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر باہر آ گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اس واقعہ کو کم و بیش چالیس سال گذر گئے اس مدت ایک کٹر مسلم لیگی

اخبار نویس کی حیثیت سے دلی سے کراچی تک پنڈت نہرو اور ان کی کانگریس کے خلاف سینکڑوں کیا ہزاروں مضمون لکھے لیکن جب یہ واقعہ یاد آجاتا ہے تو میری گردن احترام سے جھک جاتی ہے اور دل پکار اٹھتا ہے کہ پنڈت نہرو کی سیاسی پالیسی جو کچھ بھی ہو لیکن ذاتی اعتبار سے وہ بہت بلند پایہ شریف انسان تھے۔"

جناب جلیل قدوائی نے لکھا ہے کہ اس واقعہ میں غلط فہمی کا سبب یہ بھی تھا کہ پنڈت نہرو کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ مولانا کانپور کا نگریس میں شرکت کے مجاز ہیں اس لئے کہ وہ کانپور سے ڈیلیگیٹ منتخب نہیں ہو سکے تھے۔ لیکن مولانا، بیگم صاحبہ کی کوششوں سے فتح پور سے ڈیلیگیٹ منتخب ہو گئے تھے اور پنڈت نہرو کے علم میں یہ تازہ ترین اطلاع نہیں تھی۔

محترمہ نعیمہ بیگم

محترمہ نعیمہ بیگم نے لکھا ہے کہ "والدہ مرحومہ نے ہمیشہ مولانا کے دوش بدوش بلکہ ان سے بھی بڑھ کر آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا مولانا کی پہلی گرفتاری تک تو وہ زیادہ تر امور خانہ داری میں دلچسپی لیتی تھیں لیکن جب انگریزوں نے مولانا پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیئے۔ ان کا قیمتی کتب خانہ کوڑیوں کے مول نیلام کر دیا تو وہ اللہ کا نام لے کر میدان عمل میں کود پڑیں اور ہمت واستقلال کا وہ مظاہرہ کیا کہ سب دیکھتے رہ گئے پہلی گرفتاری کے وقت میں تقریباً ایک سال کی تھی اور سخت علیل تھی وہ گھر میں یک وتنہا تھیں۔ لیکن انہوں نے ان پریشانیوں کی مطلق پرواہ نہیں کی اور مولانا کو جرأت وہمت کی نہ صرف تلقین کی بلکہ انہیں کبھی اپنی ذاتی الجھنوں سے آگاہ بھی نہیں کیا۔ تاکہ وہ مزید پریشانیوں سے بچے رہیں۔"

محترمہ نعیمہ بیگم نے تحریر کیا ہے کہ مجھے ان کی واحد اولاد ہونے کا فخر حاصل ہے وہ فرماتی تھیں کہ میں نے تمہاری ولادت کے وقت دعا کی تھی کہ اللہ پاک اب مجھے دوبارہ اولاد کی تمنا نہیں ہے۔ اللہ نے ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشا

اور پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی" محترمہ نعیمہ بیگم نے کانپور کانگریس کے واقعہ کا بھی تذکرہ کیا اور لکھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو ہمیشہ اس واقعہ میں اپنے افسوس ناک کردار کا احساس رہا چنانچہ یوم حسرت موہانی پر ایک پیغام دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ "مولانا کی بیوی ایک نہایت دلیر خاتون تھیں جن کی ہمت کی میں بہت تعریف کرتا ہوں۔"

سودیشی اسٹور

محترمہ نعیمہ بیگم نے آگے چل کر لکھا ہے کہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۶ء تک مولانا کی دوسری گرفتاری کے دور میں وہ سودیشی اسٹور علی گڑھ کا بھی انتظام سنبھالتی تھیں اور رسائل اور اخبارات کو مولانا کا کلام بھیجتی رہیں۔ والدہ صاحبہ کے ایک خط سے جو مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ کے نام تھا۔ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ مقدمہ کی پیروی کے علاوہ اس بات کی بھی کوشاں رہتی تھیں کہ مولانا کو جس چیز کی ضرورت ہو وہ ان تک پہنچ جائے۔ مولانا کی رہائی کے لئے ان سے جو بن پڑتا اس سے گریز نہیں کرتیں۔ دوسری گرفتاری کے دوران جب برصغیر کے کونہ کونہ سے مولانا کی رہائی کا مطالبہ ہوا تو حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ مولانا رہا ہونے کے لئے تیار نہیں تو یہ صرف بیگم حسرت کی ذات تھی جو خاموش نہ رہ سکی۔ جناب جلیل قدوائی نے تحریر کیا ہے "حق و باطل کی جنگ کا یہ موقع ناکام رہ جائے گا اگر اس فدائے حریت کی شریک حیات بیگم حسرت کا جن سے بڑھ کر سرفروش دلیر اور شوہر کا ساتھ دینے والی خاتون کا تصور دشوار ہے اس معاملہ میں رویہ نہ ظاہر کیا جائے۔ واضح ہو کہ یہ واقعہ اب سے ۵۰ سال قبل کا ہے اور اگرچہ آج جنگ آزادی کی راہ میں جس پر بے خوفی کے ساتھ چلنا ہمیں حسرت اور ان کی بیگم نے ہی سکھایا پھر بھی اب ہر شخص قومی خدمت کا مدعی ہے مگر اس زمانہ میں عورت تو عورت بڑے سے بڑے مرد آہن کے لئے بھی بیگم حسرت جیسا مجاہدانہ طرز عمل اختیار کرنا کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا انہوں نے مولانا کے انکار کے سلسلہ میں اخبارات کو بیان

تے ہوئے انہوں نے کہا کہ حسرت نے جو طرز عمل اختیار کیا اس میں ضد اور خود آرائی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ میں نے ان کی اس کارروائی کو بیحد اطمینان اور خوشی کے ساتھ دیکھا۔ اس نظر بندی سے قید بہر حال بہتر ہے حسرت نے خوب کیا مجھے ان سے ایسی ہی امید تھی۔، یہ خیال رہے کہ یہ رائے کسی کرسی نشین لیڈر کی نہ تھی اور نہ کسی پیٹ بھرے اور خوشحال گھرانے کی عورت کا خیال تھا۔ جس کے لئے اس شوہر کی عدم موجودگی میں آسودگی اور فراغت کا ساز و سامان ہر وقت موجود رہتا ہے یہ بیگم حسرت کا ردّ عمل تھا جو مولانا کے ہمراہ نمک روٹی کھا کر اجرت پر سلائی کر کے اور چکی پیس کر گذر اوقات کرتی تھیں مگر اپنے دل کی حرارت اور قوت ایمانی اس حد تک قائم رکھتی تھیں کہ اس ذخیرہ سے خود حسرت کو بھی فیض پہنچتا تھا۔ مولانا کی اس قید کے زمانہ میں معلوم نہیں اس پیکر حیا و عفت خاتون پر کیا بیتی مگر آفریں ہے اس ضبط و استقلال کی ان پر علامہ اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

خودداری

جناب شورش کاشمیری نے اپنے ایک مضمون میں بیگم صاحبہ کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ حسرت جتنے وضعدار ہیں ان کی اہلیہ اتنی ہی خوددار ہیں۔ کسی فلسفی کا مقولہ ہے کہ عورت نصف کائنات ہے۔ ممکن ہے اس میں کچھ غلو ہو لیکن حسرت کے معاملہ میں ان کی اہلیہ نصف زندگی ضرور ہیں۔"

جرأت کی ایک اور مثال

جناب ضیاء الدین برنی نے اپنے مضمون بیگم حسرت، چند تاثرات میں مسز سروجنی نائیڈو کے حوالہ سے مولانا کی اسی قید کے بارے میں ایک جرأت انگیز واقعہ کا ذکر فرمایا ہے جس کا اس موقعہ پر تذکرہ ضروری ہے برنی صاحب نے

ابتداء میں بیگم صاحبہ کے بارے میں یہ تاثرات بیان کئے ہیں :- "بیگم حسرت موہانی ان خواتین میں ہیں جن کا حقیقی معنوں میں احترام کرتا ہوں۔ یہ ان عورتوں میں ہیں جن پر ہند و پاکستان سدا فخر کریں گے اگرچہ یہ سیاسیات میں پیش پیش تھیں جس سے حسرت کو دلچسپی تھی حسرت سودیشی کے معاملہ میں بال گنگا دھر تلک کی پالیسی پر گامزن تھے (یہ ان کا اپنا خیال ہے) اور ان کی پیروی میں انہوں نے عہد کیا تھا کہ وہ ہمیشہ سودیشی چیزیں استعمال کریں گے ان کی بیگم بھی اپنی زندگی کے آخری دن تک اسی مسلک پر قائم رہیں اور کبھی اس راستہ سے نہیں ہٹیں۔ وہ ہمیشہ موٹے چھوٹے ہاتھ کے کتے سوت کے کپڑے استعمال کرتیں ہماری عورتیں جب اپنے عزیزوں کو اور خاص طور پر اپنے خاوند کو سیاسی تحریکات میں جیل جاتے ہوئے دیکھتیں تو وہ بے اختیار رونے لگتیں مگر بیگم حسرت خدا جانے کس دل گردہ کی تھیں کہ وہ اپنے خاوند کے جیل جاتے وقت کبھی نہیں روئیں اس بارے میں ان کا تقابل ترکی کی مجاہد خاتون خالدہ ادیبہ خانم سے کیا جا سکتا ہے جنہوں نے اپنے ملک کی خاطر طرح طرح کی سختیاں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔" اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ "مسز سروجنی نائیڈو نے بیگم حسرت موہانی کی جرأت انداز کا ایک دلچسپ واقعہ مجھ سے بیان کیا تھا جسے میں یہاں درج کرتا ہوں۔ جب وزیر ہند مسٹر مانٹیگو اصلاحات کی اسکیم مرتب کرنے کے لئے ہندوستان آئے تو اس وقت یہ بھی طے ہوا تھا کہ خواتین کا ایک وفد بھی ان کی خدمت میں پیش ہو گا۔ چنانچہ مقررہ دن وہ وفد پیش ہوا۔ اس میں بیگم حسرت بھی تھیں۔ ان وفدوں میں وہی باتیں ہوا کرتی تھیں جو پہلے سے طے ہو جاتی تھیں اور پروگرام میں سر مو فرق نہ ہوتا۔ مگر دوران ملاقات میں بیگم حسرت نے مولانا حسرت کی گرفتاری، قید میں سختی اور دوسرے متعلقہ امور کے بارے میں ایک تحریری درخواست وزیر ہند کے ہاتھ میں دے ہی دی مسز نائیڈو فرماتی ہیں کہ میں نے پیچھے سے چٹکیاں لے کر اس کام سے روکنا چاہا مگر وہ بالکل نہ رکیں اور جب تک انہوں نے زبانی بھی حسرت کے بارے میں ساری باتیں نہ کہہ لیں اس وقت تک دم نہیں لیا وفد کے دیگر افراد اور متعلقہ حکام سب

حیرت میں تھے مگر چپ تھے اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔

خود مولانا کہا کرتے تھے کہ ان کی زندگی بنانے میں ان کی اہلیہ کا برابر کا حصہ ہے جس زمانہ میں مولانا نے اردوئے معلیٰ جاری کیا تو اور ان کی بیگم سینڈ پریس پر خود ہی چھاپتے اور خود ہی نکالتے تھے۔ اس دوسری قید کے دوران بیگم حسرت نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ان کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو مولانا نے انہیں جیل سے تحریر فرمائے۔ یہ سارے خطوط ۵ فروری ۱۹۱۶ء سے لے کر ۸ نومبر ۱۹۱۶ء کے درمیانی وقفہ میں لکھے گئے جن سے بیگم حسرت کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

بنام نشاط النساء بیگم

بسم اللہ

السلام علیکم۔ میں پرتاپ گڑھ سے فیض آباد ۲ فروری کو بخیریت پہنچا یہاں جیلر صاحب بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل ماشاء اللہ خان ہیں۔ ان سے بھی دوسرے دن ملاقات ہوئی۔ یہاں بھی حسب دستور کھانا مجھ کو خالص ملتا ہے یعنی دودھ شکر کے علاوہ دونوں وقت گیہوں کی روٹی اور ترکاری گھی میں پکی ہوئی۔ غرض کہ ہر طرح سے آرام ہے۔ اطمینان رکھو۔ کتابیں اور اخبار بھی حسب معمول ہیں بستر وغیرہ بھی اور سامان ضروری مثلاً لوٹا پیالہ وغیرہ سب میں اپنے پاس رکھتا ہوں۔

تمہارا ۳۰ جنوری کا لکھا ہوا کارڈ مجھ کو یکم فروری کو پرتاپ گڑھ میں مل گیا۔ آج ۳۱ کا لکھا ہوا کارڈ پرتاپ گڑھ سے واپس ہو کر ملا۔ آئندہ خطوط اور اخبار سب فیض آباد کے پتہ پر بھیجا کرنا۔ فیض آباد انگریزی میں یوں لکھنا (FYZABAD) میرے پاس اخبار وغیرہ بہت جمع ہو گئے ہیں عنقریب میں وہ سب ایک بورے میں بھر کر واپس کر دوں گا اس کے بعد میں علی گڑھ سے تذکرۃ الشعراء کے لئے بہت سے دیوان منگاؤں گا جن کی فہرست عقب سے روانہ کروں گا تم وہ سب دیوان ہمارے کتب خانے سے تلاش کر کے ایک ٹرنک میں

بند کر کے بذریعہ پسنجر ٹرین بھیج دینا مقفل بند کر دینا اور بلٹی معہ کنجی رجسٹری والے لفافے میں جس کے اندر کپڑا لگا ہوتا ہے۔ علیحدہ بھیج دینا۔

اڈیٹر ہندوستان کے روپے بھیجنے کا حال معلوم ہوا۔ میرا بھی شکریہ ان کو لکھنا بجلک میں نے پرتاپ گڑھ ہی سے بھیج دیا تھا۔ غالباً اب پہنچ گیا ہوگا نمائش سے مال واپس لانے میں بھی محصول نہیں دینا پڑتا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دوکان سے نمائشی مال لے جاتے وقت دفتر چنگی میں اطلاع کر دینا چاہیئے کہ ہم اتنا مال جو اس قیمت کا ہے نمائش میں لئے جاتے ہیں بعد نمائش پھر واپس لائیں گے۔ اس پر وہاں سے ایک رسید مل جاتی ہے جس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ لے جاتے وقت چنگی کی چوکی سے لے لیتے ہیں۔ دوسرا واپسی کے وقت ان کو دکھایا جاتا ہے۔ ناصر سے کہنا کہ وہ چنگی کے صدر دفتر سے جا کر منشی سے میرا سلام کہدے اور رسید لے لیں منشی کو کچھ ایسا ہی دے دیا جاتا ہے تو وہ سب کام ٹھیک کر دیتا ہے۔ ۲۰۰/- روپے کی مالیت لکھوانا کہ ہم نمائش میں لئے جا رہے ہیں اگر اس خط کے پہنچنے سے پہلے ہی نمائش میں مال جا چکا ہو تو سیکرٹری صاحب نمائش سے مل کر میرا سلام کہنا اور ان سے کہنا کہ غلطی سے ہم نے چنگی سے نمائش میں اپنی دکان سے مال لانے کی رسید نہیں لی ہے۔ اب آپ منشی کو لکھ دیجئے کہ وہ رسید دے دے۔

تم خط روز لکھا کرو۔ مگر میں ہفتہ وار لکھا کروں گا۔ ہفتہ کے روز تم جوابی کارڈ لکھ دیا کرو۔ میں اتوار کو جواب لکھ دیا کروں گا۔ باقی حسب معمول یونہی کارڈ لکھا کرو۔

فقط حسرت

ڈسٹرکٹ جیل فیض آباد ۵ فروری ۱۹۱۶ء

بنام نشاط النساء بیگم

بسم اللہ

السلام علیکم۔ ۹ فروری تک کے کارڈ پہنچے پیکٹ بھی ملے۔ مگر کئی روز سے

اخبار لیڈر نہیں آیا۔ معلوم نہیں کیا سبب ہوا۔ ۸ رفروری تک لیڈر ملا۔ اس
کے بعد ۹، ۱۰، ۱۱ رفروری ۱۹۱۰ء کا لیڈر نہیں ملا۔ تم مینیجر صاحب لیڈر کو لکھو
کہ اخبار ۸ رفروری کے بعد کیوں نہیں روانہ کیا۔ کہ ۸ رفروری کے بعد سے اس
وقت تک جتنے پرچے نہ بھیجے ہوں، وہ سب فوراً بھیجیں اور آئندہ برابر حسب معمول
روانہ کیا کریں پتہ انہوں نے فیض آباد کا تبدیل کر دیا تھا احتیاطاً پھر لکھ دینا
رسالہ الناظر جنوری اور فروری کا کیوں نہیں آیا۔ جنوری کا بہت روز ہوئے
کہ شائع ہو گیا ہے، اب فروری کا بھی نکل گیا ہو گا۔ دریافت کر کے بھجواؤ۔

نمائش کے حالات روزانہ لکھنا اور اشتہار مطبوعہ کالج کے ہر کمرے میں تقسیم
کرا دینا اور نمائش میں بھی سب خیموں پر تقسیم کرا دینا۔ معلوم نہیں خواجہ مجید نے
حسب وعدہ ٹائپ کرایا یا نہیں۔ دیوان حسرت وغیرہ طالب علموں کو اب نصف
قیمت پر نہیں دیئے جا سکتے۔ البتہ مع دوم ۴ اور مکمل ۱ر آنے میں اگر دے دو
تو کچھ ہرج نہیں ہے۔ ستارہ صبح کا بھی آٹھویں نمبر کے بعد پھر کوئی پرچہ نہیں آیا
دریافت کرنا۔ اگر برابر ہفتہ وار آیا کرے تو اچھا ہے۔

اردوئے معلیٰ کی ابتدائی جلدیں اب نہیں مل سکتی۔ جواب لکھ دینا
ظفر الملک صاحب نے کتابیں جتنی روانہ کیں سب کا حساب لکھتی جانا۔ مع تعداد
کتب سنہ ۱۱ء کے اردوئے معلیٰ کی جلدیں دوکان میں اندر والے حصے کے آخر
میں الماری پر موجود ہیں۔ سرخ کپڑے کا بستہ ہے دفتی پر کاغذ معمولی سبز ہے
ایک جلد مجھ کو بھیج دو۔ لیڈر کی طرح نئی روشنی بھی دو روز سے نہیں آیا
معلوم نہیں کیا سبب ہے۔ آب و ہوا یہاں کی اچھی ہے۔ اور میں بخیریت ہوں
اخبار دیکھ کر میں ایک بوری میں بھرتا جاتا ہوں جب بوری بھر جائے گی
تب علی گڑھ بھیج دوں گا۔

مندرجہ ذیل دیوان تلاش کر کے ٹرنک میں بند کر کے پسنجر ٹرین میں بھیج
دو۔ کنجی قفل ٹرنک کی مع بلٹی رجسٹری لفافے میں بھیجنا جو اڑھائی آنے کو ملتا
ہے۔ فقط

(۱) شاہ حاتم قلمی جلد چمڑا (۲) شاہ نصیر اور دیوانوں کے ساتھ ایک جلد میں

ہے۔ (۳) عبداللہ خاں سر قلمی جلد چمڑا (۴) شگفتہ (۵) قلق میرٹھی سفید کاغذ قلق لکھنوی کی ضرورت نہیں (۶) مسرور قلمی جو دوکان میں تھا (۷) ناسخ مجلد مطبوعہ (۸) رشک چھاپہ قدیم مجلد (۹) خواجہ وزیر (۱۰) بحر (۱۱) مہر مطبوعہ سلطانی (۱۲) آباد (۱۳) میر مطبوعہ مجلد (۱۴) سحر (۱۵) عرش مطبوعہ بڑی تقطیع (۱۶) نادر (۱۷) فضل قلمی جلد کمرے میں میز پر ہوگا یا کہیں اور (۱۸) راسخ عظیم آبادی قلمی مجلد چمڑا (۱۹) نساخ (۲۰) رضا علی وحشت (۲۱) میر مہدی مجروح (۲۲) ناظم نواب رام پور (۲۳) سالک قربان علی بیگ (۲۴) عاشق شاگرد غالب اس کی تین جلدیں ہیں (۲۵) مولوی سمعیل جلد انگریزی وضع (۲۶) زکی شاد غائب (۲۷) حزیں قلمی جلد کہنہ (۲۸) یقین قلمی چھوٹی جلد (۲۹) حسرت قلمی جلد کہنہ (۳۰) شاعر قلمی جلد کہنہ (۲۷، ۳۰) ایک ہی جلد میں ہیں۔ جلد دفتی والی کاپی کی شکل میں ہے مسودہ قلمی میرے ہاتھ کا ہے تلاش کرکے بھیجو۔ بھائی بھاوج ..... کو سلام۔ نامی کو دعا، لفافہ نہیں ملا تھا۔ وہ پھر کبھی بھیجوں گا۔ فقط :

حسرت ڈسٹرکٹ جیل فیض آباد
۱۱ فروری ۱۹۱۶ء

بنام نشاط النسا بیگم

بسم اللہ

السلام علیکم : تمہارے ۹ مارچ تک کے خط اور پیکٹ پہنچے حال معلوم ہوا عبدالغفار وغیرہ لوگ آئیں تو ان سے ملنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے یہاں کے سپرنٹنڈنٹ آج کل ایک فوجی یورپین افسر ہیں اور میرے ساتھ جو برتاؤ ماشاء اللہ خاں صاحب کے وقت میں ہوتا تھا۔ اب بھی وہی ہوتا ہے مگر یہاں کا پانی میرے موافق نہیں اس لئے کھانا اچھی طرح ہضم نہیں ہوتا اس کے علاوہ اور میں ہر طرح سے بخیریت ہوں۔ لوگ اکثر ایسی ہی تحریریں بھیجا کرتے ہیں۔ اطمینان رکھیں۔ سیالکوٹی خط سے تم کو ناحق غصہ ہوا۔

جن جن لوگوں کو دیوان حسرت مکمل نہ پہنچا ہو مثلاً ہمدم کا نیو بند

وغیرہ ان کو اب صرف حصّہ دوم بھیجنا اور شوکت، مولوی علی حیدر، مولوی حمیدالدین کو حیدرآباد جو دیوان تم نے بھیجے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ان لوگوں کو نہیں ملے۔ غالباً طاعون کے سبب سے وہ لوگ حیدرآباد میں نہ ہوں گے۔ اب تینوں کو کارڈ لکھ کر دریافت کرو کہ دیوان ملے یا نہیں۔ اگر نہ ملے ہوں تو ان کو بھی صرف دیوان دوم بھیج دینا اور شوکت سے دیوانِ جلیل بہ جانِ سخن منگوانا۔

معلوم ہوا کہ دیوانِ مومن، نسیم، تسلیم بھی اب نہیں باقی ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ آئندہ تذکرہ صرف انہی کو روانہ کیا جائے۔ جو خاص طور پر طلب کریں ورنہ باقی لوگوں کو مفصلہ ذیل کتابیں بھیجا کرو۔

(۱) مکتوبات ۶؍ (۲) انتخابات اردوئے معلی عہ (۳) دیوانِ غالب عہ (۴) دیوان حسرت دوم ۵؍ کل سے محصول ڈاک اور فیس ملا کر للعہ کا ویلو کیا کرو۔ اور جو لوگ عہ کا ویلو منگایا کریں ان کو بھی اسی طرح للعہ کا ویلو بھیجا کرو اور کارڈ اطلاعی لکھ دیا کرو۔ کہ تذکرہ اب نہیں رہا اس لئے للعہ کا ویلو بھیجا ہے۔

کشن پرشاد نے ۱۵۰ روپے کے ۳۰ سیٹ لئے ہیں۔ ان کو بھی ۳۰ کی بجائے ۴۰ سیٹ ترتیب کے یعنی ۱۲؍ قیمت والے بھیج دو۔ تذکرہ نہ بھیجنا۔ مجھ کو تذکرہ کی اور نسیم کی تسلیم کی مومن کے انتخاب دواوین کی بہت ضرورت ہو گی۔ ان کو لکھ دینا کہ تذکرہ نہیں رہا۔ اس لئے ۳۰ کی بجائے ۴۰ سیٹ روانہ ہیں۔

سلیپر میری ٹوٹ گئی ہے اس لئے چپل ذرا بڑی چھانٹ کر بھیج دو۔ دو ٹوپیاں بھی دو پلی بنا کر بھیجو۔

آئندہ سے مختلف قسم کی آمدنیاں علیحدہ علیحدہ جمع کرنا (۱) ۳۰۰ جمع ہیں آئندہ سے کتابوں سے جو آمدنی ہو وہ سب اسی رقم میں جمع کرنا اور علیحدہ رکھنا (۲) دوکان سے جو آمدنی ہوا کرے اس کا روزانہ حساب علیحدہ جمع کیا کرو اور اس میں سے ۵۰ روپے ماہوار ستّو کو علی کے قرض میں بھیجا کرو۔ اور گھر میں جو خرچ ہو وہ بھی دوکان کی آمدنی سے کیا کرو۔ اس کے بعد جو کچھ بچا کرے وہ علیحدہ جمع کرتی رہو اور نیا مال اس سے منگوایا کرو (۳) متفرق آمدنی جو کچھ ہو مثلاً بریلی سے یا محمد علی کے پاس سے جو کچھ آئے وہ سب علیحدہ جمع کرتی

جاؤ۔ اسے خرچ کرنا۔ جو کچھ اس طرح جمع ہوگا۔ وہ ہم علی گڑھ آنے پر لطور ضمانت ادا کرکے اپنا مطبع پھر جاری کریں گے غرضیکہ آمدنی کی تین مدیں ہیں تینوں کا حساب علیحدہ علیحدہ ہے بھائی کا قرض ابھی ادا نہ کرنا میرے آنے پر دیکھا جائے گا۔

کتابوں کے بکس کی ایسی کچھ جلدی نہیں ہے۔ جب ہندی، ترکی۔۔۔۔ سب کتابیں آجائیں تب بھیجنا بلکہ اگر ہو سکے تو ایک ایک کارڈ دوبارہ بطور یاددہانی محبوب عالم، اسید سلیمان اور کشن پرشاد کو لکھ کر کتابیں منگوانا۔ دوکان میں رلیں ناگوں کی بہت سی ہیں ناصر سے کہنا کہ ان کو وحید صاحب سے نرخ دریافت کرکے بیچنے کی کوشش کریں غالباً اب بچائے رکے نہ کو بکیں گی۔

اب تو ہولی بھی ہوگئی۔ خواجہ کے پاس سے مسودہ منگا کر بھجواؤ پتہ وغیرہ سب انہی سے لکھوا لینا اور قاعدہ بھی پوچھ لینا کہ کہاں اور کسی کے ذریعے سے بھیجا جائے گا یا بلا واسطہ بھیجا جائے گا مجھ کو قاعدہ نہیں معلوم ہے۔

۱۲ مارچ یہاں تک لکھنے کے بعد آج تمہارا ۱۰ مارچ کا کارڈ اور پیکٹ بھی ملا کھانا مجھ کو اچھا ملتا ہے۔ تم فکر نہ کرو مجھ کو روپے وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

فقط

حسرت ڈسٹرکٹ جیل فیض آباد

۱۱ مارچ ۱۹۱۶ء

بنام نشاط النساء بیگم

بسم اللہ

السلام علیکم۔ کل ایک لفافہ لکھ چکا ہوں۔ اس کے لکھنے کے بعد ہی شام کو گورنمنٹ کا حکم آگیا کہ للت پور سے کہیں جانے کی اجازت نہ دی جائے گی اس لئے اب مجبوراً مجھ کو للت پور جانا پڑا۔ میں یہ کارڈ لکھ کر جانا چاہتا ہوں گا اور اس وقت پولیس مجھ کو باضابطہ گرفتار کرے گی اور بعد میں مقدمہ ہوگا

مقدمہ کہاں ہو گا۔ اس کا حال ابھی معلوم نہیں ہوا۔ نیز جہاں کہیں ہو گا اس کا حال بعد میں بذریعہ تار تم کو لکھ دوں گا۔ تم خواجہ مجید صاحب کے پاس یہ خط بھیج دینا اور کہہ دینا کہ اگرچہ مجھ کو اپنے مقدمے میں بحث وغیرہ کے لئے کسی وکیل کی ضرورت نہیں۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی پیش آتی ہیں جن میں ایک قانون دان کی مدد کی ضرورت ہو جاتی ہے بس جہاں کہیں مقدمہ ہو وہاں آپ ایک روز کے لئے آئیے یا کسی اور کو بھیج دیجئے۔ بیشک میں فیس ادا کروں گا مقامی وکیلوں میں سے کسی مدد کی امید نہیں رکھتا اس لئے آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ کم سے کم ایک وکیل یا بیرسٹر میری مدد کے لئے ہونا چاہئے۔ فقط حسرت موہانی۔ للت پور ۹ مئی ۱۹۱۶ء

بنام نشاط النساء بیگم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم: کارڈ تمہارا آج بھی پہنچا اور جتنے خطوط تم نے لکھے سب پہنچے حالات معلوم ہوئے۔ آج صبح کو میں نے لیفٹیننٹ گورنر کو تار دیا تھا کہ مجھ کو ملنے کی اجازت دی جائے۔ اس وقت جواب آ گیا کہ نہیں مل سکتے۔ البتہ اگر کوئی تحریر بھیجو تو ہم غور کریں گے۔ بس میرا ارادہ ہے کہ آخری تدبیر یہ بھی کر دیکھوں کہ سب حال ان کو لکھ بھیجو شاید اس پر کچھ لحاظ کیا جائے مگر اس تحریر کے روانہ کرنے سے قبل میں چاہتا تھا کہ کسی بیرسٹر سے مشورہ کر لوں۔ اس لئے آج تین تار میں نے جوابی مفصلہ ذیل لوگوں کے نام بھیجے ہیں کہ مجھ سے آکر مل جاؤ میں اخراجات ادا کروں گا (۱) خواجہ عبدالحمید بیرسٹر علی گڑھ (۲) ڈاکٹر ناظر الدین حسن بیرسٹر لکھنؤ (۳) ظہور احمد بیرسٹر الٰہ آباد

غالباً پرسوں تک ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔ ان سے مشورہ کر کے لیفٹیننٹ گورنر کے نام تحریر روانہ کروں گا اور اس کے جواب کے آنے تک اور انتظار کروں گا۔ یعنی للت پور سے باہر نہ جاؤں گا اس کے سوا باقی اور احکام کی نہ میں نے آج تک تعمیل کی ہے اور نہ کروں گا باقی حالات

بدستور ہیں۔ متفرق باتوں کا جواب اس کارڈ کی پشت پر درج ہے۔
رومال ہر روپے بہت سے رکھے ہیں۔ ایک بنڈل تو اس دکان میں تھا جو خالی کی گئی ہے دوسرا بنڈل دوکان کے اندرونی حصے میں اصلی ترکی ٹوپیوں کے کسی لمبے زرد رنگ کے ڈبے میں ہے۔ وہ نکلوا لینا۔ بوٹ پالش ابھی بہت ہیں لٹھے کے لئے ناصر کو دہلی بھیجنا وہ تجارت کے بیوپار کے منیجر سے ملیں وہ ان کو دیگو لٹھا ناگپور والے کی دکان سے دلوادیں گے۔ اگر وہ نہ ملیں تو وہ رائے بشمبھر ناتھ تاجر پارچہ نئی سڑک دہلی سے میرا نام نے خرید کر لائیں (للعہ/۳) نمبر کا لٹھا غالباً عہ کو ملے گا تجارت بیوپار کا پتہ، ایشور بھون قریب مسجد فتحپوری دہلی ہے۔
عہ بذریعہ منی آرڈر جیسا کہ میں پہلے کارڈ میں لکھ چکا ہوں۔ بھیج دینا باقی اگر ضرورت ہوگی تو میں بذریعہ تار منگوا لوں گا۔ ہاں فیض عام پریس والوں سے کہنا کہ ذرا صبر کریں۔ میں عنقریب ان کا حساب کرکے بھیجوں گا۔ فقط:
حسرت موہانی للت پور ۱۰ مئی ۱۹۱۶ء

بنام نشاط النساء بیگم

بسم اللہ

السلام علیکم: آج بھی تمہارا خط نوشتہ ۱۰ مئی پہنچا گورنمنٹ کا حکم جب تک نہ آیا تھا۔ اس وقت تک میں نے خط نہ لکھنے کا عہد کیا تھا مگر اب تو حکم آگیا ہے اس لئے اب کوئی پابندی نہیں ہے میں روزانہ خط لکھوں گا بغیر کسی کو دکھائے ہوئے۔
احکام نظر بندی کی تعمیل اسی وقت تک نہ میں نے کی ہے اور نہ کروں گا ڈاکٹر ناظر الدین نے تار کے جواب میں لکھا ہے کہ اگر فیس و خرچ پیشگی دو تو آؤں۔ یہ بھی اچھا ہے میں ان کا تار، اگر للت پور مقدمہ ہوا۔ تو کوشش کروں گا کہ یہاں مجھ کو قانونی مدد نہیں مل سکتی اس لئے مقدمہ علی گڑھ کو منتقل کیا جائے بیرسٹر ظہور احمد صاحب الہ آباد میں نہیں۔ اس لئے ان کے بجائی ایڈیٹر مساوات نے تار کا جواب دیا ہے کہ جب وہ آئیں گے تب بھیجوں گا خواجہ مجید

کا کوئی جواب نہیں آیا۔ بہر حال کل یعنی سنیچر کو میں گورنمنٹ کو اپنی آخری تحریر بھیجوں گا کہ میں علی گڑھ میں نظر بندی منظور کر سکتا ہوں بشرطیکہ میرے سر کوئی الزام نہ لگایا جائے اور مجھ کو بدستور اپنی روزی خود پیدا کرنے کی اجازت ہو نیز آزادی کے سلب کرنے کا یک مشت معاوضہ اس قدر دیا جائے کہ میں اپنا قرض ادا کر سکوں اگر یہ منظور ہوگا تو خیر ورنہ پھر مقدمہ یقینی ہے غالباً ایک ہفتہ میں۔

خطوط تمہارے سب پہنچے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے انشاء اللہ تعالیٰ مجھ کو کامیابی ہوگی۔ بدایوں کے وعظ کا قصہ سب غلط ہے لوگوں نے افواہ اڑا دی ہے۔ وظیفہ عبداللہ شاہ صاحب کا بھی پڑھوں گا ان کو میرا سلام کہہ بھیجنا اشفاق علی صاحب سے کہنا کہ آپ کے ذمہ عللہ روپے تھے جن میں سے عللہ میں بمبئی جاتے وقت نقد لے گیا تھا۔ للعہ باقی ہیں ان کا حساب کتاب میں درج ہے دکھا دینا۔ باقی حالات بدستور ہیں۔ کھانا یہاں ایک خانساماں ہے وہ پکا دیتا ہے۔ ۵/ روز دیتا ہوں۔ فقط!

حسرت للت پور ۱۲ مئی ۱۹۱۶ء

بنام نشاط النساء بیگم

بسم اللہ

السلام علیکم۔ کارڈ نوشتہ ۱۱ مئی پہنچا جواب اسی وقت لکھ رہا ہوں تاکہ ۹ بجے صبح کی ڈاک میں نکل جائے اور کل ہی تم کو پہنچ جائے میں نے آج ۸۸ لفظوں کا ایک اور تار لیفٹیننٹ گورنر صاحب کو بھیجا ہے یہ آخری ترکیب ہے اگر اس کو انہوں نے منظور کر لیا تو خیر ورنہ پرسوں یعنی ۱۵ مئی ۱۹۱۶ء کو ۱۱ بجے دن کے میرے خلاف مقدمہ کی کارروائی یہاں سب ڈویژنل آفیسر کے اجلاس میں شروع ہو جائے گی پس اس کے لئے تیار ہوں۔ سب باتیں اور اعتراض وغیرہ سوچ لئے ہیں انشاء اللہ تعالیٰ مجھے کامیابی ہوگی مگر ایک اور بھی شخص مثل بیرسٹر کے ہوتا تو اچھا تھا۔ یہ خط خواجہ مجید صاحب کو پہنچا دینا کہ وہ اگر جا سکیں

تو ۱۲ بجے کی گاڑی میں روانہ ہو کر براہ متھرا فاسٹ لیسنجر میں یہاں ۸ بجے دن کے یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اگر نہ آئیں تو خیر کچھ مضائقہ نہیں ہے میں خود ہی پیروی کر لوں گا۔

کاغذ ۴۴ر فی پونڈ کے حساب سے دینا بشرطیکہ دام کل نقد ملیں۔ گبرون سب اور دھوتیاں سب اگر تھوک بک سکیں تو بیچ دو مگر دوکان بدستور قائم رہنا چاہیے باقی سب حالات بدستور ہیں۔ وظیفے دونوں پہنچے۔ پڑھتا ہوں تمہارے سب خطوط مجھ کو ملے ہیں۔ فقط!

حسرت۔ للت پور۔ ۱۳ رمئی ۱۹۱۶ء

بنام نشاط النسا بیگم

بسم اللہ

میں کل مفصل خط لکھ چکا ہوں آج بھی لکھتا ہوں ممکن ہے کہ یہ خط بھی تم کو کل ہی مل جائے اس وقت مقدمہ میرے موافق ہے انشاء اللہ تعالیٰ برابر کامیابی ہو گی اچھا ہوا کہ کوئی نہ آیا، ورنہ مفت میں احسان ہوتا اور نتیجہ کچھ نہ ہوتا۔

مسلمان ملا۔ مگر شرق اور قیصر ہند نہیں ملے معلوم نہیں کیا سبب ہوا۔ ابھی تار کا جواب نہیں آیا۔ مگر مجسٹریٹ کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غالباً گورنمنٹ مجھے نہ کچھ رعایت ضرور کرے گی۔ ورنہ ہمارا کچھ نقصان نہیں ہے ان ہی کو پریشانی ہو گی۔

مال تھوک ان کو دے دو گبرون کے تھان۔ متفرق گبرون کے تھانوں پر قیمت اس طرح لکھی ہے روپیہ، آنے، پیسے اس طرح لکھے ہیں۔ مثلاً ۴ر للعہ ۴۶۲ یعنی للعہ ۲۰۷ پیسے یہ قیمت خرید معہ نفع ار فی روپیہ ہے۔ اگر وہ اتنے میں نہ لیں تو ار فی روپیہ منافع کا اس میں سے اور کم کر دیں یعنی ۴ر للعہ والا تھان ۴ر للعہ میں لے سکتے ہیں علاوہ بریں فاضل بھائی کے یہاں کے تھان ہر قسم کی کمی کمی یعنی آٹھ آٹھ دس دس ہیں۔

ان کی قیمت یہ ہے ۵۹۰/ارعہ۔ ۳۴۰۰/ارعہ۔ ۱۱۰۱/۴ر عہ اس قیمت پر اگر لے لیں۔ تو

سب دے دینا۔ علاوہ بریں مارکینوں کے تھانوں پر بھی قیمت اسی حساب سے پڑتی ہے۔ ان کو بھی ا ر بلکہ ۲ ر فی روپیہ کم کر کے دے دینا۔ ابراہیم بھائی کو میں خط لکھ دوں گا۔ نیازؔ کا حساب مجھے صحیح یاد نہیں ہے جتنا دے دے لو بعد میں حساب کر کے لکھوں گا۔ محمود کے ذمہ ۓ زیادہ ہیں۔ ان سے ۓ لے لو باقی کا حساب میں آ کر کروں گا۔ فقط!

میں نے آج خطوط ڈاکٹر تیج بہادر سپرو، ظہورؔ احمد بیرسٹر کو لکھے ہیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو ان کے ذریعے ہائی کورٹ میں پیروی کروں گا......... کو بھی خط لکھا ہے۔ میں نے بہت بُرا بھلا لکھا ہے۔ فقط!

حسرتؔ۔ للت پور ۱۰ مئی ۱۹۱۶ء

بنام نشاط النسا بیگم

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

السلام علیکم: منی آرڈر اور خط پہنچا۔ آج میں نے ۓ بذریعہ منی آرڈر معہ درخواست نقل کاغذات، مسل مجسٹریٹ جھانسی کے نام بھیج دیئے ہیں۔ پانچ چھ روز میں نقلیں آ جائیں گی۔ تمہارے پاس جن جن کاغذات کی نقلیں ہیں۔ وہ تم بالا بالا جو بیرسٹر مقرر ہو اس کو بھیج دینا۔ میرے خیال میں ڈاکٹر سلیمان کو بھیج دو۔ کیوں کہ ظہورؔ احمد کے پاس پہلے ہی سے موجود ہیں یعنی (فیصلہ (؟) تجویز مجسٹریٹ، نقل اعتراضات اظہار وجوہ فیصلہ جج کی نقل مجھ کو ملی۔ بہت کمزور فیصلہ لکھا ہے ـــــــ انشاء اللہ تعالیٰ ہائیکورٹ میں کامیابی ہو گی۔

روزے کی نیت میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ کوئی تکلیف نہیں ہے درد بھی خفیف ہے۔ اُمید ہے کہ یہ خفیف بھی دو چار روز میں جاتی رہے گی۔ تم فکر نہ کرو میں نے جھانسی سے ایک خط ۲ جولائی کو اور لکھا تھا جس میں ایک غزل "وہ تیرا غرور تیرا" تھی۔ مجھے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تم کو نہیں ملا۔ اس میں بذریعہ تار روپیوں کا بھی ذکر تھا۔ خیر اب وہ غزل اور غزلیں پھر کبھی لکھ دوں گا انتقال ابھی تک نہیں آئے۔ آزاد صاحب کو لکھ دینا کہ اگر وہ کسی بیرسٹر کو بھیجیں۔ تو

اسے ہدایت کردیں کہ قبل مقدمہ وہ مجھ سے جیل میں آکر ضرور مل لیں تاکہ میں اسے تمام امور سمجھا دوں، ورنہ اس کا آنا بیکار ہوگا۔

لال سنگھاڑے کی لنگیاں جو چار چار ایک ہیں ان کے ملنے کا پتہ یہ ہے رتن چند جیٹھ مل تاجر پارچہ مسکتی مارکٹ، احمد آباد

ان کی قیمت فی چار شاید ۱۲؍ ہے۔ وہ فی عدد ۸؍ کے حساب سے فروخت ہوتی ھیں۔

ایک خط ناصر کو لکھنا کہ مجھے وہ فلسفۂ جذبات، فلسفۂ اجتماع و ابومسلم خراسانی یعنی سلطان حیدر جوش کا نیا ناول یہیں الہ آباد میں بھیج دیں بذریعہ رجسٹری شدہ پیکٹ میں ان پر ریویو لکھوں گا۔ اور ایک خط واحد یار خان اکبر آبادی بی اے ایڈیٹر نئی روشنی الہ آباد کو لکھ دو۔ میرا سلام لکھنا اور لکھنا کہ آپ اپنا اخبار روزانہ الہ آباد ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا کریں۔ اور ہوسکے تو تبادلے کے دیگر روزانہ اردو اخبارات بھی خود دیکھنے کے بعد مجھ کو بھیج دیا کیجئے۔ میں دیکھ واپس کردیا کروں گا۔ ایک خط سید سلیمان صاحب ندوی شبلی منزل اعظم گڑھ کو لکھ دو میرا بہت بہت سلام لکھنا اور لکھنا کہ اپنا نیا رسالہ معارف میرے نام ضرور روانہ کریں۔ یہ بھی دریافت کرنا کہ آیا آپ کے پاس آفتاب عالمتاب موجود ہے ضرور لکھئے

فقط

حسرت۔ الہ آباد ڈسٹرکٹ جیل ۱۳؍ جولائی ۱۹۱۶ء

بنام نشاط النسا بیگم

بسم اللہ

السلام علیکم، ۱۰؍ پہنچ گئے ہیں۔ مگر میں نے ابھی تک منگائے نہیں ھیں منگا لوں گا۔ آئندہ سے منی آرڈر ناصر کے نام سے روانہ کیا کرو۔ اپنا نام نہ درج کیا کرو۔

فقط

حسرت ۔ الہ آباد
ڈسٹرکٹ جیل ۸؍ نومبر ۱۹۱۶ء

استقلال کا مظاہرہ

بیگم حسرت کے استقلال سے یہ اندازہ نہیں لگانا چاہیئے کہ انہیں ان شدید مظالم کا احساس نہ تھا جو مولانا پر توڑے جاتے تھے ذیل میں بیگم کا وہ خط درج ذیل کیا جاتا ہے۔ جو انہوں نے ۲۸ اپریل ۱۹۱۶ء کو لکھا تھا۔

"آج کارڈ ۲۲ کا لکھا ہوا، اور لفافہ بھی ساتھ ملا۔ تمہارے استقلال کی حد ہو گئی۔ میں تعریف کرتی ہوں۔ مگر افسوس کہ تم سے علیحدہ رہنے کا خیال نہایت سخت تکلیف دہ ہے، ناقابلِ برداشت ہے۔ خدا تمہاری مدد کرے اور تم کو کامیاب کرے میں نے پرسوں دو خط کلکٹر کے نام بہت سخت لکھے تھے۔ کیونکہ مجھے اس وقت تک کوئی خط نہ ملا تھا، پریشان تھی۔ ظلم کا نتیجہ خراب ہوتا ہے۔ وغیرہ اور اس کے علاوہ کلام کا (ابوالکلام آزاد) حضرت کا (مولانا عبدالباریؒ) محمد علی کا (مولانا محمد علی)، ایڈیٹر ہندوستانی اور کئی لوگوں کے خط آئے باری میاں اور کلام نے مخالفت کی ہے اور خصوصاً کلام نے مخالفت کی ہے۔ کل کلام کا ایک رجسٹری خط اور آیا۔ آج جواب لکھوں گی۔ تمہارے خط کی نقل بھی کروں گی اور ہندوستانی کو بھی لکھوں گی۔

کلکٹر کے ذریعہ تم کو خط مل گیا ہوگا اور کل بھی ایک خط رجسٹری شدہ پہنچے گا۔ خدا کرے تمہارے حسبِ منشاء کارروائی ہو۔ اگر خدانخواستہ قید ہوئی اور خدا نہ کرے۔ خیال غالب یہی ہے۔ کیونکہ تم اپنی دھن کے پکے ہو اور واقعی حق سے اجتناب نہ کرنا ایک سچے مسلمان کے لئے ناگزیر ہے ظلم خدا کو ہرگز پسند نہیں وہ اس کا انتقام ضرور لے گا۔ مگر ہم کو کیا۔ ہماری چند روزہ زندگی تو گورنمنٹ کی مہربانیوں کے نذر ہو گئی۔ خیر..... دنیا میں انصاف نہیں رہا نہ سہی۔ خدا منصف ہے۔ وہ سب کے ساتھ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس کی مہربانی اور مدد پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ جو ظلم کرتا ہے وہ اپنی تلوار سے اپنا زیاں کرتا ہے۔ ہم کو خوش ہونا چاہیئے کہ ہمارے ساتھ ظلم ہوتا ہے مگر ہم ظلم نہیں کرتے۔ خدا کرے تمہارا مزاج بخیر ہو۔

نعیمہ دوا پیتی ہے اور کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم شہر میں اب کس طرح

کہاں رہتے ہو، کیا کھاتے ہو، کیا پڑھتے ہو۔ روپیہ کل ۵۰ روانہ کر دیئے۔ یہاں جو اخبار آئے۔ مثلاً وکیل شرق گورکھپور۔ اس میں ہمدردی کے نوٹ ہیں مگر ملت پیپر کا جانا کس اخبار کو نہیں معلوم۔

اچھا خدا حافظ۔ خط روز لکھا کرو۔ میں اب کلام کو لکھ رہی ہوں۔ حضرت کو بھی لکھوں گی۔

خواجہ کے پاس روز پہنچتی ہوں۔ انہوں نے شام کو ملنے کو کہلا دیا تھا مگر شام کو نہیں ملنے۔ میں نے خط لکھا اس کا جواب نہ دیا۔ ڈرتے ہیں سب۔ خدا تمہاری ہمت کو بلند کرے اور کامیاب کرے آمین!

یہ سب کچھ ہے۔ مگر قید اور تمہاری تکلیف کا خیال کیسا جانگسل ہے خدا تم کو اپنی حفاظت میں رکھے اور تمہارے دشمنوں کو پامال کرے خواہ وہ کوئی بھی ہو

حضرت کا ارشاد ہے کہ شرعاً جو آسان ہو اس کو اختیار کرو۔ چنانچہ قید سے نظر بندی مفید ہے لیکن تمہارے اس بڑھے ہوئے جوش کو جو سراسر حق بجانب اور سچائی پر مبنی ہے۔ کون روک سکتا ہے۔ خدا مدد کرے گا اور یقیناً حق کی فتح ہوگی خدا تم کو اور مجھ کو صبر اور تحمل کی قوت عطا فرمائے۔

بے چینی

بیگم صاحبہ جب مولانا کی جانب سے کوئی اطلاع نہیں ملتی تو بے چین ہو جاتی تھیں اور اس عالم میں عام طور پر اپنے پیر مولانا عبدالباری کو مخاطب کیا کرتی تھیں۔ خط فرنگی وہ خط جو بیگم صاحبہ نے اس ضمن مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو لکھا تھا خط پر ۱۵ راگست ۱۹۱۷ء کی تاریخ درج ہے۔

تسلیم فدویانہ قبول فرمائیں۔ آج حضرت صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ آپ کی زیارت سے مسرت اندوز ہوئے۔ کمال اطمینان ہوا۔ مگر انہوں نے اپنی کیفیت نہیں لکھی کہ ان کی صحت کا کیا حال ہے اُمید ہے آپ مطلع کریں گے۔ ان کی حالت خدانخواستہ خطرناک و تشویشناک تو نہیں ہے کمزور یا دُبلے تو نہیں ہو گئے۔ دُعا فرمائیے کہ دُشمن پامال اور حامیانِ حق و صداقت جلد مراد کو پہنچیں دالسی ھی

دعاؤں کا ثمرہ آج ہماری آزادی کی صورت میں موجود ہے) آج ان کا ایک مختصر عریضہ بھی ملفوف ہے انہوں نے دو کتابیں طلب کی ہیں۔ بحر ذخار اور دلائل الخیرات امید ہے آپ جیل بھجوا دیں گے اور جناب قطب میاں کو بھی انہوں نے سلام لکھا ہے۔ اور یہ کہ ایک جلد دیوان مغربی ایک عراقی ایک لالٹین ہے کر کسی شخص کے ہاتھ جیل میں دستی بھجوا دیجئے۔ جیل کے پھاٹک پر یہ تینوں چیزیں جمع کرا دی جائیں گی بذریعہ جیلر ان کو مل جائیں گی قیمت جو کچھ ہو اس سے مطلع کیجئے۔ میں بذریعہ منی آرڈر روانہ کردوں گی۔

ایک اور امتحان

یوں تو محترمہ نشاط النساء بیگم کی ساری زندگی کرب و بلا میں گذری۔ مگر ابھی قدرت کو ان سے ایک اور امتحان لینا تھا اور وہ ان کی اکلوتی اور چہیتی صاحبزادی نعیمہ بیگم کی شادی تھی۔ دوسری قید سے رہائی اور کانپور میں منتقلی کے بعد ہی شادی کے اہتمام کا آغاز کر دیا گیا اور تمام اعزا کے زور دینے پر یہ بھی طے کر دیا گیا تھا کہ شادی موہان میں ہوگی۔ اب اس شادی کا تذکرہ خود صاحبزادی کی زبانی سن لیجئے۔ لکھتی ہیں کہ احمد آباد سے واپس آتے ہی اجہاں مولانا آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت اور صدارت کے لئے گئے تھے) میری شادی کی تیاریاں شروع کر دیں چونکہ سارے خاندان والوں کا اصرار تھا کہ شادی موہان میں ہو لہٰذا مولانا نے ہم لوگوں کو موہان بھیج دیا۔ حیدرآباد۔ فتحپور اور دوسرے مقامات سے اعزا بھی وہاں پہنچ گئے۔ مولانا بھی ابتدائی انتظامات کے لئے موہان آئے اور دو چار روز رہنے کے بعد ضروری سامان لینے کے لئے کانپور گئے۔ یہ غالباً ۱۱ر اپریل ۱۹۲۳ء کی بات تھی سارے ملک میں عدم تعاون کی تحریک چل رہی تھی مولانا دوپہر سے قبل اپنے سودیشی اسٹور پہنچے اور ابھی کانپور پہنچے ہوئے چند گھنٹہ ہی ہوئے تھے۔ کہ پولیس نے یکایک چھاپہ مارا اور انہیں گرفتار کر لیا۔ مولانا جو ہر وقت گرفتاری کے لئے تیار رہتے تھے بالکل ہراساں نہ ہوتے۔ البتہ انہیں اس بات کا ضرور

دکھ ہوا۔ کہ وہ اپنی واحد اولاد کی شادی میں شرکت سے محروم کر دیئے گئے
پولیس والوں نے انہیں وارنٹ دکھایا اور چلنے کو کہا۔ اس پر مولانا نے کہا
کہ میں آپ لوگوں سے عدم تعاون کروں گا۔ آپ چاہیں تو مجھے اٹھا کر لیجائیں
چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور پولیس والے انہیں اٹھا کرلے گئے اور ان کو ریل
میں بٹھا کر لے گئے۔ مولانا نے گرفتاری کے موقعہ پر عدم تعاون کا ایک ایسا
منظر پیش کیا جس کی نظیر برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مولانا نے ہر
چیز سے انکار کیا جس سے ذرّہ برابر بھی تعاون کی بو آتی ہو یہاں تک کہ
انہوں نے چلنے پھرنے سے انکار کر دیا۔ پلیٹ فارم پر انہیں سردار علی
صابری ملے تو ان کے ذریعہ انہوں نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو یہ
پیغام کہلا بھیجا کہ آپ کل جا کر موہان میں میری جانب سے لڑکی کا عقد
کر دیں اور نکاح پڑھ دیں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میرے نہ ہونے سے
یہ کام رک جائے۔ والدہ محترمہ نے بھی اس بات سے اتفاق کیا اور دوسرے
دن ۱۸ اپریل ۱۹۲۲ء کو میری شادی ہو گئی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی
لکھنؤ سے تشریف لائے اور انہوں نے میرا نکاح پڑھایا۔" اب اس واقعہ کی
مزید تفصیل مولانا کے داماد اور محترمہ نعیمہ بیگم کے شوہر سید عبدالسمیع موہانی سے سنیئے وہ لکھتے ہیں کہ مولانا
خلافت سودیشی اسٹور کانپور سے گرفتار کر لیا گیا مولانا کچھ کپڑے اور سامان
لے جانے کے لئے اسی روز موہان سے کانپور پہنچے تھے۔ مولانا خلافت اسٹور
میں تشریف فرما تھے کہ گرفتار کرنے والے ان کے پاس پہنچے اور انہیں وارنٹ
گرفتاری دکھایا۔ مولانا نے اس کو دیکھ لیا اور بیٹھے رہے اس پر پولیس والوں نے
کہا کہ تشریف لے چلئے۔ جس پر مولانا نے کہا کہ "کیا خوب" اور بدستور بیٹھے رہے
اس پر پولیس والوں نے پھر کہا اگر آپ خود تشریف نہ لے چلیں گے تو ہم کو
جو حکم ملا ہے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ مولانا نے ان سے فرمایا کہ آپ جو
چاہیں کر سکتے ہیں۔ مگر مجھ پر نہ اس وارنٹ کی تعمیل ضروری ہے اور نہ
میں ایسا کروں گا۔ مجبور ہو کر ان لوگوں نے مولانا کو اسٹور سے ہاتھوں میں
اٹھا کر موٹر میں بٹھایا اور کانپور پرانے اسٹیشن پر جس کو اس وقت ای۔ آئی۔ آر

اسٹیشن کہا جاتا تھا لے گئے اور پھر انہی لوگوں نے موٹر سے اٹھا کر پلیٹ فارم پر بٹھایا اور ریل آنے پر اسی طرح ریل میں بٹھا دیا اور اس طرح انہیں کانپور سے احمد آباد لے گئے جہاں ان پر دفعہ ۱۲۴ الف اور دفعہ ۱۲۱ کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ جناب ضیاء الدین برنی جن کے مضمون کا ایک حصہ بیگم حسرت کی غیر معمولی جرأت کے سلسلہ میں پیش کیا جا چکا ہے اس مضمون میں نعیمہ بیگم کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "انہوں نے اپنی اکلوتی صاحبزادی کی شادی مقررہ تاریخ کو کر دی تھی حالانکہ اس سے قبل مولانا گرفتار کر لئے گئے تھے۔ ان کی گرفتاری ایک وارنٹ کے تحت عمل میں آئی تھی جسے حکومت بمبئی نے جاری کیا تھا۔ میں اس زمانہ میں حکومت بمبئی سے وابستہ تھا اور ان کی تقریر اور گرفتاری کے جملہ کاغذات میری تحویل میں تھے۔ ان کی تقریر کا ترجمہ بھی میں نے ہی کیا تھا۔ لیکن میں بیگم حسرت کو ہونے والی گرفتاری کی اطلاع کیسے دے سکتا تھا اور انہیں کیونکر لکھ سکتا تھا کہ وہ اپنی صاحبزادی کی شادی مقررہ تاریخ سے پہلے کر دیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں ان کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جس سے میری سرکاری پوزیشن خطرہ میں پڑ جائے۔"

شادی کے احمد آباد روانگی

بہر حال شادی کے بعد بیگم حسرت اپنی نو بیاہتا صاحبزادی اور نئے نویلے داماد کو لے کر موہان سے احمد آباد پہنچ گئیں اور مسٹر گاندھی کے آشرم کے ایک مکان میں جس میں مسٹر گاندھی کے ایک افریقی مسلمان دوست رہتے تھے ٹھہرایا گیا۔ یہ گرفتاری آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ خطبۂ صدارت کے سلسلہ میں تھی جس کا ذکر مولانا کی سیاسی زندگی میں رہے گا، مولانا عبد السمیع موہانی (داماد) فرماتے ہیں کہ "احمد آباد پہنچ کر جب ہم لوگ مولانا سے ملنے چلے گئے۔ تو جیلر نے پہلے ہی دن ان سے ملنے کی اجازت دے دی مولانا نے چونکہ کام کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لئے انہیں قید تنہائی میں رکھا گیا تھا ہم لوگوں کو وہیں لے جایا گیا اور تقریباً ۲۰ منٹ ملاقات رہی۔ دوسرے روز جب ہم پھر ان

ملنے کے لئے جیل پہنچے تو جیلر نے ان سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔ اس پر بیگم حسرت سخت ناراض ہوئیں اور جیلر سے بڑی حجت بازی ہوتی رہی۔ مگر اپنی ضد پر قائم رہا۔ اس لئے مجبور ہو کر بیگم حسرت نے ایک پرچہ لکھ کر دیا کہ مولانا کو پہنچا دیا جائے۔ جس میں انہوں نے لکھا کہ ہم مقدمہ کے سلسلے میں ملنے آئے تھے مگر اجازت نہ ملنے کے سبب نہ مل سکے کل پھر آئیں گے۔ جیلر نے وہ پرچہ مولانا کو نہ بھیجا اور دوسرے روز وہ سپرنٹنڈنٹ جیل کے آگے پیش کر دیا گیا سپرنٹنڈنٹ نے جب وہ اردو کا پرچہ پڑھوا کر سنا اور مقدمہ کا ذکر اس میں جو درج تھا۔ وہ اس کو معلوم ہوا تو اس پر لکھ دیا کہ مقدمہ کی وجہ سے ملنے دیا جائے۔ ہم جب دوسرے دن وہاں پہنچے تو ہمارے پہنچتے ہی پہلا پھاٹک کھلوا دیا گیا اور اس کے بعد پھاٹک بند کر کے دوسرا پھاٹک کھلوا دیا گیا اور وہاں سے گذر کر ہم پھر اسی تنہائی والے وارڈ میں پہنچائے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی نائب جیلر نے سپرنٹنڈنٹ جیل کے سامنے واقعہ مولانا کو سنایا اور طے پایا کہ ہم روز مولانا سے ملتے رہیں چنانچہ ایک ہفتہ برابر جب تک ہمارا قیام رہا۔ ہم روزانہ مولانا سے ملنے جیل جاتے رہے۔ مقدمہ کی تیاری کے لئے سپرنٹنڈنٹ جیل نے اس کی بھی اجازت دیدی تھی کہ مولانا دوسرے قیدیوں کے ساتھ مل کر مقدمہ کی تیاری کر سکتے ہیں اس لئے ہمارے وہاں پہنچتے ہی مولانا حسین احمد مدنی، مسٹر شعیب قریشی اور دیگر سب حضرات مولانا کے کمرے میں جمع ہو جاتے اور بیگم صاحبہ جو ناشتہ تیار کر کے لے جاتیں وہ سب حضرات مل کر کھاتے۔ راقم الحروف کو مولانا حسین احمد سے نیاز مولانا کی اسی قیدِ تنہائی کے کمرہ میں حاصل ہوا تھا"

جناب عبد السمیع لضرت موہانی آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "اس زمانہ میں احمد آباد جیل کو سابرمتی جیل کہا جاتا تھا اور اس وقت اس میں مسٹر گاندھی اور دوسرے بہت سے لیڈران قوم قید تھے یہ جیل اس زمانہ میں احمد آباد شہر سے ۴ میل کے فاصلہ پر تھا اور مولانا اس میں کئی ماہ بند رہے۔ کئی ماہ بعد مولانا کو بمبئی جا کر اپنے مقدمہ کی پیروی کی اجازت مل گئی تو بیگم حسرت بھی ان کے ہمراہ احمد آباد سے بمبئی گئیں۔ اس کی تفصیل پھر انہی کی زبانی سنئے "جب

بمبئی کا جانا مولانا کا طے ہو گیا تو سپرنٹنڈنٹ جیل نے مولانا سے دریافت کیا کہ آپ کا سفر کس طرح ہو گا۔ مولانا نے پہلے تو اس کا جواب نہیں دیا لیکن جب آپ سے کہا گیا کہ اگر بہت سے لوگوں کو آپ کی روانگی کا علم ہو تو آپ کے لے جانے کے لئے پورا پورا انتظام کیا جائے ورنہ خاموشی سے ایک واحد افسر ساتھ کر دیا جائے تو مولانا نے جواب دیا کہ میں نے کسی کو اپنے جانے کی اطلاع نہیں دی لیکن اگر دوران سفر کوئی مجھ سے بات کرنا چاہے تو پھر مجھے بھی مجبوراً گفتگو کرنی پڑے گی۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ جیل نے ایسی صورت کر دی کہ ان کے ساتھ احمد آباد اسٹیشن سے صرف ایک افسر بمبئی تک گیا۔ البتہ احمد آباد کے اسٹیشن پر پولیس کا بہت بڑا مجمع تھا اور تمام حکام جمع تھے۔ بی۔ بی۔ اینڈ سی۔ آئی۔ آر کا ایک کمپارٹمنٹ ریزرو کرا دیا گیا تھا۔ جس میں مولانا کو گاڑی چھوٹنے سے تھوڑی دیر قبل لاکر سوار کرا دیا گیا صرف بیگم حسرت کو ان کے ہمراہ سفر کرنے کی اجازت دی گئی۔ مولانا بیگم صاحبہ اور ایک پولیس انسپکٹر اس کمپارٹمنٹ میں اور ہم لوگ (یعنی داماد اور بیٹی) دوسرے ڈبہ میں روانہ ہوئے ایک ہی اسٹیشن بعد انسپکٹر صاحب نے فرمایا کہ اب مجھے بہت نیند آرہی ہے اور میں تو ڈبہ میں جا کر سوتا ہوں۔ آپ سب اس ڈبہ میں سفر کریں۔ اس طرح راقم الحروف اور میری اہلیہ بھی دوسرے ڈبہ سے آکر اسی کمپارٹمنٹ میں آکر بیٹھ گئے تھوڑی دیر میں میں تو اوپر کی سیٹ پر جا کر لیٹ گیا اور مجھے نیند آگئی۔ صبح سویرے جب آنکھ کھلی تو گاڑی بمبئی کے قریب پہنچ گئی تھی۔ مولانا کو تو اسٹیشن سے جیل لے جایا گیا اور ہم لوگ اسٹیشن سے خلافت کمیٹی پہنچے اور وہیں مقیم ہوئے ہائی کورٹ میں مقدمہ کی سماعت کے بعد مولانا کو پھر احمد آباد لے جایا گیا اور ہم لوگ واپس کانپور روانہ ہو گئے۔" مولانا حضرت موہانی لکھتے ہیں کہ احمد آباد جیل میں شروع کے چند مہینے مولانا پر بہت تکلیف کے گذرے اس لئے قید تنہائی تھی اور جیل کے اسٹاف کی سخت نگرانی بھی تھی لیکن مولانا اس کے باوجود اپنی خیریت اور جیل کا تازہ کلام برابر بیگم صاحبہ کو بھجواتے رہے۔ جو ان کی اشاعت کے بندوبست میں مشغول رہتی تھیں۔ چند ماہ بعد مولانا کو احمد آباد سے پونا جیل منتقل کر دیا گیا تو بیگم صاحبہ بھی کانپور سے وہاں منتقل ہو گئیں۔ اس کا حال بھی مولانا کے داماد

حسرت موہانی سے ملنے۔
تحریر فرماتے ہیں کہ۔ پونا جیل میں کچھ عرصہ گذرنے کے بعد ان کو اخبارات کے ملنے میں دشواریاں ہونے لگیں اور دوسرے شدائد میں اضافہ ہوا۔ تو ان کی خواہش پر ہم لوگ یعنی راقم الحروف۔ خورشید بیگم (بیگم حسرت موہانی) اور میری اہلیہ پونا پہنچے اور وسط ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۳ء تک ہم لوگوں کا قیام پونا میں رہا۔ پونا پہنچنے پر ہمارا قیام کچھ عرصہ تو خلافت کمیٹی پونا کے دفتر میں رہا پھر بعد میں ہم سیٹھ چھوٹانی صدر خلافت کمیٹی بمبئی کے بنگلہ میں منتقل ہو گئے۔ جو کہ جیل سے شہر کی نسبت زیادہ قریب تھا اور وہاں سے مولانا کو برابر اخبارات پہنچاتے رہے۔ پونا جیل جس کو یروڈا جیل کہا جاتا ہے۔ ایک پہاڑی پر واقع ہے جس کے سبب وہاں آمد و رفت کے لئے سواری کا خاص انتظام کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانہ یعنی ۱۹۲۳ء میں وہاں کے شہری قواعد کے مطابق ایک تانگہ میں دو سواریاں بیٹھ سکتی تھیں جس کے سبب ہم جب بھی مولانا سے ملنے جیل جایا کرتے تھے تو ہم کو دو تانگے کرنے پڑتے تھے اس لئے ہم تین سواریاں ہوتی تھیں اور تانگہ والا ایک تانگہ میں ہم کو لے جانے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا۔ بجی مرحومہ (بیگم حسرت موہانی) تقریباً دوسرے روز کئی اخبار مولانا کو جیل بھجوا دیا کرتی تھیں گورنمنٹ کی سخت پابندی کہ کاغذ کا ایک پرزہ بھی مولانا تک نہ پہنچ سکے۔ اس پر بھی انہیں اخبارات برابر پہنچتے رہے کیونکہ جیل کے اکثر کار پردازوں کو اس کا علم تھا کہ مولانا کو اخبارات بے حد عزیز ہیں اس لئے وہ اخبارات پہنچانے میں برابر تعاون کرتے تھے اخبار پہنچانے کے بہت سے طریقے تھے جن پر مختلف اوقات میں عمل ہوتا رہا جس طریقہ سے اخبارات ان تک پہنچتے تھے اسی طریقہ سے ان کا کلام ہم لوگوں تک پہنچتا رہتا تھا اور بجی مرحومہ ان کو مختلف رسائل میں شائع کرنے کا بندوبست کرتی رہتی تھیں اور پھر انہیں ترتیب دیکر خود بھی شائع کرتی رہتی تھیں۔" مولانا کو جب اخبارات کے ذریعہ معلوم ہوا کہ دسمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا ایک اجلاس دلی میں ہو رہا ہے تو بیگم صاحبہ کو ہدایت کی کہ وہ دلی جائیں اور اس میں شریک ہوں۔ چنانچہ بجی مرحومہ، راقم الحروف اور میری اہلیہ مع صاحبزادہ میاں رضوان کے پونا سے دلی پہنچے اور کانگریس کے خاص اجلاس میں شریک ہوئے۔ یہ اجلاس مولانا ابوالکلام

آزاد کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ دلی میں ہم لوگوں کا قیام ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر تھا۔ اس اجلاس سے صرف چند یوم قبل مولانا محمد علی جوہر بھی آزاد ہو کر دلی پہنچے تھے اور ان کا قیام بھی ڈاکٹر انصاری کے یہاں تھا کوٹھی کے سامنے والے بنگلہ میں پنڈت موتی لال نہرو اپنی اہلیہ اور صاحب زادے جواہر لال نہرو کے ہمراہ مقیم تھے مولانا کو جو کچھ خیالات پیش کرنے تھے وہ انہوں نے تحریراً بیگم صاحبہ کے حوالہ کر دیئے جنہیں بچی مرحومہ نے کانگریس کے اجلاس میں انہیں پڑھ کر سنایا تھا۔ اجلاس سے پونا واپسی کے بعد ہم نے پھر مولانا کو اخبارات کی ترسیل کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس زمانہ میں مولانا کو کچھ ادبی کتابوں کی ضرورت پیش آئی۔ جن کو مہیا کرنے کا سلسلہ میں بچی مرحومہ کو بڑی کدو کاوش کرنی پڑی۔ لیکن انہوں نے کسی نہ کسی طرح انکو فراہم کیں اور جیل میں مولانا کو بھجوایا۔ مولانا کے دواوین حصہ ہفتم، ہشتم، نہم اور دہم کی تکمیل اسی مدت میں ہوئی۔ مولانا جیل سے برابر غزلیں بھیجتے رہتے تھے اور بیگم حسرت انہیں ترتیب دیکر نہ صرف یہ کہ انہیں اشاعت کے لئے مختلف رسائل و جرائد تک بھیجتی رہتی تھیں بلکہ انہیں کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام بھی فرماتی رہتی تھیں۔ وہ غزلیں ترتیب دیکر میرے حوالہ کر دیتی تھیں اور میں انہیں نقل کر کے حسب ہدایت روانہ کرتا رہتا تھا اسی طرح خطوط کے جوابات بھی میرے ذمہ تھے۔

پونا جیل کا ایک واقعہ

مولانا نصرت موہانی نے اس زمانہ میں جیل کے ایک اور واقعہ کا بھی ذکر کیا جسے یہاں پر اس لئے درج کرنا ضروری ہے کہ بیگم حسرت نے اس سلسلہ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ مولانا نصرت موہانی لکھتے ہیں کہ "قواعد جیل کے خلاف عمل کرنے کے سلسلہ میں حکومت نے مولانا پر ایک مقدمہ چلایا جس میں جیل کے ایک شخص کو بھی ملوث کیا گیا۔ جو بالکل بے قصور تھا۔ جس کی رو سے مولانا کے ساتھ اس کو بھی سزا دی گئی۔ بچی مرحومہ کو یہ شاق گزرا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے سیشن میں اپیل کی جو نامنظور ہوئی۔ اس لئے اس کی اپیل بمبئی ہائی کورٹ میں کی گئی جہاں سے وہ بری کر دیا گیا اس کے لئے مجھے برابر بمبئی جانا پڑتا تھا۔ جب وہ بری کر دیا گیا

تو اس کا اثر یہ بھی ہوا کہ مولانا کی میعاد قید میں کمی آ گئی یہ آخری مقدمہ مولانا پر جیل ہی میں چلا گیا۔ مولانا کو قید تنہائی میں رکھا گیا تھا اس لئے کہ وہ کام نہیں کرتے تھے۔ مقدمہ کے لئے جب ان کو جیل کے پھاٹک کی چھت پر طلب کیا گیا تو وہاں بھی آنے سے پہلے انہوں نے انکار کر دیا تھا اور خود اس کی پیروی اور سماعت کے لئے نہیں آئے۔ ان کے انکار پر پھر چھ آدمی ان کو اٹھا کر اوپر کے کمرہ میں جس میں مقدمہ چل رہا تھا روزانہ لاتے اور لے جاتے جیل کے مذکورہ بالا کمرے سے مولانا کا کمرہ صاف نظر آتا تھا۔ اس لئے کہ جب وہ ان کے لانے کے لئے کھولا جاتا تھا تو ہم لوگ مقدمہ کے کمرے سے یہ سب حال دیکھا کرتے تھے۔ آخری تاریخ کو جس روز مقدمہ کا فیصلہ سنانا تھا۔ اس روز پولیس وغیرہ کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے جس کو دیکھ کر بیگمی مرحومہ نے فرمایا تھا کہ اللہ خیر کرے آثار اچھے نہیں ہیں۔ حاکم وقت نے کہا کہ ہم آج آپ کے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیں گے تو اس پر مولانا نے کہا کہ میں نے شروع سے آخر تک اس مقدمہ کی کسی کارروائی میں حصہ نہیں لیا۔ اور نہ میں سننا چاہتا ہوں مگر اس پر بھی تھوڑی دیر کے بعد اس حاکم نے انگریزی میں فیصلہ کا آخری حصہ سنا دیا جس سے پتہ چلا کہ ۲/۱ سال کی مزید میعاد قید بڑھا دی گئی ہے اس روز تلاشی بھی بہت سخت لی گئی جب ہم تلاشی دیکر باہر آئے تو جیلر نے جو انگریز تھا اس نے پھر اشارے سے مجھے بلایا میں اس وقت ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا اس نے اسے بھی اتار کر دیکھا۔ تو اس پر بیگمی مرحومہ نے برجستہ کہا کہ اس میں بم ہے۔ اس پر وہ بڑی حیرت سے انکی طرف دیکھنے لگا۔ اور میں نے ٹوپی سر سے اتار لی۔ اس طرح تلاشی ختم ہو کر ہم کمرۂ عدالت میں پہنچ گئے۔"

مزاح کے واقعات

بیگم حسرت کی طبیعت میں بے حد مزاح تھا جس کا اشارہ مذکورہ واقعہ میں ملتا ہے اسی قسم کے ایک اور واقعہ کا تذکرہ جناب ضیاء الدین برنی نے بھی

کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پولیس تلاشی لینے کی غرض سے
ان کی قیام گاہ واقعہ علی گڑھ میں آئی۔ بیگم صاحبہ نے چپہ چپہ دکھایا۔ مگر ایک
مقفل صندوق کے بارے میں کہا کہ اسے ہاتھ نہ لگائیے گا اگر اندر کا بم پھٹ گیا
اور آپ لوگ ہلاک یا زخمی ہو گئے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہو گی پولیس
انسپکٹر نے سپاہی سے کہا کہ صندوق کھول کر دیکھو کہ اس میں کیا ہے۔ سپاہی تو
خود خوف زدہ تھا اس لئے اس نے اپنے افسر سے کہا کہ ذرا انتظار کر لیجئے
اس صندوق کو حسرت موہانی ہی سے کھلوائیں گے جب تھوڑی دیر بعد حسرت
آگئے تو ان سے کہا گیا کہ وہ اس صندوق کو کھولیں۔ جب صندوق کھولا گیا
تو معلوم ہوا کہ وہ اندر سے خالی تھا جب انہیں سارا واقعہ معلوم ہوا تو انہوں نے
ہنس کر کہا۔ کہ بیگم نے آپ سے مذاق کیا ہو گا۔"

مولانا نصرت موہانی نے آگے چل کر تحریر فرمایا کہ "اس روز ہمارے علاوہ بھی
بہت سے لوگ فیصلہ سننے کے لئے آئے تھے مگر ان میں سے چند لوگوں کو اجازت
ملی تھی اور باقی بے چارے جیل کے باہر ہی کھڑے رہے اور فیصلہ محفوظ ہو جانے
کے بعد واپس ہوئے۔ حکومت برطانیہ نے مولانا کو احمد آباد سے بمبئی اور بمبئی
سے پونا جیل اس لئے منتقل کیا کہ انہیں کسی جگہ اطمینان نصیب نہ ہو اور کانپور
سے جس قدر دور انہیں رکھا جائے بہتر ہے لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا
پونا جیل میں مولانا کی صحت نسبتاً دوسرے مقامات کے بہتر رہی۔" مولانا نصرت جیل
سے رہائی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ قواعد جیل کے لحاظ سے رہائی سے قبل
ہر قیدی سے دریافت کیا جاتا ہے کہ رہائی کے بعد کیا کرو گے تو مولانا نے فرمایا
کہ میں جیل سے رہائی کے بعد حکام جیل کے خلاف مقدمہ کروں گا مگر اس
حملہ کے ڈر سے انہیں کانپور لے جا کر رہا کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور انہیں اگست
۱۹۲۴ء میں رہا کر دیا گیا۔"

حسرت اور ہمت

بیگم حسرت کے پونا میں قیام کے بارے میں جناب ضیاء الدین برنی نے دو واقعات

کا اور تذکرہ کیا ہے۔ اِن کے مضمون کے یہ دو حصے یہاں درج کئے جاتے ہیں
جناب برنی فرماتے ہیں کہ "جس زمانہ میں حسرت یرودا جیل (پونا) میں قید تھے
بیگم حسرت اپنی صاحبزادی اور داماد کی معیت میں پونا تشریف لائیں۔ ان دنوں انکی
مالی حالت قدرے سقیم تھی اور جب پونا کے مسلمانوں کو یہ حقیقت معلوم ہوئی
تو انہوں نے مالی امداد کی پیش کش کی مگر غیور بیگم نے جواب میں کہا کہ اگر آپ
میرے خاوند کے مداح ہیں تو آپ کو چاہیے کہ ان کی کتابیں خریدیں۔ لیکن
میں روپیہ قبول کرنے سے معذور ہوں۔ وہ پونا میں جب تک ٹھہریں۔ خود
اپنے کھانے پینے کی کفیل رہیں اور اس بارے میں انھوں نے کسی کا احسان
لینا گوارا نہیں کیا۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے خاوند کا تتبع کرتی ہیں جنھوں نے
ہمیشہ اپنے روپیہ سے سفر کیا اور خود اعتمادی کی زندگی بسر کی" اس خودداری
کے ساتھ رہنے والی خاتون کی زندگی کا ایک اور عکس اسی مضمون کے دوسرے
حصہ سے ملتا ہے۔ برنی صاحب لکھتے ہیں کہ "پونا جیل میں قیام کے دوران
مولانا کو جب کتابوں کی ضرورت ہوتی تو وہ بیگم صاحبہ سے فرمائش کرتے اور
یہ کتابیں انھیں فراہم کر دی جاتیں۔ لیکن چونکہ اس زمانہ میں مولانا پر سختی
بہت تھی اس لئے خط و کتابت بند تھی۔ بیگم صاحبہ انہی کتابوں میں کہیں کہیں
کوئی پیغام تحریر کر دیا کرتی تھیں۔ اس ضمن میں برنی صاحب کے الفاظ ملاحظہ
فرمائیے۔ "جس زمانہ میں مولانا یرودا جیل میں قید تھے بیگم حسرت ان کے نام کتابیں
بھیجتی رہتی تھیں۔ یہ سب کتابیں منظوری کے لئے میرے پاس آتی تھیں
بیگم حسرت ان کتابوں کے حاشیوں پر خطوں کا بھی مضمون لکھ بھیجتی رہیں ایک
دن میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کتابوں کے حاشیہ پر خط کیوں لکھ دیا کرتی
ہیں۔ آپ ان کے نام الگ خط کیوں نہیں بھیجتی۔ کہنے لگیں کہ نہ تو میرا کوئی
خط مولانا تک پہنچتا ہے اور نہ مجھے ملاقات کی اجازت ملتی ہے اس لئے خط
کی باتیں حاشیے پر لکھ کر بھیج دیتی ہوں۔ میں نے انھیں بتایا کہ آپ اس طریقہ
سے میری پوزیشن خطرناک بنا رہی ہیں۔ بہر حال میں نے اپنے مہربان دوست
اور افسر مسٹر جے میکڈانلڈ کے ذریعہ جو ہوم ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ سیکرٹری

کے عہدہ پر فائز تھے انہیں ملاقات کی اجازت دلوا دی اور اجازت بھی ایسی کہ جب چاہیں مل لیا کریں۔ اس کے بعد کہیں جا کر حاشیہ نویسی کا سلسلہ ختم ہوا اور میری جان میں جان آئی۔"

صحّت کی خرابی

مولانا کی تیسری گرفتاری کے بعد جب وہ کانپور واپس آئے تو بیگم صاحبہ کی صحت خراب رہنے لگی مگر وہ اپنے شوہر کے مشن کی تکمیل میں بدستور لگی رہیں محترمہ نعیمہ بیگم نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک ہر سال بیت اللہ سے مشرف ہوتی رہیں۔ اور آخری سفر حج براہ عراق کیا اور اس کا سفرنامہ شائع کیا۔ یہ سفرنامہ اپنی بیٹی کے نام خطوط کی شکل میں ہے۔ عمر کے آخری سالوں میں بیمار رہتی تھیں۔ مگر ایام حج کے قریب اس قدر صحت مند ہو جاتی تھیں۔ کہ مولانا کو انہیں اپنے ہمراہ لے جانے میں کوئی پس وپیش نہیں ہوتا تھا۔ بیگم صاحبہ حضرت شاہ عبدالوہاب فرنگی محلی کی مرید تھیں جن کا عرس لکھنؤ میں ہر سال ۲۷ صفر کو ہوتا ہے۔ شاہ عبدالوہاب کی تاریخ رحلت چاند کی دوسری محرم تھی اس لئے وہ ہر سال اس تاریخ کو خاص اہتمام سے نیاز کیا کرتی تھیں۔ بیگم صاحبہ کو حضرت عترتِ پاک سے بھی خاص عقیدت تھی اور پہلے سفر کے بعد ان کی یہ تمنا کہ اس دربار میں حاضری بھی نصیب ہو اور بڑھ گئی تھی۔ اس کی کوئی ضرورت بظاہر نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن آخر میں یہ آرزو بھی پوری ہوئی اور ان کا آخری سفر حج براہ عراق ہوا۔" محترمہ نعیمہ بیگم نے لکھا ہے کہ "وہ اپنے ساتھ اپنے نواسہ رضوان الحسن کو بھی برابر حج بیت اللہ کے لئے لے جاتی تھیں میاں رضوان جب دو ماہ کے تھے تو چیچک نکل آئی تھی اس کی وجہ سے انہوں نے اس کو اپنے پاس رکھا۔ ڈبوں کے دودھ پر اس کی پرورش ہوئی رضوان سلمہٗ کی پیدائش کے وقت مولانا سابرمتی جیل میں تھے۔ ان کو وہیں پیدائش کی اطلاع دی گئی تو جیل سے انہوں نے یہ تاریخ پیدائش لکھ کر بھیجی۔

"حق نے بیٹا جو نعیمہ کو دیا، میرا فرزند وہ روحانی ہے
سال پیدائش رضوان حسرت ثانی حسرت موہانی ہے (۱۳۴۱ھ)

مولانا عبدالماجد بدایونی نے میاں رضوان کا تاریخی نام سلیم اختر رکھا اور وہ اسے اسی نام سے یاد کرتے تھے

آخری علالت اور انتقال

محترمہ نعیمہ بیگم لکھتی ہیں۔

آخری سفر حج کے بعد سلسلۂ علالت نے شدت اختیار کرنی شروع کر دی جس کا آغاز بصرہ سے شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ وہ بالکل صاحبِ فراش ہو گئیں میں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے سبب ان کی اس آخری وقت میں زیادہ خدمت نہ کر سکی مگر یہ کام میری لڑکی نفیسہ مرحوم انجام دیتی رہی۔ ان کی علالت کے سبب مولانا ۱۹۳۷ء میں حج کے لئے تشریف نہیں لے جا سکے۔ آخر ۲۵ محرم الحرام ۱۳۵۶ھ مطابق ۸ اپریل ۱۹۳۷ء کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا مولانا نے اردوئے معلی بابت فروری تا اپریل ۱۹۳۷ء میں ان کی آخری علالت اور وفات کے جو حالات شائع کئے وہ درج ذیل ہیں۔

۸ اپریل ۱۹۳۷ء ٹھیک ۱۱ بجے دن کے وقت بیگم حسرت مکروہات دنیا سے آزاد ہو کر بہ اطمینان تمام واصل بحق ہو گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

سلسلہ علالت کئی سال سے جاری تھا۔ سال برابر بیمار رہتی تھیں لیکن موسم حج کے قریب اس قدر صحت حاصل کر لیتی تھیں کہ حج کے لئے میرے ساتھ جانے میں بظاہر کوئی دشواری نظر نہ آتی تھی، چار سال یہی حال رہا۔ آخری بار یعنی ۱۹۳۵ء میں براہ عراق سفر حج کے وقت البتہ وہ اس قدر کمزور اور بیمار تھیں کہ ان کو ساتھ جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی مگر ان کی دل شکنی اور مایوسی کا خیال بھی سوہانِ روح تھا مجبوراً مجھ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ بصرہ تک جہاز اور وہاں سے ریل میں جانا۔ چونکہ نسبتاً آسان ہے اس لئے ان کو وہیں چھوڑ دوں گا اور خود صحرائے عرب کے ۱۲۰۰ میل موٹر میں طے کر کے مدینے

اور مدینے سے مکے ہو کر پھر اسی راہ سے واپس آؤں گا اور بغداد سے انہیں
ساتھ لے لوں گا۔ اس تجویز کو انہوں نے سنا اور کچھ نہ کہا ساتھ ہو لیں۔ مگر
بغداد پہنچ کر اپنے جدِ امجد حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے روبرو اپنے اللہ سے
دعا کی کہ زیارت روضۂ رسولؐ اور حج سے محروم نہ رہوں۔ اس دعا نے تریاقِ مجرب
کا کام کیا اور انہوں نے باوجود علالت و نقاہت تمام ارکانِ حج بخوبی ادا کیے
اور دوبارہ مدینے اور دو ہی بار بغداد کاظمین، نجف و کربلا میں حاضری دے
کر صحیح سلامت واپس کانپور پہنچ گئیں مگر بصرے سے کراچی پہنچتے پہنچتے علالت
پھر نمودار ہو گئی جس کی روز افزوں تکلیفیں آخر کار ان کی جان ہی لے کر گئیں
ریڑھ کی ہڈی میں کچھ خرابی ایسی پیدا ہو گئی تھی جو ڈاکٹروں کی رائے
میں لا علاج ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے ان کے جسم کا نصف حصہ اسفل
کئی ماہ سے بالکل بے حس ہو گیا تھا اور پلنگ پر پڑے پڑے کئی زخم نہایت
درجہ تکلیف دہ پیدا ہو گئے تھے۔ پسلیوں میں بھی شدید درد رہنے لگا مگر ان
کی زبان سے اس کے سوا کہ "اللہ کی مرضی" اور اس کی مصلحت کا تقاضا" کسی نے
کبھی کوئی حرف شکایت نہ سنا۔ کبھی کبھی اتنا البتہ کہتی تھیں کہ جب بیماری میں
تکلیف کی اتنی شدت ہے تو افتراقِ روح کے وقت کیا حال ہو گا۔ مگر انتقال سے
ایک روز قبل نمازِ فجر کے اوّل وقت بحالت شدت تنفس ٹوٹے پھوٹے جملوں میں
مجھ سے کہا کہ اب مجھ کو کسی تکلیف کا اندیشہ نہیں ہے کہ ابھی حضورؐ تشریف لائے
تھے تو میں نے دامن تھام لیا اور عرض کیا کہ مجھ کو بھی مدینے ساتھ لے چلیے
آپؐ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں ہم جلد تم کو اپنے پاس بلا لیں گے اور تکلیف
جانکنی کی نسبت بھی ارشاد ہوا۔ کہ ہم ذمہ دار ہیں تم کو ایسی تکلیف نہ ہو گی
چنانچہ اب ہم کو کوئی فکر نہیں ہے۔" الحمد للہ کہ نتیجہ اسی شکل میں ظاہر ہوا
کہ میرے سوا کسی کو آخر تک اس کا احساس نہ ہوا۔ کہ ان کا خاتمہ اس درجہ
قریب ہے۔ خدا گواہ ہے کہ راقم کے اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے
کہ ایثار و انکسار، حیا و غیرت، محبت و مروّت، فہم و فراست، جرأت و صداقت
عزم و ہمت، وفا و سخا، حسن عقیدت، صدق نیت، خلوص عبادت، خلوص

عبادت حسنِ خلق صحتِ مذاق پاکی و پاکیزگی، صبر و استقلال اور سب سے بڑھ کر عشقِ رسولؐ اور محبت حضرت حق کے لحاظ سے شاید مسلمان عورتوں بلکہ مردوں میں بھی ہندوستان میں کم ایسے افراد موجود ہوں گے جن کو ہم بیگم حسرت سے بہتر تو کیا ان کی برابر بھی قرار دے سکیں۔ ان تمام باتوں کی تفصیل ایک جداگانہ تصنیف کی طالب ہے لاریب؎

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

راقم کو بیگم حسرت کی جدائی سب سے زیادہ اس خیال سے شاق ہے۔ کہ اب کوئی اس کی کوتاہیوں پر ملامت کرنیوالا اور اس کی خامیوں پر جبز و بیخ کرنے والا نہ رہا۔ ظاہری تعلیم کو چھوڑ کر باقی کل باتوں میں وہ راقم سے بدرجہا بہتر تھیں انہیں ہر قسم کی تنبیہ کا حق حاصل تھا جس کا اثر بھی خاطر خواہ ہوتا تھا افسوس کہ گذشتہ چند ماہ کے دوران مجھ سے بعض خانگی امور میں بالکل نادانستہ طور پر چند ایسی کوتاہیاں ظاہر ہوئیں جن کی بنا پر انہیں اپنے لئے میری جانب سے بے رُخی و کم التفاتی کا گمان پیدا ہو گیا اور اس کا انہیں بہت صدمہ ہوا۔ بعد میں اگرچہ اپنی فطری نیک طینتی اور عالی حوصلگی کی بنا پر انہوں نے میری معذرت کو صحیح تسلیم کر کے اپنے دِل کو صاف کر لیا تھا مگر مجھ کو برابر پاداشِ عمل کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ جس کا اظہار میں نے اپنی غزل میں بایں الفاظ کیا تھا؎

چھوڑ کر وہ چل نہ دیں آخر زراہِ انتقام
مجھ کو تنہا رات دِن آنسو بہانے کیلئے

افسوس کہ جس بات کا ڈر تھا وہی سامنے آئی اور ہمیشہ کے لئے مجھ کو مغموم و محروم بنا گئی۔

مولانا کا رنج و افسوس

مولانا کو اپنی حقیقی رفیقۂ حیات کی رحلت کا جو غم ہوا وہ ظاہر ھے پروفیسر عبدالشکور نے لکھا ہے کہ حسرت کے لئے یہ حادثۂ جانکاہ نہایت درجہ

صبر آزما اور رُوح فرسا ثابت ہوا۔ فرماتے تھے کہ ان کی حیات میں گھر بار کے کسی معاملہ سے کبھی سروکار نہ ہوا۔ اب دِن رات کی دردسری ہے جس سے جیتے جی نجات ملنی محال ہے ان کی یاد میں حسرت نے دو نہایت کامیاب غزلیں کہی ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا کو مرحومہ سے سچی اور گہری محبت تھی

(پہلی غزل)

وجہ کیا خواب میں نہ آنے کی
شرم انہیں ہو نہ رُوٹھ جانے کی

اشک باقی ہیں اب نہ کوئی رقیب
نہ ضرورت کسی بہانے کی

غیر ممکن ہے تیرے بعد ہوس
دِل کسی اور سے لگانے سے

سرمۂ چشم وعیش تھا بخدا
خاک تیرے غریب خانے کی

مٹ گئیں آپ بھی مٹا کے مجھے
سختیاں خود بخود زمانے کی

اب نہ دِل ہے نہ وہ ذخیرۂ شوق
توڑدوں کنجیاں خزانے کی

یعنی کہنے کی ہے نہ کوئی ہوس
اب کسی کو غزل سنانے کی

آج کے بعد کیا ہوئی حسرت
دل فریبی تیرے فسانے کی

دوسری غزل

عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر
آرزوئے زندگی دشوار ہے تیرے بغیر

کاروانِ شوق کی اب وہ تن سازی کہاں
دل پہ ذوقِ شاعری اک بار ہے تیرے بغیر
شرکتِ بزمِ سخن سے بھی ہیں باوصف عزم
بربنائے بے دلی انکار ہے تیرے بغیر
جس فراغت کا تمنائی تھا دل تیرے لئے
اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے بغیر
در دِل جو تھا کبھی وجہ مباہات و شرف
بہر حسرت موجب صد عار ہے تیرے بغیر

یہی پروفیسر عبدالشکور لکھتے ہیں کہ مولانا کا یہ دستور تھا کہ جب تک کانپور میں قیام کرتے ہر جمعرات کو احترام کے ساتھ بیگم صاحبہ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے جاتے اور اس طرح کھوئی محبت کو خراج عقیدت پیش کرتے۔

جلیل قدوائی

جناب جلیل قدوائی نے لکھا ہے کہ "مولانا کو اپنی شریک حیات بیگم نشاط النسا حسرت سے جو شادی سے پہلے ان کی بنت عم تھیں۔ بے پناہ عشق تھا ان کے کلام سے ایک "قمر خانگی" کے ساتھ ان کے عشق کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ یعنی۔ پیش نظر جو وہ قمرِ خانگی نہیں۔ یہ جوششِ انتظار ہے دیوانگی نہیں۔ مگر بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد چند غزلوں میں تو مولانا نے ان کے ساتھ اپنی محبت کا صاف صاف اعتراف کیا ہے بلکہ اعلان کیا۔ کیا ان اشعار کے بعد اس سلسلہ میں کسی غلط فہمی کا احتمال رہ جاتا ہے۔ بیگم صاحبہ کے دوران علالت میں جب کہ مرحومہ کو مولانا سے کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی۔ مولانا نے رفع کدورت کے سلسلہ میں ذیل کی دلچسپ و پُر لطف غزل لکھی تھی جو محبوب کو پھسلانے بلکہ گدگدانے کے مترادف ہے۔

ہر ناز آئے تو ان کو آزمانے کے لئے
پیش کرتے ہیں دل اپنا ہم نشانے کیلئے

میں بھی خوش میرا خدا بھی خوش ہے میرے درد سے

درد گو وجہِ مصیبت ہے زمانے کے لئے

چھیڑ اگر منظور ہے ان کو تو با وصف حجاب

پھر سے دیکھیں گے مجھے پھر مسکرانے کے لئے

وہ کہیں پوچھیں تو حسرت کس پہ مرتے ہو کہ ہم

نام تک تیار ہیں اس کا بتانے کے لئے

اس غزل میں ایک شعر یہ بھی ہے جو خاص توجہ کا مستحق ہے

چھوڑ کر وہ چل نہ دیں آخر ز راہِ انتقام

مجھ کو تنہا رات دن آنسو بہانے کیلئے

یہ عشق نہیں تو کیا تھا۔ مانا کہ یہ عشق کا بڑھاپا تھا۔ اس نے جوانی میں کیا کیا گل نہیں کھلائے تھے۔ غزل کی شاعری رمز و اشارت کی شاعری ہے۔ پھر بھی اوپر کے صفحات سامنے رکھتے ہوئے مولانا کے مختلف ادوار کے کلام سے ایسے اشعار چن لینا مشکل کام نہیں جو کم سے کم عشق کے لئے ایک بے تکلف گھریلو فضا کی غمازی کرتے ہیں اور اس گھریلو فضا میں باوصف تقدس مولانا اس قسم کی شاعری اس قدر جوش کے ساتھ بیگم کے لئے نہیں تو پھر کس کے لئے کرتے ہیں

سونگھی تھی جو اک بار وہ خوشبوئے گریباں

اب تک یہ اسی بوئے گریباں کا نشہ ہے

ہم حال انہیں یوں دل کا سنانے میں لگے ہیں

کچھ کہتے نہیں پاؤں دبانے میں لگے ہیں

کہنا ہے انہیں یہ کہ نہ ہم ہوں گے مخاطب

یہ کہتے نہیں، زلف بنانے میں لگے ہیں

جس نے سونگھی ہو ترے زلفِ سیہ کار کی بُو

کیا پسند آئے اسے نافۂ تاتار کی بُو

آج تک جس سے معطّر ہے محبت کا مشام

آہ کیا چیز تھی وہ پیرہنِ یار کی بُو

رنگ سونے میں چمکتا ہے طرح داری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
کر رہی تھی چاندنی نور مہ کامل نثار
سو رہا تھا بام پر وہ گیسوؤں والا پڑا

اپنے آپے میں نہیں شوق کے مارے گیسو
پھیلے جاتے ہیں رخِ یار پہ سارے گیسو
مائل شوق مجھے پاکے وہ بولے ہنس کر
دیکھو تم نے جو چھوئے آج ہمارے گیسو

فلک حسن پہ ہے ناز کے تاروں کی نمود
یا تہہ زینت افشاں ہیں تمہارے گیسو

چاندنی رات میں پھولوں کا ہے زیور کیا خوب
رنگ لائے گا ترا حسن معطر کیا خوب
قابلِ دید تھی گرمی میں پسینے کی بہار
تر ہوا ہے عرقِ حسن سے بستر کیا خوب

کھول کر بال جو سوئے ہیں وہ شب کو حسرت
گھیر لیتی ہے انہیں زلفِ معنبر کیا خوب

دن کو ہم ان سے بگڑتے ہیں وہ شب کو ہم سے
رسمِ پابندیٔ اوقات چلی جاتی ہے
تم نے بال اپنے جو پھولوں میں بسا رکھے ہیں
شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

اثرِ عشق سے نکلیں جو تمہارے آنسو
دامنِ جاں وہ لے لیجئے سارے آنسو
عالم حسن میں ہیں نور کی نہریں جاری
یا رواں عارض جاناں کے کنارے آنسو
گریۂ شوق سے تر ہیں جو تمہاری آنکھیں
بن گئے ہیں فلکِ حسن کے تارے آنسو

ہے نرالی سبزے کی بھی روئے روشن پر بہار
اوڑھنی بہتر تھی لیکن ارغوانی آپ کی

مجبوبی و رنگینی ہے جسم و بدن تیری
سرشار محبت ہے خوشبوئے دہن تیری

اسی سلسلے میں عشق کے لئے گھریلو فضا یا شادی شدہ عشق اور اس کے اظہار کی نسبت کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے جسے آج کل فیشن کے خلاف بلکہ حماقت سمجھا جاتا ہے مگر فیشن بذاتِ خود کوئی پائدار حقیقت اور قائم بالذات شئے نہیں۔ اور لئے بدلنے والی چیز ہے۔ لہٰذا بے اعتبار ہے۔ ایسی ناپائدار بنیاد اور ناقص معیار پر شادی جیسے ادارہ کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا صحیح نہیں صحیح تو یہ ہے کہ انسان کے جنسی میلان کا نقطۂ نظر اختلاط ہے اور شادی اس کا فطری نقطۂ عروج ہے۔ جس میں جنسی اختلاط جو عشق انسانی کی بنیاد ہے۔ دوام حاصل کرتا ہے چنانچہ شادی شدہ عشق سے بڑھ کر دنیا میں کوئی عشق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی نسبت یہ جو کہا جاتا ہے کہ حسن اور متعلقات حسن کا کوئی مخفی سے مخفی پہلو ان کی نظر سے نہیں بچا۔ اور عاشقانہ زندگی کے تمام ادوار کی عکاسی ان کے کلام میں موجود ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے دل میں عمر بھر اپنی شریکِ حیات کے فطری عشق کی چمک باقی رہی اور اس عشق سے زیادہ کسی جنسی لگاؤ میں حسن و عشق کے مطالعہ و تجزیہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ بیگم حسرت کو بھی مولانا سے سچی محبت تھی اور اس کا ثبوت بھی مولانا کے کلام میں موجود ہے زندگی بھر وہ مولانا کے دل و دماغ پر حاوی رہیں اور مولانا بھی خوشی خوشی مگر مگن رہ کر ان کا اثر ہی نہیں لوہا مانتے رہے اور ان کی محبت سے سرشار ہو کر شاعری کرتے رہے۔ بیگم حسرت کی حیات کے زمانہ کے سارے کلام میں سوز و ساز کے ساتھ ایک معصومیت، ایک والہانہ پن ایک خلوص بھی موجود ہے مگر ان کی وفات کے بعد یہ بات نہیں رہی مولانا پر قبرص کی پری کا سایہ تیرنے لگا۔ وہ رنگینیٔ زدیا کی زبانی اٹلی کی حسینوں کی کہانی سننے اور حسنِ مغرب کا تجزیہ کرنے لگے مزاج یہ ہے کہ ان

میں سے بعض غزلیں اس زمانہ میں لکھی گئیں جب وہ ایک مقدس سفر کی حالت
میں تھے۔ جس کے دوران میں جیتے جی تھے جو مرے ناز اٹھانے والے انہیں
مولانا نے خواب میں بھی دیکھا تھا وجہ یہ تھی کہ فطری عشق کے سوتے خشک ہو
چکے تھے۔ اور مولانا کی شخصیت اور شاعری دونوں اپنی ارفع سطح سے نیچے اتر
آئیں۔"

جناب ضیاءالدین برنی نے صحیح لکھا ہے کہ "بیگم حسرت موہانی کئی اعتبار سے
اپنے طبقۂ نسواں میں پیش پیش تھیں۔ انہوں نے پردہ چھوڑا مگر سادگی کو ہاتھ سے
جانے نہیں دیا۔ ان کے ہاتھوں میں میں نے کبھی زیور نہیں دیکھا۔ وہ چوڑیوں سے
بے نیاز تھیں۔ ان کے لباس میں میں نے کبھی بھڑک یا نمود نہیں دیکھی وہ سیدھی
سادی خاتون تھیں اور بس وہ پردہ سے اس لئے باہر آئی تھیں۔ کہ ان کے
رفاقت اس امر کی مقتضی تھی کہ وہ ایسا کریں۔"

کشن پرشاد کول

پنڈت کشن پرشاد کول نے لکھا ہے کہ "یہ مولانا کی خوش قسمتی تھی کہ ان
کو بیگم حسرت کی سی رفیق زندگی میسر آئی کہ حقیقی معنوں میں ان کی دمساز اور
ساتھی تھیں ان کی قید و مجبوری، مصیبت و عسرت میں انہوں نے نہایت حوصلہ
اور خودداری سے زندگی بھر خندہ پیشانی سے ان کا ساتھ دیا۔" پنڈت کول لکھتے
ہیں کہ "پہلی بار میری ان سے ملاقات ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء میں علی گڑھ میں ہوئی
اور دوسری بار موہان میں ہوئی۔ لیکن ان دونوں ملاقاتوں ہی میں ان کے
ذاتی اوصاف ان کے بشرہ سے عیاں ہوتے ہیں۔" پنڈت کول فرماتے ہیں۔ کہ "
میں نے جو ان کے اوصاف و خصائل اور کریکٹر کا اندازہ لگایا اور میں سمجھتا
ہوں کہ وہ صحیح تھا یہ تھا کہ ان میں فضائل کے وہ تمام جوہر جو حسرت کی
شخصیت کا خمیر تھے موجود تھے ۔ ایسی ہی سادگی، پاکیزگی، سچائی
کسر نفسی، ایثار و محبت، دلیری، وطن پرستی ان میں بھی تھی۔ کہ جیسے حسرت
میں۔ ان کی خلقی رجحان کے علاوہ غالباً حسرت کی محبت نے ان میں چار

چاند لگا دیئے تھے۔ لیکن میرے خیال میں ان کو ایک بات میں حسرت پر فوقیت حاصل تھی۔ وہ دماغ والی عورت تھیں اور ان کا دماغ حسرت کے مقابلہ میں زیادہ سلجھا ہوا تھا اور میرا یہ اندازہ ہے کہ جب تک زندہ رہیں حسرت پر کچھ نہ کچھ ان کے اس وصف کا اثر پڑتا رہا۔ تقریباً ۲۰ برس حسرت کے اور میرے مراسم رہے۔ کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا ہوگا کہ وہ لکھنؤ آتے ہوں اور بغیر مجھے ملے چلے گئے ہوں۔ لیکن ۱۹۲۵ء کے بعد سے یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سیاسی فضا جب مکدر ہوئی اور فرقہ وارانہ جوش نے زور پکڑا تو حسرت نے بھی پولٹیکل کروٹ بدلی اور مسلم لیگ میں شریک ہو گئے غالباً اسی زمانہ سے ان میں مذہبیت کا جوش بڑھنے لگا۔ میں یقیناً تو نہیں کہہ سکتا مگر شاید یہی زمانہ تھا کہ جب بیگم حسرت علیل ہو کر قضا کر گئیں۔ میرے اور حسرت کے تعلقات کبھی ناگوار نہ ہوئے لیکن وہ ملنے جلنے میں پہلو تہی کرنے لگے۔ بس راہ چلتے میں صاحب سلامت ہو جاتی تھیں پانچ سات برس ہوئے کہ گنگا پرشاد میموریل ہال میں کسی جلسے کی شرکت کی غرض سے آئے تھے برآمدے میں کھڑے مل گئے میں انہیں اپنے دفتر میں لے آیا اور بات چیت ہونے لگی۔ وہ مجھے سمجھانے لگے کہ مسلم لیگ اور سوشلزم دونوں میں موافقت ہے اور فرقہ وارانہ سیاست کو کمیونزم کے ساتھ نباہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آئی۔

سید سلیمان ندوی کے تاثرات

سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ حسرت کی زندگی کا تذکرہ حقیقت یہ ہے کہ وفادار، شریف اور بہادر بیگم مرحومہ کے تذکرہ کے بغیر تمام نہیں ہو سکتا۔ آج سے پینتیس برس پہلے وہ چہرہ کھول کر نہایت سادہ لیکن پردہ پوش لباس میں باہر آتی تھیں اور کسی کی پرواہ نہیں کرتی تھیں۔ شوہر کی قید و بند کے بعد جب ان کا کوئی مونس و مددگار نہیں ہوتا تھا ہر قسم کی مشکلوں کو بہادری اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے میں شاید ہی کوئی مسلمان عورت ان کے مقابلے میں نکل سکے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

جنابؒ ضیاالدین برنی کی گواہی

جناب ضیاء الدین برنیؒ نے اپنی کتاب عظمت رفتہ میں مولانا کا ذکر کرتے ہوئے بیگم حسرت کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا "مولانا حسرت کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتے وقت میں بیگم حسرت کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو مکمل ہم آہنگی مولانا میں اور ان میں زندگی بھر قائم رہی وہ بہت کم دیکھنے میں آتی ہے وہ صحیح معنوں میں مولانا کی رفیق حیات تھیں۔ اور ان کے ہر جہاد میں مال و جان سے شریک۔ وہ اتنی بہادر خاتون تھیں کہ انہوں نے اپنے خاوند کو جیل جاتے دیکھ کبھی آنسو نہیں بہائے۔ بلکہ ہمیشہ صبر ایوبی سے کام لیا۔ مولانا خوش قسمت تھے کہ انہیں ان کے کاموں میں دل و جان سے شریک ہونے والی ایسی نڈر اور جری بیوی ملی۔"

حبیب الرحمٰن حبیب کا بیان

جناب حبیبُ الرحمان حبیب نے لکھا ہے کہ "حسرت کی رفیقۂ حیات وہ قابلِ احترام ہستی ہے جس نے ہمیشہ حسرت کا ساتھ بہ حیثیت ایک جانثار دوست اور رفیق کے دیا۔ اس واجب التعظیم بیگم کو حسرت سے ایک خاص عقیدت والہانہ محبت اور عشق ہے۔ عشق وہ عشق نہیں جو ہوسناکیوں کی تاریک اور بھیانک فضاؤں میں روپوش ہو جاتا ہے بلکہ بیگم حسرت کا عشق صحیح معنوں میں وہ عشق ہے جہاں محبت شکل و صورت کی حدود سے نکل کر روح کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے جہاں ایک جان اور دو قالب نظر آتے ہیں۔ جہاں گنگا اور جمنا کا آپس میں میل ہو جاتا ہے جہاں من تن شدم تو جاں شدی کا فلسفہ حل ہو جاتا ہے۔ حسرت کے دکھ درد، رنج و مصیبت میں یہ برابر کی شریک اس کے سوز میں شریک اور اس کے زخم پر مرہم کا کام کرتی رہی۔ کبھی اپنی پریشانیوں اور تکالیف کے اظہار سے حسرت کی پریشانیوں اور تکالیف میں اضافہ نہیں کیا۔ کبھی اپنا، بال بچوں کا اور انجام کا خیال دلا کر حسرت کو ان

کے پاک ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کی نہ صرف امورِ خانہ داری کی حد تک ہی اس خاتون کی خدمات محدود رہیں۔ بلکہ جب حسرت نے جیل کے در و دیوار آباد کئے تو اس محترم خاتون نے نانِ شبینہ اور اپنی ننھی بچی کی آسائش و راحت کا بار بھی اپنے کندھوں پر اٹھا لیا حسرت موہانی کا ذریعہ معاش سودیشی اسٹور اور کتابوں کی ایجنسی تک محدود تھا۔ ان دونوں تجارتی اور تبلیغی اداروں کو جس خوبی، خوش اسلوبی اور قابلیت سے اس معزز خاتون نے چلایا وہ اس کا حصہ ہیں افراد قوم کی سخاوتیں اور ہمدردیاں سب ہی تو بیگم حسرت کے لئے موجود تھیں لیکن اس محترم خاتون کو اپنے شوہر کا وقار، عظمت، خودداری برقرار رکھنا اور سب سے آگے بڑھ کے اس کے عقائد اور اصولوں کا کاربند رہنا تھا اس نے کسی پر یہ ظاہر ہونے نہ دیا۔ کہ بیگم حسرت کس حال میں ہے۔ رنج میں ہے یا راحت میں۔ ہمیشہ بشاش چہرہ پر نمودِ صبح کے انوار سے ہوئے رہی۔ جتنے بھی پیش کشیں آئیں۔ جنہوں نے بھی مالی امداد پہنچانے کی خواہش بھی تھی۔ اس بلند حوصلہ اور عالی ہمت خاتون نے بہ ہزار تشکر ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہی نہیں یہ اس عالی محبت اور مایہ خاتون کا کارنامہ ہے کہ آج ہم اور آپ حسرت کے کلام سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ حسرت کے تمام دواوین کی ترتیب و تدوین اسی محترم خاتون کا کارنامہ ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے حسرت کی سوانح حیات پر نوٹس بھی لکھے۔ جس کو مسلم ریلیف کمیٹی نے شائع کر دیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ واجب التعظیم خاتون حسرت کی اقلیم سیاست میں جہانگیر کی نورجہاں سے بھی کہیں آگے ہے تو بے جا نہ ہوگا۔"

سیرت کی جھلکیاں

مگر بیگم حسرت موہانی کے صحیح کردار کا اندازہ ان کے ان خطوط سے ہوتا ہے۔ جو انھوں نے اپنے اور مولانا کے مرشد زادے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو لکھے، یہ خطوط سنہ ۱۷ء سے لیکر سنہ ۲۳ء کے درمیانی عرصہ میں لکھے گئے

اور ان کا تعلق مولانا کے اس دورِ حیات سے ہے جو ان کی قید ثانی اور ثالث سے متعلق ہے ان دونوں گرفتاریوں کا تذکرہ مولانا کی سیاسی زندگی میں آئے گا۔ مولانا اور ان کی اہلیہ میں اس دور میں جن خطوط کا تبادلہ ہوا وہ بھی سیاسی زندگی میں درج کر دیئے جائیں گے۔ لیکن یہ خطوط چونکہ ایک عقیدت مند کی جانب سے اپنے مرشد کی خدمت میں لکھے گئے ہیں لہٰذا ان میں بیگم صاحبہ نے اپنے جذبات کو نہایت واضح طور پر پیش کیا ہے۔ اور مولانا کی گرفتاری اور اسی گرفتاری کے سلسلہ میں انہیں دقتیں اور دشواریاں پیش آ رہی تھیں ان میں ان کا تذکرہ تفصیل سے ملتا ہے بہ نسبت ان خطوط کے جو بیگم صاحبہ نے اس دور میں اپنے شوہر کو لکھے انہوں نے اپنی ساری الجھنوں کو مولانا سے اخفا میں رکھا تاکہ جیل میں انہیں ذہنی پریشانی نہ ہو اور سوائے ان باتوں کے جو مولانا کو بتانی ضروری تھیں یہ خطوط بیگم صاحبہ کی ان ادبی کاوشوں کی بھی غمازی کرتے ہیں جو اس دور میں مولانا کے کلام کی اشاعت اور تشہیر سے متعلق تھیں انہوں نے یہ سارا تکلیف دہ، حوصلہ آزما اور صبر شکن زمانہ جس استقلال سے گذرا۔ اس کی جا بجا ان خطوط میں جھلکیاں ملتی ہیں۔

(۱)

۱۴ اپریل ۱۹۱۶ء

بخدمت شریف جناب حضرت قبلہ

تسلیم فدویانہ قبول فرمایئے۔ میں نہایت رنج کے ساتھ عرض کرتی ہوں کہ کل دوپہر کو یکایک پولیس نے حسرت کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا بعد کو مکان اور دوکان کی تلاشی ہوئی لیکن اللہ کے فضل سے کچھ تھا ہی نہیں۔ کیا نکلتا۔ پھر بھی وہ بہت سے ردی خطوط، مکان سے دوکان سے، اسی قسم کے تجارتی کاغذات کچھ معمولی تصویریں محمد علی کی آزاد کی۔ انور پاشا کی۔ میرے پاس تصویریں بہت تھیں ایک سے ایک بہتر، کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ خیر۔ اب یہ نہیں معلوم کہ گرفتاری کس وجہ سے ہوئی۔ اب نظر بند ہیں یا کوئی خدانخواستہ مقدمہ ہوگا۔ یہ کیا کچھ نہیں معلوم۔ طبیعت حد درجہ پریشان۔ خدا کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ دوکان

کی، جو مالی حالت ہے وہ ظاہر ہے۔ افواہیں طرح طرح کی سننے میں آتی ہیں کوئی کہتا ہے کہ لکھنؤ کے جلسے میں ڈاکٹر ضیاء الدین کی شرارت ہے انھوں نے گرفتار کروایا۔ کوئی کچھ کوئی کچھ بہرحال دیکھئے خدا کیا دکھاتا ہے۔ چونکہ حضرت کی دعا سے ہم لوگوں کا بیڑہ پار ہے۔ کیونکہ حضرت کے سوا ایسی مصیبت کے وقت خدا سے اور کون دعا ہمارے لئے کر سکتا ہے۔ میرے پہلے عریضہ کا حضرت نے جواب نہیں تحریر فرمایا۔ امید ہے کہ اگر آپ کچھ کوئی واقعات نئے معلوم ہوں تو اس عاجز کو مطلع کیجئے گا۔ میں روز حسرت سے ملنے جاتی ہوں کچھ دیر تک مختلف بات چیت کرکے واپس آجاتی ہوں۔ دعا کیجئے کہ حسرت بخیر و عافیت رہا ہو جائیں۔ اگر تحفظ ہند کی وجہ سے نظر بند کئے گئے ہیں تو اور لوگوں کی طرح سے ان سے بھی وہی سلوک کرنا چاہیئے تھا۔ مگر خدا معلوم اس کی کیا مصلحت ہے۔ طبیعت بہت متوحش ہے' فرمایئے میں کیا کروں۔ امید کرتی ہوں کہ حضرت بہت جلد عنایت نامے سے سرفراز فرمائیں گے۔

والدہ نعیمہ

جواب: مولوی فضل الحسن کا واقعہ مسموع ہوا تھا تمہارے خط سے اس کی تصدیق ہوئی۔ تمہارے پہلے خط کے جواب میں اسی وجہ سے تاخیر ہوئی کہ خیال تھا کہ مولوی فضل الحسن خود خیریت زبانی کہہ دیں گے۔ خدا کے فضل سے سب خیریت ہے اور موسم کی حالت بھی بدستور ہے۔ اطراف سے اخبار امراض کی خبریں کے آئے مگر لکھنؤ میں سب خیریت ہے۔ خدا امن و امان میں رکھے۔ دعا کرتا ہوں۔

(۲)

۱۰/ اپریل ۱۹۱۶ء علی گڑھ

حضرت صاحب قبلہ

تسلیم فدویانہ قبول فرمایئے۔ سخت افسوس ہے کہ آج میں حسب معمول صبح کو حسرت سے ملنے جیل گئی۔ وہاں معلوم ہوا کہ وہ سات بجے صبح کو کہیں باہر خفیہ طور پر بھیج دیئے گئے۔ ابھی نہیں بتایا گیا۔ کل بتایا جائے گا۔ دیکھئے خدا پر بھروسہ ہے معلوم نہیں کیا مقدر میں ہے اور اس سے زیادہ کیا عرض

کروں۔ دُعا فرمایئے۔ خیریت سے ہوں۔ شاید نظر بند کر دیئے گئے، دیکھئے بے قصور غریب کو سزا ملی۔ افسوس۔ میری پریشانی کی جو کیفیت ہے۔ خدا خوب جانتا ہے۔

خاکسار فدویہ والدۂ نعیمہ

جواب: تمہاری پریشانی سے از حد متفکر ہوں۔ ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ بے چارے فضل الحسن نے کیا کیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کی مدد شامل ہے حالت اضطرار میں خدا کا بندہ خدا کو نہ بھولے ہر حالت سے مطلع کرتی رہو۔ طبیعت بحمد اللہ رہتی ہے۔

(۳)

۲۲ اپریل ۱۹۱۶ء

حضرت صاحب قبلہ دام اقبالہٗ

تسلیم فدویانہ کے بعد عرض ہے کہ سات روز تک وہ جیل میں رکھے گئے ۱۹ اپریل کو حسبِ معمول صبح کو میں ملنے کے لئے گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ موٹر میں بیٹھ کر گئے۔ بہت پوچھا۔ سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا کسی نے نہ بتایا کہاں گئے دوسرے روز کلکٹر سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ للت پور بھیج دیئے گئے۔ اب وہیں رکھے جائیں گے۔ میں نے خط وغیرہ کے لئے پوچھا کہا ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دیکھئے کیا ہونا ہے۔

والدۂ نعیمہ

(۴)

۲۴ اپریل ۱۹۱۶ء

جناب حضرت قبلہ

تسلیم فدویانہ قبول فرمایئے۔ کل جناب کی خدمت میں عریضہ ارسال کرنے کے بعد شام کو حضرت کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ مجھے خود بھی آپکے خط کا انتظار کا خیال تھا مگر دیر اس لئے ہوئی کہ کوئی نئی بات معلوم ہو تو عرض کروں مبین الحسن آویں تب کچھ معلوم ہو۔ میرے عریضے کا جواب جلد عنایت فرمایئے گا۔ حسرت کو کیا کرنا چاہیئے۔ للت پور میں بے جرم و خطا رہنا چاہیئے یا خدانخواستہ جیل میں

زندگی گذارنا چاہیئے۔ بہر حال پریشانی ہے اور میں ہوں۔ خدا پر بھروسہ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ دعا فرمائیے۔ حسرت کو اس بلائے بے درماں سے نجات ملے خیریت سے گھر آئیں۔ فرمائیے۔ میں اب کیا کروں۔ سخت پریشان ہوں باقی سب خیریت ہے۔ نعیم کو بخار ہے۔ میں بھی عرصہ سے بیمار ہوں۔ خدا حسرت کی مجبوریوں کو دور فرمائے۔ (آمین)

(۵)

۲۵ اپریل ۱۹۱۶ء

از علی گڑھ

حضرت صاحب قبلہ

تسلیم فدویانہ قبول فرمائیے۔ مبین الحسن حسرت صاحب کے پاس سے شب کو آئے حسرت کے حالات سے آگاہی ہوئی۔ کل سے سلسلہ وار سورۂ انفال کی آیتوں پر عمل ہے ان آیتوں کا ورد اس لئے جاری ہے کیونکہ کل شب میں قرآن کھولا۔ تو میری نظر سے وہی صورتیں گذریں۔

والدۂ نعیم

(۶)

۲۷ اپریل ۱۹۱۶ء

از علی گڑھ

بعالی خدمت جناب حضرت صاحب قبلہ مدظلہ العالی

تسلیم فدویانہ قبول فرمائیے۔ کل بھی جناب کا ایک گرامی نامہ ہمت افزا ملا دل کو بہت تسکین ہوئی۔ اور آج بھی جناب کا ایک گرامی نامہ ورود فرما ہو کر باعث تسلی ہوا۔ میں نے کل حسب ارشاد حسرت کو خط کلکٹر کے ذریعہ کیونکہ مہینکر کئی خطوں کا جواب نہیں آیا روانہ کیا ہے اور تاکید لکھی ہے کہ شرعاً جو بات ہے اسی کو اختیار کرو۔ دیکھئے ان کے اس بڑھے ہوئے جوش کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ خدا رحم کرنیوالا اور مدد کرنیوالا ہے۔ آج حسرت کا بھی خط آیا۔ لکھا ہے کہ حکم دیا ہے کہ ان کو قید سے آزاد کر دو۔ چنانچہ میں شہر میں ہوں اور درخواست دی ہے کہ مزید غور کرنے کے لئے اگر گورنمنٹ مجھ کو مزید مہلت دے تو اس کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ مجھ کو وہ لکھنؤ یا الہ آباد دو ایک روز کے لئے بھیج دو۔ میں وہاں اپنے دوستوں اور قانونی مشیروں کی رائے حاصل کر سکوں۔ اگر یہ درخواست منظور

ہو گئی تو شاید کوئی صورت فیصلہ نکل آئے۔ اگر منظور نہ ہو گی تو یقیناً پھر مقدمہ حکم عدولی چلایا جائے گا۔ جب تک میں یہاں کے مجسٹریٹ کی رعایت سے آزاد رہونگا اگر موافق نہ جواب نہ آئے گا۔ تو انکار تو کر ہی چکا ہوں۔ حسرت سے مل کر بھین الحسن واپس آئے۔ حال معلوم ہوا۔ اور ایک ایک خط میرے نام لکھا تھا اس میں قرآن مجید کی صورتیں تھیں وہ خط نہیں آیا۔ کل محمد علی کا بھی ایک طویل خط آیا۔ اور لوگوں کی بھی یہی رائے ہے خدا کرے راضی ہو جائیں ورنہ مصیبت تو ہے ہی۔ نعیمہ کو بخار ہے میں بھی بیمار ہوں۔ اور کیا عرض کروں۔

فقط خاکسار والدۂ نعیمہ

(۷)

۲۸ اپریل حضرت صاحب قبلہ

سلام نیازمندانہ قبول ہو۔

بہر حال میں نے آپ سے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ حسرت اپنے دھن کے پکے اور استقلال کے مضبوط ہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے۔ اسی پر بھروسہ ہے خدا حسرت کی ہمت اور حوصلے کو بلند کرے اور جلد کامیاب کرے، آمین۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے اگر خدانہ کردہ قید ہوئے تو مجھے صبر کرنا چاہئے اور خدا سے دعا کرنا چاہئے کہ مجھے اتنی قوت اپنی قدرتِ کاملہ سے عطا کرے کہ کسی صورت سے میں بھی ظالموں سے حسرت کے ساتھ بیجا ظلم کرنے کا انتقام لے سکوں۔ چاہے مجھے بھی قید یا پھانسی کیوں نہ ہو جائے خدا سے دعا کروں گی کہ ان کافروں کو تباہ، برباد اور فنا کرے اور انشاء اللہ میری دعا ضرور قبول ہو گی آپ بھی دعا فرمایئے کہ حسرت کو خدا ثابت قدم رکھے اور محفوظ رکھے باقی خیریت

خاکسار والدۂ نعیمہ

(مولانا کے جس عزم کا ذکر کیا گیا ہے وہ انکے اس خط میں ہے جو انہوں نے ۲۷ اپریل کو بیگم حسرت کو لکھا تھا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے)

بغیر اظہار جرم و موقعہ تردید کسی کو سزا دینا صریحاً ظلم ہے اس لئے ایسے حکم کا بغیر چون و چرا منظور کر لینا بجائے خود ایک گناہ ہے جس کے ارتکاب کی مذہب

اجازت نہیں دیتا کیونکہ اس سے ظلم کو قوت ملتی ہے میں نے اسی بنا پر اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اب گورمنٹ کیا کرے گی اس کا حال کل پرسوں تک معلوم ہو جائے گا۔

(۸)

۲۹ اپریل ۱۹۱۶ء

از علی گڑھ

تسلیم فدویانہ قبول فرمائیے۔ آج آپ کا گرامی نامہ اور کل حسرت کے دو خط اور آئے۔ ایک لفافہ ہے جس کا ذکر میں نے پہلے کیا تھا۔ لکھا ہے۔ کہ مولوی عبدالباری صاحب قبلہ کو میرا خط بھیج دو اور سلام لکھو لہٰذا اس کی نقل ضروری مرسل ہے (۲۶ اپریل کا لکھا ہے) "تم نے لکھا کہ نظربندی کو قبول کر لینا چاہیئے۔ یہ ظاہر اچھا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن میں نے قرآنِ مجید سے ہدایت طلب کی تو اتفاق سے سورۂ انفال کی تلاوت کا سب سے پہلے اتفاق ہوا۔ اس سورۃ سے پڑھنے کے بعد میرا دِل مضبوط ہو گیا۔ اور میں نے عہد کر لیا کہ ظلم کے سامنے عاجزی سے کبھی سر نہ جھکاؤں گا کیونکہ ایسا کرنا گویا ظلم کی تائید کرنا ہے اور یہ خود بجائے ایک گناہ ہے۔ آخر میں چند آیتیں اسی سورۃ کی نقل کرتا ہوں۔ تم ان کو قرآن شریف میں دیکھنا اور اس کے ترجمہ کو پڑھنا۔ اس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ تمہارے دِل سے بھی وسوسہ جاتا رہے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں انشاء اللہ آخر میں ہمیں کامیابی ہو گی۔" (اس کے بعد انہوں نے سورۂ انفال پارہ نہم کی نو آیات درج کیں۔ اور لکھا کہ یہ آیتیں "نہایت اہم اور میرے حسبِ حال ہیں اب اپنے معاملہ کی نسبت معلوم کرو۔ کہ میں ہرگز ہرگز حکومت کے حکم کو تسلیم نہ کروں گا۔ مقدمہ ہونے دو۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں خوب خوب جواب دوں گا۔ اس کے بعد اگر قید ہی ہونا ہے تو کچھ مذائقہ نہیں۔ میں نے چونکہ حکم سے انکار علی گڑھ ہی میں کر دیا تھا اس لئے مقدمہ بھی غالباً وہیں ہو گا دو چار روز میں اس کے متعلق جواب آجائے گا اس وقت حال معلوم ہو گا۔ میں نے ایک غزل راہ میں لکھی تھی اس کی نقل منسلک ہے

سر یہ حاضر ہے جو ارشاد ہو مر جانے کو
کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو

دانشِ بخت ہے بے دانشیِ شوق کا نام
لوگ دیوانہ نہ سمجھیں ترے دیوانے کو

بھول جاؤں میں انہیں ہو نہیں سکتا ناصح
آگ لگ جائیو ظالم ترے سمجھانے کو

دیکھ لیں شمع کو نا شیروف کے منکر
جل بجھی خود بھی جلایا تھا جو پروانے کو

ہو کے سیراب کرمِ دل سے دعا دوں ساقی
ایک بار اور بھی بھر دے میرے پیمانے کو

فرقتِ یار میں دیکھی ہے جو گھنگھور گھٹا
اشکِ خوں آنکھ میں آمادہ ہے برسانے کو

روح کہتی ہے مری جان ہے وہ نورِ جمال
کر دیا جنّتِ مستور جو کاشانے کو

برق کا قول مجھے یاد ہے اب تک حسرت
زندگی کہتے ہیں دنیا سے گزر جانے کو

(۹)

۴؍ مئی ۱۹۱۶ء
از علی گڑھ

بہ عالی خدمت حضرت صاحب قبلہ مدظلہ العالی

تسلیم فدویانہ قبول کیجئے۔ ۲۹؍ اپریل کو میں نے ایک عریضہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ مگر اب تک جواب سے محروم ہوں خیال ہوتا ہے کہ شاید نہیں پہنچا۔ انتظار ہے کہ حسرت کے پاس سے پرسوں خط آیا تھا سلام کے بعد آپ کو اور ابوالکلام کو لکھا ہے کہ آپ صاحبوں کے خطوط پہنچے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ مشورہ آپ دونوں صاحبوں کا غلط ہے کیونکہ قرآن صاف

کہتا ہے۔ سورہ آل عمران پارہ ۲۵ میں فیٔ وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ۔ مولانا نے ۳۰ اپریل کو للت پور میں جو غزل لکھی ہے وہ حاضر ہے۔

ڈرے کیا قہر دشمن سے بھلا دل[1]
قوی ہے وعدۂ حق سے میرا دل

سہارا کیا نہیں کافی تمہارا
نہ ڈھونڈے ہے کسی کا آسرا دل

لگا دو آگ عذرِ مصلحت کو
کہ ہے بیزار اس شے سے مرا دل

لڑا کر آنکھ اس جانِ جہاں سے
نہ ہوگا اب کسی سے آشنا دل

لئے افکار گوناگوں کے جھگڑے
ترے غم کو نہ دے کیونکر دعا دل

ترے دردِ محبت کی بدولت
ہوا ہے منزلِ صدق و صفا دل

بڑی درگاہ کا سائل ہوں حسرت
بڑی امید ہے میری بڑا دل

قوی دل، شادماں دل، باصفا دل[2]
ترے عاشق نے بھی پایا ہے کیا دل

جفا کاری ہے تسلیمِ ستم بھی
نہ ہوگا تابعِ جور و جفا دل

غلط ہے قولِ عقلِ مصلحت کوش
نہ اس جانب کرے گا اعتنا دل

نہ مانوں گا نصیحت میں کسی کی
کہ ناصح سب سے بہتر ہے مرا دل

توانائے صداقت ہے تو ہرگز
نہ ہوگا پیروِ باطل مرا دل

یہ غزلیں حضرت نے آپ کی خدمت میں ارسال کرنے کو لکھا ہے حضرت ابھی اسی حالت سے ہیں گورنمنٹ کے دیئے ہوئے مکان میں رہنے سے انکار کر دیا ہے دن کو کسی اور مکان میں اور رات کو مسجد میں سوتے ہیں دیکھئے کیا حکم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اپنے نیک بندوں کے ساتھ برائی نہیں کرے گا۔ اس کا وعدہ سچا ہے وہ ہم مسلمانوں کے ساتھ ضرور بھلائی کرے گا اور مدد کرے گا۔ خدا ہم سب مسلمانوں کو احکام الٰہی بجالانے کی توفیق عطا فرمائے اور مفصل حالات بعد کو عرض کروں گی آپکے پاس سے جواب نہیں آیا۔ اس لئے اندیشہ ہے کہ شاید آپ کو میرا خط نہیں پہنچا۔ التماس ہے دعا فرمایئے۔ خدا حضرت کی تکلیف رفع فرمائے۔ آمین۔

فقط خاکسار والدہ نعیمہ

جواب:۔

تمہارے خط کا جواب فوراً دیتا ہوں۔ معلوم نہیں کس خط کا جواب نہیں ملا۔ اللہ تعالےٰ فضل الحسن کو صراطِ مستقیم پر رکھے۔ اس سے بڑھ کر ہماری اور کوئی تمنا اپنے بھائی کے لئے نہیں ہو سکتی ہے میں نے خود ارادہ کر لیا ہے کہ جیسا مشہور ہے سفر اجمیر شریف میں میری نظر بندی ہو گی۔ میں احرام باندھوں گا اور مکہ مکرمہ کا ارادہ کروں گا گھر سے ہجرت کی نیت ہو گی اور خدا کے دشمنوں سے عداوت کا استحکام ہو جائے گا۔ باوجود اس کے مولوی فضل الحسن سے میرے مشورہ کو پھر کہہ دیجئے۔ کہ خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کریں ھٰذا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ کو ملحوظ رکھنا چاہئے اور حضورؐ کا اسیر الامور کو اختیار کرنا متواتر ہے اعلاء کلمتہ الحق مدِ نظر ہو تو ہر کام آسان ہے اور اہانتِ مسلم اگر متیقن ہو ہر گز عجلت نہیں کرنی چاہئے۔ ہمارا مشورہ بالکل صحیح ہے اور مولوی فضل الحسن نے فما ھو پر غور نہیں کیا۔ وکاین من نبی قاتل معہ ربیون کثیر بہ معیت امام عادل کے اور وہ جمعیت اہل سلام کے لئے تقویت کا باعث ہے جس پر بھروسہ کیا جانا ضروری ہے اور بدقسمتی سے ابھی ہم دونوں اس سے محروم ہیں تجاوز خدا و اللہ

میں خیریت نہیں۔ تاہم خدا سے اپنے اور ان کے اور آپ کے لئے دعا استقامت کی کرتا ہوں۔

(نوٹ) "نظر بندی کو قید پر ترجیح دینے کا مسئلہ اصل میں مولانا، مولانا عبدالباری مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی کے درمیان بنائے اختلاف تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر مولانا کی سیاسی زندگی میں آئے گا۔ یہاں مولانا، بیگم صاحبہ اور مولانا عبدالباری کے درمیان جو خط و کتابت ہے اس کی بنیاد یہی مسئلہ ہے۔ مولانا جیل جانے کو ترجیح دیتے تھے اور ان حضرات کا اصرار تھا کہ نظر بندی قبول کر لیں۔"

(۱۰)

۵ رمئی ۱۹۱۶ء

از علی گڑھ

بہ عالی خدمت جناب حضرت قبلہ مدظلہ العالیٰ

تسلیم فدویانہ قبول فرمایئے۔ افسوس آج آپ کا نوازش نامہ میرے لئے مزید رنج کا باعث ہوا۔ خداوند تعالیٰ آپ بزرگوں اور ہم غریبوں پر اپنی رحمت کی نظر رکھے اور مدد کرے۔ اب اسی کا سہارا اور اسی پر بھروسہ ہے آپ سے کچھ عرض و معروض کر کے طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے صد افسوس آج کی وحشت اثر خبر سے رہی سہی امید وہ بھی جاتی رہی خدا آپ سب کو آپ آپ کو اپنے امن و امان میں رکھے اور بامراد کرے حسرت کا خط کل آیا تھا کہ آپ کو میں خط لکھ رہا ہوں (یہ خط سیاسی زندگی میں ملاحظہ فرمایئے) کہ ایک حکم آیا نظر بندی کے متعلق کہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا جائے گا۔ مگر اس حکم کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے وظائف سرکاری مد خیرات سے دیئے جاتے ہیں محمد علی صاحب اور شوکت علی صاحب کو جو وظیفہ ملتا ہے وہ بھی اسی مد سے ملتا ہے انہوں نے اسے منظور کر لیا کیونکہ وہ منظور کر سکتے تھے مگر میں نہیں کر سکتا کیونکہ سادات کے لئے مد خیرات یا مد زکوٰۃ سے قبول کرنا حرام ہے چنانچہ میں نے اسی حکم پر لکھ دیا کہ قواعد مذہب کی رُو سے میں کسی قسم کا وظیفہ نہیں لے سکتا۔ آج بھی خط آیا لکھا ہے کہ میں نے اپنے خرچ سے ایک تار بھیجا اور دو درخواستیں بھیجیں کسی کا اب تک جواب نہیں آیا۔ یعنی آج ۵ رمئی کو میں نے مجسٹریٹ للت پور

کو لکھا ہے کہ کل شام تک یعنی ۲؍مئی تک مجھے جواب تار کے ذریعہ منگوا دیجئے ورنہ شام تک للت پور سے چلا جاؤں گا چنانچہ حدودِ شہر کے باہر وہ شاید مجسٹریٹ کے حکم سے گرفتار کر لئے جائیں اور غالباً مقدمہ چلایا جائے یا دیکھئے کیا ہو وہاں خدانخواستہ ہیضہ ہے اس لئے اور بھی طبیعت پریشان ہے خدا اپنی حفاظت میں رکھے آپ کا قصد کب تک اجمیر شریف روانگی کا ہے میں نے ۲۹؍اپریل کو ایک طویل خط حسرت کے خطوط کی مفصل نقل اور آیتوں کی نقل اور دیگر حالات کا جناب کی خدمت میں روانہ کیا تھا اس کا جواب مجھے نہیں ملا۔ خیر خدا مالک ہے آج پھر حسرت کو خط لکھ رہی ہوں معلوم نہیں ان کو ملتا بھی ہے یا نہیں اور معلوم نہیں انہوں نے اور کیا کارروائی کی ہو۔ خدا حافظ ہے مددگار ہے اور کیا کہوں۔ یہاں خیریت ہے اور بالکل سناٹا ہے۔ کچھ حال نہیں معلوم ہوتا۔ طبیعت سخت پریشان رہتی ہے۔ وہاں کے اطراف کا حال معلوم ہوا اُمید ہے کہ مزید حالات سے بھی اطلاع دیجئے گا خدا سے امید ہے کہ اپنے فضل وکرم سے ہمیں ہر بلا اور ہر مصیبت سے امان میں رکھے گا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین۔ محمد علی صاحب اور شوکت علی صاحب کا بھی خط آیا۔ وہ بھی غریب کیا کر سکتے ہیں ابوالکلام کا بھی خط آیا خدا اپنے مسلمان بندوں کو نیک ہدایت دے اور ہمت اور استقلال عطا فرمائے

فقط خاکسار والدہ نعیمہ

(۱۱)

۴؍جنوری ۱۹۱۶ء

از علی گڑھ

حضرت صاحب قبلہ مزاج اقدس

کل جیل سے حسرت کا خط آیا

(۱۲)

۵؍جون ۱۹۱۶ء

از علی گڑھ

حضرت صاحب قبلہ دائم اقبالیٰ

تسلیم فدویانہ کے بعد عرض ہے کہ ایک کارڈ روانہ کر چکی ہوں ملاحظہ سے گزرا ہو گا۔ خواجہ مجید صاحب دلبعد میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے لئے بہت بڑے لیڈر بنے) نے ایک مدت سے یہ امید رکھ کر کل میرے دریافت کرنے پر صاف جواب دے دیا کہ "مناسب یہی ہے کہ آپ مجھ سے کوئی خدمت نہ لیں نیز آپ کے سوا یہاں تو کوئی نظر نہیں آتا۔ جو اس ایک معمولی سے کام کو بھی کر دے گا۔ آپ بیکس خصوصی حسرت کے حال پر مہربانی فرما کر جناب شیخ شاہد حسین بیرسٹر کو میری اور حسرت کی طرف سے ایک میموریل انگریزی میں تیار کر کے جس کا مسودہ مختصر میں نے دوسرے صفحے پر لکھ دیا ہے۔ لیفٹیننٹ گورنر کو روانہ فرما دیجئے اس کے متعلق جو صرف ہے وہ میں دینے کے لئے حاضر ہوں اور میرا میموریل بھی انگریزی میں ترجمہ کر کے لیفٹیننٹ گورنر کے پاس اور اگر مناسب ہو تو ایک کاپی وائسرائے کے پاس بھی بھیج دیں۔ اس میں اور دو ایک باتوں کا اضافہ کر دیجیے گا۔

(۱۳)

۱۲ رجون ۱۹۱۶ء از علی گڑھ

دفتر تذکرۃ الشعراء

حضرت صاحب قبلہ۔ تسلیم فدویانہ قبول فرمائیے۔

آپ کا اس وقت تک باوجود سخت انتظار کوئی عنایت نامہ نہیں آیا سخت انتشار ہے۔ ۵ رجون کو رجسٹری شدہ میموریل بھیجا تھا معلوم نہیں کیا ہوا۔ آپ نے یقین ہے روانہ فرما دیا ہو گا لیکن کوئی جواب بھی موصول نہیں ہوا۔ میں امید کرتی ہوں کہ جلد جواب سے تفصیلی عنایت نامہ فرمائیے گا آج الٰہ آباد سے ڈاکٹر تیج بہادر سپرو (ہندوستان کے مشہور قانون دان اور لبرل لیگ کے سرکردہ رہنما جنہوں نے ڈاکٹر جیکر کے ساتھ مل کر ہندوستانی سیاست میں نمایاں کردار ادا کیا) نے نقل کر مع اپنے بتائے ہوئے وجوہات اپیل مجھے واپس کر دیئے۔ کہ آپ جلد کسی عزیز کو بھیج کر اپیل دائر کرا دیجئے (خود تکلیف گوارا نہیں کی) اب میں سخت پریشان ہوں کہ کیا کروں۔ الٰہ آباد میں ظہور احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لاء

نے دیہ بزرگ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر اسمبلی کے ہونے والے منتخب امیدوار تھے) نے روح الحسن بھائی سے پختہ وعدہ کیا تھا کہ پیروی کروں گا ان کو بھی میں نے روزانہ خطوط لکھے۔ کوئی جواب نہیں دیا دیہ ہمدردی اور حوصلہ کی بات ہے) مجبوراً آج ناصر الحسن اپنے چھوٹے بھائی کو جو دوکان میں رہتے ہیں الہ آباد ظہور احمد کے پاس مع نقل وغیرہ بھیجا ہے اگر وہ چلے گئے تو اچھا ہے ورنہ آپ ہی کا صرف آخری سہارا باقی رہ جائے گا۔ لہٰذا آپ اسی حالت میں میری مجبوریوں پر رحم فرما کر شاہد حسین صاحب یا کسی اور کے ذریعہ اپیل جانسی میں کر دیجیے گا (شاہد حسین صاحب نے از خود مولانا عبدالباری کو مقدمہ حسرت کی پیروی کی پیش کش کی تھی اور اسی بنیاد پر مولانا عبدالباری نے مولانا کو اطلاع دی ہے اور اسی وجہ سے بیگم صاحبہ بار بار ان کا نام لے رہی تھیں) میں نے ناصر کو خط لکھ دیا ہے کہ اگر الہ آباد سے ظہور احمد نہ جائیں تو وہ آپ کے پاس مع کاغذات چلے جائیں۔ آپ ناصر الحسن سے سب کاغذات لے کر بیرسٹر صاحب کو دے دیجئے اور جلد جھانسی بھجوا دیجئے ناصر کو کچھ روپیہ اخراجات بیرسٹر کے زاد راہ وغیرہ کے لئے دے دیئے ہیں جو ضرورت ہو آپ ان سے لے لیجئے گا۔ جواب سے جلد سرفراز فرمایئے۔ اور شاہد حسین صاحب کو اپیل کے لئے آمادہ رکھیئے۔ خدا بھلا کرے گا ان کا جو اس وقت ہمارا ساتھ دیں۔ دیوان حافظ بھی ناصر کو آپ کے دیکھنے کے لئے دے دیا ہے۔ آپ اس کو دیکھ کر واپس فرما دیجیے گا۔

فقط

(۱۴)

۱۵؍جون ۱۹۱۶ء از علی گڑھ

حضرت صاحب قبلہ، تسلیم فدویانہ قبول کیجیے

میرے دو عریضے خدمت گرامی میں پہنچے ہوں گے۔ مگر افسوس ہے کہ کسی کا جواب نہیں مرحمت ہوا۔ معلوم نہیں۔ بیرسٹر صاحب نینی تال سے تشریف لائے یا نہیں۔ آج صبح کو ناصر الحسن الہ آباد سے واپس آئے۔ ظہور احمد بیرسٹر نے نقل

تحریری وجوہات اپیل حسرت کے پاس ڈسٹرکٹ جیل جھانسی بھیج دی ہے کہ وہ اپیل دائر کر دیں (خود تشریف نہیں لے گئے) اب غریب وہاں کیا کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر تیج بہادر سپرو، اور بیرسٹروں کی رائے ہے کہ اپیل میں فیصلہ کلکٹر جھانسی کا منسوخ ہو گا اور پھر سے تحقیقات ہوگی اور آزادی ہو گی غنیمت تھا۔ مگر افسوس ہے کہ کوئی وکیل بیرسٹر جھانسی جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا کیسی مجبوری اور افسوس کا مقام ہے بواپسی ڈاک مطلع کیجئے کہ شاہد حسین صاحب آئے یا نہیں۔ کب آئیں گے۔ جھانسی جائیں گے یا نہیں۔ آپ کو خود ہی خیال ہو گا۔ میرے لکھنے کی ضرورت نہ تھی مگر طبیعت تنہائی کی وجہ سے سخت پریشان ہے اور مدت اپیل کم رہ گئی ہے اس لئے اور بھی انتظار ہے۔ دیکھئے اب حسرت کیا کرتے ہیں وہاں ڈاکٹر تیج بہادر سپرو، صاحب نے بھی جواب دے دیا کہ مجبور ہوں حالانکہ انہوں نے پہلے وعدہ کیا تھا خیر خواجہ مجید صاحب (مشہور نیشنلسٹ لیڈر) کا کوئی ہرج نہ تھا کہ اپیل دائر کرنے کے لئے جھانسی جاتے خیر کوئی ہماری مصیبت میں شریک نہ ہوں۔ شاید اللہ کی مرضی ایسی ہی ہے مجبوراً دو سال قید برداشت کر لیں گے۔ کیا کیا جائے۔ ایک اب آپ کا سہارا باقی ہے دیکھئے آپ کے پاس سے کیا جواب آتا ہے خدا خیر کرے شاہد حسین آ گئے ہوں اور جھانسی ڈسٹرکٹ جیل بذریعہ کلکٹر یا جج جھانسی حسرت کے پاس چلے جائیں۔

فقط

(نوٹ، شاہد حسین صاحب بھی جھانسی تشریف نہیں لے گئے)

(۵)

۱۲ر جون ۱۹۱۶ء
از علی گڑھ

دختر ارد وئے معلی

حضرت صاحب قبلہ۔ تسلیم فدویانہ قبول کیجئے۔ آج حسرت کا جھانسی سے خط آیا۔ غزلیات اور من جملہ اور باتوں کے آپ کے متعلق بھی یہ عرض ہے کہ مولانا عبدالباری صاحب کو جس روز یہ خط پہنچے اسی دن خط لکھا کہ اس

بار ہیں عرس میں حاضری سے معذور ہوں اس لئے یہ غزل بطور نذر حاضر کرتا ہوں۔ میری جانب سے درگاہ شریف میں بعد فاتحہ پیش کر دی جائے
میں نے کل ایک عریضہ ارسال خدمت کیا ہے۔ عرض کیا ہے کہ اپیل حسرت نے خود ہی بذریعہ سپرنٹنڈنٹ دائر کر دی ہے پہلی جولائی کو پیشی مقرر ہوئی ہے خاموش نہیں رہا جاتا۔ چونکہ فطرت انسانی انقلاب پسند واقع ہوئی ہے اس لئے کوشش کچھ نہ کچھ ہوتی رہے گی۔ باقی اللہ تعالےٰ پر بھروسہ تو ہے ہی۔ جو اس کی مرضی ہے ہو کر رہے گا۔ باقی خیریت۔ زیادہ ادب۔ فدویہ نعیمہ بہ ادب تسلیم گزار ہے۔
فقط

(۱۶)

۲۴ جون ۱۹۱۶ء
از علی گڑھ

دختر ادوئے معلیٰ

حضرت صاحب قبلہ۔ تسلیم فدویانہ قبول فرمائیے۔ آج آپ کا عنایت نامہ باعث تسلی ہوا۔ اب آپ شاہد حسین کا یا اور کسی بیرسٹر کا خیال نہ فرمائیے گا۔ جانے دیجئے، سب لوگ بے وجہ۔ حد درجہ خائف ہیں اور یہی ہلاکت کے نشان ہیں خدا رحم فرمائے۔ ۱۲ مئی کو حسرت کا خط جیل سے آیا تھا۔ من جملہ اور بہت سی غزلوں کے ایک غزل حضرت مولانا مرشد عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی قدس سرہ العزیز کی شان میں لکھ کر درگاہ شریف کے نذر کرنے کو آپ کی خدمت میں بھیجنے کو لکھا تھا۔ چنانچہ میں نے آپ کی خدمت میں روانہ کر دی اور ایک مخمس خدمت حضرت امیر خسرو میں نقل ہے کل وہ عریضہ آپ کو مل گیا ہوگا۔ امید ہے رسید سے مطلع کیجئے گا۔ آج حسرت کا ایک اور خط جیل سے آیا ہے۔ لکھا ہے۔ میں نے اس کی بھی درخواست دی تھی کہ عدالت میں میں خود پیروی کر سکوں تاکہ میرے وکیل کو مجھ سے مدد پہنچے وغیرہ۔ یہ درخواست بھی منظور ہو گئی۔ اب اگر ظہور احمد بیرسٹر الٰہ آباد چلے جائیں گے تو اچھا ہے زادہ اہ بھیج دیا ہے کیونکہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ پیشی پر چلے جائیں گے

ورنہ وہ خود پیروی مقدمہ کریں گے۔ ممکن ہے کوئی وکیل جھانسی میں ہو جائے (یہ موصوف وعدے کے باوجود تشریف نہیں لے گئے) میں نے ایک تار ابوالکلام کو دیا تھا۔ انہوں نے کلکتہ سے کسی بیرسٹر کو سو روپیہ فیس وغیرہ دیکر جھانسی بھیج دیا اگر پہلی جولائی تک وہاں مقیم رہ کر پیروی کرے تو اچھا ہے۔ ویسے میں نے محض احتیاطاً رودلی شریف سے سید افضال حسین کو جھانسی حسرت کے پاس بھیج دیا تھا۔ ۱۵ر جون کو تاکہ ۲۳۔ جون تک وہاں اپیل دائر کرنے کا کوئی انتظام کریں۔ چنانچہ ان سے غالباً حسرت کو کچھ مدد ملے گی۔ باقی اللہ مددگار ہے۔ نظمیں اور غزل حسب ارشاد دوبارہ ارسال خدمت ہے ایڈیٹر صاحب۔ سول اینڈ ملٹری ناظر کو بھجوا دیجئے گا۔ فقط

خاکسار فدویہ اہلیہ حسرت موہانی

(۱۷)

۲۷ر جون ۱۹۱۶ء

از علی گڑھ

دختر اردوئے معلیٰ

حضرت صاحب قبلہ۔ تسلیم فدویانہ قبول کیجئے

آپ کے دو عنایت نامے مجھے ملے۔ کیفیت معلوم ہوئی۔ چونکہ آپ نے حسرت کو شاد حسین صاحب کے پیروی کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ اسی لئے اسی امید پر آپ کو بار بار تکلیف دینے کی ضرورت پیش آئی اور حسرت نے کچھ زائد لکھا بھی نہیں تھا۔ البتہ میری ذاتی کوشش تھی وگرنہ وہ جا کر اپیل دائر کر دیتے تو بہتر تھا۔ اللہ پر بھروسہ تو ہے۔ ان کے دوستوں کو حسرت سے شکایت ناحق ہے وہ غریب تو اب جیل میں ہیں۔ کسی سے کچھ کہتے سنتے نہیں۔ جس کا کوئی پرسان حال نہیں اس کا مددگار اللہ تعالیٰ تو ہوتا ہی ہے چنانچہ میں نے کوشش نہ کی خدا کے فضل و کرم سے حسرت کی اپیل بغیر کسی وکیل، بیرسٹر کے منظور ہو گئی اور پیشی پہلی جولائی کی مقرر ہے۔ اگر کوئی پیشی کے دن گیا تو گیا ورنہ جہاں اب تک خود ہی کچھ کیا کرایا ہے یہ بھی مرحلہ طے کر لیں گے خواہ نتیجہ کچھ ہی ہو۔ آپ نے غالباً غزلیں الناظر کو

بھیج دی ہوں گی الناظر کل میرے نام آیا۔ میں نے کل ہی حسرت کو بھیج دیا ہے۔ میری جانب سے ان کا شکریہ اور کیا عرض کروں۔ باقی ادب نعیمہ تسلیم گزار ہے۔

خادمہ والدہ نعیمہ

(۱۸)

اکتوبر ۱۹۱۶ء
از علی گڑھ

دختر اردوئے معلّی

بہ عالی خدمت جناب حضرت صاحب مدظلہ العالیٰ

تسلیم فدویانہ قبول فرمایئے مجھے سخت افسوس ہے کہ ایک زمانہ سے کچھ تو اپنی علالت کے سبب اور کچھ عدیم الفرصتی کے باعث نوبت تحریر نہ آئی۔ اللہ تعالیٰ سے قوی امید ہے کہ جناب کا مزاج بہ خیر ہو گا کل حسرت کا جیل سے خط آیا آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے۔ وہ اپنے حال میں خوش ہیں۔ دعا فرمایئے کہ وہ بہ عافیت رہیں جہاں کہیں رہیں۔ غزل مندرجہ بالا شہید صاحب کو اکتوبر نمبر۔ الناظر کے لئے مرحمت فرمادیں اور انہوں نے ۲۰ ستمبر کو ایک غزل عرش پر ہے۔ مزید ان کو روانہ کی ہے آپ شہید صاحب سے فرما دیجئے اور کیا عرض کروں۔ حسرت کے حالات بدستور ہیں۔ امید ہے جناب خیریت مزاج سے مجھ خاکسار کو مطلع فرمائیں گے۔ فقط

خاکسار اہلیہ حسرت موہانی

(۱۹)

۲۶ نومبر ۱۹۱۶ء
از علی گڑھ

بہ عالی خدمت حضرت صاحب قبلہ مدظلہ العالی

تسلیم فدویانہ کے بعد عرض یہ ہے کہ کئی روز سے ارادہ کر رہی تھی کہ عریضہ لکھوں مگر علالت طبع اور پریشانیاں مانع رہیں۔ مختصراً عرض ہے کہ میں دوبارہ ۱۸ نومبر کو آگرہ گئی اور میموریل وہاں سے روانہ کر دیا اور ۲۰ محرم کو

دفعتاً جیل الٰہ آباد میں جیلر نے حسرت کے ساتھ خلاف قاعدہ سختیاں کیں یعنی ان کا ضروری سامان لوٹا۔ جوتا وغیرہ وغیرہ زبردستی لے گیا۔ قواعد جیل بھی حسرت نے دیکھا ہے جس کی رُو سے جھانسی جیل میں اور اب تک الٰہ آباد میں جن چیزوں کے رکھنے کے مجاز تھے مگر جیلر نے صاف کہہ دیا کہ میں سختی کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ شاید خفیہ پولیس رپورٹ کردے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے مسلمان قیدی کے ساتھ کوئی رعایت کی تو میری نوکری جاتی رہے گی حالانکہ اس نے رعایت بجز سختی کے نہیں کی۔ کھانا بھی دہی جوار باجرہ مٹی ملی ترکاری جو درد گردہ کی وجہ سے حسرت کے لئے سخت مضر ہے چنانچہ حسرت نے عہد کر لیا ہے کہ ۱ محرم سے جھگڑا شروع ہے اگر جیلر یزیدی پر آمادہ ہے تو میں بھی بحمد اللہ پیروئ حسین کے لئے اچھی طرح تیار ہوں۔ نتیجہ خواہ کچھ ہو اور روزہ رکھنا شروع کر دیا برائے نام روزہ صحیح ہونے کے خیال سے پانی پیتے رہے پانچ تک یعنی ۱۱ محرم تک مطلق کچھ نہ کھایا۔ یہ واقعات مجھے ایک الٰہ آبادی صاحب سے معلوم ہوئے تھے میں نے جملہ حالات بھی لکھوا کر بھجوا دیئے جس کا جواب بھی ان کو مل گیا کہ انگریزی میں میموریل دے دیا گیا الٰہ آباد پہنچکر جیل کے واقعات سے پردہ اٹھے گا۔

(۴۰)

۲۳ر فروری ۱۹۱۷ء

از علی گڑھ دفتر اردوئے معلی

مولانا حضرت صاحب قبلہ مدظلہ العالی

تسلیم بعد تنظیم عرض یہ ہے کہ عرصہ ہوا میں نے جناب قطب میاں صاحب کے نام عریضہ بدیں وجہ دریافت خیریت مزاج عالی ارسال کیا تھا۔ انتظار رہا۔ مگر جواب سے ہنوز محروم رہی۔ امید ہے بفضل تعالیٰ مزاج گرامی بخیر ہوگا اور امید ہے کہ اب اس عریضہ کی رسید اور صحت مزاج سے مطلع کی جاؤں گی۔ تازہ واقعہ یہ ہے کہ حسرت کا جیل میرٹھ سے آج حسب ذیل خط آیا۔ کہ آج ۲ بجے دن کے قریب سپرنٹنڈنٹ پولیس میرٹھ ایک اور انگریز کے ساتھ آئے اور کہا کہ

حکومت تمہیں رہا کرنا چاہتی ہے مگر اس شرط پر کہ مقام کھتور ضلع میرٹھ کے
کسی بنگلہ میں جو لب سڑک ہے نظر بندی کے جملہ قیود کے ساتھ رہنا منظور کرو ان
قیود کی ایک نقل مجھ کو دی. گاڑی بھی ہمراہ لائے تھے. کہ اگر میں چاہوں تو
کھتور چلا جاؤں مگر میں نے اس کو منظور نہیں کیا۔ اور انگریزی میں ایک تحریر
لکھ کر واپس کر دی جس کی ایک نقل بغرض اطلاع روانہ کرتا ہوں میری یہ
تحریر غالباً گورنمنٹ کے پاس جائے گی دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے بظاہر کوئی امید
معلوم نہیں ہوتی بلکہ اندیشہ ہے کہ کہیں دوبارہ حکم عدولی کا مقدمہ نہ قائم ہو
جائے خیر جو کچھ ہو۔ میں نے تو اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے تم بھی صبر کرو
مولوی عبدالباری صاحب قبلہ کو خط لکھنا تو میرا سلام اور سب حال لکھ دینا
اور لکھ دینا کہ میں نے اس موقع پر جو طرز عمل اختیار کیا اسمیں میری خود آرائی کی
ضد کو ذرا بھی دخل نہیں بلکہ بقول حافظ

بارہا گفتہ ام و بار دگر می گویم — کہ من دل شدہ ایں رہ نہ زخود می پویم

دیکھئے کیا ہوتا ہے آج ایڈیٹر ہندوستانی پنڈت کشن پرشاد کول کا خط
آیا جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب نے مسٹن سے مل
کر خاص طور پر حسرت کی رہائی کا ذکر کیا جس پر مسٹن نے وعدہ کیا. کہ اب
بقیہ قید مولانا کی منسوخ کر دی جائے گی اور علی گڑھ میں رہنے کی اجازت دے
دی جائے گی اگرچہ نگرانی رہے گی اور مکان بھی علی گڑھ میں رہنے کے لئے
تجویز ہو رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ مگر واقعات موجودہ تو اس کے خلاف ثابت ہو
رہے ہیں دعا فرمائیے کہ حسرت کو علی گڑھ میں رہنے کی اجازت مل جائے
میرٹھ آتے وقت آپ سے حسن اتفاق سے حسرت سے ملاقات وغیرہ کا بھی
حال حسرت کے خط سے معلوم ہو کر اطمینان قلب ہوا. اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے
نعیمہ بہ ادب تسلیم گذار ہے. جناب قطب میاں کی خدمت میں تسلیم۔ منتظر
خیریت مزاج — خاکسار فدویہ والدہ نعیمہ

(۳۱)

۱۸ / مئی ۱۹۱۷ء

از علی گڑھ دفتر اردوئے معلیٰ

مخدومی و مطاعی مولانا حضرت صاحب قبلہ دائم اقبالہٗ

تسلیم فدویانہ قبول فرمائیے۔ عرصہ ہوا میں نے عریضہ ارسالِ خدمت کیا تھا۔ جس کا دو ہفتہ تک انتظار رہا۔ لیکن اب اکرام الحسن کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ اجمیر شریف لے گئے تھے امید ہے مزاج بہ خیر ہوگا۔ حسرت بدستور جیل فیض آباد میں ہیں مگر صحت کی خرابی کا سلسلہ نہیں دور ہوتا۔ دعا فرمائیے کہ وہ جہاں کہیں رہیں بہ عافیت رہیں دشمنوں کے شر سے محفوظ رہیں میں نے دلی سے حکیم اجمل صاحب سے دوا بھی بھجوائی جس کا استعمال کرتے ہیں مگر پیٹ کی خرابی کی تمام شکایتیں دور نہیں ہوئیں حالانکہ روزے بھی برابر اب تک رکھے جاتے ہیں میں نے کئی بار لکھا بھی کہ اب اس عہد کو ترک کر دو کیونکہ گرمیاں ہیں طبیعت اچھی نہیں۔ جواب یہ لکھا کہ تم کسی کو میرے روزے وغیرہ کا حال نہ لکھا کرو اور جس کو لکھا ہے ان کو بھی لکھ دو کہ کسی اور سے تذکرہ نہ کریں۔ تسخیر بغداد کا ماتم جگر سوز ہے۔ دیکھئے کب اس انقلاب کا دور ختم کرے خدا ہمارے مایوس دلوں کو شادمانی سے پر کرتا ہے۔ آج جناب مولانا سلامت اللہ صاحب کا مرسلہ عنایت نامہ ملا جس میں جناب الطاف الرحمان صاحب کی غزلیات حسرت کی کہی ہوئی نقلیں نہ خوب ہیں۔ قصیدہ بھی بہت خوب ہے زخمی صاحب کی غزل بھی آئی تھی۔ میں نے آج ہی حسبِ ارشاد سلامت اللہ صاحب حسرت کو جیل بھیجدیا۔ آپ مولانا سلامت اللہ صاحب سے فرمائیےگا الناظر کا انتظار ہے کیا ابتک شائع نہیں ہوا معلوم نہیں بغداد والی غزل بھی شائع ہو چکی یا نہیں اور اس سے پہلے جو نظم حسرت نے ارسال کی تھی وہ بھی درج ہوئی کہ نہیں۔ میں نے جوابی خط اس لئے لکھا تھا کہ اگر "الناظر" میں شائع نہ ہو سکے تو کسی اور پرچہ کو بھیج دوں مگر اس کے جواب سے ہنوز محروم ہوں۔ محمد علی صاحب چھنڈوارہ کی غزل پہلے روانہ کر چکی ہوں۔ مکرر یہ گذارش ہے کہ حسرت کی صحت کے لئے دعا فرمائیے۔ فقط منتظر خیریت۔

خاکسار والدہ نعیمہ

(۲۲)

۳۰ مئی ۱۹۱۷ء

از علی گڑھ دفتر اردوئے معلی

بہ عالی خدمت جناب حضرت صاحب قبلہ مدظلہ العالی

تسلیم فدویانہ قبول فرمائیے۔ اخبارات سے خصوصاً ۱۸ شعبان کے ہمدم سے آپ کو حسرت کے واقعات رہائی سے اطلاع ہو گئی ہو گی جیل سے رہائی پر نظر بندی کا حکم تو نہیں دیا گیا۔ لیکن چونکہ کچھ شرطیں ابھی اور باقی تھیں اس لئے ان کے فیصلے تک حسرت علی گڑھ نہیں آئیں گے۔ ضلع میرٹھ ہی میں رہیں گے مگر اپنی خوشی سے۔ کہ اب تک حسرت کی مرضی کے مطابق کاروائی ہوتی یعنی ۲۱ مئی کو جو تار حسرت کی طرف سے گورنمنٹ کو بھیجا گیا تھا کہ اگر نظر بندی کا نوٹس حسرت کو دیا گیا تو پھر اس سے انکار کریں گے اس لئے بہتر ہے کہ نہ دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ گورنمنٹ نے حسرت کو جواب دیا کہ نوٹس نظر بندی منسوخ کر دیا گیا اور دوسرا مرحلہ علی گڑھ آنے کا باقی ہے۔ دیکھئے میموریل وغیرہ بھیجنے کا انتظام ہو رہا ہے اب جو خدا کی مرضی ہو۔ اگر علی گڑھ نہ بھیجا تو پہلی سی صورت پھر قائم یعنی مقدمہ ہو گا اور اس کا نتیجہ پھر کیا ہو۔ خدا کو معلوم مجھے میموریل وغیرہ کا انتظام تار وغیرہ بھجوانا اور پھر شب برات کے سبب جلد مکان واپس ہونا تھا۔ اس لئے صرف حسرت کے پاس کھٹور جو میرٹھ سے ۱۸ میل دور ہے۔ ۲۲ مئی کو دن بھر اور رات بھر رہ کر ۲۳ کی صبح کو واپس ہو گئی حسرت کمزور بے حد ہو گئے ہیں اب ان کا وزن ۱۱۲ پونڈ رہ گیا ہے شروع میں ۱۵۵ پونڈ تھا۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ دعا فرمائیے کہ جلد خیریت سے علی گڑھ لائے۔ امید ہے مزاج عالی بہ خیر ہو گا۔ باقی خیریت ہے۔

(۲۳)

از کانپور

۳۰ شوال ۱۳۴۱ھ مطابق جولائی ۱۹۲۳ء

تسلیم بعد تعظیم کے عرض ہے کہ عرصہ ہوا خیریت معلوم ہوئی تھی اور اسی وقت خاص طور پر سلام عرض کیا تھا اور حسب ذیل غزل ارسال کرنے کی درخواست

غالباً آپ عرس بانسہ تشریف لے گئے ہوں گے۔ آپ ہمدم کو بشرطیکہ صحت کے ساتھ چھپنے کے لئے مرحمت فرما سکتے ہیں۔ خارجاً معلوم ہوا کہ غالباً مولانا کا اب حیدر آباد سندھ جیل تبادلہ کر دیا گیا۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ یروڈا جیل (پونا) سے دریافت کیا ہے مگر جواب نہ دارد۔ خیر خدا مالک ہے۔ دعا فرمائیے۔ بخیریت ہوں۔ نجمہ سلمہا تسلیم گزار ہے۔ عبدالولی رضوان الحسن بفضلہ خیریت سے ہے سرکاری مراسلہ جو حال میں شائع ہوا ہے وہ بالکل غلط ہے۔

اہلیہ حسرت موہانی

(۲۴)

۱۱ر جمادی الثانی مطابق فروری ۱۹۲۳ء

حسرت روڈ کانپور۔

بعالی خدمت مولانا مدظلہ العالی

تسلیم بعد تعظیم عرض خدمت عالی ہے کہ عرصۂ دراز کے بعد آج خیریت ان کی معلوم کر کے اطمینان ہوا۔ تازہ غزل جناب کی خدمت میں بھیجنے کی تاکید اور خدمت میں سلام عرض کیا ہے اور عرض کیا ہے کہ ہمیں مطلوبہ کتب کی سخت ضرورت ہے کوشش فرما کر کانپور بھجوا دیجئے۔ میں جلد یہاں منگوا لوں گا۔ یحییٰ آئے تھے تو ان سے دیوان برق جس کو جناب نے عنایت فرمایا تھا عاریتاً ملا۔ اس کی کافی احتیاط کروں گی اور آپ کو بعد فراغت واپس مل جائے گا عشرت صاحب نے صرف دو دیوان مشتری اور قائم دس آنے میں دیئے اور ان کے پاس سے فہرست ضائع ہو گئی۔ لہٰذا میں دوسری نقل فہرست کتب بھیجتی ہوں اور فوراً عشرت صاحب کو بلا کر دے دیجئے اور میری جانب سے فرما دیجئے کہ مولانا کے کتب خانہ کے تبادلہ میں جو میرے یہاں فروخت ہوئی جس کی فہرست بھی ملفوف ہے۔ آپ ضرور بالضرور مطلوبہ کتب تلاش کر کے بھجوا دیجئے۔ یا عاریتاً مل سکیں غرض کہ جس طرح بھی ممکن ہو کوشش فرمائیے ظفر الملک صاحب کے یہاں ملیں یحییٰ کہتے تھے کہ شاید ان کے یہاں بھی ہوں۔ اور جناب سے عرض ہے کہ نعیمہ سلمہا کے ربع حمل کے لئے تعویذ ضرور مرحمت فرما دیجئے۔ اب ربع حمل کے دن شروع ہیں نواں مہینہ ہے اس لئے خواہ کمر میں باندھنے کے لئے یا جہاں

آپ ہدایت فرمائیں تاکہ رفع حمل میں آسانی ہو اور بچہ کے گلے میں ڈالنے کے لئے بھی تعویذ مرحمت فرمائیے اور دعا فرمائیے کہ نعیمہ سلمہا بمعہ بچہ کے بفضلہ تعالیٰ تندرست اور اچھی رہے۔ امید ہے کہ مزاج اقدس بہ خیر ہوگا۔ اس مرتبہ کیا آپ خلافت کانفرنس اور علماء کانفرنس کسی میں تشریف نہ لے جا سکے۔ گذارش ہے کہ کتب کی فراہمی کا خیال ضرور رکھئے اور تعویذ بھی ارسال فرمائیے۔

خاکسار بیگم حسرت موہانی

(۲۵)

تنظیم از پونا

لعالی خدمت حضرت صاحب قبلہ

تسلیم مزاج اقدس میرا عریضہ ۲۔ فروری کا آپ کو ملا ہوگا اس میں بھی مولانا کے حسب ہدایت غزلیات اور سلام مع قطب میاں صاحب کے سلام کے۔ آپ نے غزل ملاحظہ فرما کر الناظر کو بھجوا دی گئی اور اس سے قبل بھی عریضہ ملا ہوگا اس کی غزلیں بھی ملاحظہ فرما کر ہمدم کو بھجوا دی ہوگی۔ آج بھی مع آپ کو سلام اور قطب میاں کے سلام کے بعد تازہ کلام ارسال ہے جسکو آپ مناسب خیال کر کے ہمدم وغیرہ کو اشاعت کے بعد ملاحظہ نقل دے دیجئے امید ہے کہ مزاج آپ کا بخیر ہوگا۔

خاکسار بیگم حسرت موہانی

(۲۶)

۲۰ جمادی الثانی ۱۳۴۲ھ

مطابق فروری ۱۹۲۳ء بنگلہ سیٹھ چھوٹانی

جناب عالی تسلیم مزاج اقدس۔ گرامی نامہ ۱۳ جمادی الثانی کا صادر ہوا۔ خیریت مزاج و حالات معلوم کر کے اطمینان ہوا۔ مولانا کی تاکید ہے کہ جب تک میں نہ کہوں نہ جانا۔ دوسرے یہاں میں نے سیف الرسول (وار ڈر) کی اپیل ہائی کورٹ میں وکیل بیرسٹروں کی رائے سے ۲۲ دسمبر کو بمبئی ہائی کورٹ میں دائر کر دی ہے ممکن ہے اس پر دفعہ ۱۶۱ رشوت والی اڑا دی جائے تو مولانا کو بھی اس سے فائدہ ہوگا رشوت کا قصہ بالکل لغو، جھوٹ سراسر خلاف قاعدہ و قانون چلایا گیا ہے

ابھی تاریخ پیشی نہیں معلوم ہوتی غالباً ۸ فروری ہو گی۔ اگر فیصلہ ٹھیک ہوا تو مجسٹریٹ کی صریحاً بے ایمانی کا راز کھل جائے گا۔ خیر علاج برابر کر رہی ہوں میرے مرض کے لئے بجائے کانپور کے پونا کی پہاڑی آب و ہوا ڈاکٹروں کی رائے سے مفید ہے دوسرے یہ بنگلہ بھی شہر سے دور ایسی جگہ واقع ہے پہلے کی بہ نسبت صبح کے وقت طبیعت کسی قدر صاف رہتی ہے باقی جو خدا کی مرضی اس میں کسی کا کیا دخل۔ مولانا نے سلام عرض کیا ہے اور جناب قطب میاں کو خاص طور پر سلام لکھنے کی تاکید کی ہے آپ ان سے فرما دیجئے اور اس مرتبہ بھی چند تازہ غزلیات بغرض ملاحظہ ارسال کرنے کو کہا چنانچہ بعد ملاحظہ ۱، اور ۲، الناظر کے لئے ظفر الملک صاحب کے پاس بھجوا دیجئے گا۔ اور صحیح چھپنے کی تاکید۔ اب تک مولانا کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ جیل و جیلر کا برتاؤ نہایت سخت ہے بلکہ روزانہ کوئی نہ کوئی نئی شرارت کرتا رہتا ہے حال میں مزید تعزیت یہ کی ہے کہ برش، آئینہ سرمہ، قرآن شریف رکھنے کی رحل حتیٰ کہ پانی کا گھڑا تک اٹھوا لیا ہے۔ پانی کی بھی قلت ہے۔ روٹی ایک صبح کو گیہوں کی ملتی ہے وہ بھی بند جوار باجرہ مٹی ملی ہوئی ترکاری خراب ملتی ہے سب سزائیں اس لئے روزانہ دی جاتی ہے کہ کام کیوں نہیں کرتے مگر مولانا بھی اپنی دھن کے پکے ہیں ان کو کسی بات کا خوف نہیں برابر سے مقابلہ کئے جاتے ہیں (ترک موالات کا دور تھا) مگر مجھے کسی قدر تردد پیدا ہو گیا ہے جب سے مجھے معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہوا کہ ایک سال سے زائد قید تنہائی۔ اس پر مزید سختیاں اور کرنا تو در کنار پڑھنے کے لئے ایک معمولی کتاب بھی ان کی جو سنسر شدہ ہیں وہ بھی پڑھنے کے لئے سپرنٹنڈنٹ جیل انہیں نہیں دیتا۔ جس کا ان کے دماغ پر خراب اثر خدانخواستہ پڑنے لگا ہے۔ دعا فرمائیے۔ کہ دماغی حالت صحیح رہے اور صحیح سلامت اللہ تعالیٰ ان کو ظالموں کے ظلم سے نجات دلائے نعیمہ، رضوان الحسن، عبدالسمیع بفضلہ خیریت سے ہیں اور آداب گذار ہیں امید ہے خیریت مزاج سے جلد اطلاع دیجئے گا۔

فقط بیگم حسرت موہانی

(۴۷)

سہ شنبہ پونا

۲۲ر جمادی الثانی ۱۳۴۳ھ

جناب عالی، مزاج اقدس۔ مولانا کا سلام قبول کیجئے اور مرسلہ غزل ملاحظہ کے لئے بھیجی ہے۔ مولانا کے حالات آپ کو اخبارات سے معلوم ہوتے رہتے ہوں گے۔ بعض کی اپیل ہائی کورٹ میں دائر ہو گئی ہے ابھی تاریخ پیشی معلوم نہیں ہوئی۔ میری طبیعت اچھی ہے مگر مجبوراً انہی معاملات کی وجہ سے یہاں کا قیام ضروری ہے۔ اسٹور کانپور کی حالت تباہ ہو گئی ہے اور بھی ہر طرح سے نقصانات ہو رہے ہیں۔ دعا فرمایئے اب جلد مولانا آزاد ہو جائیں۔ میں اپنی بیماری سے عاجز آ چکی ہوں۔ معلوم نہیں خدا کو کیا منظور ہے۔ امید ہے حضور کا مزاج بخیر ہو گا۔ نعیمہ رضوان۔ سمیع سب خیریت سے ہیں اور سلام عرض کرتے ہیں۔

خاکسار بیگم حسرت موہانی

(۴۸)

۲۷ر جمادی الثانی ۱۳۴۳ھ

از پونا

جناب حضرت صاحب قبلہ مدظلہ العالی تسلیم

مزاج شریف۔ ایک عریضہ ۲۳ کو روانہ کر چکی ہوں جس میں چار غزلیں تازہ ملفوف تھیں اور الناظر کو دینے کے لئے میں نے تحریر کیا تھا امید ہے کہ آپ کو وہ عریضہ مل گیا ہو گا۔ اور آپ نے ملاحظہ فرما کر الناظر کو تحریر شدہ روانہ کر دی ہوں گی۔ آج ایک فارسی غزل مع سلام کے اور بھیجنے کی ہدایت ہے ملاحظہ کے لئے اور جلد سے جلد صحیح نقل کرا کے سید سلیمان ندوی معارف اعظم گڑھ کو ضرور مہربانی کر کے بھجوا دیجئے۔ امید ہے مزاج بخیر ہو گا۔ میرا حال بدستور ہے خلافت کی جنرل میٹنگ ۵۔ فروری کو ہو گی مولانا نے تار حکیم صاحب واجمل خان، عنایت حسین صاحب، اصغر صاحب کو شروع جنوری میں روانہ کئے تھے کہ کسی طرح اسٹور ٹوٹنے نہ چاہیئے۔ میں نے بھی تاکیدی خطوط لکھے تھے۔ نتیجہ خدا کو معلوم۔

اہلیہ حسرت موہانی

(۲۹)

۲۵ شوال ۱۳۴۲ھ

از کانپور

جنابِ عالی تسلیم مؤدبانہ کے بعد ضروری عرض یہ ہے کہ مولانا کا جیل سے خط آیا تھا۔ انہوں نے سلام کے بعد آپ سے درخواست کی ہے۔ کہ آپ جلد از جلد توجہ فرما کر حسب ذیل پتہ پر ایک نسخہ کتاب مناقب رزاقیہ اور اس کے ہمراہ وہ عربی رسالہ ضرور بھیج دیجئے جس میں حالات وصال مرشدی حضرت شاہ عبدالوہاب قدس السرہ العزیز درج ہیں۔ ضرورت اور انتظار سخت ہے چونکہ مولانا کو اب جیل میں کتابیں اور رسالے دیکھنے کی اجازت مل گئی ہے اس لئے اب انہوں نے تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع کر دیا ہے چنانچہ کتابوں کی اسی وجہ سے اور سخت ضرورت ہے۔ میں ۲۲ اپریل کو یہاں آگئی

خاکسار اہلیہ حسرت موہانی

سچ تو یہ ہے کہ ان کی زندگی اس قابل ہے کہ اس پر اور مفصل ریسرچ کی جائے اور ایک الگ کتاب ان کے کارناموں کے بارے میں تحریر کی جائے۔ درحقیقت برصغیر کی تاریخ میں ایک بھی اولو العزم خاتون ایسی نظر نہیں آتی جو ان کے مقابلہ میں پیش کی جا سکے اس موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد کا وہ خط پیش کیا جاتا ہے جس سے بیگم حسرت موہانی کی شخصیت کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

مکتوب مولانا ابوالکلام آزاد

مکتوب الیہا بیگم حسرت موہانی

تحیۃ وسلاما

اخبارات میں صوبہ جات متحدہ کی گورنمنٹ کا مولوی حسرت کے متعلق کمیونک نظر سے گذرا اور آپ کا خط بھی جو سینٹرل بیورو نے شائع کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ آپ لوگوں نے اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ

الملائکۃ ان لا تخافوا ولا تحزنوا کی مجسم تفسیر دنیا کو دکھلا دی
قرآن نے ان کامل انسانوں کا ذکر کیا ہے جو اللہ پر سچا ایمان رکھتے ہیں
اور پوری استقامت کے ساتھ اس پر جم گئے ہیں۔ پھر وعدہ کیا ہے۔ کہ ایسی
پاک ہستیوں کے لئے نہ تو کوئی چیز ڈرانے والی ہے کہ ایسے کامل انسانوں سے
مسلمانوں کی بستیاں ابھی بالکل خالی نہیں ہوئی ہیں یہ مقام یوسفی کا کامل
ترین درجہ ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے دو راہیں کھولی گئی تھیں
آزادی اور معصیت، قید خانہ اور طاعت حق۔ انہوں نے آخری راہ اختیار
کی اور فرمایا۔ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْہِ۔ خدایا قید خانہ
مجھ کو کہیں زیادہ محبوب ہے اس چیز سے۔ جس کی طرف مجھے بلایا جا رہا ہے الحمد اللہ
کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے حسرت کو مقام یوسفی کے کامل اتباع کی توفیق
دی۔ اور اس حقیقت میں کوئی دوسرا ان کا شریک و نظیر نہیں۔
ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ۵
البتہ موجودہ عہد سے اس مقام کے فہم و قدر شناسی کی امید نہیں۔ یہ عہد صرف
تخم ریزی کا ہے جو کاشت کاری کے کاموں میں سب سے زیادہ محنت طلب اور
مشکل وقت ہے۔ فصل کاٹنے کا وقت نہیں ہے جب وہ وقت آئے گا تو دنیا ان
ان لوگوں کو یاد کرے گی جنہوں نے بیج بونے کی محنت اپنے ذمہ لی تھی۔ اور
پھل کھانے کی لذت آنے والوں کے لئے چھوڑ دی تھی اس وقت آسمان و
زمین ان لوگوں کی بڑائی پر شہادت دیں گے اور وہی دنیا جو اس وقت غافل
سو رہی ہے اٹھے گی۔ تاکہ ان کی پرستش کرے۔ حسرت جو کچھ کہہ رہا ہے ہندستان
اس کو پچاس برس بعد سمجھ سکے گا اس وقت اس سے زیادہ امید نہ رکھیئے کہ
چند اخباروں میں دو چار مضمون نکل جائیں گے اور وقت کی حالت دیکھتے ہوئے
یہ بھی خلاف توقع ہے جو حالت اس بارے میں دنیا کی متفقہ تاریخ بتلاتی ہے
اس کا مقتضی تو یہ ہے کہ ہر طرف سے تحسین کی جگہ ملامت کی صدائیں اٹھیں
اور لوگ کہیں کہ اِنَّہٗ لَمَجْنُوْنٌ ... یہ تو پاگل ہو گیا ہے اقوام، ممالک کی اصلاح
و قدامت کا اصلی منبع و سرچشمہ انبیاء کرام کی زندگی اور ان کا پاک نمونہ ہے

سوان کا حال جو ان قرآن نے تبلایا ہے وہ معلوم ہے۔ جب کہ وہ اپنی قوم کو زندگی اور کامیابی بخشنا چاہتے تھے تو قوم پتھروں کی بارش سے ان کا استقبال کرتی تھی۔

جب میں آپ کے عزم و استقامت اور اس کے ساتھ تنہائی و کسمپرسی کو سوچتا ہوں تو کہہ نہیں سکتا کہ قلب کا کیا حال ہوتا ہے یہ اللہ ہی کی مدد ہے اور اس کے روح القدس کا القا جس نے آپ کو ان مصائب و شدائد میں بھی وہ درجۂ عزم بخشا ہے جو کسی ایک مرد کو بھی آج نصیب نہیں افسوس میں خود مجبور و معطل ہو رہا ہوں اور اپنے وجود ناکارہ کو آپ کے لئے کچھ سودمند نہیں پاتا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میں کیونکر آپ کے لئے مفید ہو سکتا ہوں؟ کوئی ضرورت کوئی کام۔ کوئی خدمت مجھے بتایئے شاید میں کچھ کر سکوں۔ اور اس طرح اپنے قلب نادم و خجل کو تسکین دے سکوں۔

آپ کی مالی حالت آج کل کیسی ہے؟ مصارف و ضروریات کا کیا انتظام ہے؟ مکان قائم ہے یا نہیں۔ اگر قائم ہے تو کیونکر اس کا انتظام ہوا ہے؟ امید ہے کہ ان امور کو مفصل لکھیں گی۔

آپ نے فوٹو کی نسبت لکھا تھا۔ یہاں ایک شخص نے اپنے شوق سے فوٹو کیا تھا میں نے ایک کاپی کے لئے اس کو کہا ہے کہ آپ کو بھیج دے۔ میں اس کو ایک محض بے کار شئے سمجھتا ہوں۔ تعجب ہے کہ آپ کو اس کے لئے اصرار ہے۔

مخلص ابوالکلام والخیر

مکتوبِ مولانا محمد علی

• اس نوعیت کا ایک خط مولانا محمد علی نے بھی بیگم حسرت موہانی کو لکھا تھا جیسے مکتوب رئیس الاحرار سے نقل کیا جا رہا ہے یہ خط بھی مولانا آزاد کے خط کی طرح بیگم حسرت موہانی کے عزم و ہمت کی ایک واضح دلیل فراہم کرتا ہے۔

(۳۹)

نشاط النسا بیگم حسرت موہانی

چھنڈواڑہ

۲۳؍ فروری ۱۹۱۸ء

میری عزیز و محترم بہن

خدا آپ کو جلد بامراد کرے اور حسرت کی قید کا خاتمہ بالخیر فرمائے۔ آپ سے بہت محجوب ہوں کہ عرصہ ہوا آپ کے محبت ناموں کا جواب نہ دے سکا۔ آپ ضرور مجھ سے سخت خفا ہوں گی۔ مگر میں ضرور آپ سے اپنا قصور معاف کرالوں گا یقین کیجئے کہ کسی کو خط لکھ کر اس قدر مسرت نہیں ہوتی جس قدر آپ کو لکھ کر اور نہ کسی کے خط ملنے سے اتنی خوشی میسر ہوتی ہے جتنی آپ کے محبت نامہ کے ملنے سے۔ حسرت کی خداداد ہمت و استقلال و حوصلہ کا معترف و مداح تو پندرہ سولہ برس سے ہوں۔ جب سے انگلستان سے واپس آکر ان سے ملنا ہوا اور باوجود اس کے کہ ایک زمانہ میں میکر اور ان کے سیاسی خیالات میں گونہ اختلاف تھا۔ میں ان کی دوستی کو اپنے لئے باعث فخر و امتیاز سمجھتا تھا اور جب چند غلام سیرت طلبائے سابق نے حسرت کو ۱۹۰۸ء کے بعد اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے خارج کرنا چاہا تو میں نے اس کی سخت مخالفت کی اور اور ان کی ذلیل کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا بعد میں تو ہمارے سیاسی خیالات میں کبھی اختلاف نہ رہا اور ے

من تو شدم تو من شدی من جاں شدم تو تن شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

کا مضمون تھا۔ اگر مجھے اس زمانے میں اپنی کسی کارروائی پر کسی کی اتفاق رائے سے دلی خوشی ہوتی تھی تو وہ حسرت ہی تھے۔ مگر آپ سے محبت پہلے حسرت کے تعلق سے پیدا ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ گذشتہ دو سال میں بلا واسطہ خود آپ کی ہمت و استقلال و حوصلہ کے باعث پیدا ہو گئی ہے دل سے آپ کے لئے دعا نکلتی ہے اور آپ کی جرأت اور ثبات قدم کو دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے

اور خود اپنے دل میں طاقت زیادہ پانے لگتا ہوں۔ بہت سے لوگ نظر بند ہوئے۔ ان کے بہت سے دوست، احباب اور شرکاء تھے۔ سب نے ان نظربندوں کے لیے کچھ نہ کچھ کیا اور حقِ رفاقت ادا کیا۔ لیکن آپ نے باوجود عورت ہونے کے ان سب کو شرما دیا اور خلق پر آشکارا کر دیا کہ حقِ رفاقت اس طرح ادا کرتے ہیں حسرت کا مرتبہ ہم سب سے بڑا ہے کیونکہ حسرت نے وہ مصائب نہ صرف بطیب خاطر برداشت کئے ہیں جن سے ہم کو اب تک واسطہ نہیں پڑا ہے بلکہ خود مردانہ واران کا ایک طرح مطالبہ کیا اور ان کو دعوت دی حسرت جب چھوٹیں گے تو ان کی عزت و احترام دو برس پہلے کی عزت و احترام سے کہیں زیادہ ہو گا۔ مگر بھائی حسرت سے کہہ دیجئے کہ برادرم باوجود اس ہمت و استقلال کے تمہارا مرتبہ ہماری نظر میں ایک نحیف الجثہ عورت سے کم ہی رہے گا جس کے سینہ میں بہ ظاہر تم سے بھی بڑا دل موجود ہے اور جس نے تمہاری غیر حاضری میں مسلمانوں کو ہمت و استقلال جرأت اور حوصلہ کا وہ سبق دیا۔ جو تم خود آزاد ہو کر نہ دے سکتے تھے اور جو شاید قید ہو کر بھی تم نے نہ دیا حالانکہ مجھ سے زیادہ شاید ہی کوئی اس سبق کی عظمت کرتا ہو گا جو تم نے مصائب کو خود دعوت دے کر ہم کو سکھایا۔

میری پیاری بہن۔ اگر خط لکھنے میں میری طرف سے کوتاہی ہوئی ہے تو اس کو میری ناقدرشناسی پر محمول نہ فرمایئے بلکہ میری کاہلی پر اور سنسرشپ کے باعث میری افسردگی طبع پر۔ اس تین ماہ کے عرصہ میں تو تین بار علیل بھی ہو گیا۔ اب مجھ میں بالکل جان نہیں ہے اور کسل و ماندگی ہمیشہ ترغیب کئے رہتی ہیں۔ میری قوت جواب تک امراض کا مقابلہ کر سکتی تھی اب بہت کچھ سلب ہو چکی ہے اور جب کبھی بھی آزادی نصیب ہو آزاد ہو کر پھر میں شاید صحت کے اس درجہ پر نہ پہنچ سکوں گا۔ جو چار پانچ برس پہلے میسر تھا مگر مجھے زندگی کی زیادہ خواہش نہیں۔ اگر تمنا ہے تو اس کی کہ جو دن زندگی کے باقی ہیں اس میں اپنے بیشتر کے بے شمار گناہوں کی تلافی کچھ نہ کچھ کر سکوں مگر خوف ہے کہ پچھلا حساب تو بے باق نہ ہو سکے

گا۔آگے کے نامۂ اعمال میں تازہ گناہوں کا روز اندراج ہوا کرے گا کاش اپنے وطن اصلی کی طرف لوٹنے سے قبل دینِ رسول اکرمؐ کی تھوڑی بہت خدمت کر لوں۔اب تو ایک یہی آرزو ہے دیکھئے کب پوری ہوتی ہے۔اور کیونکر۔

آپ فرماتی ہیں کہ مدراس سے واپسی کے وقت آپ نے والدہ صاحبہ کے نام رائے پور سے یا رائے چور سے تار دیا تھا کہ آپ ملنے کے لئے آنا چاہتی ہیں۔پہلے جس کارڈ میں یہ مذکور تھا اس کا یہ حصہ مشکل سے پڑھا جاتا تھا اور سنسر صاحب کے پاس جاکر وہ کارڈ پھر واپس نہ آیا۔مگر بعد کے کارڈ سے یہ امر بالکل واضح ہو گیا۔مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ تار ہم کو مطلق نہیں ملا۔اگر ملتا تو اسی وقت جواب دیا جاتا کہ آیئے اور ضرور آیئے۔ہمارے مہمانوں کے متعلق قیود ہیں والدہ کے مہمان ان کے پاس آ جا سکتے ہیں زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کو اجازت ان کے مہمانوں سے ملنے کی نہ ملے تو ہم خود کسی دوسری جگہ قیام کریں اور مکان پر والدہ صاحبہ کے پاس ان کے مہمان کو ٹھہرا دیں۔

مگر غالباً آپ کے متعلق تو گورنمنٹ کو اجازت دینے میں عذر بھی نہ ہوتا کہ ہم سے ابتداً یہی کہا گیا تھا کہ کسی کے ملنے میں عذر نہ ہو گا صرف اطلاع درکار ہے یہ ضرور ہوا کہ جب آپ مدراس میں تھیں تو اس سے ایک یا دو روز پیشتر والدہ صاحبہ نے یکایک لوگوں کے اصرار سے کلکتہ جانے کا قصد کر کے براہ رام پور و دہلی روانہ ہو گئی تھیں وہ چاہتی تھیں کہ آپ بھی ہمراہ چلیں مگر آپ کا مدراس جانا اور وہاں کے واقعات بعد کو معلوم ہوئے تو ان کو افسوس باقی نہ رہا بلکہ یہی انسب جانا کہ آپ مدراس گئیں۔مسز نائیڈو کی پریشانی پر بے اختیار ہنسی آئی۔بھلا آپ جیسے لوگ کہیں دربار داری کر سکتے ہیں۔جہاں آپ نے کئی اور بُت توڑے ہیں وہاں اچھا ہوا کہ یہ آدابِ دربار، کا بت بھی توڑ دیا۔بقول اقبالؒ ؎

سومنات عقل را محمود عشق

آپ کو تو معلوم ہے کہ میں پردہ کا (یعنی شرعی پردہ کا) کتنا بڑا حامی ہوں اور ہر مسلم کو بھی ہونا چاہیئے۔ شیخ عبداللہ کی حمایت کرنے والی بعض خواتین میری اس سختی سے مجھ سے ناراض بھی ہوئیں مگر مجھے رسول اللہ کی ناراضی کا ان کی ناراضی سے کہیں زیادہ خیال تھا اور یورپ کی کورانہ تقلید سے میں ہمیشہ سے متنفر تھا۔ مگر میرا خیال عورتوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے متعلق ہمیشہ یہی رہا ہے کہ اس کا حصول ان کے لئے جائز نہیں بلکہ ضروری ہے اور حقوق نسواں کا حامی اسلام اور مسلمانوں سے زیادہ کون ہو سکتا ہے۔ البتہ اسلام دین وسط ہے۔ افراط و تفریط کو اس میں مطلق دخل نہیں۔ اس لئے جو کچھ آپ حسرت اور حسرت سے زیادہ حق کی حمایت کرتی ہیں۔ اس کو میں جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن اور ضروری سمجھتا ہوں آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ بعض مسلمانوں کو والدہ ماجدہ کے اجلاس ہائے کانگریس و لیگ میں جانے میں بھی کسی قدر عذر تھا اور رسمی پردہ کی دلدادگی اس زمانے میں بھی جب کہ دین اور شریعت خود خطرے میں ہیں بدستور باقی معلوم ہوتی تھی مجھے تو اس کا بھی افسوس ہے کہ انہوں نے کلکتہ میں کیوں ان عذروں کا اتنا بھی پاس کیا اور جو کچھ انہیں فرمانا تھا خود زبانی کیوں نہ فرمایا اگر ایسا کرتیں تو کم از کم ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ لوگوں کو صاف معلوم ہو جاتا کہ وہ کوئی کٹھ پتلی نہیں ہیں جنہیں کل کے پیچھے نچائیں (معاذ اللہ) جو لوگ ان سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ ہم دونوں ان کے پاؤں کے انگوٹھے کے ناخن برابر بھی نہیں ہیں اور جو کچھ ہیں وہ بھی انہیں کا طفیل ہے۔ ایک زمانے میں بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں میں فیشن میں داخل تھا۔ کہ خواتین کے مضامین اخباروں میں شائع ہوا کریں اور جلسوں میں ان کی حاضری سے محفل کی جائے جس زمانے میں لوگوں کو یہ شوق چرایا تھا میں دل ہی دل میں کڑھتا تھا اور اس خیال سے لرزتا تھا کہ دیکھئے یہ فیشن آئندہ کیا رنگ لائے۔ اقبال نے تو ان پردہ نشینوں کی خوب خبر لی ہے ؎

شوقِ تحریر مضامین میں کھلی جاتی ہیں
بیٹھ کر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہیں

اور مولانا سید اکبر حسین نے تو اور بھی سخت سست کہا ہے وہ تعلیم یافتہ حضرات جو اس طرح تقلید یورپ پر کمربستہ تھے۔ اس کو ایک طریقہ مسلمان خواتین کی قابلیت دکھانے کا سمجھتے تھے اور اس الزام کو مٹانا چاہتے تھے کہ ہماری پردہ نشین بیبیاں "پنجرے کے پکھیرو" ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ شیخ عبداللہ کی نمائشوں اور کانفرنسوں کا یہ فیشن مسترد ہو گیا۔

مگر اس مشکل زمانے میں جب بے پردہ مرد پردوں میں چھپے بیٹھے تھے اور "شوق تحریر مضامین" بلکہ دھواں دھار تقاریر کرنے کا ذوق رفوچکر ہو گیا تھا۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ مسلمان بیبیاں اپنے شوہروں کی ایسی رفیق ہوتی ہیں۔ خولہ کی یاد آپ نے تازہ کر دی۔ میرا تو ہمیشہ سے یہی عقیدہ ہے کہ ہمارے انحطاط کے اثر سے اگر کوئی حصہ اب تک محفوظ ہے تو وہ ہماری خواتین ہیں اس گئے گذرے زمانے میں بھی جب کہ "قربانی" ایک لفظ بے معنی ہو کر رہ گیا ہے جو پریس اور پلیٹ فارموں پر ہی استعمال ہوا کرتا ہے ہماری خواتین ہر شہر اور ہر قصبہ اور ہر قریہ میں بڑی تعداد میں موجود ہیں جو باپ کے لئے یا بھائی کے لئے، شوہر کے لئے یا اولاد کے لئے وہ قربانیاں ہر روز اور ہر گھڑی خوشی خوشی قبول کرتی ہیں جن کا عشر عشیر بھی اگر ہمارے مرد، ملک اور قوم، خدا اور رسولؐ کے لئے گوارا کریں تو ہمارے انحطاط کا آج ہی خاتمہ ہو جائے۔ خیر مرد کچھ کریں یا نہ کریں اب وہ وقت آ رہا ہے کہ ہماری عورتیں اپنی قربانیوں کے دائرے کو وسیع کر کے بلکہ ان کے رخ کو خدا اور رسولؐ کی طرف پھیر کر وہ اصلاح اخلاق جاری کریں گی کہ ہمارے تمام مصائب قومی و ملکی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

والدہ ماجدہ تو پھر عمر رسیدہ ہیں مگر اب جوان لڑکیاں کتخدا اور ناکتخدا دونوں خدا اور رسولؐ کے لئے وہ خدمتیں انجام دیں گی کہ مردوں کو خواہ مخواہ شرم آئے گی۔ اور وہ دین مبین کی خدمت کی طرف رجوع کریں گے۔ اس میں بفضل اللہ تعالیٰ آپ کا بڑا حصہ ہو گا اور پھر نہ صرف یہاں بلکہ اللہ میاں کے ہاں بھی نہ ہماری اس قدر پوچھ ہو گی نہ برادر حسرت کی۔ بلکہ آپ کی اور

آپ کی بہنوں کی۔

میں نے اس خط میں حسرت کی عزت و احترام میں اگر کمی کی ہے تو ان سے کہہ دیجئے کہ وہ باوجود اس کے کہ ان کے اشعار پڑھتا ہوں اور وجد کرتا ہوں خدا انہیں اجر دے گا۔ کس طرح روح کو تازہ کرتے ہیں ان سے کہہ دیجئے کہ بھائی اگر قید کا یہی نتیجہ ہے تو میں گورنمنٹ کو میموریل بھیجنے کو تیار ہوں کہ برائے خدا اور رسولؐ حسرت کو آزاد نہ کیجئے۔ اشعار میں بیڑی کی جھنکار پھر کون سنائے گا مزا تو جب آتا کہ ہم اور وہ ایک ہی سلسلۂ سلاسل میں مقید ہوتے اور خود ان کی زبانی ڈنز تازہ کلام سننے میں آتا۔ کہئے میرٹھ کا تحفہ کب تک ملے گا للت پور، جھانسی، الہ آباد نینی، فیض آباد، لکھنؤ سب کا تحفہ تو مل گیا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

ہم لوگ خوش ہیں۔ خدا کے فضل سے صبر و شکر کا پیمانہ اب تک خالی نہیں ہوا۔ جب اس کی مرضی ہو گی۔ جسم بھی آزاد ہو جائے گا روح تو پہلے سے کہیں زیادہ آزاد ہے۔

آخر میں اپنی اہلیہ کی طرف سے معذرت کرتا ہوں کہ اس بار بھی شرف ملاقات انہیں نصیب نہ ہو سکا۔ حمیدہ کی علالت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور وہ دہلی سے واپسی کے وقت علی گڑھ جانے لگیں تو معلوم ہوا کہ آپ وہاں نہیں ہیں۔ خیر یار باقی صحبت یار باقی۔ خدا پھر ملائے گا۔

آپ کا عزیز بھائی

محمد علی

مکرر یہ کہ دو تصویریں بھیجتا ہوں۔ بڑا گروپ آپ کے لئے اور ہم دونوں کی تصویر حسرت کے لئے۔

محمد علی

حلیہ

جناب غلام احمد فرقت کاکوروی نے بیگم صاحبہ کو ۱۹۲۲ء میں دیکھا تھا ان کی زبانی بیگم صاحبہ کا حلیہ سُنیئے: "بیگم صاحبہ کو پہلی بار میں نے مولانا ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر کے یہاں دیکھا تھا۔ مولانا کے گھر میں ان سے بڑی رسم وراہ بحثی مولانا ظفر الملک علوی میرے حقیقی پھوپھا تھے اس لئے میرا ان کے یہاں برابر آنا جانا تھا۔ اس زمانہ میں الناظر کا دفتر وکٹوریہ اسٹریٹ میں بزازے کے سامنے ایک بڑے پھاٹک میں تھا جس کی بالائی منزل میں پھوپھی رہتی تھیں اور نیچے کی منزل میں الناظر کا دفتر تھا۔ میری پھوپھی پردہ کرتی تھیں اور بیگم حسرت کو میں نے دیکھا۔ اس وقت تک وہ پردہ ترک کر چکی تھیں۔ گندمی رنگ کتر اکترا چہرہ، چھریرہ بدن، ستواں ناک، درمیانہ قد، سر سے پیر تک کھدر میں ملبوس تھیں مجھے ان کی صورت اچھی طرح یاد ہے۔ یہ واقعہ ۲۳-۱۹۲۲ء کا ہے جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔"

علمی و ادبی خدمات

جہاں تک بیگم حسرت کی ادبی اور علمی خدمات کا تعلق ہے یہ بات کیا کم ہے کہ مولانا کے کلام، مضامین اور دوسری تصانیف کی تمام تر ترتیب و اشاعت بیگم صاحبہ کی مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ ہے وہ شاعر نہیں تھیں مگر سخن فہمی کی صلاحیت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور انتقال سے قبل انہوں نے سفرنامۂ عراق مرتب کیا تھا جسے مولانا نے ۱۹۳۷ء میں شائع فرمایا یہ سفرنامہ خطوط کی شکل میں ہے جو بیگم صاحبہ نے اپنی لڑکی نعیمہ بیگم کو تحریر فرمائے۔ سفرنامہ کو شائع کرتے وقت مولانا نے جو مقدمہ تحریر فرمایا وہ درج ذیل ہے "عراق کا یہ دلچسپ سفرنامہ جس کو ۱۹۳۶ء میں مرحومہ بیگم حسرت موہانی نے خطوط کی

شکل میں اپنی بیٹی نعیمہ بیگم کو بھیجا تھا۔ پہلے ان کے انتقال کے بعد اُردوئے معلٰی میں بطور ضمیمہ شائع کیا گیا اور اب کتابی شکل میں بطریق یادگار شائع کیا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۲ء راقم الحروف نے پہلا حج تنہا کیا تھا جو اتفاق سے حج اکبر واقع ہوا۔ اس کے بعد ہر سال مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی حاضری بالالتزام بیگم حسرت موہانی اور اپنے نواسے رضوان الحسن کی معیت میں ہوتی رہی۔ ۱۹۳۴ء میں نعیمہ بیگم بھی مع اپنی چھوٹی بچی انیسہ کے ہمراہ تھیں ۱۹۳۵ء میں نعیمہ بیگم کی لڑکی نفیسہ بھی ہمراہ تھی سفرنامہ عراق میں تذکرہ اس سفر کا ہے۔ افسوس کہ ۱۹۳۷ء میں بیگم حسرت کی شدید علالت کے باعث راقم حج کے زمانہ میں حاضری مکہ سے معذور رہا تاہم ان کی وفات کے بعد جو ۱۸ر اپریل ۳۷ء کو ہوئی۔ مکہ معظمہ میں ۲۲ر مئی کو عمرہ ادا کرنے کے بعد ہی مدینہ منورہ کی سعادت نصیب ہوئی اور الحمد للّٰہ سالانہ زیارت روضۂ رسولؐ کے عہد میں فرق نہیں پڑا مصداق۔

مدینہ چلو کیوں نہ ہر سال حسرت — بلائیں جو خود تاجدار مدینہ

چونکہ اس سفر حجاز کا اتفاق زمانہ حج کے بعد ہوا تھا اس لئے جہاز عدن پورٹ سوڈان ہوتا ہوا بہت تاخیر سے جدہ پہنچا اور ان سب مقامات کی سیر کا موقع ملا اسی زمانہ میں ایک غزل عدن میں بیگم حسرت کی یاد میں بھی (جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے) یہ سفرنامۂ عراق بطور ضمیمہ اس کتاب کے آخر میں افادہ عام کے لئے درج کیا جاتا ہے

اہل خاندان

مولانا حسرت موہانی کی پہلی اہلیہ نشاط النسا بیگم اور دوسری اہلیہ جمیلہ بیگم کا ذکر ان کی ازدواجی زندگی میں مذکور ہو چکا ہے۔

نشاط النساء بیگم سے ایک ہی صاحبزادی ہوئیں جن کا نام نعیمہ بیگم تھا جمیلہ بیگم سے بھی ایک صاحبزادی خالدہ بیگم ہوئیں۔ اب ہم ان کا تعارف تفصیل سے کریں گے۔

نعیمہ بیگم!

مولانا کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں آپ محترمہ نشاط النساء بیگم کے بطن سے علی گڑھ میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئیں ان کی تعلیم گھریلو ہوئی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی۔ ان کی عمر صرف ایک سال تھی کہ مولانا کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس لئے مولانا ان کی تعلیم پر پوری توجہ نہ دے سکے۔ دوسرے وہ یہ بھی خیال کرتے تھے کہ بیگم حسرت کی موجودگی میں ان کو اس فکر کی ضرورت نہیں ہے بیگم صاحبہ اگرچہ خود بے پردہ رہتی تھیں لیکن لڑکی کو پردہ میں رکھا۔ محترمہ نعیمہ بیگم لکھتی ہیں کہ "میرے بچپن میں جب مولانا مجھ کو اپنے پاس بٹھاتے تھے تو موقع بہ موقع مجھے کچھ نہ کچھ سکھاتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے جھوٹ بولنے کے بارے میں بتایا کہ یہ بری چیز ہے اس وقت میری عمر ایسی تھی کہ سچ اور جھوٹ سمجھنے کی پوری استعداد نہیں تھی۔ کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد ذرا سیانی ہوئی اور اس قابل ہوئی کہ میں طالب علمی کے زمانے سے ہی اپنی روزمرہ کی ڈائری رکھ سکوں۔ تو ایک روز میں نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ مولانا نے آج جھوٹ بولا واقعہ یہ تھا کہ مولانا نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کل صبح میں دکان پر رسل گنج تمہیں لے چلوں گا۔ دوسرے روز مولانا مجھ سے چھپ کر چلے گئے میں نے اپنی ڈائری میں مولانا کا جانا اور جھوٹے وعدہ کا ذکر کر دیا۔ مولانا نے جب ڈائری دیکھی تو مسکرائے اور اقرار کیا کہ میں نے ڈائری میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے یہ واقعہ ۱۹۱۷ء کا ہے محترمہ نعیمہ بیگم کی شادی کی تفصیل بیگم نشاط النساء کے حالات میں آچکی ہے محترمہ نعیمہ بیگم تقسیم کے بعد کراچی آکر آباد ہو گئیں ان میں اور ان کے شوہر (جناب عبدالسمیع موہانی مرحوم) میں بے انتہا محبت تھی اور انہوں نے بڑے سکون کی زندگی بسر کی مگر انکی سیرت و کردار پر ان کے والدین کا بے پناہ اثر تھا اخبارات کا مطالعہ اور ان کو سلیقے سے رکھنا ان کی عادت تھی مزاج میں بے پناہ استغنا اور کسی قسم حرص و ہوس نہیں تھی اور انہوں نے اپنی زندگی انتہائی سادگی سے بسر کی۔

محترمہ رابعہ بیگم نے لکھا ہے کہ "صاحبزادی کے متعلق خاندان بھر میں

مشہور ہے کہ اچھی پتنگ لڑاتی ہیں۔ غالباً یہ شوق باپ سے ورثے میں ملا تھا
انہی رابعہ بیگم نے نعیمہ بیگم سے مولانا کی محبت کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا تھا۔:

"بیگم حسرت کی یادگار ان کی ایک لڑکی (نعیمہ بیگم) ہیں جن سے حسرت کو گہرا لگاؤ تھا۔ اور بعد میں اپنی نواسی (نفیسہ بیگم) سے ان کو شدید تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ جب بیمار تھیں تو علاج کی غرض سے پورے دو ماہ وہ حیدر آباد ٹھہرے رہے حالانکہ وہ بغیر کسی سیاسی مقصد کے کانپور چھوڑ کر کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ دن رات مریضہ نفیسہ بیگم کی خدمت میں لگے رہے۔ اپنی غذا۔ اپنے لباس اور اپنی ہر ضرورت سے بے نیاز یہ عظیم المرتبت، کھویا کھویا لا ابالی انسان اس چھوٹی سی بچی کے لئے آرام و آسائش فراہم کرنے کے لئے دن رات مصروف و سرگرداں نظر آتا تھا۔ کانپور کے دوران قیام میں ڈاکٹروں نے ان کے لئے شام کی تفریح ضروری بتائی تھی چنانچہ وہ تمام کام چھوڑ کر نفیسہ بیگم کو لے کر تفریح کو جاتے۔ کبھی نہ تفریح کا وقت بدلا اور نہ کسی اور پروگرام یا مصروفیت نے رخنہ ڈالا۔ محبت اور خلوص کا یہ عظیم پیکر دنیاوی فرائض میں خدمت، ہمدردی اور لگن کو سب سے اہم جانتا اور مانتا تھا"۔ محترمہ نعیمہ بیگم کے ادبی کارناموں میں ایک کتاب "حسرت کی زبانی، نعیمہ کی زبانی" شائع ہو چکی تھی اور انہوں نے کراچی ہی میں انتقال فرمایا اور پاپوش نگر کے قبرستان میں دفن کی گئیں

اولاد

نعیمہ بیگم کے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں نام یہ ہیں رضوان الحسن، احسان الحسن، انعام الحسن، مصباح الحسن، جامع الحسن، انیسہ بیگم اور صفیہ بیگم۔

رضوان الحسن

بڑے صاحبزادے رضوان الحسن گریجویٹ ہیں انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنی نانی محترمہ نشاط النساء بیگم، سے حاصل کی اس لئے ان کو اردو کے علاوہ عربی اور کچھ فارسی

حاصل ہو گئی۔ انہوں نے اپنی نانی کے ہمراہ چار حج کئے۔ وہ اب پنشن پر ہیں۔

احسان الحسن

کانپور میں انٹر کرنے کے بعد اس جذبے کے ساتھ انڈیا چھوڑ دیا کہ یہ جگہ اب رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اس زمانے میں آنے والے لوگ چند ماہ کے پرمٹ پر انڈیا سے آیا کرتے تھے مگر انہوں نے یہ گوارا نہیں کیا بلکہ کھوکھرا پار کے ذریعہ ہجرت کر کے مستقل پاکستان آ گئے یہاں آ کر انہوں نے بی کام کر لیا اور اب سرکاری ملازم ہیں۔

انعام الحسن

یہ مولانا کے تیسرے نواسے ہیں اور جب حلیم مسلم کالج کے درجہ نہم کے طالبعلم تھے تو ان کے ایک اُستاد نے اُن کے والد سے فرمایا تھا کہ آپ کے دوسرے لڑکوں رضوان اور احسان نے بھی تعلیم حاصل کی تھی مگر صرف یہ صاحبزادے ایسے معلوم ہوتے ہیں جو سچائی، ایمانداری، پابندیٔ وقت اور اصول پرستی جیسی عادتوں میں مولانا مرحوم سے ملتے ہیں صورتاً بھی وہ کچھ مولانا سے مشابہت رکھتے ہیں اس لئے کہ چیچک کے داغ ان کے چہرے پر نمایاں ہیں۔ انہوں نے کانپور میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ کراچی میں آ کر بی کام اور ایل ایل بی کیا۔ تین سال تک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی ٹریننگ بھی حاصل کی اور پھر مختلف اداروں میں سینئر آڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے آج کل پاکستان بنکنگ کونسل میں وائس پریذیڈنٹ ہیں۔

مصباح الحسن

آپ مولانا کے چوتھے نواسے ہیں مولانا کے وصال کے بعد اپنے والدین کے ہمراہ کراچی آ گئے تھے میٹرک میں اس وقت تعلیم حاصل کر رہے تھے یہاں آ کر الیکٹرک اور وائرلیس میں ڈپلومہ حاصل کیا اور پھر بحری جہاز میں ملازمت اختیار کی

جامع الحسن

آپ مولانا کے پانچویں نواسے ہیں آپ نے بی کام کیا اور آج کل سرکاری ملازمت پر فائز ہیں۔

انیسہ بیگم

یہ مولانا کی بڑی نواسی ہیں آپ کا عقد صفی پور ضلع اناؤ میں جناب شاہ جمیل احمد سجادہ نشین درگاہ خلیل میاں صاحب کے چھوٹے لڑکے عقیل احمد کے ساتھ ہوا ان کے بطن سے ایک صاحبزادی عطیہ بیگم ہیں۔

صفیہ بیگم

یہ مولانا کی دوسری نواسی ہیں انہوں نے بی اے کیا اور آج کل ایک اسکول میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اظہر حسن

مولانا کے والد کا نام اظہر حسن تھا فتح پور میں زمیندار تھے۔ ۷۰ سال کے قریب عمر پائی مولانا کی والدہ شہر بانو اپنے شوہر کی حقیقی پھوپھی زاد بہن تھیں آپ نے مولانا کے دورِ اسیری ہی میں انتقال فرمایا۔

روح الحسن

مولوی روح الحسن مولانا کے بڑے بھائی تھے حیدر آباد کے شہر ناندیڑ میں وکالت کرتے تھے خاندان میں سب سے زیادہ صاحب حیثیت تھے پابندِ صوم وصلوٰۃ تھے اور وضع داری کا بڑا خیال تھا ہر سال گرمیوں کی تعطیلات میں حیدر آباد دکن سے وطن آتے اور مولانا جہاں کہیں بھی ہوتے ان سے ملنے ضرور جاتے ان کے بڑے صاحبزادے ظہور الحسن کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا دوسرے صاحبزادے ڈاکٹر نجم الحسن کراچی میں پریکٹس کرتے ہیں اس کے علاوہ دو صاحب زادگان

اور ہیں اور ایک شمس الحسن جو کانپور میں مقیم ہیں اور دوسرے ضیاء الحسن جو فتحپور میں رہتے ہیں دو صاحبزادیاں ہیں رئیسہ موہانی اور قریشہ بیگم موہانی۔

مُبین الحسن

یہ مولانا کے دوسرے بھائی ہیں فتح پور میں زمیندار تھے انہی کے ذمہ زمینوں کی دیکھ بھال تھی۔ ۵۰۔۶۰ سال کی عمر پائی ان کی اولاد میں ایک صاحب زادہ مستقیم الحسن ہیں جو کانپور میں تجارت کرتے ہیں تین صاحبزادیاں ہیں محترمہ علیمہ بیگم محترمہ ہاشمہ بیگم، محترمہ آمنہ بیگم۔ محترمہ علیمہ بیگم کراچی میں مقیم ہیں جن کا عقد نواب انور حسین سے ہوا۔ جو روزنامہ "ڈان" کراچی کے اسپورٹس ایڈیٹر بھی تھے۔

رئیسہ موہانی

یہ مولانا کے بڑے بھائی مولوی رُوح الحسن کی صاحبزادی ہیں اور ان کا عقد مولانا کے نواسے سید انعام الحسن موہانی کے ساتھ ہوا۔ آپ سماجی کارکن ہیں اور آج کل کراچی میں ایک نجی اسکول چلا رہی ہیں۔ آپ حسرت موہانی میموریل سوسائٹی کی مجلس کی رکن بھی ہیں اور فی الحال مولانا کی یادگار کے طور پر قائم کئے جانے والے ہال اور لائبریری کی تعمیر کا بیشتر کام آپ انجام دے رہی ہیں آپ کی بڑی صاحبزادی رومیکا، موہانی صحافت سے کافی شغف رکھتی ہیں اور انہوں نے بی کام کیا اور آجکل M-B-A کرنے لندن گئی ہوئی ہیں دوسری چھوٹی صاحبزادی ملکہ فرح موہانی بی کام کی طالبہ ہیں اور CA کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

قریشہ بیگم موہانی

قریشہ بیگم موہانی مولانا کے بڑے بھائی مولوی رُوح الحسن کی چھوٹی صاحبزادی ہیں جن کا عقد مولانا کے چھوٹے سالے ناصر الحسن کے صاحبزادے حفیظ الحسن سے ہوا جن کی تین صاحب زادیاں اور ایک صاحب زادے ہیں اور انڈیا میں بمقام فتحپور مقیم ہیں

نسیم النساء

یہ مولانا کی بڑی بہن تھیں جو مولانا کے بڑے سالے مولوی حاتم الحسن سے منسوب ہوئیں ان کی ایک لڑکی کا نام وسیمہ بیگم اور دوسری کا نام شمیمہ بیگم ہے مولانا اپنی ان بہن سے محبت کرتے تھے اور تقریباً ہر سال ان سے ملنے کے لئے حیدر آباد جایا کرتے تھے۔

منیب النساءؔ

مولانا کی دوسری بہن کا نام منیب النساءؔ تھا جو مولوی نعیم الدین سے منسوب تھیں۔

شبیر الحسن

مولانا کے خسر اور محترمہ نشاط النساء کے والد کا نام مولوی شبیر الحسن تھا آپ حافظِ قرآن تھے۔ ہر سال رمضان میں محراب سناتے تھے آپ حیدر آباد دکن کے قصبہ رائے چور میں وکالت کرتے تھے آپ بڑے منکسر المزاج اور اعلیٰ شخصیت کے حامل انسان تھے۔

منصور النساءؔ

یہ مولانا کی ساس اور محترمہ نشاط النساء بیگم کی والدہ تھیں اور مولانا کی حقیقی پھوپھی بھی تھیں۔ آپ پابند صوم وصلوٰۃ تھیں

حاتم الحسن

مولوی شبیر الحسن کے بڑے صاحب زادے اور مولانا کے بڑے بہنوئی تھے آپ حیدر آباد دکن میں وکالت کرتے تھے۔

ناصر الحسن

مولوی شبیر الحسن کے چھوٹے صاحبزادے تھے مولانا کے چھوٹے سالے تھے اکثر و بیشتر مولانا کے ساتھ رہتے تھے۔

عبد السمیع

مولانا کے داماد اور محترمہ نعیمہ بیگم کے شوہر، مولانا کے چچا زاد بھائی مولوی عبد الحئی کے صاحبزادے تھے حیدرآباد کے قصبے ناندیڑ کے پاس پرگنی میں وکالت کرتے تھے۔ مولوی عبد السمیع کی والدہ محترمہ ظہور فاطمہ ولد مولوی حبیب الدین اپنے شوہر کی حقیقی چچا زاد بہن تھیں اور سمیع صاحب جب بارہ سال کے تھے تو انتقال فرما گئی تھیں انہوں نے فرنگی محل میں تعلیم پائی اور تعلیم سے فراغت پانے کے بعد اپنے چچا مولوی حمایت الحسن کے پاس بنارس چلے گئے جنوری ۱۹۲۳ء تک یہ خیال ہی نہیں ہوا کہ شادی ہونے والی ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ جنوری میں والد صاحب کا خط پہنچا کہ میں تمہاری شادی حسرت موہانی کے یہاں کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارا عندیہ کیا ہے؟ میں نے شرم کے مارے جواب نہیں دیا تیسری مرتبہ انہوں نے چچا کو خط لکھا اور اس مرتبہ چچی صاحبہ نے مجھ سے کہا اور جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو چچی صاحبہ نے کہا کہ ہم مولوی صاحب کو لکھ دیتے ہیں کہ تمہیں کوئی انکار نہیں۔ چنانچہ ایسا ہی۔ سمیع صاحب کہتے ہیں کہ اس کے بعد میرا پیغام مولانا کے یہاں بھجوا دیا گیا اسی زمانہ میں میرے پھوپھی زاد بھائی مولوی حکیم حسین الحسن صاحب نواسہ حکیم مرزا صاحب کا پیغام بھی مولانا کے یہاں پہنچا مولانا یہ دونوں پیغام لے کر حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی کی خدمت میں لکھنؤ گئے اور ان سے مشورہ کیا۔ تو مولانا باری نے میرے حق میں رائے دی۔

او مولانا نے میرے رشتے کو منظور کر لیا اس منظوری کے بعد مولانا کے خاندان میں دو ایک بزرگوں نے بھی مخالفت کی مگر سمیع صاحب کے ارشاد کے مطابق

مولانا نے ان سے یہی کہا کہ میں نے آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا ہے آپ سے مشورہ طلب نہیں کیا۔

جناب عبدالسمیع شاعر بھی تھے اور نصرت تخلص کرتے تھے۔

آپ کی کوششوں سے حسرت موہانی میموریل سوسائٹی کو شمالی ناظم آباد کراچی میں ایک وسیع خطۂ اراضی الاٹ ہوا تھا جس میں مولانا کی شایانِ شان یادگار تعمیر کرنے کا کام پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے اور اُمید ہے کہ یہ یادگار آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے قوم کے اس بے لوث محسن کی یاد تازہ کرنے کا کام بخوبی انجام دے گی۔ افسوس ہے کہ مولانا عبدالسمیع موہانی کا بھی ۱۹۸۹ء میں انتقال ہو گیا اور وہ اپنی زندگی میں حسرت میموریل ہال کی تکمیل کے مظاہر نہیں دیکھ سکے لیکن انہوں نے اپنی پوری زندگی اپنے چچا اور خسر کے طرز پر بسر کر کے آنے والی نسلوں کو یہ بتا دیا۔ کہ اگر کوئی انسان صدق دل سے چاہے تو وہ مولانا حسرت موہانی کے اتباع کا فریضہ کسی نہ کسی حد تک ضرور انجام دے سکتا ہے۔

حصّہ سوئم

حصہ سوم

مذہبی زندگی

صاحبِ حالاتِ حسرتؔ نے لکھا ہے کہ مولانا جس طرح اپنے سیاسی عقائد میں نہایت مستحکم و مضبوط ہیں اسی طرح مذہبی اعمال اور عقائد میں بھی کمال درجہ شغف و توغل رکھتے ہیں اور اپنے کلام میں جابجا اپنے معتقدات کو ظاہر کرتے رہے ہیں۔ مولانا مذہباً حنفی ہیں اور مشرباً قادری ہیں اور اس خانوادہ کے رکنِ اعلیٰ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے آپ کی عقیدت و ارادت عشق کے درجہ پر پہنچی ہوئی ہے۔ جس کا اظہار متعدد غزلوں میں آپ نے کیا ہے۔ مثلاً ایک پوری غزل حضرت غوث الاعظم سے متعلق ہے۔

دستگیری کا طلب گار ہوں شیئاً للہ　　پیرِ بغداد میں لاچار ہوں شیئاً للہ
حالِ دل شرم سے اب تک نہ کہا تھا لیکن　　آج میں درپئے اظہار ہوں شیئاً للہ
کرم خاص کے لائق تو نہیں میں پھر بھی　　آپ کا غاشیہ بردار ہوں شیئاً للہ
آپ ہی سنیے کہ اب اور کہوں میں کس سے　　بستۂ دامنِ سرکار ہوں شیئاً للہ
مجھ سے اب دین کی پستی نہیں دیکھی جاتی　　غلبۂ کفر سے بے زار ہوں شیئاً للہ
پائے رفتن ہے نہ ہے ہند میں جائے ماندن　　سخت مشکل میں گرفتار ہوں شیئاً للہ

غوثِ اعظم سے جو مانگو گے ملے گا حسرتؔ
بس کہو حاضرِ دربار ہوں شیئاً للہ

ایک دوسری نعتیہ غزل میں حضرت غوث الاعظم کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

رہنمائے گمرہاں و سرگروہِ مقبلاں　　عاشق و معشوقِ یزداں جان و جانانِ رسول
مقتدائے سالکان و مخزنِ اسرارِ حق　　بادشاہِ عاشقان و گنجِ عرفانِ رسول
نورِ چشمِ فاطمہ، مہرِ درخشانِ علی　　غوثِ اعظم، شاہِ جیلاں ماہِ تابانِ رسول

حسرتؔ محروم ہے امیدوارِ التفات
اس طرف بھی اک نظر اے میرِ سامانِ رسول

یا پھر یہ سُنیے۔

کرو کچھ تو ارشاد یا غوثِ اعظم — سنو میری فریاد یا غوثِ اعظم
رہِ عاشقی میں کہیں میری محنت — نہ ہو جائے برباد یا غوثِ اعظم
گرفتاری حسنِ ظاہر سے دل کو — کرو جلد آزاد یا غوثِ اعظم
اسے تم سوا کون اٹھائے گا مجھ پر — پڑی ہے جو افتاد یا غوثِ اعظم
مبارک ہمیں دردِ دل ہو کہ اس پر — تمھارا بھی ہے صاد یا غوثِ اعظم
زیارت ہزاروں کو ہوتی ہے اک تن — اسے بھی کرو یاد یا غوثِ اعظم

کہاں تک رہے دل میں حسرت کے آخر
تمنائے بغداد یا غوثِ اعظم

مولانا نے حضرت غوثِ اعظم کی شان میں ایک رباعی بھی لکھی جو درج ذیل ہے۔

بے باک رہیں فکرِ اسیری نہ کریں — یوں خانۂ فقر میں فقیری نہ کریں
ہم کیا ہیں بساط کیا ہے مری حسرت — غوث الاعظم جو دستگیری نہ کریں

مولانا کو تصوف سے ایک غیر معمولی لگاؤ تھا۔ چنانچہ اکثر غزلوں میں اس کا اظہار فرمایا ہے۔ مثلاً

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد کو نخوت کے سوا
شغل بے کار ہیں سب ان کی محبت کے سوا
دے سکا کوئی نہ دہری کے وساوس کا جواب
تیرے وارفتۂ دیوانہ طبیعت کے سوا
قول زاہد کا غلط ہم نہیں کہتے ہیں مگر
اور کچھ ہو بھی طریقت میں شریعت کے سوا
اہلِ ظاہر نہ کریں کوچۂ باطن کی تلاش
کچھ نہ پائیں گے وہاں رنج و مصیبت کے سوا
سب سے منہ موڑ کے بیٹھے ہیں تری یاد میں ہم
اس میں اک شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا

نعت میں بھی کئی غزلیں موجود ہیں اور اہلِ بیت اطہار سے بھی تعلق خاطر ہے جس کو ایک غزل میں ظاہر کیا ہے۔ جس کی ردیف جانِ اولیا ہے۔

تصوف میں یوں تو مولانا کو خاص تعلق تھا لیکن بار بار قیدِ فرنگ میں اس رنگ نے اور بھی پختگی اختیار کرلی ہے۔ حسرت کا قول ہے کہ تصوف جانِ مذہب ہے اور عشق جانِ تصوف اور وہ اس بات کا اکثر ورد کرتے رہتے تھے۔ یہ مذاق حسرت پر اس قدر غالب ہے کہ ان کے کلام میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔

عقائد

پرنسپل عبدالشکور نے اپنی کتاب "حسرت موہانی" میں لکھا ہے کہ حسرت کے مذہبی عقائد کیا ہیں، ان کا دین وایمان کیا ہے۔ یہ سوالات جس قدر ضروری ہیں، اسی قدر دلچسپ اور اہم بھی ہیں۔ سوال کرنے پر حسرت نے ارشاد فرمایا کہ میں قدامت پرست نہیں اور صوفی ہوں۔ اس موقعے پر حسرت نے (CONSERVATIVE) کا لفظ استعمال کیا تھا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہب کے الجھیڑوں سے بلند تر ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

حنفی ہیں نہ مالکی سے غرض   حنبلی سے نہ شافعی سے غرض
ہم کہ خالص ہیں پیرو اسلام   اور رکھتے نہیں کسی سے غرض

ہندوستان میں اسلام نے جو مسخ صورت اختیار کی ہے اس کے بارے میں حسرت کا خیال ہے۔

کشورِ ہند کہ مغلوب رہا ہے اس میں
نام ہی نام ہے اسلام کا اسلام کہاں

اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ حسرت اسلام کی صحیح تعلیم اور مذہب کے سچے جوہر سے واقف ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میرے عقائد کی دو مستحکم بنیادیں ہیں۔ ایک "العشق ہو اللہ والحسن ہو الحق اور دل بہ یار دست بکار" میں تصوف کو مذہب کا جوہر سمجھتا ہوں اور تصوف کا حاصل میرے نزدیک جذبۂ عشق ہے۔ فرماتے ہیں کہ . . .

تعلق حسن و حق میں بھی ہے العشق و ہو اللہ کا
یہی تو اصل دین اللہ پنہاں تصوف ہے

اس سلسلہ میں خود حسرت کا یہ نوٹ ہے۔

تعین العشق ہواللہ کی طرح الحسن ہوالحق بھی رموزِ تصوف میں ہے اور اپنے اشعار مجاز کو اس طرح واضح کیا ہے۔

میرے عشقِ مجاز کا ہے شعار
فی الشل دل پیار ور دست بکار

عمر کے آخری حصے میں سیاسی جدوجہد سے گزر کر حسرت کہتے ہیں۔

کوراج سوراج سب بھول کر حسرتؔ
اب مانگتا ہے پریم کا راج

پریم کی لگن، عشق کا جذبہ، استعداد زمانہ کے ساتھ ساتھ حسرت کے کلام میں مجاز سے گزر کر حقیقت کی جانب تیزی سے گامزن ہے۔ ہمارے پیشِ نظر حسرت کے ۴ دیوان ہیں۔ پہلے دو دیوان میں ...

دیکھیے اب رنگ کیا لائے یہ حسنِ دلفریب
آئینہ پیشِ نظر ہے ہاتھ میں ہے شانہ آج

اور

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں تری کج اَدائیاں
اس درجہ اعتبارِ تمنّا نہ چاہیے

کا رنگ موجود ہے اور آخری دو دیوان میں تصوف اور معرفت کا رنگ زیادہ گہرا ہوگیا ہے

مذہبِ عشق میں ناکامیِ جاوید کی خو
فرض منجملۂ احکام عبادات ہوئی

اسی کا جلوہ ہر جانب عیاں ہے
نمودِ حسن بے صورت کہاں ہے

بیعت

صاحبِ حالاتِ حسرت نے لکھا ہے کہ مولانا نے بچپن ہی میں مولانا شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی سے بیعت کی تھی۔ اس کے بعد آپ کے صاحبزادے یعنی مولوی عبدالباری کے والد ماجد (مولانا عبدالوہاب صاحب قدس سرہ العزیز) سے پھر بتجدید بیعت کی۔ یہ خاندان قادری المشرب ہے" پرنسپل عبدالشکور نے لکھا ہے کہ "حسرت بچپن ہی سے

مولانا شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی کے دائرہ ارادت مندان میں داخل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ان کے فرزند اور جانشین حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب فرنگی محلی سے تجدید بیعت کی۔ یہ سلسلہ قادریہ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

غرض حسرت کو وہاب عبدالرزاقین ودالی سے
سلوک مرتب انوارکلو و یا رسول اللہ

مولانا نے خود اس شعر میں جن بزرگانِ دین کا نام لیا ہے ان کی خود تشریح بھی فرمائی جو درج ذیل ہے۔

۱۔ حضرت سید عبدالصمد خدا نما مرشد حضرت سید عبدالرزاق بانسوی
۲۔ مرشدی حضرت شاہ عبدالوہاب لکھنوی فرنگی محلی
۳۔ حضرت شاہ عبدالرزاق لکھنوی فرنگی محلی و حضرت سید عبدالرزاق بانسوی
۴۔ حضرت شاہ عبدالوالی لکھنوی فرنگی محلی
۵۔ حضرت مولانا انوار لکھنوی فرنگی محلی جن کا باغ انوار لکھنو محلہ رکاب گنج میں مشہور عام ہے۔

انھیں بزرگوں اور دوسرے بزرگانِ دین سے اس قدر عقیدت اور ان کے توسط سے دل میں تصوف کا اس قدر غلبہ ہے کہ بار بار ان کا اشعار میں نام آتا ہے۔ مثلاً

گر بیانِ وصلِ یار کریں — جا کے بانسے میں رہبر کی تلاش
شمس رومی سے پوچھ لیں جو کہیں — سخن عشق معتبر کی تلاش

*

مجھے فیضِ سخن پہنچا ہے حسرت — ز روحِ پاک شمس الدین تبریز
ہر لحظہ وظیفہ ہے جانِ دل آگرا کا — الحسن ہو الحق کا العشق ہو اللہ کا

سید سلیمان ندوی نے تحریر فرمایا ہے کہ بچپن ہی میں وہ قادری سلسلہ میں مولانا شاہ عبدالوہاب فرنگی محلی یعنی جدِ بزرگوار مولانا جمال میاں فرنگی محلی کے مرید ہو چکے تھے اور اسی سلسلہ میں سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ سے انھیں بڑی عقیدت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں انقلابات کے باوجود حسرت اپنی زندگی میں اور صوفیانہ مشرب

میں غیر متزلزل رہے۔ بچپن سے مرگ تک وہ سچے اور پکے دین دار مسلمان رہے۔ وہ نہ صرف مسلمان بلکہ صوفی مسلمان تھے اور صوفیوں میں بھی وہ صوفی تھے جن سے سے بزرگوں کا کوئی عرس اور کوئی قوالی کی مجلس چھوٹتی نہ تھی۔ خصوصاً فرنگی محلی اور اودھ کی کوئی مجلس۔

روحانی مرتبہ

مولانا جمال میاں نے لکھا ہے کہ ان کی زندگی کا شخصی پہلو بھی عجیب وغریب تھا۔ غریبوں کی طرح رہے اور جس مساوات کے علمبردار تھے اس کا نمونہ تھے، جس فقر و زہد کی تلقین کرتے تھے، اس کا معیار تھے۔ جس خلوص اور للہیت کو صرف کتابوں میں پڑھا جاتا ہے وہ اس کا چلتا پھرتا خاکہ تھے۔ سیاسی عقائد کی انتہائی پختگی کے ساتھ تصوف کی ایک لطیف فضا بھی تھی جو ان کے انکسار، ان کے خلوص، ان کے زہد، ان کی حق گوئی، ان کی بے باکی ان کی شاعری بلکہ ان کی ساری زندگی کو اپنے دامن میں چھپائے تھی۔

ہر حال، ہر خیال میں ہر اعتبار سے
حسرت مطیعِ عشق رہے ٹھیک ہم رہے

وہ ایک ایسے درویشِ کامل تھے کہ ایک زمانہ تک اپنے روحانی سلسلہ کا کوئی عرس ناغہ نہیں کیا۔ نعت و منقبت میں ان کا بہت سا کلام ایسا ہے کہ جو بہت سے سلاسل میں اور اوراد میں پڑھا جاتا ہے۔ پیرانِ پیر کی شان میں ان کی یہ غزل جس کی ردیف شیئاً للہ ہے اکثر سلاسل میں بطور ورد کے پڑھی جاتی ہے۔ مولانا اپنے مشرب میں کٹر صوفی تھے۔ قوالی کے بہت شوقین تھے اور محفلِ سماع میں خاص جذب و کیفیت سے شریک ہوتے تھے۔ جب روپے ختم ہو جاتے تو اپنے کپڑے اتار کر قوالوں کو دے دیتے۔ عرس سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اپنی جائیداد کا بیشتر حصہ اپنے پیر و مرشد اور جدِ اولیٰ کے عرس کے لیے اپنی زندگی میں وقف کر دیا تھا۔ مولانا دراصل سلسلۂ قادریہ میں میرے دادا مولانا عبدالوہاب کے مرید ہوئے اور بیعت کا واقعہ انھوں نے مجھ سے یوں بیان کیا کہ ایک بار ان کے ذہن میں کچھ شکوک تھے اور انھوں نے یہ خیال کیا کہ اگر مولانا عبدالوہاب میرے شکوک بغیر بات کیے صرف اپنی نظر سے دور کر دیں تب

میں ان کا قائل ہوں گا۔ اِدھر یہ خیال آیا اُدھر ان کے ہونے والے مرشد نے ان کو ایک ایسی نگاہ سے دیکھا کہ مولانا ان کے قدم بوس ہو گئے اور داخل بیعت ہوئے۔ اس واقعہ کی طرف انھوں نے اپنے ایک شعر میں اشارہ کیا ہے۔

کیا چیز تھی وہ مرشد وہاب کی نگاہ
حسرت کو جس نے عارف کامل بنا دیا

خانوادہ فرنگی محل سے

مولانا قطب الدین عبدالوالی نے لکھا ہے کہ مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اکابر تقریباً سات پشت سے یہاں فرنگی محل میں ہمارے بزرگوں کے مرید نسلاً بعد نسلاً چلے آرہے ہیں مولانا مرحوم اپنے بزرگوں کی آخری اور جامع یادگار تھے۔

سلسلہ طریقت

مولانا کے پیر مولانا عبدالوہاب فرنگی محلی اپنے والد مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی کے اور وہ مولانا حافظ عبدالوالی فرنگی محلی اور وہ مولانا احمد انوار الحق فرنگی محلی اور وہ مولانا مولوی احمد عبدالحق فرنگی محلی کے خلیفہ تھے اور وہ حضرت سید عبدالرزاق بانسوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ جناب جمال میاں نے لکھا ہے کہ "مولانا حسرت کے مرشد طریقت حضرت مولانا شاہ عبدالوہاب فرنگی محلی ایک ایسے خاندان کے رکن تھے جس کا علم تجربہ اور روحانی درجہ مسلّم ہے۔ ان کے جدّ امجد اعلیٰ حضرت ملا قطب الدین شہید سلسلہ چشتیہ سے وابستہ تھے لیکن حضرت قطب شہید کے فرزند استاذ الهند ملّا نظام الدین لکھنوی کے پوتے حضرت احمد عبدالحق ایک ایسے بزرگ کے وسیلے سے سلسلہ قادریہ میں داخل ہوئے جو عارفِ رموزِ طریقت و شریعت تھے مگر بظاہر نوشت و خواند سے بھی ناآشنا تھے۔

ان جلیل القدر بزرگ کا نام نامی اور اسم گرامی سید السادات حضرت شاہ عبدالرزاق علیہ الرحمۃ تھا۔ حضرت ممدوح اودھ کے ایک گاؤں بانسہ شریف میں اقامت پذیر ہوئے اور وہیں آپ کا مرقد منور ہے۔ حضرت سید صاحب نے مولا علی کرم اللہ وجہہ کی خواب میں زیارت کی اور ان کے ارشاد کے بموجب حضرت سید عبدالصمد خدا نما احمد آبادی کے دستِ حق پرست پر بیعت سے مشرف ہوئے۔ میر خدا نما علیہ الرحمت کے ایک خادم تاج بابا نے بیعت کے بعد درخواست کی کہ معمول کے مطابق حضرت سید صاحب کو چلّہ کشی کی ہدایت کی جائے۔ اس پر حضرت میر عبدالصمد خدا نما نے فرمایا کہ اولیائے کاملین کو جو کچھ خلوت اور چلّہ کشی میں حاصل ہوا ہے وہ اس سپاہی کو گھوڑے کی پیٹھ پر حاصل ہو گا۔ حضرت سید صاحب کو رخصت کرتے ہوئے ہدایت فرمائی کہ جب وہ دہلی پہنچیں تو پیر سید حسن رسول نما سے ملاقات کریں چنانچہ جب وہ دہلی آئے اور پیر سید حسن رسول نما سے تو انھوں نے فرمایا کہ اے مرد سپاہی ایک ہی بات ہے جو تم کو پیر و مرشد سے ملی اور مجھ کو میرے پیر سے لیکن مطالب کا حصول ہر ایک کی سعی اور کوشش کے بقدر ہے ایسا نہ چاہیے کہ خوب شکم سیر ہو کر کھائے پیر پھیلا کر سوئے اور کسی فقیر کو بدنام کرے۔"

یہ بزرگ جیسا کہ مولانا جمال میاں نے اوپر لکھا ہے پیر بانسہ شریف میں قیام فرما تھے اور جب خاندان فرنگی محل کے بزرگ ملا نظام الدین اور بھتیجے ملا احمد عبدالحق ان سے بیعت ہوئے تو اربابِ علم کو شکایت پیدا ہوئی اس لیے حضرت سید عبدالرزاق بانسوی عالم نہ تھے اور ملا نظام الدین اور ملا احمد عبدالحق کی ایک عالم کی حیثیت سے دور دور شہرت تھی۔ حضرت مولانا شبلی نعمانی نے اپنے مضمون "ملا نظام الدین" کے زیرِ عنوان اس شکایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "علوم ظاہری کی تکمیل سے فارغ ہو کر ملا صاحب (ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ) نے علوم باطن کی طرف توجہ کی۔ اس وقت حضرت شاہ عبدالرزاق بانسوی کے فیوض و برکات کا تمام ہندوستان میں غلغلہ تھا۔ ملا صاحب ان کے آستانے پر حاضر ہوئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شاہ صاحب موصوف علوم رسمیہ سے ناآشنا تھے۔ اس لیے تمام لوگوں کو تعجب ہوا یہاں تک کہ علمائے فرنگی محل نے اعلانیہ ملا صاحب سے شکایت کی۔ ملا صاحب کے تلامذہ میں سے ملا کمال علوم عقلیہ میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے اور چونکہ بے انتہا

ذہین وطباع تھے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ملا صاحب کی بیعت پر رد وبر وگستاخانہ عرض کیا کہ آپ نے ایک جاہل کے ہاتھ پر کیوں بیعت کی۔ اس پر بھی قناعت نہ کر کے شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچے اور فلسفہ کے چند مشکل مسئلے لے کر گئے۔ مشہور ہے کہ شاہ صاحب نے خود ان مسائل کو چھیڑا اور ملا کمال کی خاطر خواہ تسکین کر دی۔ چنانچہ اس وقت ملا کمال اور ان کے ساتھ بہت سے علماء شاہ صاحب کے قدموں میں گر پڑے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شاہ صاحب نے ۱۱۳۶ھ میں وفات پائی اور ان کی وفات کے بعد ملا نظام الدین نے ان کے خلیفہ سید اسمٰعیل بلگرامی سے باطنی فیوض حاصل کیے۔ ملا احمد عبدالحق نے اپنے چچا ملا نظام کی خدمت میں تحصیلِ علم کی۔ ان کی تصانیف میں شرحِ مسلم اور حواشی زواہر ثلاثہ یادگار ہیں۔ ۹ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۴ء میں انتقال ہوا۔ تذکرہ علمائے ہند میں تحریر ہے کہ آپ علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی میں کامل تھے۔ مولانا جمال میاں لکھتے ہیں کہ "ملا احمد عبدالحق فرنگی محلی (پسر ملا سعید برادر بزرگ ملا نظام الدین فرنگی محلی) کے فرزند مولانا انوار الحق سلسلہ انواریہ قادریہ کے ایک نمایاں بزرگ تھے۔ مولانا شبلی نے ملا احمد عبدالحق کے بارے میں اپنے مضمون "درس نظامیہ" میں یوں لکھا ہے: "دوسرے صاحبزادے ملا سعید باپ کے ساتھ زخمی ہوئے تھے۔ عالمگیر کے پاس دکن گئے اور فرنگی محل کی معافی کا پیغام لائے۔ عنفوانِ شباب میں وفات پائی۔ ملا عبدالحق جو مشہور صوفی اور بزرگ ہیں، انھیں کے صاحبزادے ہیں۔ مولوی مبین شارح مسلم ان ہی کے فرزند ہیں۔" تذکرۂ علمائے ہند میں تحریر ہے کہ مولانا انوار الحق کے دل میں ازل ہی سے اللہ کی محبت ودیعت ہوئی تھی۔ اس لیے بچپن میں اپنے ماموں کی خدمت میں بیٹھتے تھے۔ درسی کتابیں مولوی احمد حسین اور ملا محمد حسن سے پڑھیں۔ ۱۷ سال کی عمر میں والد سے بیعت ہوئے۔ ۲۶ رشعبان ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں رحلت فرمائی۔ قبرستان فرنگی محل جہاں مولانا حسرت مدفون ہیں، انھی کے نام سے منسوب ہے اور "باغِ انوار" کہلاتا ہے۔ مولانا نے اس باغ کی شان میں جو غزل لکھی ہے، اسے ان کی ذاتی زندگی کے باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ ساداتِ موہان مولانا انوار الحق کے زمانہ ہی سے شیوخ فرنگی محل سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ مولانا حسرت کے پرنانا سید آل حسن مرحوم مولانا انوار الحق کے مرید تھے۔

مولانا انوار الحق کے جانشین مولانا عبدالوالی فرنگی محلی تھے۔ آپ تحصیلِ علم کے بعد اپنے نانا انوار الحق فرنگی محلی سے بیعت ہوئے اور ان کے خلیفہ برحق اور مجاز ہوئے تمام عمر یادِ الٰہی میں بسر کر دی اور ۲۲ رشعبان ۱۲۷۹ھ بمطابق ۱۸۶۳ء میں نوّے سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ ان کے جانشین مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی تھے۔ مولانا حسرت کے نانا مولانا احمد سعید، مولانا عبدالرزاق کے خصوصی مرید تھے اور مدت العمر فرنگی محل میں اپنے پیر و مرشد کے پاس رہے۔ مولانا حسرت کا پورا خاندان مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی کا مرید اور ارادت مند تھا۔ ان کی والدہ اعراس کے زمانہ میں شرکت کے لیے پابندی سے فرنگی محل جایا کرتی تھیں اور مولانا ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ اس لیے عہدِ طفولیت ہی سے وہ حضرت مولانا عبدالرزاق کے معتقد اور ارادت مند تھے، اور بہت ممکن ہے کہ انھوں نے بچپن ہی میں ان سے بیعت کی ہو کیوں کہ اکثر اشعار میں اس طرف اشارے ملتے ہیں۔

غلام حضرتِ رزاق کیا ہوئے حسرت
کہ آپ نام خدا عاشقوں کے پیر ہوئے

مولانا حسرت کو مولانا شاہ عبدالرزاق سے بے حد عقیدت تھی اور اردوئے معلیٰ اگست ۱۹۳۸ء میں انوارِ رزاقیہ (سوانح حیات حضرت مولانا شاہ عبدالرزاق) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ہمارے حضرت کا ولیِ کامل، امامِ وقت اور غوثِ دوراں ہونا اربابِ نظر اور اہلِ تحقیق کے نزدیک مسلّم ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنھیں حضور کی زیارت نصیب ہوئی۔ جن لوگوں کو یہ دولت نصیب نہیں ہوئی، انھیں بھی کم سے کم اس کتاب سے فیض یاب ہونا لازم ہے۔ لکھنؤ سینٹرل جیل میں فقیر نے حضور کی شان میں یہ شعر کہے تھے۔

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب
لکھنؤ آنے کا باعث یہ کھلا ہے اخترؔ
کھینچ لایا ہے دل اک شاہدِ پنہاں کے قریب

روز ہو جاتی ہے رویا میں زیارت حسرتؔ — آستانِ شہِ رزاق ہے زنداں کے قریب

تذکرہ علمائے ہند میں تحریر ہے کہ مولانا عبد الرزاق ۱۲۲۷ھ بمطابق ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ مولوی جمال الدین احمد ابن مولوی علاؤالدین احمد کے فرزند تھے۔ آپ نے حدیث کی کتابیں مولوی حسین بخش ملیح آبادی اور مرزا حسن علی لکھنوی سے پڑھیں۔ اپنے مرشد مولوی عبد الوالی سے کتب عقائد، سلوک و تصوف کی تحصیل کی۔ اس کے بعد ایک سال میں قرآنِ مجید حفظ کیا۔ ۱۲۵۴ھ بمطابق ۱۸۳۸ء میں پورے طور پر فارغ ہو گئے۔ سلسلہ قادریہ چشتیہ میں مولوی عبد الوالی اور اپنے والد سے اجازت حاصل کی۔ اپنے مرشد کے انتقال کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ ترک کر دیا اور یادِ حق میں مشغول ہو گئے۔ آخر ماہِ صفر ۱۳۰۷ھ بمطابق ۱۸۸۰ء انتقال فرمایا۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ مولانا عبد الرزاق کے وصال کے بعد ان کے فرزند مولانا عبد الوہاب جانشین ہوئے۔ مولانا حسرت نے ان سے تجدید بیعت کی یا باقاعدہ بیعت کی، جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ اس کے بعد مولانا جمال میاں لکھتے ہیں کہ اردوئے معلّٰی میں جو شجرے شائع ہوئے ہیں وہ مولانا عبد الباری کے عنایت کیے ہوئے ہیں اور عبارات ذیل ان پر لکھی ہے۔

> مولوی سید فضل الحسن را کہ بر دست خدمت ابی مرشدی مولانا عبد الوہاب قدس سرہ العزیز توبہ کردہ و بیعت نمودہ داخل سلسلہ قادریہ رزاقیہ والیہ رزاقیہ استقامت بر توبہ بخشا شد و خاتمہ بخیر کن

اس سلسلہ کے مشائخ کا دستور تھا کہ وہ مرید کو پہلے سلسلہ قادریہ میں اور بعد کو ظرف استقامت کے مطابق سلاسلِ چشت اور دیگر سلاسل میں بھی داخل کرتے تھے۔ حضرت سید بانسوی کو سلسلہ چشتیہ کی اجازت باطنی مکاشفات کی بنا پر ہوئی۔

خلافت

مولانا حسرت کو سلسلہ قادریہ کی خلافت حاصل ہو چکی تھی اور بعد کو دولت چشتیہ بہ عطائے خاص حاصل ہوئی۔ تفصیل اس اجمال کی درج ذیل مکتوب سے ہوتی ہے۔

نقل خط بنام حضرت مولانا عبد الباری علیہ الرحمۃ

"از یروداسینٹرل جیل

۵ر شعبان المعظم

مخدومی و مطاعی! بعد سلام مسنون گزارش ہے کہ اس وقت تک میں نے شرم کے سبب سے اپنا حال آپ کو نہیں لکھا تھا مگر آج بہ ایمائے خاص بذریعہ عریضہ ہذا درخواست کرتا ہوں کہ بروقتِ ضرورت مجھ کو سلسلہ چشتیہ صابریہ، رزاقیہ انواریہ، والیہ رزاقیہ میں بیعت لینے کی اجازت مرحمت ہو۔ میں آپ کی اجازت کو اپنے اور آپ کے مرشد علیہ الرحمۃ کی اجازت کا قائم مقام سمجھوں گا۔

خاک پائے شما و بزرگانِ شما
فقیر حسرت موہانی

پتہ یہ ہے۔

درجیل خانہ۔ حسرت موہانی، بذریعہ سپرنٹنڈنٹ سینٹرل جیل

یروودا، پونا"

جواب از حضرت مولانا عبدالباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ

"آپ کا خط مولانا عبدالوالی صاحب کے عرس کے دوران پہنچا جو آپ کی شرکت کا قائم مقام ہے۔ میں آپ کو مطلوبہ اخذ بیعت کی اجازت دیتا ہوں اور اپنے لیے باعثِ افتخار و مغفرت سمجھتا ہوں۔ مجھے آپ کی تخفیفِ سزا کا حال معلوم ہوا۔"

مولانا کی صاحبزادی اور داماد نے بتایا ہے کہ مولانا جیل میں کسی قیدی کو بیعت کرنا چاہتے تھے، اس لیے اجازت کی درخواست کی گئی تھی۔ مولانا جمال میاں کا جو مضمون "نگار" کے "حسرت نمبر" میں شائع ہوا تھا، اس میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔" مولانا جمال میاں نے مقدمۂ کلیات حسرت میں تحریر کیا ہے کہ مولانا کو دوسرے سلاسل میں بھی بیعت لینے کی اجازت ان کے مرشد زادے نے دے دی تھی لیکن شاگردانِ شاعری کی طرح مریدانِ حسرت کی تعداد بھی مختصر ہے۔ مولانا جمال میاں نے اسی مقدمہ میں آگے چل کر تحریر فرمایا ہے کہ مولانا حسرت نے اپنے شیوخ کی مدح میں جو اشعار لکھے ہیں وہ تصنع سے بری ہیں اور ان میں زیادہ تر ایسے

معاملات کا ذکر ہے جو ان پر خود گزرے۔ مثلاً قیدِ فرنگ ثانی میں ان کو بلا اطلاع فیض آباد جیل سے سینٹرل جیل لکھنؤ لایا گیا۔ مولانا حسرت قیدِ تنہائی میں تھے اور بند گاڑی میں لائے گئے۔ کسی بیرونی ذرائع سے انھیں معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس جگہ پر ہیں۔ پہلی ہی شب انھوں نے خواب میں حضرت مولانا شاہ عبدالرزاق کی زیارت کی اور حضرت نے تسلی دی اور کہا کہ وہ قریب ہیں۔ مولانا حسرت فرماتے ہیں کہ جتنے دن لکھنؤ جیل میں رہے ہر روز زیارت کی۔ مقطع میں برملا اس کا ذکر موجود ہے۔

روز ہو جاتی ہے رویا میں زیارت حسرتؔ
آستانِ شہِ رزاق ہے زنداں کے قریب

اس غزل کے ان اشعار کے علاوہ جو اوپر بیان کیے جا چکے ہیں، یہ دو شعر بھی بیانِ واقعہ ہیں۔

وہ جو ہیں پاس تو حبس بھی ہے اک باغ ہمیں
کامیابی بھی نمودار ہے حرماں کے قریب
لیٹے اس ڈھب سے کہ پھر ہو نہ جدا خاک مری
کہیں پہنچے بھی تو اس گوشۂ داماں کے قریب

یہ شعر اس وقت ایک واقعہ بن گیا جب وہ ایامِ علالت میں لکھنؤ پہنچے اور فرنگی محل ہی میں انتقال فرما کر اپنے پیر کے پائنتی دفن ہوئے اور بقول مولانا جمال میاں ہر سال ان کا عرس اپنے پیر کے عرس کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے۔

سلسلۂ چشتیہ سے ارادت

مولانا کو سلسلۂ چشت سے بڑی ارادت تھی۔ ان کا یہ شعر بانیٔ سلسلۂ چشتیہ ہند حضرت خواجہ اجمیری کی شان میں مشائخِ چشت سے ان کی ارادت اور محبت کا پتہ دیتا ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

غلامِ خواجۂ اجمیر حسرتؔ
بجا ہے گر کرے دعویٰ شاہی

مولانا جمال میاں نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ "مولانا سلسلۂ چشتیہ کے اعراس میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ پہلی بار قید فرنگ سے رہا ہوتے وقت ان کو سب سے زیادہ مسرت اس بات سے تھی کہ انھیں صاحب توشہ حضرت احمد عبدالحق ردولوی کے عرس میں شرکت کا موقع ملا۔ مولانا نے مشاہداتِ زنداں میں لکھا ہے کہ ان کے زمانۂ قید میں ۱۵ یوم کی تخفیف حضرت صاحب توشہ کی کرامت کا نتیجہ تھی۔ حضرت احمد عبدالحق ردولوی . . . حضرت مخدوم کبیر الاولیا جلال پانی پتی کے خلیفۂ اعظم تھے۔ مولانا کا یہ شعر حضرت کبیر الاولیا کی خدمت میں ایک حقیر نذرانۂ عقیدت ہے۔

سبب حسرت ہوئی فیضانِ حق کا
نظر لطفِ کبیر الاولیاء کی

طرزِ طریقت

مولانا جمال میاں نے مقدمۂ کلیاتِ حسرت میں لکھا ہے کہ "مولانا حسرت نہ صرف باقاعدہ مرید اور بزرگانِ سلسلہ کے معتقد تھے بلکہ وہ اپنے سلسلہ کے سلوک اور ریاضات سے بھی آگاہ تھے۔ جس طرح ان کی شاعری غور و فکر، عمیق مطالعہ اور قدیم قواعد کی پابندی کی وجہ سے اساتذہ قدیم کے اصول پر بھی درست ہے اور ندرتِ مضامین اور جدتِ فکر کے لحاظ سے جدید تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے اسی طرح ان کی طریقت اگر ایک طرف مجاہدات اور مکاشفات سے وابستہ ہے تو دوسری طرف ان کے سیاسی افکار پر اس کے گہرے اثرات پڑے ہیں۔ ایک سچے درویش کی طرح وہ زندگی بھر ساز و سامان سے بے نیاز رہے۔ اللہ کے فقیر کی شان سے کبھی مخلوق کے سامنے دستِ طلب دراز نہیں کیا۔ قیدِ فرنگ میں جن مصائب کا سامنا ہوا وہ خوشی خوشی برداشت کیے۔ حق گوئی اور بے خوفی ان کا شعار رہا۔ کبھی مایوس و ملول نہیں ہوئے۔ طالبانِ حق اور سالکانِ معرفت کو جو کچھ چلہ کشی اور ریاضت سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ مولانا حسرت کو چکی کی مشقت اور جیل خانوں کے اعتکاف میں حاصل ہوا۔ مشاہدات زندان کے صفحات

گواہ ہیں کہ سیاسی جدوجہد اور قید و بند کے تمام مراحل انھوں نے ایک پکے صوفی کے انداز سے طے کئے۔ ان کے سیاسی نظریات کلیتاً ان کی درویشی کا نتیجہ تھے۔ حد یہ ہے کہ اشتراکیت کے ایسے نظریہ کو بھی وہ اپنی درویشی اور اسلام سے بھی مربوط سمجھتے تھے۔ خود فرماتے ہیں۔

اہلِ ایماں رکھتے ہیں کامل بہ فتوائے جنوں
شانِ لاخوف علیہم شیوۂ لاہم یحزنوں
کامیاب و کامراں ہیں شادکام و شادماں
گو کہ دیوانے ترے ظاہر میں ہیں زار و زبوں
روشنی بخشِ دلِ جاں ہو نہ کیوں اس کا خیال
جس کے جلوے کی درخشانی ہے انوار

مولانا جمال میاں نے آگے چل کر لکھا ہے کہ "مولانا حسرت نے جابجا اس کا اظہار کیا ہے کہ ان کی بے انتہا قوتِ برداشت اور فطری شادمانی و بے غمی کا سرچشمہ ان کا ذوقِ تصوف اور جذبۂ عشق ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی شاعری اور سیاست ان کے تصوف سے وابستہ ہے ان کا عشقِ مجازی بھی تو صرف حقیقت کی رہنمائی کے لیے ہی ہے۔

عشقِ بتاں سراجِ طریقِ صفا بنا
حق الیقیں تک آتے ہیں عین الیقیں سے ہم

مولانا صوفی صافی تھے۔ صاحبِ نسبت تھے۔ اپنے مرشدین سے اکتسابِ فیض کرتے۔ ان کے سلسلۂ طریقت میں صفائی باطن اور تہذیبِ اخلاق کے ساتھ شریعت کی کامل پابندی لازمی ہے۔ اس لیے ان کا کلام یکسر ان اصطلاحات اور مضامین سے خالی رہا جو اربابِ تصوف کے نقل کرنے کے اشعار میں انھوں نے ایسے اشعار نہیں لکھے جو شریعت اور طریقت کے معیار پر پورے نہ اتریں۔ انھوں نے اپنا مسلک دو مصرعوں میں بیان کر دیا اور ان کی سیرت شاہد ہے کہ وہ اس پر عامل رہے۔

پڑھیے اس کے سوا نہ کوئی سبق
خدمتِ خلق و عشقِ حضرتِ حق

مولانا کے اپنے سلسلے میں ایک شخصیت ایسی نظر آتی ہے جس نے راہِ سلوک مروجہ طریقے سے طے نہیں کی اور جس کے بارے میں ان کے شیخِ طریقت نے اظہار کیا کہ اس مرید کو نسبتِ معرفت گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر حاصل ہوگی۔ وہ شخصیت حضرت شاہ عبدالرزاق بانسوی کی تھی۔ اگر اس سلسلۂ طریقت میں مولانا نے بھی راہِ سلوک مروجہ طریقہ سے طے نہیں کی تو یہ کوئی ناممکن العمل بات نہیں۔ بقول مولانا جمال میاں "طریقت نے ان کو سب سے بڑی نعمت یہ عنایت کی کہ وہ صوم وصلوٰۃ، حج اور خیرات کی انتہائی پابندی اور منہیاتِ شریعہ سے مکمل احتراز کے باوجود تقشّف کی خشونت اور زہد کے غرور سے محفوظ رہے۔ کلیاتِ حسرت کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے راہِ سلوک و تصوف کو طے کر لیا تھا۔ فنافی الشیخ سے فنافی الرسول ہوئے اور درجۂ کمال یعنی فنافی اللہ بھی حاصل کر لیا۔ کلیات کے ابتدائی حصّوں میں شیوخِ طریقت کی مدح سرائی ہے اور آخری حصّوں میں زیادہ تر نعت و حمد ہے۔ پروفیسر عبدالشکور نے بھی اسی جانب اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں: "عشقِ مرشد بڑھتے بڑھتے عشقِ رسول تک پہنچا اور ناظرین کو سن کر تعجب ہوگا کہ سرمایہ کے فقدان کے باوجود حسرت نے ۱۱ حج کیے۔ (صحیح یہ ہے کہ ۱۳ حج کیے) اور ایک مرتبہ خشکی کے راستے سے خانہ کعبہ گئے۔ بیگم حسرت بھی ساتھ تھیں۔ جس میں سفر کی بہت سی صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ مگر بصرہ، بغداد، کاظمین، کربلائے معلیٰ، نجفِ اشرف سب کی زیارت سے مشرف ہو کر تزکیۂ نفس اور تصفیہ روح کر سکے۔ چنانچہ آخری دور کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ مدینہ، شاہِ مدینہ، دیارِ مدینہ اور گنبدِ خضرا کی جانب تکرار سے اشارے پائے جاتے ہیں۔

پھر آنے لگیں شہرِ محبت کی ہوائیں — پھر پیشِ نظر ہو گئیں جنّت کی فضائیں
اے قافلے والو کہیں وہ گنبدِ خضرا — پھر آئے نظر ہم کو کہ تم کو بھی دکھائیں
ہاتھ آئے اگر خاک ترے نقشِ قدم کی — سر پر کبھی رکھیں کبھی آنکھوں سے لگائیں

٭

فنا ہے بقا مسلکِ عاشقی میں — اگر رونما ہو دیارِ نبی میں
سفر جب شہِ ہو پھر مدینہ سے حسرت — وہ کب آئیں گے دن تری زندگی میں

کھچ گئی نورِ اعلےٰ نور کی تصویرِ جمیل　　بعد کعبے کے جو آنکھوں نے مدینہ دیکھا

سری کرشن سے عقیدت

پروفیسر عبدالشکور، مولانا جمال میاں اور جناب جلیل قدوائی نے تصوف کے سلسلہ میں مولانا کی سری کرشن سے عقیدت کے واقعات بھی بیان کیے ہیں۔ پروفیسر عبدالشکور لکھتے ہیں کہ انھوں نے مولانا سے کئی بار مشربِ تصوف کے بارے میں بات کی اور ہر مرتبہ سری کرشن کا ذکر آیا۔ یہ بات پروفیسر صاحب کے الفاظ میں سنیے: "مشربِ تصوف کے سلسلہ میں گفتگو کی گئی۔ دورانِ گفتگو میں حسرت نے ایک نہایت دلچسپ نکتہ بیان فرمایا کہ ان کے نزدیک صداقت اور حسن میں کوئی فرق نہیں ہے اور چوں کہ ہندو سری کرشن کو حسن کا اوتار مانتے ہیں لہٰذا حسرت کو بھی کرشن سے یہی عقیدت ہے اور وہ ایک سچے عقیدت مند کی طرح متھرا اور بندرا بن جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس سفر سے ان کو روحانی فیض حاصل ہوتا ہے۔ حسرت کہتے ہیں کہ گیتا میں دراگ اور تیاگ پر زور نہیں دیا گیا ہے جب کہ سری کرشن عمل یعنی کرم یوگ کے فلسفہ کی تبلیغ کرتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک اسلام اور گیتا کی تعلیمات میں جابجا یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ان کے خیال میں سری کرشن عشق اور حسن کے اوتار تھے۔ اس لیے اہلِ باطن اور صوفیائے کرام سری کرشن کو ولیِ کامل مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ ان کا روحانی تصرف ہندوستان میں جاری و ساری ہے۔ دیوانِ مختم مرتبہ بیگم حسرت موہانی کے دیباچہ میں مولانا یوں رقم طراز ہیں: "جن جن بزرگوں سے فقیر کو فیض پہنچا ہے، ان میں اکثر کی جانب کہیں نہ کہیں اشارہ موجود ہے۔ بزرگانِ دین اسلام کے علاوہ ایک موقعہ پر سری کرشن کا بھی نام آیا ہے۔ حضرت سری کرشن علیہ الرحمۃ کے باب میں فقیر اپنے پیر اور پیرانِ پیر حضرت سید عبدالرزاق بانسوی قدس سرہ کے مسلکِ عاشقی کا پیرو ہے۔

مسلکِ عشق ہے پرستشِ حسن　　ہم نہیں جانتے عذاب و ثواب

⁂

متھرا سے اہلِ دل کو وہ آتی ہے بوئے انس　　دنیائے جاں میں شور ہے جس کے دوام کا

لبریز نور ہے دل حسرت زہے نصیب
اک حسن شکر نام کے شوقِ تمام کا

☆

متھرا کا نگر ہے عاشقی کا — دم بھرتی ہے آرزو اسی کا
پیغام حیاتِ جاوداں کا — ہر نغمہ کرشن بانسری کا
وہ نور سیاہ تھا کہ حسرت
سرچشمہ فروغِ آگہی کا

اور اس نظریہ کی تائید اس طرح کی گئی ہے۔

حسرت کا دل آئینہ ہے اک صورتِ حق کا
گو اس کی نظر شیفتۂ حسنِ بتاں ہے

سن رے پریت لگائی کھسائی کا ہو اور کی تدابر کا بیکا آئی
گوکل ڈھونڈ بندرابن ڈھونڈ — برسانے لگ گھوم کے آئی
تن من دھن سب وارکے حسرت — متھرا نگر چل دھونی رمائی

مولانا جمال میاں سری کرشن سے مولانا کی عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "کرشن جی کے ساتھ اس حسنِ ظن کے باوجود انھوں نے ان کی مدح میں یہ غزلیں لکھی ہیں ان کے ساتھ حضرت بانسوی کے کشف کا بھی حوالہ دیا ہے اور اس مدح میں بھی اپنے اصول سے نہیں ہٹے ہیں۔

جناب جلیل قدوائی نے لکھا ہے کہ ہر سچے مسلمان کی طرح ان کا بھی عقیدہ تھا کہ خداوند تعالے نے ہر زمانہ میں اور دنیا کے ہر حصے میں بشرطِ ضرورت فدائیانِ حق اور معلمینِ قوم روانہ فرمائے ہیں جن میں بہتوں کا ہمیں علم ہے اور بہتوں کا نہیں۔ مگر مولانا اس عقیدہ سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ وہ کرشن جی سے بھی والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ خاص کر اس لیے کہ شری کرشن کا فلسفہ کرم یوگ ایک فلسفۂ عمل تھا اور اسلام کی تعلیم سے میل کھاتا تھا۔ ہندو کرشن جی کو حسن اور عشق کا اوتار مانتے تھے۔ شاعرانہ اعتبار سے حسرت حسن و عشق کے پرستار ہونے سبب بھی کرشن جی کے پرستار تھے اور متھرا اور اس کے نواحی علاقوں میں پابندی کے ساتھ

حاضر ہونے کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بعض دلچسپ اشعار کہے ہیں۔ حدیہ کہ اس عقیدت کی بدولت انھوں نے ہندی میں شاعری کی اور بعض بڑی پیاری ہولیاں اور ٹھمریاں کہی ہیں۔ مثلاً

برسانہ و نندگاؤں میں بھی دیکھ آئے ہیں ہم جلوہ کسی کا

آنکھوں میں نور جلوۂ بے کیف وکم ہے خاص جب سے نظر پہ ان کی نگاہِ کرم ہے خاص

کچھ ہم کو بھی عطا کرو اے حضرت کرشن

اقلیمِ عشق آپ کے زیرِ قدم ہے خاص

حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری

سنتے ہیں عاشقوں پہ تمھارا کرم ہے خاص

اور ان کی ہولیوں اور ٹھمریوں کی طرف تو لوگوں کی نظریں ہی نہیں گئی ہیں حالانکہ آج بھی ان کا لطف کچھ برج رسیا ہی اٹھا سکتے ہیں۔

مو پہ رنگ نہ ڈار مراری بنتی کرت ہوں تماری

پنیاں بھرن کو جانے نہ دیہیں

شیام بھرے پچکاری

تھر تھر کانپت لاجن حسرت دیکھت ہیں نر ناری

کہیں بھاگے لے گردھاری اور ان سر جل بھول بھاری

روت دھوت تکیت بلکت

ہی اس کی رین گئی کٹ ساری

جیا جات رکھارت حسرت دیکھ دیکھ بدریا کاری

تزکیۂ نفس

شری کرشن سے عقیدت، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ ان کے فلسفہ کرم یوگ کی وجہ سے تھی، جس کو مولانا فلسفۂ عمل گردانتے تھے۔ پھر یہ کہ اس عقیدت میں تزکیۂ نفس، فلسفۂ تصوف میں ایک بنیادی اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں

نے اپنے کئی اشعار میں تزکیۂ نفس کے بنیادی اصول پیش کیے ہیں۔ مثلاً

عقدہ وصالِ یار کا حل ہو تو جانیے
خوف و خلوص و علم و عمل ہو تو جانیے

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

ہم ہیں بیمار کبر و بغض و ریا — کیوں نہ درکار ہو دوائے خلوص
طے کرائے دل بزورِ علم و عمل — راہ بیم و رجا بپائے خلوص
زہد و تقویٰ ریاضت و عزلت — بن گئے سب کے دست و پائے خلوص
نفس شیطاں حقیقت و دنیا — سب پہ غالب ہوئی دعائے خلوص

پھر

دل کا تقویٰ ہے خیر خواہی خلق — ہو بشرطیکہ بر بنائے خلوص
فکر رزق و مصائب تقدیر — عارضی حال تھے بجائے خلوص
سو بہ صبر و توکل و تفویض — بن گئے شیوۂ رضائے خلوص
توبہ و علم و حمد و شکر ہیں باب — شہر ہے شہر پہ فضائے خلوص
ذکر و فکر و ریاض و صوم و صلوٰۃ — سارے جھگڑے ہیں اک برائے خلوص
اور حقیقت میں ان کے سب کے سوا — عشق ہے اصل مدعائے خلوص

پروفیسر عبدالشکور لکھتے ہیں کہ اس تمام گفتگو کے بعد حسرت کا یہ کہنا۔

ولایت کا دعویٰ نہیں ہم کو لیکن
ہے اتنا کہ ہوں اک گنہ گارِ صالح

بجائے خود تصوف کا کوئی رمز ہے جو صرف اہلِ بصیرت جانتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ حسرت کی ایک پرانی غزل ہے۔

کیوں نہ مقبول ہو دعائے خلوص — کہ اثر خود ہے خاک پائے خلوص
قید کی بات خوب مان گئے — دسنی میری التجائے خلوص

یہ غزل ۱۹۱۶ء میں کہی گئی۔ دوسری غزل جو اسی زمین میں کہی گئی وہ سن ۱۹۲۱ء میں لکھی گئی۔ دونوں کے مضامین میں بہت فرق ہے۔ پہلی غزل میں عشق ناکام اور بیکسی ہائے دوستی کے دلسوز نغمے چھیڑے ہیں۔ دوسری غزل میں سراسر طریقت کی طرف

اشارہ کیا گیا ہے۔
ایک ہیں حسرت ٹھیٹ عاشق ہیں۔ اپنے محبوب کے پرستار ہیں اور دوسری میں حسرت عشقِ مجاز سے گزر کر حقیقت تک آن پہنچے ہیں یعنی خود ان کے بقول

عشق ناکام ہی نہیں ناکام
وہ جو ہو جائے رہنمائے خلوص

دنیا کے بھی بادشاہ اور آخرت کے بھی بادشاہ

ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی نے لکھا ہے کہ ہر چند تغیّر کائنات کا لازمی قانون ہے۔ لیکن حقائق زندگی بدلا نہیں کرتے۔ وہی صبح و شام وہی چاند و سورج، وہی زمان و مکان، وہی فطرتِ انسانی وہی فطرتِ کائنات ہے۔ لیکن کسی عزم و ارادے کی ایک نئی صبح اور احتسابِ عمل کی ایک نئی شام ہوتی ہے اور کوئی کسی اور لذتِ نفس میں زندگی کے دن گزارتا ہے۔ گویا اس کے لیے

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے

دونوں ہستی کے بحرِ بے کنار میں موجوں سے کھیلتے ہیں۔ ایک پیر کر نکل جاتا ہے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور حیاتِ تازہ پاتا ہے۔ دوسرا پیرتا نہیں تیرتا۔ نفس و نفسیات کے سمندر میں اپنے جذبات کا غلام بن جاتا ہے۔ اس کی مثال اس خس و خاشاک کی سی ہے جس کو نہیں معلوم کہ اس کا ساحل کہاں ہے۔ دونوں کی زندگی میں جملہ مقاصد پورے نہیں ہوتے۔ درجنوں آرزوؤں کی ایک دنیا لے کر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ لیکن ایک حسرت مہجور کے ساتھ یہ کہتا ہوا جاتا ہے۔

بے خودی میں اب نہیں ہے امتیاز وصل و ہجر
رات دن پیش نظر ہے جلوہ نیکوئے درست

دوسرا خاموش، مایوس، اپنی حسرتوں میں ڈوبا ہوا رخصت ہوتا ہے جس کی ترجمانی غالب مرحوم کو کرنی پڑتی ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

انسان کے انہی افکار و اعمال کی بنا پر اسلامی نقطۂ نظر سے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔

۱۔ دنیا کے بادشاہ آخرت کے فقیر
۲۔ آخرت کے بادشاہ دنیا کے فقیر
۳۔ دنیا کے بادشاہ آخرت کے بادشاہ
۴۔ دنیا کے فقیر آخرت کے فقیر

حسرت موہانی کا شمار لوگ دوسرے گروہ میں کریں گے۔ یعنی آخرت کے بادشاہ دنیا کے فقیر۔ لیکن اگر وسیع النظری سے کام لیا جائے اور اقلیم ملک وسلطنت۔ اقلیم سخن اور اقلیم قلوب کو بھی شامل کر لیا جائے تو انھیں دنیا کا بادشاہ اور آخرت کا بادشاہ بھی کہنا پڑے گا۔ آپ نے حسرت موہانی کی زندگی اور ان کے کلام کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ آج وہ اس نذر عقیدت سے بلند ہیں جو ان کو پیش کی گئی۔ لیکن یہ ہمارے لیے ضروری کہ ہم ان کی شخصیت کے ان مختلف پہلوؤں کو سمجھیں تاکہ ان کی انفرادیت ہم پر نمایاں ہو۔ ہم ان سے سبق لیں اور یہ یاد محض یاد نہ ہو بلکہ خود اپنی ذات کے ساتھ ایمان و عمل کا ایک نیا عہد کریں۔ حضرت حسرت مرحوم کی زندگی کے دو رخ نہایت واضح ہیں۔ ایک مشق سخن، دوسری چکی کی مشقت۔ لیکن درحقیقت یہ حسرت کی زندگی کے دو پہلو نہیں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں جو بظاہر ایک دوسرے کے لیے حجاب معلوم ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ حسرت جتنی بار جیل جاتے ہیں ایک دیوان ساتھ لاتے ہیں۔ صفحۂ کاغذ پر نہیں، صفحۂ دل پر محفوظ اور یہ باقیاتِ فانی کی طرح یاس و حرماں نصیبی کے مرقع نہیں بلکہ حسنِ دل نواز کے لطیف ترانے ہیں۔ ہر دیوان پہلے دیوان کے مقابلے میں پختگیٔ فکر کے ساتھ حسنِ بے پناہ کی وسعتوں کا آئینہ دار ہے۔ ہر ایک میں معصومیت۔ رعنائی، ذوق وشوق، بالیدگی اور زندگی کی تڑپ موجود ہے۔ حسرت کا رنگِ تغزل انکی عملی زندگی کا وہ رنگین حجاب ہے جو ان کی شخصیت کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ بات یہ ہے کہ حسرت نے جو آلام جھیلے، مصیبتیں اٹھائیں انھوں نے ان کو اپنے تزکیۂ نفس، اپنی فرض شناسی، اپنی ذہنی تشنگی کے لیے نور سمجھا۔ ان کی شخصیت رسم شکایت اور گلہ ہائے ابنائے روزگار سے بیگانہ ہے۔ بحرِ ہستی میں وہ اپنا کنارہ آپ ہیں۔ جہاں نہ وہ ممنون تمنا

ہیں نہ مشتاقِ مسرت ہیں۔ حسرت خود کہتے ہیں۔

گرفتارِ محبت ہوں اسیرِ دامِ الفت ہوں
مَیں رسوائے جہانِ آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں
عجب انداز ہے میرے مزاجِ لاابالی کا
نہ ممنون تمنا ہوں نہ مشتاقِ مسرت ہوں
مرا شوقِ سخن پروردۂ آغوشِ حرماں ہے
مَیں خود شیدائے غم ہوں رفتۂ دردِ محبت ہوں
نہیں ہے قدرداں کوئی تو میں ہوں قدرداں اپنا
تکلف برطرف بے گانۂ رسمِ شکایت ہوں
کمالِ خاکساری پر یہ بے پروائیاں حسرت
کہ اپنی داد خود لے لوں کر میں بھی کیا قیامت ہوں

حسرت کی یہ فطرت نتیجہ تھی ان کی بلندیٔ مقاصد اور ان کی اولوالعزمی کا جس نے خود ایک حسنِ جہاں آرا کی صورت اختیار کرلی تھی۔ آپ اس حسن کو، حسنِ آزادی وحسن معرفت، حسن کائنات وحسنِ مخلوق، جس حسن سے چاہیں تعبیر کرلیں۔ لیکن یہ وہ حسن ہے جو حسرت کی زندگی کا سہارا ہے۔ یہ محض تمنّا نہیں ایک محرک جذبہ ہے۔ ایک امید افزا حقیقت ہے۔

روح کو محوِ جمالِ رُخِ جاناں کرلیں
ہم اگر چاہیں تو زنداں کو گلستاں کرلیں

لطف کر لطف لے سراپا ناز — تجھ پہ رنگینیٔ بہار نثار
روح آزاد ہے خیال آزاد — جسمِ حسرت کی قید ہے بے کار
روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام — دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام
حیرت غرورِ حسن سے شوخی سے اضطراب — دل نے بھی تیرے سیکھ لیے ہیں چلن تمام

مَیں نے حسرت کی شاعری کو ان کی زندگی کا ایک رنگین حجاب اس لیے کہا ہے کہ حسرت مرحوم نے اپنی زندگی کی تلخیوں کو ایک جذبۂ تشکر کا لبادہ پہنا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کے ذاتی اخلاص، بے پناہ اسلامی اقدار کی محبت، معرفتِ الٰہی، عشقِ رسول پر ان کے رنگِ تغزل نے ایک پردہ ڈال دیا ہے تاکہ لوگ انھیں شہنشاہِ غزل تو کہیں لیکن

ان کی قلبی اور روحانی کیفیات کے چرچے نہ کریں، خود ان سے ملیں تو ان کا حال نہ پوچھیں۔ ان سے شعر سن کر خوش خوش چلے جائیں اور اپنے مذاق اور اپنے ظرف کے مطابق جس طرح چاہیں لطف اندوز ہوں۔ لیکن جس نے حسرت کا یہ انداز سمجھ لیا ہے اس کے لیے نہ ان کی زندگی حجاب ہے نہ ان کی شاعری۔ دونوں ان کی انفرادیتِ طبع کے روشن پہلو ہیں، دونوں خدمتِ خلق اور جمالِ باطن کے دو وسیلے ہیں۔ جب نظر مجاز سے اٹھ جاتی ہے تبھی حقیقت سامنے آتی ہے اور حسرت کے قول و فعل، کلام و عمل ہیں وہ فیض نظر آتا ہے جو محض ایمان سے سیراب ہوتا ہے، اور محبت و عمل سے پروان چڑھتا ہے۔ جس کے لیے گریۂ نیم شبی، حضوریٔ قلب کی نعمتِ خاص عطا ہوتی ہے اور انوارِ محبت معاونِ حیات بن جاتے ہیں۔ آپ نے حسرت کے کلام سے ان کے اس رنگِ ایمانی، اس حسنِ لازوال، اس مجاہدۂ نفس، مشیتِ الٰہی اور عشقِ رسول کو سمجھیں، جس نے حسرت کو دنیا کی ہر حسرت سے بے نیاز کر کے فکرِ عمل میں ایسا مستغرق رکھا کہ خود ان کے دل میں نعمتِ دید کے علاوہ اور کوئی حسرت باقی نہ رہی۔

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ کیوں نہ خوبیٔ قسمت پہ اپنی ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

ش

اب مرے پاس ترے ہجر میں کیا رکھا ہے
اک ترے درد کو پہلو میں چھپا رکھا ہے

ش

ہم کیا کریں اگر نہ کریں آرزو تری
دنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہے کیا

ش

جان کو سوزِ غم بنا، دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطعِ رہِ مراد کر
اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھکو آرزو
ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر

حسرت کے لیے اس صبر و استقلال، ہمتِ سربلند کا ذریعہ صوم وصلوٰۃ کا ورد ہی تھا جس کی تربیت کے لیے ماہِ رمضان ہے۔ ہر سال یہ ماہِ مبارک آتا ہے۔ ہم اسے رخصت بھی کرتے ہیں لیکن ذرا دیکھیے وہ جس کا نہ سحر تھا نہ افطار جس کو قید کی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑی تھیں، کس محبت، کس جذبۂ الفت، کس صداقتِ ایمان اور عرفان کے ساتھ رمضان کو الوداع کہہ رہا ہے۔ اس مردِ مجاہد پر اس ماہ کے کیا فیوض ہوں گے۔ اس کے قلب کو کیا ملتا ہوگا۔ اس کا کچھ ہلکا سا اندازہ ان اشعار سے ملتا ہے۔

الوداع اے ماہِ رمضان الوداع — الوداع اے مونسِ جاں الوداع
تجھ سے روشن تھا سوادِ ملکِ جاں — اے چراغِ نورِ عرفاں الوداع
اے زمانِ رحمتِ حق الفراق — اے محبِ اہلِ عصیاں الوداع
عین راحت تجھ سے تھی تکلیفِ قید — اے انیسِ اہلِ زنداں الوداع

قدر دانی کی نہ تیری اے عزیز
تجھ سے حسرت ہے پشیماں الوداع

حسرت نے سچ کہا تھا۔

یا تو ملتا نہیں ساقی سے ہمیں ایک بھی جام
یا جو ہوتے تو اک ساتھ عطا ہوتے ہیں
کامیابی رہِ حق میں ہے مسلّم ان کی
جو فنا ہو کے سزاوارِ بقا ہوتے ہیں

:

اربابِ اشتیاق سے پردہ نہ چاہیے
اے حسنِ خود نما تجھے ایسا نہ چاہیے
ان کا ستم بھی عین کرم ہے خواص کو
اس کا مگر عوام میں چرچا نہ چاہیے
حسرت کی طرح اور بھی مشتاق ہیں بہت
اس حسن بے مثال کو چھپنا نہ چاہیے

مصائب کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں عسرت اور زندانی کے پیہم مصائب میں جو چیز ان کی معاون تھی وہ اک جلوۂ جمال نورانی تھا۔

برکتیں سب ہیں عیاں دولتِ روحانی کی
واہ کیا بات ہے اس جلوۂ نورانی کی
شوق دیکھے تجھے کس آنکھ سے اے مہرِ جمال
کچھ نہایت ہی نہیں تیری درخشانی کی
مجھ سے وہ سگ بھی ہے افضل جسے عزت نصیب
آستانِ حرمِ یار پہ دربانی کی
سعیٔ احباب کو ناحق ہے رہائی کا خیال
اور ہی کچھ ہے تمنّا ترے زندانی کی

دربارِ رسالت میں بھی حسرت کی دعائیں سن لیجیے۔ جہاں خیال غیر سے بیزاری جمال حسن کی تجلی۔ علم معرفت کی تمنا کے ساتھ جس حوصلہ کی دعا حسرت نے کی میں نہیں جانتا کہ ہم میں سے آج کتنے حضرات اس حوصلۂ بلند کی تمنا بھی کر سکتے ہیں۔

خیالِ غیر کو دل سے مٹا دو یا رسول اللہ
خسرؔ کو اپنا دیوانہ بنا دو یا رسول اللہ
تجلی طور پر جس نور کی دیکھی تھی موسیٰ نے
ہمیں بھی اک جھلک اس کی دکھا دو یا رسول اللہ
علیؓ آگاہ جس سے ہو کے بابِ علم کہلائے
وہ رازِ عشق ہم کو بھی بتا دو یا رسول اللہ
حسینؓ ابنِ علی کے صبر نے جس کے مزے لوٹے
ہمیں بھی اس بلا کا حوصلہ دو یا رسول اللہ

ڈائری کے اقتباسات

مولانا جمال میاں نے مولانا کی ذاتی ڈائری سے ان کی عظمتِ روحانی کے چند واقعات پیش کیے ہیں، ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا حسرت کی شاعری اور ان کی سیاست بلکہ ان کی ساری زندگی تصوف و روحانیت سے پُر تھی۔ ان کے روزنامچے کے چند صفحات یہاں نقل کیے جا رہے ہیں، جن سے ان کی قلبی کیفیات اور بعض رویائے صالحہ کی تفصیل ملتی ہے۔

"۱۲، مارچ ۱۹۴۲ء۔ آج بیگم حسرت مرحومہ کا فاتحہ تھا۔ حسبِ معمول میں نے بتاشوں پر نیاز دے کر بچوں کو تقسیم کر دیے۔ میرا تجربہ ہے کہ ہر ماہ کی گیارھویں بارھویں اور تیرھویں تاریخ کی درمیانی شب میں پہلی بار رسول اللہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضرتؐ تہ بند میں لپٹے ہوئے تھے اور جسمِ مبارک پر ایک کورے لٹھا قمیص تھی اور شکل مبارک کا ایک حصہ فقیر کی نظروں میں اس وقت تک موجود ہے۔ ایک قلعہ نما عمارت میں پہلی مرتبہ حاضری کا اتفاق ہوا اور وہیں شناسائی کی دولت نصیب ہوئی۔ قلعہ کے باہر میدان میں ایک بڑی نماز جماعت کے ساتھ ہو رہی تھی۔ ایک رکعت ختم ہو گئی تھی۔ میں رسول اللہ سے دور تھا مگر میں نے دوڑ کر حضور ہی کے قریب جماعت میں شرکت کی اور پہلی رکعت کے نہ ملنے کی پروا نہ کی۔ بعدِ نماز کرسیوں پر جماعت بیٹھی رہی۔ حضور نے اپنے سامنے ایک قاب سے

دو نارنگی کی پھانکیں مجھ کو خاص طور پر مرحمت فرمائیں۔ سب لوگوں نے اس لطفِ خاص پر مجھ کو مبارک باد دی۔ میرے خیال میں یہ پھانکیں اس کی علامت ہیں کہ حضور کو درویشی کی اشاعت منظور ہے۔"

۱۳ مارچ کی رات کے خواب کا آج دن بھر دل پر اثر رہا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاید آزادیٔ ہند و مسلمینِ ہند کا مجھ سے کام لینا ہے۔ اب مجھ کو یاد آتا ہے کہ پہلے سفرِ حج کے موقعہ پر جبلِ احد پر چلہ میں نے اس لیے باندھا تھا کہ انگریزوں کی حکومت کا ہندوستان میں خاتمہ ہو جائے ... رات کے خواب میں یہ دو باتیں یاد آئیں۔

۱۔ یہ کہ نمازِ جماعت اور اجلاس کے بعد نماز سے پہلے ہی قلعہ میں حضور کی نظر مجھ پر پڑ چکی تھی اور حضور نے خوب پہچان کر توجہ کے لیے مخصوص کر لیا تھا۔

۲۔ اجلاسِ عام میں جب پہلے الش ایک رکابی میں جملہ حاضرین میں تقسیم کی اور ہر شخص کو چند دانہ ہائے انار نصیب ہوئے، مجھ کو بھی ملے۔ نارنگی کی پھانکیں صرف مجھ کو ملیں۔

(مولانا جمال میاں نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ ۲۵ صفر ۱۳۶۱ھ کو پیش آیا جو ان کے مرشد کی تاریخِ عرس بھی ہے۔

۲/اپریل ۱۹۴۲ء رات، یعنی ۲ اور ۳ اپریل کی درمیانی رات میں ۱ اور ۲ بجے شب کے درمیان دفعتاً رسول اللہ کی دوبارہ زیارت نصیب ہوئی۔ ایک مربع کمرے میں آپ استراحت فرما رہے تھے۔ صورت قاضی محمد حامد حسرت فیض آبادی سے مشابہ تھی۔ فرطِ شوق میں جب دست بوسی کے قریب ہوا تو حضور نے لیٹے لیٹے دستِ مبارک میری طرف بڑھایا اور میری اس بے باکی کو گستاخی پر محمول نہ فرمایا بلکہ بہ تبسم کچھ نصیحتیں کیں جو مجھے یاد نہ رہیں۔

۲؍ مئی ۱۹۴۹ء۔ آج رات کے نصف آخیر میں بلا تکلف رسول اللہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ روضۂ مبارک میں جو گنبدِ خضرا کے تحت میں محصور و محدود ہے۔ حضور لحد مبارک کے قریب کسی چیز سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ تہ بند حجازی وضع کا ہے جس کی وضع وہی ہے جو حجاج استعمال کرتے ہیں میرے

دل میں بے اختیار خواہش پیدا ہوئی کہ حضور میرا ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں لے کر اس وقت مجھ کو مرید کر لیں۔ میں نے بغور دیکھا تو حلیہ مبارک کو قریب قریب ایسا پایا جیسا کہ کتبِ حدیث مثل شمائل ترمذی میں منقول ہے۔ ایک ایسا موقعہ آیا کہ میں اس قدر قریب ہو گیا کہ جسدِ مبارک کی خوشبو بخوبی محسوس ہوئی۔ اس کے بعد کیا ہوا، وہ آنکھ کھلنے کے بعد مجھے یاد نہیں رہا۔ دوبارہ آنکھ لگنے پر ایک بار پھر وہی منظر پیشِ نظر ہوا مگر اس کی تفصیل بھی باوجود کوشش کے مجھے یاد نہ آئی۔

خاندان فرنگی محل

جیسا کہ مولانا قطب الدین عبد الوالی فرنگی محل نے لکھا ہے۔ مولانا اور ان کے خاندان اور ان کے اکابر سات پشتوں سے فرنگی محل کے بزرگوں کے مرید اور معتقد رہے ہیں اس لیے مولانا کی مذہبی زندگی کا یہ باب ان بزرگوں کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس خاندان کے جدِّ اعلیٰ ملا قطب الدین شہید تھے اور علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ "تمام ہندوستان بلکہ انصاف یہ ہے کہ تمام دنیائے اسلام میں یہ بات صرف اس ذاتِ مقدس کو حاصل ہے کہ پورے دو سو برس تک متواتر اور بلا فصل ان کی نسل میں علما ہوتے چلے آئے ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ قائم ہے۔" مولانا شبلی آگے چل کر لکھتے ہیں کہ مولانا عبد الباری صاحب نے ایک رسالہ آثار الاول کے نام سے لکھا ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ وہ گویا اس خاندان کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس میں سینکڑوں کے نام اور ان کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ ان بزرگوں میں اکثر صاحبِ علم اور صاحبِ تصنیفات تھے یہاں تک کہ اگر سب کی تصنیفات جمع کی جائیں تو ایک کتب خانہ بن جائے گا۔ میرے زمانے تک جو مشاہیر زندہ تھے ان کے یہ نام ہیں۔ مولانا مفتی محمد یوسف مولانا نعمت اللہ ارباحتی) مولانا عبد الحکیم، مولانا محمد نعیم، مولانا عبد الحی، مولوی فضل اللہ۔ ان بزرگوں کے تلامذہ ہزاروں سے متجاوز تھے۔ خاکسار کو بھی اس سلسلۂ شاگردی کا فخر ہے۔ ہندوستان میں بھی جس قدر اور جہاں جہاں بڑے بڑے سلسلۂ درس قائم ہوئے، اکثر اسی خاندان کا فیض ہے مثلاً پورب میں ملا محب اللہ بہاری

اور غلام یحیٰ بہاری سے علم پھیلا۔ دونوں اسی خاندان کے شاگرد ہیں۔ رام پور ایک زمانہ تک درس گاہِ علم رہا۔ یہ مولانا بحر العلوم اور ملا حسن کا فیض تھا۔ کیوں کہ یہ دونوں بزرگ ایک عرصہ تک یہاں رہے تھے اور ملا حسن نے رام پور ہی میں وفات پائی۔ نجیب الدولہ نے امروہہ کے قریب دار الشکر میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں نہایت کثرت سے طلبہ نے تعلیم پائی۔ اس مدرسہ کے اکثر مدرسین اس خاندان کے شاگرد ہیں۔ بنگال اور مدراس میں جو کچھ علم پھیلا وہ مولانا بحر العلوم کا فیض ہے۔ یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ یہ خاندان اگر دنیا کی طرف متوجہ ہوتا تو جاہ و منصب کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ بعض نے اتفاقاً ادھر کا رخ کیا تو بڑے بڑے عہدے حاصل کیے۔ مثلاً مولوی غلام یحیٰ اور مولوی غلام محمد صدالصدور تھے۔ تو ریہ سلسلہ نے حیدرآباد میں نہایت عظمت حاصل کی لیکن من حیث المناصب اس خاندان نے علم و فن کو مقصد زندگی قرار دیا۔ فقر و فاقہ میں بسر کی اور اس میں عمریں گزار دیں۔ دلی میں شاہ ولی اللہؒ اللہ آباد شاہ محمد افضل کا دائرہ۔ بہار میں ملا محب اللہ جون پور میں ملا محمود جون پوری بلگرام میں عبد الجلیل بلگرامی اور غلام علی آزاد۔ یہ سب خاندان دو دو تین تین پشت سے زیادہ نہ چلے یعنی وہ علمی حیثیت قائم نہ رہی لیکن فرنگی محلی کا خاندان دو سو برس تک ایک حیثیت سے قائم رہا اور سینکڑوں علما اور فضلا پیدا ہوئے۔

خاندانی شجرہ

مولانا کے پیرزادے مولانا عبد الباری اور پیر مولانا شاہ عبد الوہاب فرنگی کے خاندان کا سلسلہ یہ ہے۔ مولانا عبد الباری بن مولانا شاہ عبد الوہاب بن مولانا شاہ عبد الرزاق بن مولانا جمال الدین بن مولانا علاؤ الدین بن مولانا انوار الحق بن ملا احمد عبد الحق بن ملا سعید بن ملا قطب الدین سہالوی شہید جو خاندانِ فرنگی محلی کے جدِ امجد ہیں۔

حالات اکابر

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ اسلام عرب سے نکل کر دُور دُور ممالک میں پھیلا تو اکثر عرب خاندان ہجرت کر کے ان ممالک میں چلے آئے۔ ان میں سے حضرت

ابو ایوب انصاریؓ کی نسل سے ایک بزرگ ہرات میں آئے (جن کا نام حضرت شیخ الاسلام عبداللہ انصاری تھا) اور یہاں سکونت کی۔ ان کے خاندان سے ایک بزرگ علاؤ الدین انصاری ہندوستان آئے (یہ تین بھائی ساتھ آئے تھے۔ ایک نے پانی پت میں قیام کیا۔ چنانچہ پانی پت کے انصاری انہی کے خاندان میں سے ایک ہیں۔ ایک نے سہارن پور میں قیام کیا اور سہارن پور، گنگو اور رد ٹھا کے انصاری ان کے خاندان سے ہیں) ان کا مزار قصبہ برناوا میں ہے جو دلی اور متھرا کی راہ میں واقع ان کی نسل سے شیخ نظام الدین سہالی آئے (جو لکھنؤ سے ۲۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے) شیخ موصوف نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ شیخ نظام الدین کے پرپوتے شیخ حافظ نے علم و عمل میں زیادہ شہرت حاصل کی۔ یہ شہنشاہ اکبر کا زمانہ تھا۔ تیموری حکومت کی یہ خصوصیت ان کے کارناموں کا طغرائے زریں ہے کہ تمام ملک میں چپہ چپہ پر واقع نویس موجود تھے جن کے متعلق یہ خدمت بھی تھی کہ ارباب کمال کے وجود سے بادشاہ کو اطلاع دیتے تھے چنانچہ خبر ہونے کے ساتھ ان لوگوں کی جاگیریں مقرر ہو جاتی تھیں۔ جن کی مال گزاری ان کے لیے معاف ہو جاتی تھی۔ اس قسم کے بے شمار فرامین خود ہماری نظروں سے گزرے ہیں۔ بغرض شیخ حافظ کی جاگیر مقرر ہو گئی اور اس کے متعلق فرمانِ شاہی جاری ہوا۔ یہ فرمان اب تک خاندان میں موجود ہے اور اس میں شیخ کے متعلق نہایت تعظیمی الفاظ مذکور ہیں۔ شیخ مذکور کی درس گاہ میں طلبہ کی سکونت کا انتظام تھا جن کے مصارف کا انتظام خود شیخ کی طرف سے کیا جاتا تھا۔

ملا قطب الدین شہید

ملا قطب الدین شہید بانی خاندان فرنگی محلی انہی شیخ حافظ کی نسل سے چوتھی پشت میں تھے۔ درس نظامیہ کی بنیاد انہی سے شروع ہوتی ہے۔ ملا صاحب کے والد برابر کے ایک مدرسہ میں مدرس تھے۔ ملا صاحب نے اسی زمانے میں ان سے تعلیم پائی۔ ان کے علاوہ قاضی گھاسی سے علوم حاصل کیے جو بہت بڑے صوفی اور حضرت محب اللہ الہ آبادی (خلیفۂ خاص حضرت ابو سعید گنگوہی) کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ اس زمانہ

میں قصبہ دیوہ (جو بعد میں حضرت حاجی وارث علی کے مدفن کی حیثیت سے مشہور ہوا) مولانا عبدالسلام کے درس کی وجہ سے علم و فضل کا مرکز تھا۔ ملا صاحب نے وہاں جا کر بھی تحصیل علم کی۔ ملا صاحب کا معمول یہ تھا کہ دن کو درس دیتے، شب کو عبادت میں مصروف ہوتے اور سہ شنبہ اور جمعہ کے دن تصنیف کرتے۔ ملا صاحب کے فضل و کمال کا شہرہ ہوا تو عالم گیر نے ان سے ملاقات کی خواہش کی لیکن ملا صاحب نے اپنے اسلاف کے طریقہ کے موافق گوشۂ عزلت کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ ملا صاحب نے درس کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا تھا جو خود ان کا اپنا قائم کردہ تھا۔ وہ ہر فن کی صرف ایک جامع اور مستند کتاب پڑھاتے تھے کہ شاگرد کو تمام مسائل پر مجتہدانہ عبور حاصل ہو جائے۔ ملا صاحب کے حلقۂ درس نے نہایت وسعت حاصل کی اور سلسلۂ تلامذہ میں ایسے ایسے علما پیدا ہو گئے جن کے الگ الگ حلقۂ درس قائم ہو گئے اور تمام ہندوستان پر چھا گئے۔ ان میں سے چار شخص نہایت نامور ہیں۔ ملا نظام الدین (فرزند) جن کے نام سے درس نظامیہ مشہور ہے (۲) مولوی محب اللہ بہاری جو بیک واسطہ ملا صاحب کے شاگرد ہیں۔ (۳) مولوی امان اللہ بنارسی جو ملا نظام الدین کے استاد ہیں اور (۴) ملا قطب الدین شمس الدین جو ملا محب اللہ بہاری کے استاد ہیں

ملا قطب الدین کی شہادت

ملا قطب الدین کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ قصبہ سہالی کے پاس خان زادے رہتے تھے۔ ان میں سے چودھری آصف سے سہالی کے زمین دار اور ملا صاحب کے ابن العم تھے، ہمیشہ سرحدی جھگڑے رہتے تھے۔ ملا صاحب کی شادی چودھری محمد آصف کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اس تعلق سے خان زادوں کو ملا صاحب سے بھی عداوت ہو گئی تاہم چونکہ ملا صاحب کی عزت دربار شاہی میں تھی اس لیے یہ لوگ جرات نہیں کر سکتے تھے۔ سوئے اتفاق کہ خود سہالی میں عثمانی خاندان کے جو شیخ زادے تھے۔ ان سے بھی چودھری محمد آصف کا نزاع شروع ہو گیا۔ غرض دونوں طرف سے بڑی تیاریاں ہوئیں مگر ملا صاحب نے جا کر بیچ بچاؤ کرا دیا اور دونوں طرف کی قومیں واپس چلی گئیں۔ موقعہ پا کر خان زادے

کئی سو آدمیوں کے ساتھ سہالی میں آئے اور عثمانیوں کو جا کر بھڑکایا کہ ہم ساتھ ہیں، آپ حملہ کریں۔ سب مل کر چودھری محمد آصف کے گھر پر چڑھ آئے۔ چودھری صاحب ملّا صاحب کے مکان پر تقریبِ ولادت پر مبارک باد دینے آئے تھے۔ ظالموں نے جا کر ملّا کے مکان کا محاصرہ کر لیا اور دیواروں میں نقب لگا کے گھس گئے۔ ایک نازک اور کمزور جسم کے لیے ہلکا سا وار کافی تھا لیکن ظالموں نے تمام آلاتِ جنگ استعمال کیے۔ پہلے تیر، پھر بندوق اور آخر تلواروں کے ساتھ واروں نے مل کر اس پیکرِ روحانی کو برباد کرنا چاہا اور اپنے اعتقاد کے مطابق کام یاب بھی ہوئے۔ اس واقعہ کی تاریخ روز دوشنبہ رجب ۱۱۰۳ھ ہے۔ ملّا صاحب کے ساتھ چند طلبا نے بھی جو مشغولِ درس تھے وفات پائی۔ ظالموں نے خون ریزی سے فارغ ہو کر گھر کا مال و اسباب لوٹا اور ملّا صاحب کا ذخیرہ علمی جس میں سات سو کتابیں تھیں جلا کر برباد کر دیں۔ ملّا صاحب کی لاش اور چودھری آصف کا سر لے گئے۔ تین چار دن کے بعد ملّا صاحب کے دونوں ہاتھ کاٹ کر رکھ لیے اور لاش واپس بھیج دی۔ ۲۷ رجب کو نمازِ جنازہ پڑھ کر تجہیز و تکفین کی گئی۔ اس واقعہ میں ملّا صاحب کے صاحبزادوں میں سے تین یعنی ملّا سعید (مولانا کے پیر و مرشد کے جدِّ امجد) ملّا نظام الدین اور ملّا رضا موجود تھے۔ ملّا رضا اور ملّا سعید زخمی ہوئے اور ملّا نظام الدین کو اتفاقیہ پکڑ کر لے گئے لیکن فتح پور اور دیوہ کے شرفا نے جا کر نہایت سماجت کی اور ظالموں سے ان کی رہائی کرائی۔ صاحبزادہ نے ایک محضر لکھا جس میں واقعات کی تفصیل لکھی۔ یہ محضر اب تک موجود ہے اور اس پر تمام علما، روسا اور عمالِ شاہی کے تصدیقی دست خط ثبت ہیں۔ احمد سعید یہ محضر لے کر عالم گیر کے پاس دکن گئے۔ عالمگیر نے عمال کے نام فرمان بھیجا کہ قاتلوں سے قصاص لیا جائے اور ان کا خاندان برباد کر دیا جائے۔ چنانچہ صوبیدار لکھنو نے سرکاری سپاہ بھیج کر ان کا گھر بار غارت کر دیا۔ اور مخالفین بھاگ کر جلا وطن ہو گئے۔ مولوی ولی اللہ لکھتے ہیں کہ میں نے ۱۱۰۴ھ میں سہالی جا کر دیکھا تو ویران و تباہ تھا اور گاؤں والے کہتے تھے کہ یہ خون ناحق کی سزا ہے۔ عالمگیر نے ملّا قطب الدین کے صاحبزادوں کے لیے فرمان کے ذریعہ سے لکھنو میں دو مکانات عنایت کیے۔ یہ فرمان اب تک اس خاندان میں موجود ہے . . .

اس کے مکمل الفاظ نقل کرتے ہیں، جو مقالاتِ شبلی جلد سوم میں موجود ہے۔

فرمانِ شاہی

"دریں وقت میمنت اقتران والاشان واجب الاذعان صادر شد کہ یک منزل حویلی فرنگی محل بہ متعلقان واقع بلدہ لکھنؤ مضاف بہ اودھ کہ از املاک منزولی ست برائے بودن شیخ محمد اللہ و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید حب الضمن مقرر فرمودیم باید کہ حکام و عمال و متصدیان مہمات حال و استقبال و جاگیرداران و کروریان آں را بنام مشارٌ الیہما معاف و مرفوع القلم دانستہ بوجہ من الوجوہ مزاحم و معترض نہ شوند و اندریں باب سند مرقوم غرہ ذی قعدہ سالِ سی و ہفتم جلوس والا نوشتہ شد۔"

فرمان کی پشت پر جو عبارت ہے اس کا متن یہ ہے: "شرح یادداشت واقع بتاریخ روز پنج شنبہ ۱۴ شعبان المعظم ۳۷ھ جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ مرداد و ماہ بر سال صدارت و مشیخت پناہ، فضیلت و کمالات دستگاہ سزاوارِ مرحمت و احسان صدرِ رفیع القدر فاضل خان و نوبت واقعہ نویسی کمترین بندگان درگاہِ خلائق پناہ حسام الدین قلمی می گردد کہ بعرض مقدس و معلی رسید کہ شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید ساکن قصبہ سہالی بسبب شہادت پدرِ خود قصبہ مذکورہ را گذاشتہ جلاوطن گردیدند و کدام مکان برائے سکونت ندارند۔"

فرنگی محل کی وجہ تسمیہ

اس محلہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ فرانس کا ایک سوداگر اس محلہ میں تجارت کے تعلق سے رہا تھا۔ وہ وطن چلا گیا تو اس کے مکانات سرکاری قبضہ میں ہو گئے اور وہی اسلامی علوم کی یونیورسٹی بن گئے۔

بہ بیں کرامت بت خانہ مرا اے شیخ
کہ چوں خراب شود خانہ خدا گردد

ملا صاحب کی اولاد

ملا صاحب کے چار صاحبزادے تھے۔ ملا محمد اسعد، ملا سعید، ملا نظام الدین اور

ملا رضا۔ ملا اسعد سب سے بڑے تھے اور بہت بڑے عالم تھے۔ حاشیہ قدیمہ پر حاشیہ لکھا تھا ملا جیون سے مناظرہ میں فتح حاصل کی تھی۔ مزاج امیرانہ تھا۔ اس لیے دربار میں توسل پیدا کیا اور ہمیشہ عالمگیر کے ہم رکاب رہتے ہیں۔ شاہ عالم کے زمانہ میں وفات پائی۔ ملا حسن جو مشہور عالم تھے انہی کے پوتے تھے۔ دوسرے صاحبزادے ملا سعید جو دکن سے فرمان شاہی لے کر آئے تھے۔ مولانا کے پیر حضرت شاہ عبدالوہاب فرنگی محل کے جدِ اعلیٰ تھے۔ اس لیے ان کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ تیسرے صاحبزادے ملا نظام الدین تھے جن کا ذکر آئے گا اور چوتھے صاحبزادے ملا محمد رضا۔ ملا نظام الدین سے سات سال چھوٹے تھے۔ یہ بھی بہت بڑے عالم تھے۔ مسلم پر شرح لکھی لیکن آخیر میں درس اور تدریس چھوڑ کر شاہ عبدالرزاق بانسوی کے ہاتھ پر مرید ہوئے اور تارک الدنیا ہو گئے۔

ملا نظام الدین

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ "ملا نظام الدین کی عمر باپ کی شہادت کے وقت ۱۴ برس کی تھی اور شرح ملا جامی تک پڑھ چکے تھے۔ لکھنو آکر طالب علمی میں مشغول ہوئے ابتدائی کتابیں دیوا میں جا کر پڑھیں جو اس زمانہ میں مولانا عبدالسلام کی درس گاہ تھا۔ پھر اکثر کتابیں جائیس میں جاکر ملا علی قلی سے پڑھیں۔ امور عامہ مولانا امان اللہ بنارسی سے پڑھا دوسرے علوم کی تحصیل ملا نقش بند سے لکھنو میں کی۔ ملا صاحب نے ۲۴ برس کی عمر میں تمام علوم وفنون سے فراغت حاصل کی۔ سلسلہ قطبیعہ میں یوں تو سینکڑوں علماء پیدا ہوئے لیکن ملا نظام الدین کے نام کو خدا نے وہ عزت دی کہ آج سب کا نام انہی کے نام سے روشن ہے۔ مولانا غلام علی آزاد باثر لکرام میں لکھتے ہیں کہ امروز علما اکثر قطر ہندوستاں نسبت تلمذ بہ مولوی دارند وکلاہ گوشہ تفاخر می شکنند وسیلہ سلسلہ تلمذ باو رسانند بین الفضلا علم امتیاز می افروزد

وہ علم وفضل کے ساتھ زہد وقناعت صبر ورضا تقدس اور ایثار نفس کے وجود مجسم تھے۔ ان کی تصانیف بھی کثرت سے ہیں لیکن یہ بھی ان کا ایثار نفس ہے کہ سلسلہ درس میں اپنی ایک تصنیف بھی نہیں رکھی بلکہ اپنے استاد بھائی ملا محب اللہ بہاری کی کتابیں سلم ومسلم درس میں داخل کیں جن کی بدولت آج ان کتابوں کا نام آفتاب

ماہتاب کی طرح روشن ہے۔ ملا صاحب نے ۴۰ سال کی عمر میں شاہ عبدالرزاق بانسوی کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر تصوف کا رنگ ان پر غالب آگیا۔ ملا صاحب کا بالاخانہ جس پر بیٹھ کر وہ درس دیا کرتے تھے آج بھی موجود ہے۔ میں نے ۱۸۹۹ء میں اسکی کی زیارت کی تھی۔ ۹ جمادی الاول ۱۱۶۸ھ میں سنگِ مثانہ کی بیماری میں وفات پائی۔ جناب عبدالباسط امیٹھوی نے تاریخ لکھی ہے۔

نظام الدین محمد واصل حق — چوں از روئے زمیں سوئے فلک شد
وصال سال تاریخش فلک گفت — ملک بود و بیک حرکت ملک شد

تصانیف حسب ذیل ہیں۔

شرح منار، حاشیہ شمس بازغہ، حاشیہ حاشیہ قدیمہ، شرح عقائد جلالیہ، شرح مسلم شرح تحریرالاصول، حاشیہ صدرا۔

ملا صاحب نے نہایت زہد و قناعت کی زندگی بسر کی۔ کبھی کبھی تین تین دن کا فاقہ گزر جاتا۔ اکثر چنے داب کر رہ جاتے۔ کبھی اہلِ دنیا کی طرف توجہ نہیں کی۔ مناظرہ اور مجادلہ میں جو علماء کا طریقہ ہے، اس سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کے   میں اگر کوئی الزام دیتا تھا تو اس سے ناراض ہوتے تھے۔

بحرالعلوم

خاندان فرنگی محل کا تذکرہ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم کے بغیر نامکمل رہے گا، اس لیے یہاں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ "ملا نظام الدین کی پہلی شادی سے اولاد نہیں تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ دوسری شادی کیجیے۔ فرماتے تھے کہ میں بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ ہاں کسی بزرگ کا ارشاد ہو تو مجبوری ہے میر اسمٰعیل بلگرامی سے ملا صاحب نے فیضِ باطنی حاصل کیا تھا۔ انھوں نے کہلا بھیجا کہ ہم کو الہام سے معلوم ہوا ہے کہ دوسری شادی سے تمھاری اولاد ہوگی۔ غرض آخر سن میں قصبہ سترکھ میں شادی کی جس سے وہ گوہر شاہوار پیدا ہوا جو آج بحرالعلوم کے نام سے مشہور ہے تمام کتابیں ملا صاحب ہی سے پڑھیں ———————————۔ اسی دوران میں ملا صاحب نے ان کی شادی قصبہ کاکوری میں کردی۔ ملا صاحب کے

وصال کے بعد بحرالعلوم نے ملا کمال سے استفادہ کیا جو ملا نظام الدین کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ آغاز شباب میں آپ ایک ناگوار واقعہ کی بنا پر لکھنؤ سے ترک سکونت کر کے شاہ جہاں پور چلے آئے تو حافظ رحمت خاں نے مولانا کے مصارف کے لیے معقول رقم مقرر کردی اور ان کے طلبا کے لیے وظائف مقرر کر دیے۔ نواب عبداللہ خان رئیس شاہ جہاں پوری نے قلعہ میں لے جا کر اپنے مکان میں اتارا اور دور دور سے طلبہ مولانا کا نام سن کر آنے لگے اور بہت بڑی درس گاہ قائم ہو گئی۔ بہت سے لوگ فارغ التحصیل ہو کر یہاں سے نکلے۔ یہاں مولانا نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ حافظ رحمت خان نے جب شہادت پائی تو یہ اطراف نواب شجاع الدولہ کی حکومت میں آ گئے تو مولانا چند روز کے لیے رام پور گئے۔ بلکہ والی رام پور نواب فیض اللہ خاں خود آ کر انھیں لے گئے۔ لیکن نواب صاحب مولانا کے شاگردوں کی کفالت نہ کر سکے۔ اس کے بعد مولانا رام پور سے کلکتہ چلے گئے۔ جہاں منشی صدرالدین نے ان کا استقبال کیا اور مولانا کی چار سو تنخواہ مقرر کی اور مولانا کے تمام شاگردوں کے وظائف مقرر کر دیے۔ ایک روایت کے مطابق مولانا کو نواب صاحب سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن منشی صدرالدین نے بہت سے انگریزوں سے نواب فیض اللہ خان سے سفارش کرائی جس کے نتیجہ میں مولانا نے کلکتہ کا قیام اختیار کیا۔ بہرحال مولانا نے زیادہ عرصہ کلکتہ میں قیام نہیں کیا اور نواب والاجاہ محمد علی خان والی اکارٹ کی درخواست پر جو قصبہ گوپامئو کے رہنے والے تھے۔ مدراس تشریف لے گئے۔ نواب صاحب نے اپنے خاندان اور امرائے دربار کو ایک منزل آگے کے لیے بھیجا اور جب مولانا مدراس میں داخل ہوئے تو سب امرا جلو میں تھے۔ ڈیوڑھی کے قریب جب پالکی پہنچی تو نواب نے تمام مقربین کے ہمراہ پاپیادہ نکلا۔ مولانا نے پالکی سے اترنا چاہا۔ نواب نے دوڑ کر پالکی کو کاندھا دیا اور اسی طرح مکان کے صحن تک لایا۔ دربار میں جہاں خود اس کی نشست تھی مولانا کو اس جگہ بٹھایا اور مولانا کے قدم چومے اور کہا: "اللہ اکبر یہ نصیب کہاں تھے کہ حضور کا قدم میرے گھر میں آتا۔ نواب محمد علی خان نے مولانا کو ایک نہایت عمدہ محل رہنے کو دیا اور اپنے باورچی خانہ سے کھانا بھجواتا تھا۔ چند روز بعد ایک تیسرا مدرسہ قائم

کیا اور مولانا نے اس میں درس دینا شروع کیا اور وہیں ۱۲ ر رجب ۱۲۳۵ھ میں ۸۴ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔

شجرۂ روحانی

مولانا کا شجرۂ روحانی درج ذیل ہے۔

سلسلہ قادریہ، رضویہ، رزاقیہ

سید العالم خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم باتو دارد
سید الاولیا حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ باتو دارد
امام الآئمہ حضرت امام حسین رضؓ
امام الآئمہ حضرت امام محمد باقر
امام الآئمہ حضرت امام جعفر صادق
امام الآئمہ حضرت امام موسیٰ کاظم
امام الآئمہ حضرت امام علی موسیٰ رضا
حضرت شیخ معروف کرخی قدس اللہ سرہٗ
حضرت شیخ سری سقطی
حضرت خواجہ جنید بغدادی
حضرت شیخ عبد اللہ ابو بکر شبلی
حضرت شیخ عبد العزیز
حضرت شیخ عبد الواحد
حضرت خواجہ ابو الفرح یوسف طرطوسی
حضرت شیخ ابو الحسن بہاری
حضرت شیخ ابو سعید مخزومی
غوث الاعظم حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ
حضرت میر سید عبد الرزاق ابن حضرت غوث الاعظم قدس اللہ سرہٗ
حضرت میر محمد بن ابو صالح قدس اللہ سرہٗ

حضرت میر سید احمد برادر میر سید محمد بغدادی
حضرت میر سید علی
حضرت شاہ موسیٰ قادری
حضرت میر سید حسن
حضرت شیخ ابوالعباس احمد
حضرت شاہ بہاؤ الدین
حضرت میر سید احمد قادری
حضرت شاہ جلال قادری
حضرت میر سید فرید بھکری
حضرت شاہ ابراہیم ملتانی
حضرت شاہ ابراہیم بھکری
حضرت شاہ امان اللہ
حضرت شاہ حسین خدانما
حضرت شاہ ہدایت اللہ
حضرت شاہ عبد الصمد خدا نما
حضرت شاہ عبد الرزاق بانسوی
حضرت مولانا مولوی عبد الحق فرنگی محلی
حضرت مولانا مولوی احمد انوار الحق
حضرت مولانا حافظ محمد عبد الوالی
حضرت پیشوائے عشاق حضرت شاہ عبد الرزاق فرنگی محلی
مرشدی حضرت شاہ عبد الوہاب فرنگی محل
حسرت موہانی

اہم نگارشات

اب ہم مولانا حسرت موہانی اور محترمہ نشاط النساء بیگم کی چند اہم نگارشات کو

پیش کرنے کے بعد سیدالاحرار حصہ دوم کی زینت واشاعت سے فارغ ہوئے ہیں۔
ان اہم نگارشات میں پہلی تحریر اس مضمون کا احاطہ کرتی ہے جس میں مولانا
حسرت موہانی کو پہلی بار قیدِ فرنگ کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا حسرت موہانی نے
اس اسیری کے احوال وکوائف مشاہداتِ زنداں کے عنوان سے اردوئے معلیٰ میں شائع
کیا تھا، جسے بعد میں الگ کتاب کی حیثیت سے بھی شائع کیا گیا اور جناب نیاز فتحپوری
نے "نگار" کے حسرت نمبر کے بعد والے شمارے میں اسے ایک بار اور شائع کیا۔ قیدِ فرنگ
کے نام سے ایک اور عبارت میں شائع ہوئی ہے۔ یہ مشاہداتِ زنداں کے اقتباسات
پر مشتمل ہے۔ مضمون تھا۔ مصر میں انگریزوں کی اور اس کے بارے میں انگریز حکمراں
یہ دریافت کرنا چاہتے تھے کہ اسے کس نے لکھا ہے۔ ہم اس بات کا تفصیلی تذکرہ
سیدالاحرار حصہ اوّل میں کر چکے ہیں اور ذکر ہو چکا ہے۔

حصہ چہارم

سیاسی زندگی

آزادی کی لگن

مولانا کو آزادیٔ وطن کا نشہ ابتدائے جوانی ہی سے تھا یوں کہنا چاہیئے کہ ابھی ایم اے او کالج کی تعلیم کا دور ختم نہیں ہوا تھا کہ مولانا کو آزادی کی لگن پیدا ہو گئی تھی اس کے اسباب و علل کیا تھے ان کے بارے میں آج کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ خیال ضرور آتا ہے کہ اس زمانہ میں ایم اے او کالج پر انگریز پرنسپل کا تسلط تھا اور کالج کے آنریری سیکرٹری کا اقتدار برائے نام تھا یہ غیر منطقی نظام اور ردِّ عمل ایک منطقی ذہن رکھنے والے نوجوان طالب علم کے لئے کسی صورت میں قابل قبول نہ تھا اور ایک امر انگریز پرنسپل کی زیادتیاں اور ضطائی ذہنیت بڑھتے بڑھتے مولانا کے نزدیک انگریز قوم اور اور انگریز قوم کی زیادتیوں اور ضطائیت میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

ہنگامۂ کالج

اس بارے میں مولانا کے جو جذبات تھے ان کا اندازہ ان کے اس مضمون سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے فروری، مارچ ۱۹۰۷ء میں ہنگامہ مدرسۃ الاسلام علی گڑھ کے بارے میں شائع کیا تھا اس ہنگامہ کا آغاز کالج کے ایک طالب علم غلام حسین کے اخراج سے ہوتا ہے جو بعد میں بڑھتے بڑھتے کالج کے سات قابل ترین طلبا کے اخراج کا باعث بنا۔ اس ہنگامہ میں کالج کے ٹرسٹیوں نے انگریز پرنسپل اور پروفیسروں کی جس حد تک حمایت کی مولانا نے اپنے مضمون میں اس کی مذمت کی۔ مولانا کے بقول واقعہ یہ تھا کہ ایک کانسٹیبل نے نہایت غیر مہذب اور درشت لہجہ میں مسٹر غلام حسین کو احاطۂ نمائش کے قریب جانے سے اس لغو عذر پر روکنا چاہا کہ وہاں صرف "صاحب لوگ" ہی جا سکتے ہیں یہ بیان کئی وجوہ کی بناء پر ناقابل یقین تھا

اوّل اس لئے کہ اشیائے نمائش دیکھنے میں یورپین انڈین امتیاز بالکل بے معنی تھا دوئم اس لحاظ سے کہ عام طور پر طلبائے کالج اور دیگر شرفائے شہر کے لئے پہلے اس قسم کی ممانعت سننے میں نہیں آتی تھی۔ یہ پابندی غلط تھی۔ بنا بریں مسٹر غلام حسین نے کانسٹیبل کی اس ناروا حرکت کو اپنے حق میں توہین خیال کیا اور ہمارے نزدیک صحیح خیال کیا۔ جب وہ بر سر وحشت ہوا تو مسٹر غلام حسین اسے دھکا دیکر اندر چلے گئے اور ان کے ہمراہ اور ابھی چند طالب علم داخل ہو گئے، کانسٹیبل مذکور نے یہ واقعہ بڑھا چڑھا کر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سامنے پیش کیا اور پرنسپل نے اپنے سفید روہم قوم کی خوشنودیٔ مزاج کے لئے ایک جاہل کانسٹیبل کے بیان کو بہت سے شریف اور راست گفتار طالب علموں کے قول سے زیادہ قابل اعتبار قرار دیا" اور فیصلہ کیا کہ طالب علم مذکور سپرنٹنڈنٹ سے معافی مانگے دوئم ۴۰ روپیہ جرمانہ دے اور سوئم یہ کہ بورڈنگ ہاؤس سے ایک ماہ کے لئے باہر نہ جائے اور اپنی موجودگی کی اطلاع وقتاً فوقتاً دیتا رہے۔ طالب علموں کی بردباری کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ باوجود سخت اور ناواجب ہونے کے سخن بہ خیال رفع شر انہوں نے پرنسپل کا حکم مان لیا۔ لیکن انگریز پرنسپل کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی اور کچھ روز بعد یہ شرط لگائی کہ اگر غلام حسین ۴۸ گھنٹہ کے اندر اندر بورڈنگ ہاؤس خالی نہ کیا تو اس کو مدرسہ سے خارج کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ طلبا میں اس مزید ناروا حکم پر جوش پیدا ہوا اور وہ یونین کلب کے سامنے جمع ہوئے اور شور و غل مچایا۔ اس پر براؤن صاحب پروسٹ اور ٹول صاحب پروفیسر آئے اور طلبا کی پرائیوٹ میٹنگ میں گھس کر انہیں برا بھلا کہا اور یہاں تک دھمکی دی اگر وہ منتشر نہ ہوئے تو گولی چلا دی جائے گی۔ اس واقعہ کے بعد حالانکہ طلبا بے چین تھے مگر جب ٹرسٹیوں نے زور دیا اور انگریز پرنسپل کی حمایت کی تو طلبا نے پھر معافی مانگی اور غلام حسین از خود کالج سے چلا گیا اس کے بعد پھر انگریز پرنسپل کا جذبہ انتقام عود کرایا اور اب مزید سات لڑکوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ بھی چپ چاپ کالج سے چلے جائیں ورنہ ان کا نام بھی کاٹ دیا جائے گا ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال ناقابل برداشت تھی تمام طلبا نے کالج سے جانے کا فیصلہ کر لیا اس عرصہ میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو سارے واقعات

کی چھان بین کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔ مولانا نے اس واقعہ کا تذکرہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس وقت سب سے بڑی شکایت نہ صرف عام طالب علموں کی بلکہ تمام مسلمانوں کی کالج کے بارے میں یہ ہے کہ اس کے تمام معاملات میں یوروپین اقتدار حد سے زیادہ ہو گیا ہے۔" غالباً یہی خیالات تھے جن کے باعث دوران تعلیم مولانا کو تین بار کالج سے نکالا گیا لیکن انہوں نے آخر کار ۱۹۰۳ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کر کے اپنی تعلیم مکمل کر لی۔

جیسا کہ بیگم حسرت نے بھی لکھا ہے کہ آزادی کا یہ سرفروش پہلے ہی سے اس بات کا تہیہ کئے ہوئے تھا کہ انگریزوں کو اس جگہ سے نکال کر ہی دم لیا جائے گا۔ لہٰذا مولانا جب کالج کی فضا سے باہر نکلے تو ملازمت سرکاری کی بجائے میدانِ صحافت کے مردِ میدان تھے اور نتیجہ کا انتظار کئے بغیر اردوئے معلیٰ کا ڈیکلریشن حاصل کر چکے تھے۔ شمع آزادی کے پروانے نے جب یہ رسالہ نکالا تو سید سلیمان ندوی کے بقول اس رسالہ میں "شعر و سخن کے پھول اور سیاست کے کانٹے ایک ساتھ پیش ہوتے رہے اور لوگ حسب مذاق اس دو رنگی سے فائدہ اٹھاتے رہے۔"

کانگریس میں شمولیت

رسالہ نکالنے کے بعد کسی سیاسی جماعت میں شمولیت کی فکر ہوئی تو اس سلسلہ میں انڈین نیشنل کانگریس پہلے ہی سے موجود تھی چنانچہ وہ پہلی بار ۱۹۰۴ء میں ایک ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے بھی کانگریس میں شریک ہوئے ۱۹۰۷ء تک یعنی سورت کانگریس تک برابر شریک رہے شرکت کے علاوہ انہوں نے بمبئی، کلکتہ اور بنارس کانگریس کی روداد اور رپورٹیں بھی اردوئے معلیٰ میں بطور ضمیمہ شائع کیں لیکن سورت کانگریس کے معرکتہ الآرا اجلاس کے بعد جس میں نرم دل اور گرم دل میں زبردست ٹکر ہوئی وہ لوکمانیہ تلک کے ہمراہ کانگریس سے الگ ہو گئے اور وہ اسی طرح کانگریس سے نفرت کرنے لگے جس طرح مسلم لیگ سے کرتے تھے کیونکہ مسلم لیگ اس وقت معرض وجود میں آچکی تھی اور حکومت کی وفادار تھی۔ کانگریس کا نرم دل انگریزی سامراج کے مخالف نہیں تھا بلکہ اس کا شاکی تھا۔ یہ دل انگریز حکومت کے خلاف نہیں تھا

بلکہ حکومت کے نظم و نسق میں ترمیم اور تنسیخ چاہتا تھا اس دل میں دادا بھائی نوروجی گوکھلے فیروز شاہ مہتہ اکرشنا سوامی اور پنڈت مدن موہن مالویہ قابل ذکر تھے گرم دل کا مسلک برصغیر کی مکمل آزادی تھا یہ دل برصغیر سے انگریزوں کا انخلاء چاہتا تھا۔ اس کے قائد بال گنگا دھر تلک، موہن چندر پال، لالہ لاجپت رائے اور آربند گھوش اور مولانا حسرت موہانی تھے یہ رہنما انقلاب کے داعی اور مکمل آزادی کے پیامبر تھے اور ان کا کہنا تھا کہ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ سورت کانگریس میں ان متضاد نظریات کا تصادم ہوا اور مولانا تلک اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ کانگریس سے نکل آئے۔

اردوئے معلی کے ذریعہ قومی خدمت

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے انہوں نے اردوئے معلی کے ذریعہ کانگریس اور سیاست سے مسلمانوں کو روشناس کرانا شروع کیا اور ایسے مضامین شائع کئے جن میں مسلمانوں کو سیاست کی تعلیم دی گئی۔ ان میں ایک مضمون تو حیدرآباد دکن کے ملا عبدالقیوم کا تھا۔ وہ دائرہ المعارف حیدرآباد دکن کے بانیوں میں تھے اور دوسرا ایک بھوپالی عالم مولوی برکت اللہ مرحوم کا تھا جو پہلی جنگ عظیم سے بہت قبل ہندوستان چھوڑ کر یورپ چلے گئے تھے اور برصغیر کے دوسرے حریت پسندوں کی یورپ میں رہبری کرتے تھے۔ انہوں نے مسئلہ خلافت پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ جو کئی زبانوں میں شائع ہوئی ان حضرات کے علاوہ اردوئے معلی میں شیخ عبداللہ کا ایک مضمون مسلمان اور پالٹیکس بھی شائع ہوا تھا۔ مسلمان اور کانگریس کے عنوان سے بھی ایک مضمون اردوئے معلی کی زینت بنا۔ غرضیکہ مولانا نے اپنے رسالہ کے ذریعہ برصغیر کے مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے کے لئے راغب کرنے کی مہم کو چار پانچ سال بڑی کامیابی کے ساتھ چلایا۔

نرم دل اور گرم دل پر بحث

بہر حال جب مولانا کانگریس سے باہر نکلے تو انہوں نے "فریق نرم کی بعض غلط

نفسیوں" کے عنوان سے اگست ستمبر ۱۹۰۷ء کے اردوئے معلی میں دو مضمون سپرد قلم کئے جن میں انھوں نے ثابت کیا کہ برصغیر کی فلاح اس میں ہے کہ اسے انگریزوں کے چنگل سے آزادی نصیب ہو اور اس کے لئے گرم دل نے جو لائحہ عمل ترتیب دیا ہے وہ صحیح ہے یہ مضامین اس لحاظ سے بے حد اہم تھے کہ ان کے مطالعہ سے اس وقت کے حالات کا صحیح تجزیہ ہمارے سامنے آجاتا ہے مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ "جس وقت سے نوجوانانِ ہند کے دلوں میں حریت کامل کا جذبہ اور قومیت کا حقیقی مفہوم جاگزیں ہوا ہے اس وقت سے فریق نرم کے کہنہ عقائد کی فضیلت ارباب بصیرت کی دُور بین اور رمز شناس نگاہ میں تقویم پارینہ سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔" لیکن اس اظہار خیال کے ساتھ ساتھ مولانا کو اس بات کا بھی اعتراف تھا کہ نرم دل کے رہنماؤں نے ماضی میں ملک کی بڑی خدمات سر انجام دی ہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "مجھ کو ان قدیم رہنماؤں کے حفظِ مراتب کا اقرار ہے لیکن ہماری اس شکرگذاری اور سچے ادب کی بنا پر اس امر کو لازم قرار دینا کہ ہم ان قابلِ تعظیم بزرگوں کے قدیم پولٹیکل اور اقتصادی عقائد کو ہر زمانہ اور ہر حالت میں بلا چون و چرا صحیح اور درست کہتے رہیں اول درجہ کی کوتاہ بینی اور جبر ہے۔" اس لئے کہ مولانا کی نگاہ میں۔ واقعات عالم کے روزانہ تغیر و تبدلی سے حالات اور خیالات رسانی میں بھی عظیم تبدیلیوں کا پیدا ہونا قانون قدرت کا صریح اقتضا ہے اور اس کے خلاف امیدِ عبث۔"

مولانا لکھتے ہیں کہ "۲۵ سال کے تجزیہ نے جب یہ بات پوری طرح ثابت کر دی کہ زمانہ قدیم کے نرم لیڈروں کے خیالات و عقائد جادۂ راستی سے علیحدہ ہیں۔ تو انہیں ان عقائد کو یک قلم ترک کر دینے میں تامل کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔" مولانا کا یہ خیال ہے کہ جس طرح خلاق جرمنی پرنس بسمارک کی شخصی پالیسی کا اس جرمنی میں کوئی فرد پیرو نہیں ہے لیکن تمام قوم اس کو مملکت جرمنی کا بانی سمجھتی ہے اسی طرح ہندوستان میں بھی اس زمانہ کا آغاز ہو چکا ہے۔ جب کہ کوئی قوم پرست ہندوستانی بانیانِ کانگریس کے نرم اصول کا معتقد باقی نہ رہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہر شخص ان ابتدا کرنے والے بزرگوں کی عزت

و احترام کو عقائدِ مذہبی کے مانند اپنے ذمہ لازمی جانے گا۔ مولانا نے ان دونوں
مضمونوں میں ان تمہیدی جملوں کے بعد ایک ایک کر کے نرم دل کے رہنماؤں
کے تمام دلائل کو رد کیا ہے ہم ان خیالات کو اس لئے یہاں درج کرنا چاہتے
ہیں کہ ان سے نرم دل اور گرم دل کے نظری اختلافات کا اعادہ ہو جائے گا
اور تاریخ کے طالب علموں کو اس اہم کشمکش کے بارے میں صحیح معلومات
بھی مہیا ہو جائیں گی پھر یہ کہ ان کو دہرانے سے اس زمانہ کی صحیح سیاسی صورتِ
حال بھی سامنے آ جائے گی۔ مولانا کا پہلا مضمون سودیشی اور بائیکاٹ سے
متعلق نرم دل کے دلائل کے رد میں تھا جس کا تذکرہ سودیشی تحریک کے سلسلہ
میں اپنی جگہ آئے گا مگر دوسرا مضمون نرم دل کے سیاسی عقائد اور ان کے رد
پر مشتمل ہے جس کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ "نرم دل کے
رہنماؤں کو یہ غلط فہمی ہے کہ حصول مقصد کے لئے صرف ریزرولیشن پاس
کرنا اور عرضیاں پیش کرنا کافی ہے اور اس طریقۂ کار کو وہ آئینی جدوجہد
سے تعبیر کرتے ہیں ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہم لوگوں کو اپنی شکایات برابر اہل
برطانیہ کے روبرو پیش کرتے رہنا چاہیئے ہمارا معاملہ چونکہ سچا ہے اس لئے آخر
کار کبھی نہ کبھی فتح ضرور ہو گی اور اگر کامیابی جلد نہیں ہوتی تو ہم کو اظہارِ
بے صبری کے بجائے خود انگلستان کی مثال سے فائدہ اٹھانا چاہیے کہ اسے
حکومتِ خود اختیاری کتنی صدیوں میں جا کر ملی" مولانا نے ان دلائل کو نقل کرنے
کے بعد ان کا تجزیہ کیا اور ہر دلیل کو نہایت متانت، سنجیدگی اور بردباری سے
رد کیا۔ مولانا کی پہلی دلیل تو یہ تھی کہ سیاست میں فلسفیانہ اور مذہبی خیالات
کا اثر کم ہوتا ہے بلکہ بالکل نہیں ہوگا دوسری دلیل یہ تھی کہ انگلستان اور
ہندوستان کی حالتوں کو باہم مشابہ سمجھنا صریحاً غلط ہے اس لئے کہ جب
انگلستان میں حکومت خود اختیاری کی جدوجہد شروع ہوئی تو اس کے
اصول متعین نہیں ہوئے تھے پھر یہ کہ انیسویں صدی میں سیاسی جدوجہد کا
دائرہ بالکل محدود تھا اس وقت بے شک عرضداشتوں اور شکایت ناموں
سے کام لیا جا سکتا تھا لیکن جب ہم نے سوراج کو اعلانیہ اپنا مسلک بنا لیا تو اب

گداگری کی قدیم پالیسی پر قائم رہنا اوّل درجہ کی نادانی ہے۔ کوئی شخص خوشی سے اپنی جائداد دوسرے کو نہیں دیتا۔ ہمیں تو قرار دادیں پاس کرنے کے بجائے دفاعی مزاحمت کی پالیسی پر کاربند ہونا چاہیئے (مولانا نے ان خیالات کا اظہار ۱۹۰۵ء میں کیا جب مسٹر گاندھی کا برصغیر کے میدان سیاست میں دور دور پتہ نہیں تھا۔ دفاعی مزاحمت کی ترکیب کا استعمال سب سے پہلے مولانا کے اس مضمون میں ملتا ہے۔ مولانا نے اس مضمون میں آگے چل کر لکھا کہ تحریکِ آزادی سے انگریزوں کی مخالفت قطعی اور لازمی ہے مولانا نے نرم دل کے ارکان سے سوال کیا کہ آپ سلف گورنمنٹ کا مطالبہ مانتے ہیں اور اگر یہ صحیح ہے۔ تو آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ سلف گورنمنٹ کا مطالبہ اور انگریزوں کی رضامندی دو متضاد چیزیں ہیں جن کا یکجا ہونا ممکن نہیں مولانا کہتے ہیں کہ "جب حصول مقصد کے لئے انگریزوں کی ناراضگی لازمی قرار پائی تو پھر اس سے بچنے کی کوشش کرنا فضول ہے" مولانا کا کہنا تھا کہ شاید ہمارے نرم دوستوں کو امید ہو گی کہ ہم دھوکہ ہی دھوکہ میں بغیر انگریزوں کو ناراض کئے تمام حقوق حاصل کریں گے لیکن ہمارے نزدیک ایسا ناممکن ہے کیونکہ انگریزوں کی قوم اتنی بے وقوف نہیں ہے کہ اہل ہند کے مقصد کی تہہ کو نہ پہنچ سکے۔ مولانا کا ایمان تھا کہ جو آزادی بطورِ تحفہ حاصل ہوتی ہے وہ بہت جلد نابود ہو جاتی ہے (جیسی صحیح پیشین گوئی ہے) مولانا کے خیال میں جو آزادی نتیجہ ہو سخت محنت جدوجہد و کشمکش کا اس کے دیرپا ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ مولانا نے اپنے اس مضمون میں نرم دل کی اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا کہ دفاعی مزاحمت کی پالیسی حد اعتدال سے تجاوز ہے مولانا فرماتے تھے کہ اس پالیسی کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ جہاں تک ممکن ہو ملک کو جنگ اور خون ریزی کی مصیبتوں میں مبتلا ہونے سے روکا جائے مولانا فرماتے تھے کہ محکوم حاکم اپنے ملکی حقوق صرف تین ہی صورتوں میں لے سکتے ہیں اوّل درخواست مرحمت کے ساتھ گدایانہ دست طلب دراز کر کے جس کا بیکار ہونا قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے دوسرے خون ریزی اور

فساد کے ذریعہ حاکم کو مغلوب اور مجبور کر کے جس کی بظاہر حالات کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بس اب ہمارے لئے سوائے اس کے اور کوئی کارروائی مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ فی الحال نہ تو ہم گداگری کی ذلت گوارا کریں نہ جنگ و جدل کی آزمائش میں پڑیں بلکہ ان دونوں سے علیحدہ رہ کر دفاعی مزاحمت کے درمیانے راستہ پر چلنا شروع کر دیں جو مفید ہونے کے علاوہ کبھی مضر نہیں سکتا اور یہی وہ بات ہے جس کی بناء پر مزاحمت کی پالیسی کو طلب کی پالیسی پر صریحاً ترجیح حاصل ہے کیونکہ بحالت ناکامی گداگر کی طبیعت مایوسی کے ایسے گڑھے میں گر جاتی ہے جس سے دوبارہ نکلنا اس کے لئے محال ہو جاتا ہے لیکن برخلاف اس کے مزاحم اگر ناکام بھی رہے تو دوران مزاحمت میں اسے جو قوت اور تجربہ حاصل ہوتا ہے اس کا فائدہ کسی طرح زائل نہیں ہوتا۔ یہی پالیسی آخرکار کانگریس کا نصب العین قرار پائی مگر مولانا کے اس اظہار خیال کے ۱۵ برس بعد

عمل کا وقت آن پہنچا

مولانا نے اپنے اس مضمون میں جس قوت اور تجربہ کا ذکر کیا تھا اس کا وقت قریب آن پہنچا تھا۔ مولانا اردوئے معلیٰ کے ذریعہ جنگ آزادی کا ماحول تیار کرنے کی جس جد و جہد میں مصروف تھے اس کو تقریباً ۵ سال کا عرصہ ہو چکا تھا اور یہ سارا کام علی گڑھ میں ہو رہا تھا جو اس وقت تک انگریزی اقتدار اور اثرات کا قلعہ تھا۔ اور جہاں انگریز کی مخالفت کا مطلب یہ تھا کہ ایک نئی ولولہ انگیز قیادت کو جنم دیا جائے۔ علی گڑھ میں طلبہ کی ہڑتال کا جس کا اوپر کے صفحات میں ذکر ہو چکا تھا شاخسانہ ابھی نیا تھا اور عقول ڈپٹیاں وقت یہ سب کچھ مولانا کا کیا ہوا تھا اور ہر کس و ناکس کی زبان پر یہی تھا کہ مولانا اپنی ان حرکتوں سے خود مصیبت کو دعوت دے رہے ہیں اور ایک ایسا حلقہ تیار کر رہے ہیں جو ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے لہٰذا انہیں مصائب اور شدائد میں مبتلا کرنے کے لئے تانا بانا بننا شروع ہو گیا مگر قبل اس کے کہ ان واقعات کو پیش کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حالات حسرت کا ایسا اقتباس پیش کر دیا جائے جو آنے والے واقعات کی صحیح نشان دہی کرے

یہ سیرت حسرت، بیگم حسرت موہانی کی نگرانی میں شائع ہوئی تھی ملاحظہ فرمایئے "خداۓ قدوس کی یہ ایک صفت جاریہ ہے کہ وہ اپنے عزیز اور محبوب بندوں کو ابتلا اور آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کے ذریعہ مراتب و درجات میں بلندی عطا فرماتا ہے اور اگر اس امتحان و آزمائش میں وہ پورا اترتا ہے تو پھر قادر قیوم اس بندہ پر کامیابی کی راہیں کھول دیتا ہے اور اس کی بے سروسامانی و تنہائی کے اندر اس قدر فتح و نصرت پیدا کر دیتا ہے کہ پھر کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مولانا حسرت کے لئے بھی ان مراحل سے گذرنا اور ابتلا و آزمائش کی اس کسوٹی پر کسنا ضروری تھا۔ خدا تعالے کو ان کے خلوص و صداقت کا امتحان لینا تھا کہ آئندہ عمل کی کوئی سخت سے سخت قوت بھی ان کے پر خلوص کاروبار میں حارج نہ ہو چنانچہ عملاً میدان عشق میں قدم رکھے ہوئے چار سال ہی گذرے تھے کہ امتحان کی پر خطر وادیاں راستہ میں آنا شروع ہو گئیں وہ سخت گیریاں جو پردۂ خفا میں رہ کر وقتاً فوقتاً دامن گیر ہوتی رہیں۔"

پہلا وار

سب سے پہلے آپ پر یہ وار کیا گیا کہ اردوئے معلی میں ایک مضمون کی اشاعت کے سلسلہ میں آپ پر ایک مقدمہ قائم کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ اردوئے معلی حکومت کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اور ارباب اقتدار کا خیال یہ تھا کہ اگر کسی طرح یہ رسالہ بند ہو جائے تو پھر مولانا انگریز حکومت کے خلاف نوجوانوں کا محاذ قائم کرنے اور مسلمانان ہند کو غیر ملکی حکومت کے خلاف نبرد آزما بنانے کی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکیں گے اور علی گڑھ کا پر سکون حال خراب ہونے سے بچ جائے گا۔

حالات حسرت میں لکھا ہے کہ ۱۹۰۸ء میں لطف ستم اور لذت ایذا کی لکھی ہوئی دعوت آپ کو دی گئی۔ یعنی آپ پر اردوئے معلی میں ایک مضمون "مصر میں انگریزوں کی پالیسی" شائع کرنے کے جرم بغاوت کا مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ یعنی آپ کو دو برس قید سخت کی سزا سنا دی گئی یہ مضمون کس نے لکھا تھا اس کے

بارے میں جناب سراج نظامی نے جنگ مورخہ ۱۴؍مئی ۱۹۷۶ء میں لکھا ہے کہ اس کے متعلق متضاد رائیں ہیں مولانا سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ یہ مضمون اعظم گڑھ کے مشہور شاعر اور وکیل اقبال سہیل کا تھا جو حسرت کی طرح شعر و سخن اور سیاسی مذاق رکھتے تھے اس کے برعکس جناب ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ میرے دوست ڈاکٹر سید سجاد نے ۲۶؍ستمبر ۱۹۵۱ء کو مجھے یہ تحریر لکھ کر دی کہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق فرماتے ہیں کہ یہ مضمون ان کا تھا اور اس پر حسرت کو جیل ہوئی راقم الحروف نے بھی ڈاکٹر عبدالحق سے یہی سنا کہ یہ مضمون ان کا ہے یہ گفتگو کئی افراد کی موجودگی میں حیدرآباد سندھ کے ریلوے اسٹیشن پہ ہوئی۔ لیکن جناب ضیاء الدین برنی تحریر فرماتے ہیں کہ "معارف والوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مضمون عربی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا تھا اور ڈاکٹر عبدالحق عربی نہیں جانتے اس لئے مضمون ان کا نہیں ہو سکتا ایک دن میں نے بابائے اردو سے دریافت کیا کہ وہ اس واقعہ پر روشنی ڈالیں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر قصہ ختم کر دیا کہ اب انہیں یہ واقعہ بالکل یاد نہیں رہا۔ جناب جلیل قدوائی نے مولوی سید ہاشمی فریدآبادی اور سید سلیمان ندوی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ مضمون مولوی عبدالحق کی اردو اور فضل امین صاحب کی انگریزی تحریروں کا خلاصہ تھا جو اقبال سہیل صاحب نے تیار کیا تھا جناب جلیل قدوائی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مدرسہ کی جانب سے اس سلسلہ میں ایک پروانہ مولوی عبدالحق کے نام بھی جاری ہوا تھا مگر اس کی تعمیل نہ ہو سکی۔

صاحب حالات حسرت نے صرف یہ لکھا ہے "کہ یہ مضمون جس کی وجہ سے آپ کو قید فرنگ کی سختیاں برداشت کرنی پڑیں درحقیقت علی گڑھ کالج کے ایک طالب علم کا لکھا ہوا تھا مگر مولانا کے اعلیٰ کردار کو دیکھئے اور ان کے اعلیٰ اخلاق اور خوبیوں کا صرف اس ایک بات سے اندازہ لگائیے کہ انہوں نے عدالت میں مضمون نگار کا نام نہیں لیا اور اس کی اشاعت کی تمام ذمہ داری اپنے اوپر ڈالی اور اس طرح صحافت کے اعلیٰ اصولوں پر دل و جان سے عمل کیا۔ صحافی ہر حال میں ذریعہ اطلاع کے تحفظ کا ذمہ دار ہے اور تاریخ میں جب بھی اس قسم

کا مرحلہ آیا تو اس نے اپنی جان پر کھیل کر اپنی اس ذمہ داری کو پورا کیا۔

لیکن برصغیر کی تاریخ میں اس میدان میں بھی اوّلیت کا سہرا مولانا ہی کے سر رہا، حسرت کی بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ایک یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے ان کے خلاف شہادت دی تھی انہیں ان لوگوں سے کبھی ذاتی پرخاش نہیں ہوئی مگر اس کے مقابلہ میں نواب وقار الملک کے علاوہ اب تک علی گڑھ کے جاہ پسند حسرت سے بلا وجہ بغض و عناد رکھتے ہیں۔ (اب تک سے مراد ۱۹۱۶ء ہے حالات حسرت اسی سن میں شائع ہوئی تھی) مولانا نے جیل سے رہائی کے بعد بھی کسی سے مضمون نگار کا تذکرہ نہیں کیا ورنہ کم سے کم یہ تو ضرور ظاہر ہوتا کہ صاحب مضمون کون تھا مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ایک خط میں جناب عبدالقوی دسنوی کو لکھا کہ "حسرت کی ہمت کا اصلی امتحان ۱۹۰۸ء کی جیل تھی جب ساری قوم بشمول بزرگ قوم نواب وقار الملک ان سے سخت ناراض ہو گئی تھی اور اس زمانہ میں ہندؤں میں بھی جیل جانا ایک ذلت کی بات تھی" سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ "علی گڑھ کالج کی حرمت کو بچانے کے لئے (اس لئے کہ مولانا بھی علی گڑھ کالج کی پیداوار تھے) کالج کے بڑے بڑے ذمہ داروں نے حسرت کے خلاف گواہی دی یہاں تک کہ نواب وقار الملک نے بھی دو ایک تقریروں میں مضمون مذکور کی مذمت کی۔"

مقدمہ کی روداد

اب مقدمہ کی روداد خود مولانا سے سنیئے۔ تحریر فرماتے ہیں، "کہ ۲۳ر جون ۱۹۰۸ء کو اردوئے معلیٰ پر سیڈیشن کا مقدمہ قائم ہوا اور ۴ر اگست ۱۹۰۸ء کو دو سال قید سخت اور ۵۰۰ سو روپیہ جرمانہ کا حکم سنایا گیا علی گڑھ میں ہر شخص جانتا ہے اور اس لئے مجسٹریٹ علی گڑھ کو بھی غالباً اس کا علم تھا کہ راقم الحروف کی زندگی کس نہج پر بسر ہوتی ہے مگر نیت توصرف یہ تھی کہ اردوئے معلیٰ اور کتب خانہ اردوئے معلیٰ کی بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہے تاہم بھی مجسٹریٹ علی گڑھ کے ان احکام

کی شکایت نہ اب ہے اور نہ کبھی ہوئی اور نوعیت مقدمہ کے لحاظ سے ان کی
غیر معمولی سختی پر نہ کبھی تعجب ہوا۔ اور نہ اب ہے اس لئے کہ جب تک ہندوستان
میں مجسٹریٹ پولیس کے بھی اعلیٰ افسر رہیں گے اور خفیہ پولیس کی ان جھوٹی رپورٹیں
سن کر جن کی تردید کا فرضی ملزم کو کوئی موقعہ نہ ملتا ہے نہ مل سکتا ہے فیصلہ
مقدمہ کے شروع ہونے سے قبل ہی کر لیا کریں گے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ جب تک انہیں
ایک شخص پر الزام لگانے کا حق ہے، وارنٹ جاری کرنے کا حق ہے اور پھر خود ہی
انہیں انصاف کرنے کا حق ہے اس وقت تک مقدمات میں عموماً اور پولیٹکل مقدمات
میں خصوصاً خالص انصاف یا رہائی کی امید کرنا اوّل درجہ کی حماقت ہے۔ کیونکہ
پولیٹکل مقدمات میں ایک اور خرابی یہ بھی ہوتی ہے کہ ملزم اکثر فرنگیوں اور فرنگی
حکومت کا دشمن سمجھا جاتا ہے اور اس لحاظ سے یورپین مجسٹریٹ کے دل میں اس
کی جانب سے بغض و کدورت کا پیدا ہونا ایک ایسا قدرتی امر ہے جس کی نسبت
ہم اس کو الزام نہیں دیتے"
سبحان اللہ کیا حوصلہ اور وسعت نظری ہے مولانا کے مذکورہ بالا اظہار خیال
سے مقدمہ کی نوعیت اور سزا کے بارے میں تمام متعلقہ امور سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اور
پتہ چل جاتا ہے کہ یہ ساری سزا جیسا کہ پہلے اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے اور قید ایک
سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھی لیکن جیسا کہ مولانا نے فرمایا انہیں اس ضمن میں کسی
سے یہاں تک کہ مجسٹریٹ سے بھی کوئی شکایت نہیں تھی اس لئے کہ انہوں نے اس
فیصلہ کا سائنسی تجزیہ کر لیا تھا در حقیقت یہ محض سزا نہیں تھی بلکہ مصائب شدائد
کا ایک مسلسل دور تھا جس کا تفصیلی ذکر آ رہا ہے لیکن جیسا کہ مولانا نے نرم دل کے
رہنماؤں کو دفاعی مزاحمت کا راز سمجھاتے ہوئے لکھا تھا کہ سونے کو جتنی آگ دی
جائے وہ اتنا ہی کھرا بن جاتا ہے۔ مظالم کے ساتھ ساتھ مولانا کی روحانی، ایمانی
اور اخلاقی قوتوں میں اضافہ ہوتا گیا حالاتِ حسرت کے مطابق یہ مصائب اور
آلام معمولی نوعیت کے نہیں تھے حسرت کے ساتھ جیل میں جو سختیاں کی گئی وہ ظلم
اور بے انصافی کی عبرتناک مثالیں ہیں اور جب بھی محکوم ہندوستان کی تاریخ لکھی
جائے گی تو حسرت پر جس قدر ظلم توڑے گئے ہیں اور ان پر جس قدر جور و ستم

کی بارش کی گئی ہے وہ اس تاریخ کا سب سے زیادہ تاریک اور سیاہ باب ہو گا'' افسوس کہ یہ توقع اب تک پوری نہیں ہوئی اور مذہبی تعصب نے صحیح واقعات کو منظر عام پر نہیں آنے دیا۔

سب سے بڑی الضافی

''سب سے پہلی اور سب سے زیادہ سخت ناالضافی جو مولانا کے ساتھ کی گئی وہ یہ تھی کہ ان میں اور اخلاقی مجرموں میں کوئی فرق نہیں کیا گیا اور نہ صرف یہ بلکہ تمام مجرمین سے بھی زیادہ ذلت انگیز اور تکلیف دہ برتاؤ ان کے ساتھ کیا گیا یہاں تک کہ قواعد جیل کے مطابق جن رعائتوں سے عام قیدی مستفید ہوتے رہتے تھے حسرت کو ان سے بھی ہمیشہ محروم رکھا گیا۔ مثلاً یہ کہ کسی قیدی سے چکی پیسنے کی سخت ترین مشقت دس پندرہ روز سے زیادہ نہیں لی جاتی مگر حسرت کی تمام میعاد قید اسی مشقت میں گذری'' مولانا فرماتے ہیں کہ میری نسبت دارڈر کو یہ گمان تھا کہ اس سے چکی نہ پس سکے گی (اظہار یہ خیال درست تھا۔ اسلئے کہ مولانا اس زمانہ میں علی گڑھ سے گریجوئیٹ ہو چکے تھے اور مسلمانوں میں تعلیم عام نہ ہونے کے سبب ان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی بڑی کمی اور بی۔اے ہونا بڑا فخر تھا) لیکن جب دوسرے دن برقنداز سے دریافت کرنے پر اس کو معلوم ہوا کہ میں نے پہلے ہی روز اپنا کام (یعنی ایک من گیہوں) وقت مقررہ سے پہلے ہی ختم کر لیا تو اسے یقین نہیں آیا اور برقنداز سے ایسی باتیں کیں جن سے اس نے اپنی سمجھ کے مطابق یہ نتیجہ نکالا کہ میری نسبت دارڈر کا یہ منشا ہے کہ اس کی پیشی ہو جائے چنانچہ تیسرے دن اس نے مجھے سب سے خراب چکی دی اور میرے جوڑی دار کو سمجھایا کہ تم ڈھیل دے دینا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دس سیر غلہ باقی رہ گیا۔ قاعدہ کے مطابق ہم دونوں کی پیشی ہونی چاہیئے تھی لیکن حسب قرار داد سابق صرف میری پیشی ہوئی اور دو دن کے لئے رات کو ہتھکڑیاں ڈالنے کی سزا تجویز ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ سے سارا حال کہہ دوں مگر برقنداز کو پیٹی اتار کر زدوکوب پر آمادہ پا کر میں نے خاموشی اختیار کی اور معاملہ کو خدا کے سپرد کر دیا'' صاحب

حالات حسرت تحریر فرماتے ہیں کہ "مولانا برابر جیل میں چکی پیستے رہے یہاں تک کہ پورا رمضان المبارک اس صبر آزما شغل میں بسر ہوا پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے علاوہ حکام جیل کی طرف سے دوسرے قسم کی سخت گیریاں بھی عمل میں آتی رہیں مثلاً کسی کو اجازت نہیں تھی کہ وہ حسرت سے گفتگو کرے۔ ملازمان جیل کو بھی یہ سختی سے ہدایت تھی کہ وہ مولانا کے ساتھ کوئی جائز رعایت نہ کریں"

آغاز قید کا حال

خود مولانا نے اپنے رسالہ اردوئے معلی میں آغاز قید کا حال اس طرح لکھا ہے کہ "۴ر اگست ۱۹۰۸ء میں قید سخت کا آغاز اس طرح ہوا کہ کچہری سے واپس جیل پہنچتے ہی ایک لنگوٹ، ایک جانگیہ اور ایک کرتہ ٹوپی پہننے کو اور ایک ٹکڑا ٹاٹ کا اور کمبل اوڑھنے بچھانے کے واسطے اور ایک قدح آہنی بڑا اور ایک چھوٹا دیگر جملہ ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا۔ ان چند چیزوں کے علاوہ قیدیوں کو اور کوئی چیز رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ابتدا میں سامان بود و ماندگی کی اس شکل سے کسی قدر تکلیف ضرور محسوس ہوئی لیکن بہت جلد طبیعت نے انہی کے استعمال پر قانع ہو کر ایک عجیب و غریب سبق حاصل کر لیا اگر انسان ہوا و حرص کو ترک کر دے تو زندگی کی ضرورتیں اس قدر کم ہیں اور وہ اتنی آسانی سے فراہم ہو سکتی ہیں کہ بظاہر ان کے لئے انسان کو جبر و ستم یا مکر و فریب کے وسائل اختیار کرنے اور بعض اوقات اغیار کی بندگی و غلامی تک کے قبول کرنے پر آمادہ ہو جانا ایک حیرت انگیز معاملہ نظر آتا ہے۔ زندانی معاشرت کی یہ فقیرانہ شان ہر طرح راقم الحروف کے مناسب تھی البتہ ابتدا میں بحالت نیم برہنگی فریضۂ نماز ادا کرنے میں تکلف ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اپنی مجبوری اور بے بسی کے احساس نے اس کا بھی خوگر بنا دیا۔ جیل کی سخت ترین مشقت چکی سے پہلے ہی روز سابقہ پڑا راقم نے بمصداق برہم فرزند آدم ہر چہ آید بگذرد اس جبری خدمت کو بسر و چشم قبول کیا" اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ "لوگوں کو عام طور پر خیال تھا کہ یہ مشقت چند روزہ ثابت ہوگی اور کسی سینٹرل جیل میں تبدیلی ہونے پر کوئی لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے گا

لیکن راقم الحروف کو اہل فرنگ کی شرافت اور عالی حوصلگی سے اس رعایت کی توقع نہ تھی چنانچہ میرا خیال صحیح نکلا اور وہاں بھی چکی کی پُر اذیت اور ذلت انگیز مشقت سے سابقہ پڑا اور تقریباً ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنے سے سرکار رہا حالانکہ عام قیدیوں سے بھی عموماً چکی دو ایک ماہ سے زیادہ نہیں پسوائی جاتی۔

نینی جیل

علی گڑھ سے الہ آباد (نینی جیل) کی روانگی اور وہاں پہنچنے پر جن تکالیف کا سامنا ہوا، اس کی نسبت مشاہدات زنداں میں مولانا نے فرمایا کہ "گورنمنٹ نے کرایہ کے علاوہ دوسری ضروریات کے لئے ایک پیسہ زائد نہیں دیا یہاں تک کہ راستہ میں قیدیوں کی خوراک کے لئے فی کس فی روز ایک آنہ کے حساب سے جو ملتا تھا وہ بھی نہیں ملا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن صبح تک تھوڑے سے بھنے ہوئے چنوں کے سوا کچھ کھانے کو نہیں ملا۔" (ظلم کی بھی حد ہوتی ہے مگر مولانا کے معاملہ میں کس قسم کی حد کو روا نہیں رکھا گیا) الہ آباد جیل میں داخل ہونے کے بعد علی گڑھ جیل کے کپڑے اتروالئے اور کہا گیا کہ یہاں کے کپڑے کچھ دیر میں ملیں گے اس وقت تک کالے کپڑے پہنو جن کی کیفیت یہ تھی کہ ان سے زیادہ کثیف و غلیظ اور بدبودار کپڑے کا تصور بھی بہ آسانی ذہن میں نہیں آ سکتا تھا لیکن مجبوراً وہی کپڑے پہننے پڑے۔ عینک بھی اتروا لی گئی حالانکہ علی گڑھ میں معائنہ کے بعد پہننے کی اجازت مل گئی تھی (اور چونکہ مولانا کی نگاہ دوربین نہیں تھی اس لئے عینک اترنے کے بعد وہ بالکل معطل ہو کر رہ گئے تھے) تھوڑی دیر بعد جیلر صاحب نازل ہوئے اور میرے ساتھ کے تمام اخباروں اور کتابوں کو سوائے دیوان حافظ میرے سامنے جلا کر خاکستر کر دیا اور دفتر میں حاضر ہونے کا حکم صادر فرمایا دفتر میں مجھ کو غضب آلود اور قہر بار نگاہوں سے دیکھ کر ارشاد ہوا کہ اگر یہاں ٹھیک طور سے نہ رہو گے تو بیمار بنا کر اسپتال بھیج دیئے جاؤ گے اور وہاں جا کر خاک کر دیئے جاؤ گے اس کے علاوہ ان دفعہ داروں کو جو قیدیوں سے کام لیتے تھے حکم ملا کر ان کے دماغ کی نکال دو۔"

صاحب حالات حسرت نے لکھا ہے کہ "اس کا منشا یہ تھا کہ مولانا کو بلا وجہ اذیت پہنچائی جائے۔"

"بہر حال اس پرستار حریت، فدائے ملک وقوم نے ان مصائب وتکالیف کو بہ نفسی خوشی برداشت کیا اور ایک لمحہ کے لئے بھی کمزوری کو اپنے پاس نہ آنے دیا۔ بلکہ ستم گریوں سے امر حق کی خدمت گذاری کا ولولہ اور زیادہ نشو پذیر ہوا اور ایسی خدمت حاصل کی کہ برسوں کی ریاضت اور مجاہدات سے بھی یہ بات حاصل نہ ہوتی یہ بھی خداوند ارض وسما کا احسان عظیم تھا کہ اس نے مسکین حسرت کو پہلے تو مبتلائے الام کیا اور پھر خود ہی ان کی برداشت کی قوت بھی عطا فرمائی۔ اس کے علاوہ دیگر اخلاق حسنہ اور صفات حمیدہ کی طرف بھی اس قید فرنگ کے ذریعہ رہنمائی حاصل کی چنانچہ عزم واستقلال کے علاوہ یہ سبق بھی مولانا کو حاصل ہوا کہ آنچہ مادر کار داریم اکثرے درکار نیست۔ چنانچہ اب مولانا بالکل فقیرانہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ سامان معاش کی تلاش میں دیوانہ وار اور حریصانہ طریق سے ارذل اور بعید از اخلاق مسائل کے جال میں نہیں پھنستے اور ہر وقت ان سے جدا ہو جانے کے لئے تیار ہیں یعنی انہوں نے اپنی ضروریات اور تعلقات کو اس قدر محدود کر لیا ہے کہ وہ آئندہ درد ومصائب سے نہیں گھبراتے۔ اور ان سے جدا اور علیحدہ ہو جانے کے خوف سے حق وصداقت کے نشر واعلان سے باز نہیں رہتے جیسا کہ ملک وقوم کو بارہا تجربہ ہو چکا ہے اور اب اس تجربہ کی تجدید ہو رہی ہے۔" مختصر یہ کہ اس پر الام ومحن زمانۂ قید کو مولانا نے صبر وشکر کے ساتھ حافظ شیراز کے اس شعر کو زبان حال سے پڑھتے ہوئے ختم کر دیا۔

پنداشت ستمگر کے جفا بر ما کرد　　　بر گردن او بماند و بر ما بگذشت

قید فرنگ کی رُوحانی برکتیں

حالات حسرت میں آگے چل کر تحریر ہے کہ "دیارِ صدق　تسلیم صداقت کا یہ ایک مسلم مسئلہ ہے کہ باطل کے جبر وتسلط میں بھی حق کی سربلندی کی قوت مخفی ہوتی ہے اور ظلم وستم کی راہیں بھی آخر دیارِ حق کی صراط مستقیم سے جا

ملتی۔ یعنی انسان کی مادی طاقت اپنی قہرمانیوں کے اندر جادۂ صداقت کے لئے ایک نور مستور رکھتی ہے اور وہی نور مستور بالآخر ظلمت و استبداد کی چادر چاک کر کے سیہ خانۂ ظلم و ستم کو منور کر دیتا ہے غرضیکہ ابتلاء و آزمائش کا دور آفرینی حق و صداقت کے لئے بے شمار فوائد و برکات کا واحد ذریعہ ہوا کرتا ہے پھر اس کلیہ سے مولانا حسرت کی ذات گرامی کیونکر مبرا رہتی اور یہ کیوں کر ممکن تھا کہ ایسے کاروبار کی نصرت بخشی کے لئے خداوند قدوس کا دست اعانت فرما حسرت کی طرف نہ بڑھتا۔ یقیناً اس کو جنبش ہوئی اور اس نے حسرت کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ پھر وہ کون سی قوت ہے جو حسرت پر فتح پا سکے اور کون سی طاقت ہے جو حسرت کی قوت ایمانی کو زیر کر سکے یہی ایک فضل و تائید ربانی برکات و حبس کے تحت کیا کم ہے کہ کسی دوسری چیز کی تلاش میں آپ نکلیں حالانکہ اس کے علاوہ قید فرنگ کی سختیوں نے حسرت کے دامن کو روحانی فیوض سے مالا مال کر دیا۔ اس کو بھی نظر انداز کیجئے برکات ابحبن کے صرف اس حصہ کو لیجئے جس کا تعلق براہ راست ملک و قوم سے ہے۔

دنیا کی تاریخ حریت و استبداد کا بغور مطالعہ کیجئے۔ آپ کو ایسے نفوس قدسی کی مثالیں بہ کثرت ملیں گی جو قید کی پُرمحن زندگی میں بھی قومی خیال سے غافل نہ رہے اور وہاں بھی سلسلۂ رشد و ہدایت اور خدمت فرمائی کو انہوں نے جاری رکھا حضرت امام ابو حنیفہ۔ حضرت امام احمد ابن حنبل۔ حضرت علامہ ابن تیمیہ۔ حضرت مجدد الف ثانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی۔ ان کے علاوہ موجودہ عہد میں بلا قید مذہب و ملت۔ مقتدائے وطن پرستان مسٹر بال گنگا دھر تلک۔ حسرت کی طرح یہ تمام حضرات اپنے عہد میں حمایت حق و پرستاری صداقت کے جرم بے جرمی میں مقدس بیڑیاں اپنے پیروں میں پہن چکے ہیں اور جیل کی صعوبات میں گرفتار رہ چکے ہیں مگر ان بلاکشان صداقت نے ان پُر اذیت لمحات میں قوم کو فراموش نہیں کیا اور جس قدر ممکن ہو سکا خدمت کرتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ قوم نے انہیں فراموش کر دیا، یعنی اگر زبان بند کر دی گئی تو قلم کو انہوں نے نہیں چھوڑا اور جس حد تک اسے آزادی دی گئی انہوں نے اس سے کام لیا۔ بعض بزرگوں کے حالات تو اس قسم کے ہیں کہ اُن

مقدس وجود نے جیل خانہ کو بھی خانقاہ۔ دارالحدیث اور موعظت خانہ بنا دیا۔ اور ہزاروں بداخلاق قوموں کو چند ہی روز میں متخلق با اخلاق اللہ انسانوں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ اکثر نے تالیفات و تصنیفات کا شغل جاری رکھ کر موتیوں میں تولنے کے قابل پر از حکمت و موعظت تصنیفات قوم کے لئے تیار کر دیں۔ لیکن حسرت کے مقدس جسم کی طرح ان کا قلم بھی مجبور و محبوس تھا اور سخت تاکید تھی کہ کاغذ قلم دوات کیا کاغذ کا ردی ٹکڑا بھی ان تک نہ پہنچ جائے لیکن بایں ہمہ اس نے رمضان المبارک میں روزے رکھ کر اور چکی پیس پیس کر ایک عدیم النظیر دیوان تیار کر دیا اور اس طرح اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہوا۔ اس دیوان کی شعری لطافت و پاکیزگی جو قیمت رکھتی ہے حق یہ ہے کہ وہ انمول ہے لیکن اس کے علاوہ مولانا نے پردۂ شعر میں جابجا حریت و وطن پرستی کا درس دیا ہے اور حق کی طرف انہوں نے اس ذریعہ سے بھی رہنمائی کی ہے۔ بس دو چیزیں ایسی ہیں کہ دوسروں کی آزادی سے زیادہ قیمتی ہیں۔ مگر ان کے علاوہ بھی مولانا نے ایک خدمت ملک و قوم کی اور بھی کی ہے یعنی مشاہدات زندان فرنگ کے عنوان سے موصوف نے ایک طویل سلسلہ میں جیل خانوں کی وہ بدانتظامیاں اور ابتریاں بیان کی ہیں جن کو سن انسانیت کی روح لرز جاتی ہے اور اس امر کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس عہدِ تہذیب میں دورِ ظلمت و وحشت کی یاد کو کس طرح زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

جیل کی سختیاں

"تمام متمدن ممالک میں جیل خانوں کا انتظام نہایت عمدہ ہوتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ مجرموں کے اخلاق درست ہو جائیں نیز کوئی وحشیانہ برتاؤ ان کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ لیکن ہندوستان کی برٹش گورنمنٹ کے انتظامات جیل حسب تحریر مولانا حسرت موہانی اس قدر ابتر و بدتر ہیں کہ اصلاح و درستی کے عوض مجرمین کے اخلاق اور زیادہ ذلیل و مبتذل ہو جاتے ہیں اور خلاف انسانیت جو سختیاں روا رکھی جاتی ہیں ان کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے مولانا حسرت نے انتظامات جیل

پر نہایت تفصیلی ناقدانہ نظر ڈال کر اہل ملک کو اس سے آگاہ کیا اور کونسل کے آنریبل ممبروں کو توجہ دلائی چنانچہ آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما آنجہانی نے صوبجات متحدہ کی کونسل میں ایک سوال کے ذریعہ گورنمنٹ کو اس حالت زار کی طرف توجہ دلائی اور اگرچہ حکومت نے نہایت مغرورانہ اور مغرورانہ انداز میں اس سوال کو ٹھکرا دیا تاہم اہل ملک اس حقیقت سے کم از کم آگاہ ہو گئے حکومت کی بے نیازی اور استغنا کو شکست دے کر اپنے مطالبات کو تسلیم کرا لینا حسرت کا نہیں بلکہ تمام ملک و قوم کا کام ہے آنریبل آنجہانی نے دریافت کیا تھا کہ آیا گورنمنٹ کی نظر سے اردوئے معلی کے یہ مضامین گذرے ہیں اور آیا ان کی بابت کچھ تحقیقات کی جائے گی۔ لیکن اس سوال کے جواب میں انسپکٹر جنرل نے کمال غرور و بے پروائی سے جواب دیا۔ کہ گورنمنٹ کے نزدیک ان مضامین کی کوئی وقعت نہیں ہے اور نہ ان کے متعلق کوئی تحقیقات کی گئی ہے اور نہ آئندہ کی جائے گی یہ جواب جن پر غرورانہ الفاظ اور جس غضب ناک لہجہ میں دیا گیا اس سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ غریب حسرت پر جیل میں کیا کچھ ستم نہ توڑے گئے ہونگے اور یہ کہ حکومت کو مولانا حسرت سے کس درجہ عناد ہے اس کے جواب کے متعلق مولانا حسرت نے اپنے رسالہ اردوئے معلی میں تحریر فرمایا کہ خیر آپ حاکم ہیں اور ہم محکوم، جو چاہے سمجھئے لیکن اتنا خیال رہے کہ جبر و خودسری کے ساتھ غرور اور تکبر زوال کی یقینی علامت ہے۔" (مولانا نے یہ پیشین گوئی اس وقت کی جب کسی کو اس بات کا یقین بھی نہ آتا تھا کہ سلطنت برطانیہ مٹنے کے لئے بنی ہے)

ابتداً حسرت کو مجسٹریٹ علی گڑھ نے دو سال قید سخت اور ۵ سو روپیہ جرمانہ کی سزا اپنے تمام اختیارات سے کام لیکر دی تھی جرمانہ وصول کرنے میں اس سزا کی نوعیت میں وہ اور اضافہ کر سکتے تھے چنانچہ عالی حوصلہ مجسٹریٹ نے زر جرمانہ وصول کرنے کے حیلہ سے حسرت کا نہایت نادر قیمتی کتب خانہ برباد کر ڈالا یہ کتب خانہ اس زمانہ میں چار ہزار روپیہ کی مالیت کا تھا اور اس میں نہایت نادر و نایاب کتابیں تھیں اور بعض قلمی بھی تھیں ایسا قیمتی اور لاجواب کتب خانہ صرف ساٹھ روپیہ میں برباد کر دیا گیا ظاہر ہے کہ اس حرکت سے مولانا حسرت کو جس قدر

تکلیف اٹھانی ہوگی اس کا اندازہ صرف اہل ذوق ہی کر سکتے ہیں مولانا نے اس ظلم اور زیادتی کے متعلق جو خیالات ظاہر ہوئے وہ حسب ذیل ہیں "اس جرمانہ کی بدولت کتب خانہ اردوئے معلیٰ کی جو حالت ہوئی اس کا بیان نہایت دردناک ہے جن کتابوں کو راقم الحروف نے معلوم نہیں کن کن کوششوں اور دقتوں سے بہم پہنچایا جن کتابوں میں بہت سے نایاب اور قلمی نسخے دوواوین شعراء وغیرہ کے تھے جن کی نقل بھی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ ان سب کو پولیس کے جاہل جوان تھیلوں میں اس طرح بھر بھرے گئے جس طرح لکڑی اور بھس لے جاتے ہیں ان کتابوں کی فہرست بنانا تو درکنار کسی نے ان کو شمار تک نہیں کیا۔ اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گذری، اس کا ذکر کرتے ہوئے ہمارا دل دکھتا ہے اس لئے اس سے قطع نظر ہی مناسب ہے اس جبر و ظلم کا انصاف خدا کے ہاتھ ہے یہ جملے ان حضرات کے لئے سرمایۂ عبرت ہونے چاہئیں جو انگریزی زبان اور تہذیب کو قومی زبان اور قومی تہذیب سے افضل سمجھتے ہیں۔"

"بہر حال مجسٹریٹ علی گڑھ کے اختیار میں جس قدر تھا انہوں نے حسرت کو اذیت دینے اور ان کو برباد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن ان کی تجویز کردہ دو برس کی میعاد میں ہائی کورٹ سے ایک سال کی تخفیف ہوگئی اور چونکہ حسرت کی مالی حالت سقیم تھی کیونکہ وہ فقیرانہ زندگی بسر کر رہے ہے اس لئے زر جرمانہ کے عوض ۶ ماہ قید سخت کا اس میں اضافہ ہو کر ڈیڑھ سال کی مدت رہ گئی تھی۔ اس قدر طویل مدت میں بھی حسرت پر سختیاں کم نہ ہوئیں جیل کے حکام نے تو یہ تہیہ کر لیا تھا کہ انہیں ہر قسم کی تکلیف و پریشانی میں مبتلا رکھا جائے مگر مولانا کے والد کے انتقال کی وجہ سے حسرت کے بڑے بھائی روح الحسن وکیل حیدرآباد دکن نے زر جرمانہ مجبوراً ادا کر دیا کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وارثتی مولانا کو ترکہ میں جو جائیداد ملی تھی اس کو بھی مجسٹریٹ علی گڑھ نیلام کرا ڈالتے ہیں اس حساب سے ڈیڑھ سال کی مدت میں ۶ ماہ کی مزید کمی ہوگئی اور آپ صرف ایک سال جیل میں رہے اور یہ تمام مدت جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے چکی پیستے گذری۔"

والد کو ملنے کی اجازت نہیں دی گئی

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے مولانا کے والد ماجد کا انتقال مولانا کے قید کے دوران ہوا اور جیسا کہ مولانا کی صاحبزادی نعیمہ بیگم نے تحریر کیا ہے رحلت کا سبب مولانا کی گرفتاری اور قید کے دوران ان پر مظالم اور شدائد تھے مولانا جس وقت گرفتار ہوئے اس وقت تو وہ اپنے والد کو اطلاع نہ کر سکے لیکن الہ آباد جیل پہنچنے کی خبر مولانا نے ایک شخص کے ذریعہ بھجوا دی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے خود مولانا کو کھلے جسم جانگیہ اور ہتھکڑی بیڑی میں الہ آباد اسٹیشن پر دیکھا تھا مگر بہرحال جب وہ مولانا سے ملنے کے لئے نینی جیل پہنچے تو مولانا پر سختیوں کا یہ عالم تھا کہ والد کو بھی ان سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور وہ اپنے لڑکے سے ملے بغیر ہی واپس کر دیئے گئے یہ ایسا جانکاہ صدمہ تھا جس نے بڑھاپے میں ان کی کمر توڑ دی اور وہ اپنے نورِ نظر، لختِ جگر سے ملاقات کی آرزو لئے راہی ملک عدم ہو گئے مولانا نے خود اس سانحہ عظیم پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

"موصوف نے بہ کوشش تلاش کر کے میرا پیغام اسی روز (والد ماجد) کو پہنچا دیا دو ہی چار روز کے بعد معلوم ہوا کہ والد مرحوم نے مجھ سے ملنے کے لئے درخواست پیش کی لیکن افسوس کہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے ان کی درخواست کو کسی مصلحت سے منظور نہیں کیا اور وہ ناکام واپس گئے مجھ کو اس واقعہ کا کس قدر افسوس رہا اور خصوصاً اس لئے کہ اپیل کے متعلق کارروائی تھی اس کا بھی کچھ حال نہ معلوم ہو سکا والد مرحوم کو میرے اس طرح گرفتار ہونے کا بے انتہا قلق تھا چنانچہ جیل سے واپس آنے پر اکثر اعزا کی زبانی معلوم ہوا کہ اس واقعہ کے بعد ان کی صحت کبھی ٹھیک نہیں اور آخر کار میری عدم موجودگی میں انہوں نے انتقال فرمایا جیل میں مجھے اس واقعہ کی خبر تک نہ ہوئی۔"

تین اہم واقعات

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ جیل کی ساری مدت

ابتلا اور مظالم میں بسر ہوئی لیکن تین واقعات کا اس موقعہ پر اعادہ ضروری ہے تاکہ اس ابتلا کی نوعیت پر مفصل روشنی پڑسکے پہلا واقعہ تو یہ ہے کہ مولانا کو علی گڑھ سے الہ آباد لے جاتے وقت کھانے پینے کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا حالانکہ اس مقصد کے لئے ضروری قواعد و ضوابط موجود تھے مولانا نے خود اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہم اس کی تفصیل اوپر درج کر چکے ہیں دوسرا واقعہ یہ ہے کہ مولانا کو جیل میں لکھنے پڑھنے کی سخت ممانعت تھی حالانکہ قاعدہ اور قانون میں اس پابندی کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور صرف اس پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مولانا کے ساتھ جو کتابیں اور اخبارات تھے وہ بھی ان کے سامنے جلا دیے گئے تیسرا واقعہ یہ ہے کہ مولانا کو جیل میں عینک لگانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا مولانا نے اس واقعہ کے سلسلہ میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ سنئے۔ راقم کی نگاہ دور بین نہیں ہے اس لئے پڑھنے لکھنے کے اوقات کو چھوڑ کر باقی سارے وقت عینک کی ضرورت رہتی ہے چنانچہ علی گڑھ کے سپرنٹنڈنٹ جیل نے وقت معائنہ عینک لگانے کی اجازت دے دی تھی لیکن الہ آبادی نے اس کو کسی طرح گوارا نہیں کیا اور عینک کو داخل دفتر کر کے راقم کی عزت افزائی میں ایک درجہ اور بڑھا دیا۔

ایں ہم اندر عاشقی غم ہائے بالائے دگر

ان تین واقعات کے یہاں بیان کا مقصد یہ ہے کہ یہ قید فرنگ واقعی قید تھی اور اس کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ مولانا کو ڈرا دھمکا کر راہ راست پر لایا جائے مولانا پر ڈرانے دھمکانے کا اثر تو نہ ہوا البتہ وہ راہ راست میں پہلے کے مقابلہ میں اور زیادہ مستحکم ہو گئے۔

خوراک اور پوشاک

قبل اس کے کہ اس داستان قید فرنگ کو ختم کیا جائے جیل کی خوراک پوشاک اور دوسرے اقدامات کا بھی یہاں تذکرہ ہو جائے تاکہ قید فرنگ کی صحیح صورت حال سامنے آجائے اور آج کے دور کے افراد کو معلوم ہو جائے کہ انہیں جو آزادی میسر آئی ہے اسکی مولانا حسرت موہانی نے بڑی قیمت ادا کی تھی اس ضمن میں یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مظالم کے ساتھ ساتھ

قید فرنگ میں مذہبی فرائض کی ادائیگی میں سو طرح قسم کی پابندیاں عائد کی جاتی تھی اور قید ہر حال اور ہر لحاظ سے آغا خان پیلس اور احمد نگر فورٹ کے قیدیوں کی زندگی سے مختلف تھی۔

جہاں تک خوراک کی فراہمی کا تعلق ہے مولانا سے بڑا گواہ کون ہو سکتا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ کالوں کے لئے صبح کو آدھ پاؤ چنے بطور ناشتہ دیئے جانے کا حکم ہے لیکن عموماً یہ چنے بھی قیدیوں کو چھٹانک ڈیڑھ چھٹانک سے زیادہ نہیں ملتے ناشتہ کے بعد کام پر جانا ہوتا ہے جہاں سے ۱۱ بجے کھانے کھانے کے لئے کچھ دیر کی فرصت ملتی ہے کھانے میں جوار باجرہ، ماش اور گیہوں کے مخلوط آٹے کی کچی روٹیاں (سبحان اللہ کیا امتزاج ہے) ہوتی ہیں جس میں گیہوں کی مقدار سے کچھ ہی کم مٹی یا چونا ملا ہوتا ہے" وجان سے مارنے کے لئے اس سے زیادہ مناسب کیا غذا ہو سکتی ہے۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ "جیل کی سخت مشقت سے مٹی تو کیا کنکر اور پتھر بھی ہضم ہو جاتا ہے مولانا نے سخت مشقت کا جو اشارہ کیا ہے اس کا پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے یعنی ہر قیدی سے ایک من غلہ پسوایا جاتا تھا) ورنہ کسی آزاد شخص کا معدہ اس قسم کی روٹی کو قبول ہی نہیں کر سکتا۔ ان روٹیوں کو کچا رکھنے کی مصلحت یہ ہے کہ اول تو پکانے کے لئے پتھر کا کوئلہ اس قدر کم ملتا تھا کہ نئے دفعیوں کو (جیل کی اصلاح میں باورچیوں کو دفعیہ کہا جاتا ہے) کچی روٹی پکانی پڑتی ہے دوسرے یہ کہ کچی روٹی کے بھاری ہونے کے سبب مقررہ وزن کی روٹیاں کم آٹے میں تیار ہو جاتی ہیں اور بچا ہوا آٹا دوسرے لوگوں کے کام آجاتا تھا کچی روٹیاں ۹ چھٹانک تک ملنے کا حکم ہے لیکن قیدیوں کو یہ روٹیاں عموماً ۸ چھٹانک بلکہ کبھی کبھی سات چھٹانک سے بھی کم وزن کی ملتی تھی۔ لیکن کسی کو چوں و چرا کی ہمت نہیں ہوتی تھی راقم الحروف نے حسرت موہانی ایک بار وارڈر وغیرہ ملازمان جیل کی خفگی سے بے پرواہ ہو کر بطور تجربہ روٹیاں تلوائیں تو ۹ چھٹانک سے کچھ زیادہ ہی نکلیں۔ معلوم نہیں آٹا جو اس طرح بچتا ہے وہ کہاں جاتا ہے اور کس کے مصرف میں آتا ہے کیونکہ گودام سے روزانہ مقررہ وزن کے آٹے کا خرچ دکھایا جاتا ہے۔

* روٹی کے ساتھ کھانے کے لئے دوپہر کو ابلی ہوئی بے دھلی ارہر کی دال بے روغن اور بے مزہ ملتی ہے اور شام کو چولائی کا ساگ جس کی ادنیٰ صفت یہ ہے کہ پھینک دینے کے بعد کوے بھی اسے سونگھتے نہیں (غور فرمایئے، کہ ہم انہی قربانیوں کے بعد آج آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں) ترکاری جو مختلف قسم کی جیل میں بوئی جاتی ہے روزانہ ڈالیوں میں (یہ رشوت کی انگریزی اصلاح ہے) چلی جاتی ہے یا کبھی کچھ ملتی ہے تو وہ پکانے والوں کے صرف میں آتی ہے عام قیدیوں کو کبھی اس کی صورت دیکھنے نہیں ملتی۔

کالے اور گورے کی تمیز

برخلاف اس کے گوروں کو ناشتے میں ڈبل روٹی جائے، شکر اور کھانے کے لئے گھی، گوشت، ترکاری، چاول، دودھ غرضیکہ سب کچھ ملتا ہے» اور بقول مولانا کافی مقدار میں ملتا ہے یہ تو حال خوراک کا تھا اب پوشاک کا حال سنئیے یہاں بھی مولانا ہی راوی ہیں فرماتے ہیں کہ" کالے قیدیوں کو ایک لنگوٹ، ایک جانگیہ، ایک کرتہ، ایک ٹاٹ، ایک کمبل، ایک ٹوپی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا آغا پیلیس اور احمد نگر فورٹ کے قیدی اس کلیہ سے مستثنیٰ تھے) جن میں سے ٹاٹ اور کمبل سالہا سال کے لئے اور جانگیہ اور کرتہ قاعدہ کی رُو سے ہر ماہ کے لئے لیکن ازروئے عمل سال بھر بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ دنوں کے لئے بھی کافی سمجھا جاتا تھا (غور کیجئے کہ یہ لباس علی گڑھ کے ایک گریجویٹ اور ٹونک کے سادات عظام کے ایک معزز رکن کو دیا گیا تھا) اگر اس زمانہ میں یہ چیزیں پھٹ یا خراب ہو جائیں تو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ قیدی بغرض احتیاط صرف صبح و شام انہیں استعمال کرتے ہیں باقی سارا دن لنگوٹ باندھ کر بسر کرتے ہیں اگر کسی کے ان کپڑوں سے زیادہ کوئی چیز پائی جائے تو اسے سخت سزا دی جاتی ہے برخلاف اس کے گوروں کے لئے جوتوں کے کئی جوڑے مع موزوں کے ملتے ہیں پہننے کے لئے متعدد سوٹ جن کے دھونے کے لئے علیحدہ ہندوستانی قیدی دھوبی کا کام کرتے ہیں لیٹنے کے لئے مسہری اس

پر گدا اور چادر۔ غرضیکہ آرام کی تمام چیزیں مہیا کی جاتی ہیں؟ مولانا نے اس تفصیل کو یوں بیان کیا ہے کہ قیدیوں میں بھی کالے اور گورے کی تمیز تھی۔ اور اور اگرچہ کہ سزا کی میعاد مقرر تھی مگر نسل و رنگ کا فرق سزا کی یکسانیت میں خارج تھا) یہ فرق صرف لباس، پوشاک اور خوراک ہی میں نہیں بلکہ جائے قیام اور دوسری ضروریات زندگی کے بارے میں بھی تھا۔ اس مزید فرق کو بھی مولانا ہی کی زبانی سنیئے " کالوں کے لئے بارکیں ہیں۔ جن میں برابر سمنٹ کے دھوئے یا اولے دجیل کی زبان میں چبوتروں کا متبادل، بنے ہوئے ہیں جاڑا گرمی برسات غرضیکہ ہر موسم میں انہی پر سونا ہے سخت گرمی کے زمانہ میں کاغذ وغیرہ کا پنکھا بھی رکھنا ممنوع ہے رات کو پائے خانہ کا کوئی معقول بندوبست نہیں جس سے بعض اوقات سخت تکلیف ہوتی ہے۔ صبح کو جب بارک کا دروازہ کھلتا ہے۔ تو سب قیدی ایک ساتھ پائے خانہ جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیدھے اور شریف قیدیوں کو آخر تک منتظر رہنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی جب گھنٹی سے کام لیا جاتا ہے تو اور بھی دقت کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ گھنٹی دو تین منٹ سے زیادہ پائے خانے میں رہنے کی اجازت نہیں دیتی جس کے بعد بلا توقف باہر نکل آنا چاہئے خواہ کل قیدی فارغ ہوئے ہوں یا نہ ہوں پائے خانہ کے بعد منہ ہاتھ دھونے کا کوئی وقت نہیں ملتا بلکہ اکثر وہاں سے سیدھے کام پر بھاگنا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے گوروں کے لئے فی کس ایک کمرہ علیحدہ ہوتا ہے جس میں ایک آہنی پلنگ گدے دار ایک میز ایک اسٹول ایک لیمپ اور ہر کمرے کے ساتھ ایک غسل خانہ اور پائے خانہ موجود ہوتا ہے غسل خانہ میں تولیہ۔ صابن ہر شے موجود رہتی ہے رات کو لیمپ کی روشنی میں اور دن کی فرصت کے اوقات میں گورے قیدی کتابیں اور کبھی کبھی اخبار بلا تکلف دیکھتے ہیں۔ ان کو لکھنے کو دوات۔ قلم ہر وقت موجود رہتا ہے حالانکہ کالوں کے لئے کتاب دیکھنا تو درکنار اگر ان کے پاس کاغذ کے ایک پرزے کا بھی شبہ ہو جائے تو قیامت آجائے چنانچہ خود راقم الحروف کی ایک بار اسی شبہہ میں ڈپٹی وارڈر کے حکم سے جامہ تلاشی لی گئی اگرچہ کچھ برآمد نہیں ہوا۔ سب سے بڑا تماشہ

یہ ہے کہ ہر یورپین قیدی کے کمرے پر دو ہندوستانی قیدی رات بھر پنکھا قلی کا کام دیتے ہیں۔ ۱۲ بجے تک ایک اور پھر صبح تک دوسرا۔ دو گوروں کے لئے ہر ہفتہ ایک یا دو بار پادری صاحب آ کے وعظ کرتے ہیں اور ایک جگہ عبادت کی اجازت ہوتی ہے لیکن کالوں کی مذہبی ضروریات کی جانب کبھی بھول کر بھی توجہ نہیں ہوتی عام قیدیوں کی پوشاک میں جانگیہ کی لمبائی اس قدر کم ہوتی ہے کہ جسم اسفل تک کھلا رہتا ہے اور اس طرح پر نماز کے لئے کافی ستر پوشی نہیں ہو سکتی۔ یہ کمی ایسی ہے کہ صرف دو بالشت کپڑا زیادہ استعمال کرنے سے رفع ہو سکتی ہے لیکن کوئی اس جانب توجہ نہیں کرتا راقم الحروف مجبورًا اسی حالت نیم برہنگی میں نماز پڑھتا تھا۔ کالوں کے لئے مذہبی وعظ و تلقین تو درکنار اخلاقی جرموں کے ارتکاب پر سزا کے عوض الٹا انعام ملتا ہے اور بعض حالتوں میں تو حکام جیل ایک طرح پر انہیں ایک دوسرے کی غیبت، جاسوسی، سب و شتم، مار دھاڑ اور ظلم و سختی کی ترغیب دیتے ہیں کیونکہ غیبت یا جاسوسی کرنے والے قیدی ہر طرح کی رعایت کے حق دار قرار دیئے جاتے ہیں اور قیدی نمبرداروں میں تو خاص کر ایسے ہی لوگ ان کے منظور نظر ہوتے ہیں جو اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ چالاک۔ پاجی۔ ظالم اور بدزبان مشہور ہوں مسلمانوں کے تہوار عید۔ بقرعید۔ شب برات۔ محرم میں شاذ و نادر ہی کسی تہوار پر تعطیل ہوتی ہے حالانکہ گوروں کے لئے بڑے دن کے ایام میں جیلر وغیرہ کی طرف سے دعوت کا سامان کیا جاتا ہے اور ان کو ہر قسم کے میوے اور کھانے دیے جاتے ہیں اس کے علاوہ عام برتاؤ میں بھی گوروں کو کالوں پر ہر طرح سے فوقیت حاصل ہے۔ کام انہیں ہلکا ملتا ہے اپنے عزیزوں۔ دوستوں سے ملنے اور خط و کتابت کرنے میں انہیں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ ہر سپرنٹنڈنٹ جیل کار گذار قیدیوں کو رہائی کے جو دن اپنی طرف سے دیتا ہے اس رعایت سے یہی سب سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں ملازمان جیل انہیں کسی طرح دق نہیں کر سکتے بلکہ اکثر موقعوں پر دیدہ و دانستہ ان کی بے ضابطگیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں غرضیکہ ہر صورت میں ان کی قید کا زمانہ اس طرح سے گذرتا ہے کہ بعض آوارہ مزاج

مزاج قیدیوں کو ہم نے یہ کہتے سُنا ہے کہ ہم گھر سے زیادہ تو جیل میں آرام ہے۔"

جیل کے انتظامات

اس سلسلہ میں الٰہ آباد سینٹرل جیل کا بھی کچھ بیان ہو جائے مولانا فرماتے ہیں کہ" الٰہ آباد سینٹرل جیل کے چار حصّے ایک ہی چار دیواری کے اندر ہیں لیکن علیحدہ علیحدہ بنے ہوئے ہیں اوّل نئی تکلیف جس میں زیادہ تر کمسن، نوجوان یا وہ قیدی رکھے جاتے ہیں جو گورنمنٹ برانچ پریس میں کام کرتے ہیں دوئم پرانی تکلیف جس میں عارضی طور پر آئے ہوئے قیدی یا جنگ جُو و شورا پشت لوگوں کے سوا کوٹھڑیوں میں قید تنہائی بسر کرنے کے لئے تمام جیل سے ہر ہفتہ کچھ قیدی آتے جاتے رہتے ہیں۔ پرانی اور نئی تکلیف کی وضع یہ ہے کہ ہر ایک بارک میں دو رویہ کوٹھڑیاں ہیں اور ان کے درمیان تھوڑی سی جگہ سینٹر کے نام سے خالی ہے پھر ہر دو بارکوں کے درمیان ایک کھلا ہوا دہ کمرہ ہے جسے جیل کی زبان میں اڑگوا کہتے ہیں اس میں قیدیوں کے نہانے دھونے پاخانے وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔ سوئم نیا احاطہ جس میں زیادہ تر دو تین مرتبہ کے سزا یافتہ قیدی رکھے جاتے ہیں چہارم پرانا احاطہ اس میں زیادہ تر یک بارہ قیدی رہتے ہیں ان دونوں احاطوں کی بارکوں میں کوٹھڑیاں نہیں ہیں بلکہ ہر بارک میں دو رویہ برابر برابر ۴۰ یا ۵۰ مٹی کے چبوترے قیدیوں کے لیٹنے کے لئے بنے ہوئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رات کو جو چالیس پچاس قیدی ایک ہی بارک میں بند ہوتے ہیں اور آپس میں مل کر فرصت کے اوقات میں بات چیت کر سکتے ہیں۔ نئی تکلیف جیلر کے تحت رہتی ہے اور پرانے نئے احاطوں کے علیحدہ علیحدہ یورپین نائب جیلر اور وارڈرز اور پرانی تکلیف کے لئے عموماً ایک ہندوستانی وارڈر ہوتا ہے جیل میں ان مختلف حصوں کی اچھائی برائی کا اندازہ وہاں کے حکام کی اچھائی برائی سے کیا جاتا ہے"

مولانا پر خصوصی مہربانی

"میرے زمانہ میں پرانے احاطہ کے نام سے قیدی خوف کھاتے تھے اس لئے

اس کا انچارج نائب جیلر تھا۔ جس کا ہر قیدی شاکی تھا لیکن ہمیں معلوم نہ تھا۔ کہ چند ہی دن میں ہم کو اسی احاطہ میں جانا اور پھر وہیں زمانۂ قید بسر کرنا پڑے گا" مولانا آگے چل کر بیان فرماتے ہیں کہ "الٰہ آباد سینٹرل جیل جانے کے بعد داروغہ صاحب پہلے روز ہی نائب جیلر کا حکم لایا کہ اسے پرانے احاطہ بھیج دو۔ قریب شام جب ہم سب نئے احاطہ سے کام کر کے پراتی "تکلیف" میں حسب معمول اپنی اپنی بارک میں بند ہونے کو آئے۔ تو داروغہ صاحب اور سوامی جی (تلک کے ایک معتقد) کو خاموش اور رنجیدہ پایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اسی وقت مجھ کو پرانے احاطہ جانا ہوگا داروغہ صاحب نے سوامی جی کی فرمائش سے راقم الحروف کی آخری دعوت کے لئے کچھ پوریاں اور حلوہ تیار کر رکھا تھا سوامی صاحب نے علیحدہ لے جا کر خود کھلایا کھانے کے بعد ہم دونوں بغل گیر ہو کر نہایت افسوس اور افسردگی کے ساتھ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے ابتدائی مقدمہ اور کورٹ معلیٰ تک بہت سے افسوس ناک منظر پیش ہوئے لیکن مجھ کو خوب یاد ہے کہ کسی موقعہ پر میرے آنسو نہیں نکلے تھے لیکن اس وقت سوامی جی کو مضطر اور آبدیدہ دیکھ کر مجھے بھی ضبط نہ ہو سکا اور دیر تک باوجود ضبط آنکھیں پُرنم رہیں۔" اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ "پراتی "تکلیف" سے رخصت ہو کر پرانے احاطہ میں اس وقت پانچ نمبر کو بند کرا رہے تھے دفعدار نے مجھ کو لے جا کر پیش کیا لیکن کچھ مشورے کرنے کے بعد یہ حکم ہوا کہ اس کو پانچ نمبر میں نہیں بلکہ سات نمبر کے پچھلے حصہ میں بند کرو۔ بارک نمبر سات کے تمام قیدیوں اور برقندازوں کو راقم کے متعلق پہلے ہی سے خفیہ احکام پہنچ چکے تھے کہ نئے قیدی سے نہ کوئی ملے نہ بات کرے۔ ذاکر برقنداز نے جو اپنی سختی اور بد زبانی کے لئے تمام جیل میں بدنام تھا مزید احتیاط کی غرض سے راقم کا بستر عین اپنی نشست کے سامنے لگوایا تاکہ ہر وقت کافی نگرانی آسانی کے ساتھ ہو سکے لیکن بمصداق ایک عربی مقولے کے اسی روک ٹوک سے قیدیوں کے دل میں مجھے ملنے اور بات چیت کر کے دریافت حال کرنے کا اور بھی شوق پیدا ہوا۔ اور جس برقنداز کو حکم ہوا تھا کہ اس شخص کی گری نکال دو وہ بھی قیدیوں کو مجھ سے ملنے سے روکنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

قید سے رہائی کے وقت کی کیفیت

قید سے جب رہائی کا وقت قریب آتا ہے تو دل کی عجیب کیفیت ہوتی ہے اس کا اظہار کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں۔ کہ زمانۂ قید کے ابتدائی ایام کی سختی ضرب المثل ہے کہ قیدیوں کے ان چند دنوں کی بے چینی سالہا سال کے کرب و اضطراب سے بڑھ جایا کرتی ہے ابتداء میں جیل کی نئی تکلیفوں سے سابقہ پڑتا ہے اس لئے گرفتاران مصیبت کو کچھ روز کے لئے زندان میں عذاب دوزخ کا نمونہ نظر آیا کرتا تھا مگر رفتہ رفتہ مصداق بر سر اولاد آدم ہر چہ اید بگذرد طبیعت ان ذلتوں کی خوگر ہو جاتی ہے اور مایوس قیدیوں کے دل میں ایک ایسا سکون پیدا کر دیتی ہے جس کی مدد سے وہ راضی بہ رضائے الٰہی ہو جاتے ہیں ورنہ اگر ابتدائی بے قراری کا عالم بدستور قائم رہے تو ان عزیزوں کی زندگی دشوار ہو جائے دو سال پانچ سال۔ سات سال بلکہ ۱۴ سال تک کی دراز میعادیں لوگ بہ آسانی کاٹ دیتے ہیں لیکن آخر میں جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ہماری قید کا صرف ایک مہینہ باقی ہے۔ صرف پندرہ دن باقی ہیں۔ صرف تین دن باقی ہیں صرف ایک دن باقی ہے اس وقت کسی کا صبر و سکون باقی نہیں رہتا قواعد جیل کی رو سے قیدیوں کے ٹکٹوں پر رہائی کی تاریخ کچھ روز پہلے متعین کر کے درج کر دی جاتی ہے جس کے لئے قیدی خاص کر سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پیش ہوتا ہے اس موقع پر سپرنٹنڈنٹ صاحب ازراہ کرم کبھی کبھی قیدیوں کو دو چار دن کی رہائی اپنی طرف سے مرحمت فرمایا کرتے ہیں راقم الحروف کو چونکہ شروع ہی سے کسی قسم کی رعایت نہیں ملی تھی اور جب کنگ ایڈورڈ آنجہانی کا اعلان بابت معافی جاری ہونے کے باوجود سپرنٹنڈنٹ صاحب کا یہ ارشاد کہ تم کو چھٹی نہیں ملے گی اور ۱۸ دن کی رہائی میرے بحث سے خارج کر دی گئی تو مزید رہائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا چنانچہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے خلاف معمول طلب کئے بغیر حساب کر کے ۳ر جولائی ۱۹۰۸ء کی تاریخ مقرر کر دی تو اس سے اس خیال کی پوری پوری تصدیق ہو گئی ۔،

صاحبُ نوشہ کی کرامت

راقم الحروف کو بزرگان دین کی عقیدت کا فطری انس ہے اس کی بدولت زندان فرنگ میں جیسی کچھ قلبی قوت اور روحانی آزادی اور اطمینان میسر رہا۔ اور ضمناً جو باطنی فیوض حاصل ہوئے الفاظ کے ذریعہ سے ان کی حقیقت صحیح طور پر نہیں بیان ہو سکتی اور نہ ان کے ذکر کا یہاں محل ہے اس لئے ان سے قطع نظر ہی مناسب ہے البتہ آخر زمانۂ قید کا ایک واقعہ ایسا ہے جس کے اظہار میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا ہے ردولی شریف کا عرس ماہ جمادی الثانی کی درمیانی تاریخوں میں ہوتا ہے ۱۹۰۹ء کی تاریخیں ماہ جولائی کی ابتدائی تاریخوں کے مطابق واقع ہوئی تھیں۔ اتفاق سے میں نے ایک روز سوتے وقت حساب کیا تو معلوم ہوا۔ کہ میری رہائی کا دن ٹھیک اسی تاریخ کو مقرر ہوا ہے جو عرس شریف کا آخری روز ہوگا، مجھ کو چونکہ حاضری میں حضرت شیخ العالم سے سعادت اندازو اور فیض پذیر ہونے کا اکثر اتفاق ہو چکا تھا اس لئے بے اختیار دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اگر رہائی کی تاریخ دو یا ایک روز قبل بھی مقرر ہوئی تو شرکت عرس کا موقعہ مل سکتا تھا لیکن تاریخ رہائی کے ٹکٹ پر درج ہو جانے کے بعد دوبارہ تبدیل ہونے کا اس وقت میرے دل میں وہم وگمان بھی نہ تھا۔ پھر بھی صبح اٹھتے پر سب سے پہلی جو بات مجھ کو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے غیر معمولی طور پر دفتر کی بجائے نئی تکلیف میں طلب کیا ہے نئی تکلیف میں پہنچ کر منشی صاحب سے مجھے معلوم ہوا کہ صاحب بہادر میرے استقلال اور نیک چلنی سے بہت خوش ہیں اور اس لئے اپنے اختیار سے غالباً وقت مقررہ سے کچھ قبل ہی رہا کر دیں گے اس مژدۂ جانفزا کے سننے سے مجھ کو بھی بہت مسرت ہوئی اور یقین ہو گیا کہ شب گذشتہ کی آرزو اب ضرور پوری ہوگی سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے دیکھتے ہی حکم دیا۔ کہ ہم ان کو پندرہ دن کی رہائی اپنی جانب سے دیتے ہیں چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور میں مقررہ تاریخ سے پندرہ دن پہلے رہا ہو کر شام تک الہ آباد میں ٹھہر کر مکان روانہ ہوا اور دس دن قیام کرنے کے بعد یہ اطمینان تمام ردولی روانہ ہوا

ممکن ہے کہ اس واقعہ کو لوگ حسن اتفاق پر محمول کریں لیکن راقم کے نزدیک یہ سب کچھ حضرت شیخ احمد عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کے باطنی تصرف کا نتیجہ تھا۔ جیل سے نکلتے وقت مولانا کے اپنے تاثرات ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں کہ "داخلہ جیل کو دُنیا سے قطع تعلق کے برابر تو نہیں تو اس سے کچھ ہی کم سمجھنا چاہیئے ارباب ہوش کو اس سے موت کا سبق حاصل ہوتا ہے جس طرح کہ اجل انسان کو تمام دنیاوی جھگڑوں سے چھڑا کر آناً فاناً ایک ایسے عالم میں پہنچا دیتی ہے جس کا کسی کو علم نہیں اسی طرح مقدمہ سڈیشن میں گرفتار ہونے والا اپنے تمام مشاغل اور کاروبار سے دفعتاً علیحدہ ہو کر ایک دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں کی آب و ہوا، طریق بود و باش، طرز رفتار گفتار غرضیکہ ہر چیز نرالی نظر آتی ہے فرق صرف اس قدر سمجھ لیجئے کہ موت کے بعد اعزا و اقربا سے دائمی جدائی ہو جاتی ہے لیکن یہاں آئندہ کے لئے اُمید باقی رہنے کے علاوہ اختتام مقدمہ تک کبھی کبھی ان سے دور کی ملاقات ہو جایا کرتی ہے"۔ یہ اقتباسات مولانا کی تصنیف مشاہدات زنداں سے لئے گئے ہیں جس کا لالہ لاجپت رائے نے اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اب قید فرنگ کے نام سے ایک اور کتاب بھی شائع ہو گئی جس میں مولانا کی مذکورہ تصنیف کے حوالے ہیں۔

صاحب حالات حسرت تحریر فرماتے ہیں کہ "مولانا حسرت نے اس امتحان خداوندی میں ثابت قدم رہ کر یہ ثابت کر دیا کہ اہل ایمان دنیا کی کسی طاقت سے کبھی کسی حال میں مرعوب نہیں ہو سکتے اور ان کا سر نیاز سوائے خداوند قدوس کے آستانہ عزّ و جلال کے کسی دوسرے دروازے پر کبھی بھی جھک نہیں سکتا ان کو مصائب و آلام کے طوفان اپنی جگہ سے ایک انچ ادھر ادھر نہیں کر سکتے ان کے ناتواں جسم اور کمزور ہستیاں جہازوں سے زیادہ وزنی ہوتی ہیں جن کو ذلالت و گمراہی کی تبار موجیں جنبش تک نہیں دے سکتیں چنانچہ مولانا حسرت نے یہ تمام مصائب و آلام برداشت کر کے اور پھر اپنے معتقدات پر اسی سختی سے قائم رہ کر ثابت کر دیا کہ حق کی طاقت کبھی مغلوب نہیں ہو سکتی بلکہ جس طرح گیند کو پٹک کر اور سیلاب کو روک کر اس کی قوت میں اور اضافہ کر دیا

جاتا ہے۔ اور صداقت کی لازوال طاقت کسی کے فنا ہونے سے فنا اور کسی کے نیست و نابود اور برباد کرنے سے برباد نہیں ہو سکتی اسی طرح حق کو دبانے سے اس کی طاقت اور بھی زیادہ زور قوت حاصل کر لیتی ہے مولانا حسرت کا حال اس حقیقت کے بالکل مطابق ثابت ہوا وہ قید فرنگ سے آزاد ہونے کے بعد اور زیادہ جری و بیباک اور اپنے عزائم و افکار میں اور زیادہ راسخ اور ثابت قدم ہو گئے۔"

کمزور احباب کا مشورہ

"چنانچہ قید فرنگ سے آزادی حاصل ہونے کے بعد حسرت کے بعض کمزور احباب نے لکھا کہ اب آپ اپنی روش بدل لیجئے تاکہ آئندہ مصائب سے محفوظ رہیں مگر حسرت نے جن الفاظ میں ان احباب کے مشوروں کا جواب دیا۔ اس کو پڑھ کر روح میں بالیدگی اور قوت پیدا ہوتی ہے آپ لکھتے ہیں"اردوئے معلیٰ کی دوبارہ اشاعت پر چند احباب نے بمقتضائے محبت و ہمدردی یہ صلاح دی ہے کہ ہم کو اب پالٹیکس سے بالکل دست کش ہو جانا چاہیئے۔ بعض کا مشورہ یہ ہے کہ اگر سیاسی مضامین ہوں بھی۔ تو مسلم لیگ کے موافق ہوں۔ چند دوستوں نے جو یقیناً زیادہ آزاد خیال ہیں یہاں تک اجازت دی کہ اگر جمہور اہل ہند کی ہم خیالی منظور ہے تو کانگریس کے نرم فریق کی روش اختیار کی جائے۔"

"ہم پر ان تمام نیک نیت مشوروں اور مصلحت کوش صلاحوں کا شکریہ فرض ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے خیال میں یقین یا عقیدۂ عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی ایک ایسی چیز ہے جس کو کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کر دینا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے جس کے ارتکاب کا کسی حریت پسند آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں ارادہ بھی نہیں پیدا ہو سکتا۔ پالٹیکس میں ہم مقتدائے وطن پرستان مسٹر تلک اور سرگروہ احرار بابو اروبندو گھوش کی پیروی کو اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں" انہی مسٹر تلک کی شان میں انہوں نے یہ اظہارِ عقیدت کیا ہے۔

اے ملک اے افتخار حب وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن
تجھ سے قائم ہے بنا آزادی بے باک کی
تجھ سے روشن اہل اخلاص و صفا کی انجمن

تجھ سے لوگوں نے لیا خود اعتمادی کا سبق
ہو گئے مستغنیٔ اعدا محبان وطن
دل میں ہے اک آگ حریت پرستی کی لگی
حب جاہ و مال باقی ہے نہ فکر جان و تن
ورنہ جو رانگیزی و مظلومی اظہار سے
ہو گئی تھی چاپلوسی ہندوالوں کا چلن
قدر آزادی سے واقف ہو گئے پیر و جواں
ہٹ گئی لوگوں کے دل سے ہیبت دار و رسن

سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزند ہند
خدمت ہندوستان میں کلفت قید و محن
ذات تیری رہنمائے راہ آزادی ہوئی
تھے گرفتار غلامی ورنہ یاران وطن
تو نے خود داری کا پھونکا اے ملک ایسا فسوں
یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسم کہن
ناز تیری پیروی پر حسرت آزاد کو
اے تجھے قائم رکھے تا دیر رب ذوالمنن

مولانا آگے چل کر فرماتے ہیں کہ چنانچہ اس حیثیت سے فیروز شاہی کانگریس سے ہم کو اتنی ہی بے زاری ہے جتنی امیری مسلم لیگ یا لال چندری کانفرنس سے اور ہمارے خیال میں یہ بے زاری بالکل حق بجانب ہے چنانچہ خوابیدہ براعظم ایشیا میں بھی ہندوستان کے سوا اور کوئی بڑا ملک اس وقت آزادی کی نعمت سے محروم نہیں ہے پس عقل سلیم کسی طرح باور نہیں کر سکتی کہ

تمام عالم میں صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک باقی رہے جس کی قسمت میں محکومی دوام کی ذلت لکھ دی گئی ہو ایسا گمان بظاہر مشیت ایزدی کے سراسر خلاف نظر آتا ہے۔" غرضیکہ ارباب دانش و بینش کو یہ بات ماننی پڑے گی کہ فرنگی حکومت کا غیر طبعی نظام ہمیشہ کے لئے ہندوستان میں باقی نہیں رہ سکتا اور اپنی موجودہ صورت میں تو اس کا چند سال قائم رہنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔ گرم فرقے کے رہنما اور بابو اروبندو گھوش خصوصاً تمام پولٹیکل کوششوں میں مذکورہ بالا اصول کو پیش نظر رکھتے ہیں اس واسطے ہمارے نزدیک وہ حق پر ہیں۔ بر خلاف اس کے رہنمایان فرقۂ نرم، پیروان مسلم لیگ اور بانیان ہندو کا نفرنس اہل ہند اور دوامی محکومی کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں کیونکہ ان حضرات کے نزدیک ہمارے انتہائی عروج کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہم غلام سے ترقی یافتہ غلام یا محکوم سے خوش حال محکوم بن جائیں یہ لوگ آزادئ ہند کی خواہش کو خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں دیتے ان کا دائرہ خیال اور اس لئے دائرۂ عمل بھی نہایت تنگ اور محدود ہے ان کی روش دنیا کی رفتار حریت کے خلاف اور اس لئے غیر طبعی اور نا قابل قبول ہے اردوئے معلیٰ کو ان لوگوں کی پالیسی سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ بقول مرحوم مصطفےٰ کامل پاشا مفتوح قوموں اور ملکوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی پالیسی نہیں ہو سکتی کہ وہ تمام محنت کے ساتھ حریت کامل کے دوبارہ حاصل کرنے کی سعی میں مصروف ہو جائیں پس جس شخص کی پالیسی اس سے کچھ مختلف ہو اس کی نسبت سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ بہی خواہان وطن کے گروہ سے یقیناً خارج ہے۔" یہ ہے وہ پالیسی جس کا اظہار شدائد قید برداشت کرنے اور اس سے آزادی حاصل کرنے کے بعد مولانا حسرت موہانی نے کیا اس بیان سے مولانا کی بلند خیالی، حوصلہ مندی اور بیباک جرأت و علوی ہمت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے اپنی خیالات و معتقدات کے مطابق جیل جانے سے قبل بھی ان کا عمل یہ تھا اور وہاں سے آنے کے بعد بھی ہمیشہ اسی پر عمل رہا اور اب تک وہ اسی پالیسی پر کار فرما ہیں۔" اکبر الہ آبادی نے ایسے لوگوں کے لئے یہ شعر کہا ہے۔

پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں پر نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

عزم و استقلال

حالاتِ حسرت میں درج ہے کہ "اس سے ان کے عزم و استقلال ثبات اور استقامت فی الرائے پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ مولانا حسرت کس کیرکٹر کے بزرگ ہیں اور انہوں نے قومی فلاح و بہبود کی خاطر اپنے تئیں کس قدر خطرات میں اپنے آپ کو ڈالا اور کس حد تک انہوں نے مصائب و شدائد کے علاوہ نقصانات برداشت کئے، یہ بالکل واقعہ ہے کہ اگر مولانا چاہتے تو دنیاوی ثروت و جاہ اور دولت و عزت کے حصول میں اپنے کسی معاصر سے پیچھے نہ رہ سکتے تھے خدا نے ان کو ہر طرح کی قابلیت دی ہوئی تھی۔ دل و دماغ اور زبان و قلم سب کچھ ہی ان کے پاس موجود تھا اس پر مستزاد یہ کہ ضروریات اس کی مقتضی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کو معلوم تھا کہ آج کل ہر دولت مند کس قدر آسانی سے قوم کا لیڈر بن جاتا ہے یہ سب امور ایسے تھے کہ ایک بندہ ہوا و حرص کے لئے ان کا اختیار کرنا امر ناگزیر تھا لیکن اس قدر محرکات قویہ کے باوجود انہوں نے ان میں سے کسی ایک بات کی طرف بھی کبھی توجہ نہ دی۔ نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ قومی خدمت گذاری کا ولولہ یہی ایک دولت تھی جو خدا نے انہیں عطا فرمائی تھی اس پر وہ قائم تھے اور اس کے مقابلہ میں کائنات کی ہر قیمتی سے قیمتی چیز کی طرف انہوں نے اپنی چشم قناعت پسند کو بند کر لیا تھا ہوس جاہ اور طلب نام و نمود کے مکروہ جذبات سے حسرت کا قلب پاک کبھی آشنا نہیں ہوا۔ ان کا باطن خود ان کے اور دوسروں کے ظاہر سے زیادہ پاک و صاف رہا۔ صدق و صفا زہد و ورع کے اوصاف ان میں قدما کی طرح جلوہ گر ہیں نئی پود میں شاید ہی ایسی مثالیں مل سکیں جن میں مزاج کی سادگی کے ساتھ حوصلہ کی بلندی۔ یقین کی دشواری، حق پسندی و حق شعاری خلوص و تقویٰ اور ایثار و خدویت کے اعلیٰ اوصاف، نہ کریمانہ اخلاق حسرت سے زیادہ یا حسرت کے برابر پائے جاتے ہیں ان کے ایثار کامل کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ باوجود ہر قسم

ئی قابلیتوں کے اور بے شمار گردوپیش کی خارجی اور اندرونی ترغیبوں کے انھوں نے وجاہت طلبی کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور قومی خدمت گذاری کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیکر اپنی معاشرتی دنیا کو متوکلانہ طریق پر نہایت محدود و مختصر کرلیا اور چونکہ انھوں نے اپنی ضروریات کو بہت محدود کرلیا اس لئے مدنیت کے غیر ضروری لوازم کے لئے وہ کسی دوسرے کے محتاج نہیں ہوتے اور اس استغنا اور بے نیازی کا اثر ان کے قوت ضمیر و جرأت صداقت اور بے باکانہ اظہار رائے پر پڑتا ہے یعنی کوئی خارجی طاقت ان کو متأثر و مرعوب کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی"

ایثار

"حسرت کے ایثار کا صحیح اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی آمدنی ابتدأ سے اس وقت تک شاید دس روپیہ سے زائد نہیں ہوئی۔ سودیشی اسٹور قائم کرنے سے پہلے تو اردوئے معلیٰ کی محدود آمدنی پر مولانا قانع تھے اور اردوئے معلیٰ کی اشاعت پانچسو سے کبھی زائد نہیں ہوئی جن لوگوں کو اخباری تجربہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس قدر محدود اشاعت میں کس قدر آمدنی ہو سکتی ہے۔ بس یہی ایک آمدنی تھی جس پر حسرت اپنے اہل و عیال کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے جیل جانے کے بعد اردوئے معلیٰ بند ہو گیا اور تھوڑی سی یہ آمدنی بھی جاتی رہی اس وقت خدا ہی کو معلوم ہے کہ بیگم صاحبہ اور ان کی شیر خوار بچی نے کیونکر دن گذارے اس کے علاوہ نہایت قیمتی کتب خانہ تلف کر دیا گیا اور ۵۰۰ سو روپیہ جرمانہ کی رقم دوسری قلیل آبائی جائداد سے ادا کرنی پڑی

جیل سے رہائی کے بعد کے حالات

جیل سے رہا ہونے کے بعد ان کے پاس معاش کا کوئی سامان نہ تھا یہ وہ زمانہ تھا جب حسرت کے سایہ سے لوگ بھاگتے تھے ان کے ساتھ ہمدردی کرنا اور ان کو کسی قسم کی امداد بہم پہنچانا تو ایک بڑی بات تھی اکثر لوگ ان

کو پالٹیکس سے باز رہنے کی فہمائش کرتے تھے۔ اکثر کمزور طبائع نے ان سے ملنا ترک کر دیا تھا۔ غرضیکہ ملک و قوم کی طرف سے ان کے اس ایثار و فدویت کی کوئی قدر دانی نہیں کی گئی بلکہ ان کی روش کی ہمیشہ تضحیک کی گئی اور ان کو ہندوؤں کا غلام اور مسلمانوں کا نادان دوست کہا گیا۔ لیکن باوجود ان باتوں کے اس مردِ حق نے کبھی اپنے عزائم و آراد سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ اور حق پرستی کی جو روش ابتداء سے انھوں نے اپنے لئے منتخب کر لی تھی اس پر نہایت سختی سے ہمیشہ قائم رہے اس پالیسی کی وجہ سے حسرت مخفی اور اعلانیہ صعوبات میں مبتلا ہوتے رہے۔ لوگوں نے ان کی فقیرانہ زندگی کو بھی روا داری سے نہیں دیکھا اور اس عالم فقر میں بھی طرح طرح کی مشکلات ان کے راستہ میں حائل کرتے رہے چنانچہ قید فرنگ سے آزادی ملنے کے بعد علی گڑھ کالج کے طلبہ کو ان سے ملنے کے لئے روک دیا گیا یہاں تک بھی کوئی مضائقہ نہ تھا مگر بغض و عناد کی دوسری منزل جو غیر اخلاقی کی نہایت ذلیل مثال ہے یعنی جب مولانا حسرت نے سودیشی اسٹور قائم کیا تو اور زیادہ یہ ظلم کیا گیا۔ کہ ہرگز کوئی طالب علم نہ حسرت سے ملے اور نہ ان کے اسٹور سے کوئی چیز خریدے یہاں تک کہ دوسرے ذریعہ سے بھی ان کے یہاں سے کوئی چیز نہ منگوائی جائے اگر ارکان کالج حسرت کی زہریلی صحبت سے کالج کے طلبہ کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور انگریزوں سے عہدِ وفا کو اس صورت میں قائم رکھنا چاہتے تھے تو یہ چنداں ہرج کی بات نہ تھی اس لئے کہ ہر شخص کو اپنی پالیسی پر نیک نیتی کے ساتھ عمل کرنے کا حق ہے لیکن اپنے مخالف عقائد ہستی کو نقصان پہنچانا کسی قوم کا قانون اخلاق جائز نہیں رکھتا۔ ظاہر ہے کہ علی گڑھ میں اہل تجارت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ کالج ہے۔ خصوصاً کپڑے۔ موزے۔ بنیان۔ تولئے اور اس قسم کی دوسری چیزیں جن کی نکاسی جس قدر کالج میں ہوتی ہے شاید تمام علی گڑھ شہر میں نہ ہوتی ہوگی اور حسرت کے خلاف ارکان کالج کا ایسا طرز عمل اختیار کرنا کہ طلبا اور ملازمین دیگر ذرائع سے بھی حسرت کی دوکان سے خرید و فروخت نہ کر اسکیں صریح ظلم و زیادتی ہے مگر حسرت نے پبلک طور پر کبھی ان باتوں کا اظہار نہیں کیا

اور ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ ان مشکلات کو برداشت کرتے رہے ارباب استبداد کے اس طرز عمل سے حسرت کو جس قدر نقصان پہنچا ہوگا وُہ ظاہر ہے۔"

علی گڑھ چھوڑنے کا مشورہ

"حسرت کے بعض احباب نے اس حالت کو دیکھ کر مشورۃً ان سے عرض کیا۔ کہ آپ علی گڑھ چھوڑ دیں تو اچھا ہے کیونکہ علی گڑھ کے قیام میں بغیر نقصان کے کوئی فائدہ نہیں مگر حسرت نے اس کو منظور نہیں کیا اور اس کو کمزوری پر محمول کر کے اس سے انکار کر دیا اور برابر نقصان برداشت کرتے رہے بہر حال جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے جیل سے نکلنے کے بعد حسرت نے پھر دوبارہ اردوئے معلیٰ جاری کر دیا مگر چونکہ اب کوئی سرمایہ ان کے پاس باقی نہ رہا تھا اور حکومت کے لطف و مہربانی نے ان کی مالی حالت اس قابل نہ رہنے دی تھی کہ وہ اردوئے معلیٰ کو بہ سابقہ اسی شان سے نکال سکتے اس لئے مجبورًا ان کو اردوئے معلیٰ کا سائز حجم اور اسی کے ساتھ اس کی قیمت کم کرنی پڑی یعنی صرف ایک روپیہ قیمت رکھی۔ ابتداء میں تو ساڑھے سات سو خریدار ہو گئے۔ مگر بعد میں اکثر لوگوں نے کمزور طبیعت کے باعث خریداری ترک کر دی چنانچہ تھوڑے دنوں کے بعد پھر وہی پانچ سو اشاعت رہ گئی گویا سال بھر میں صرف ۵ سو روپیہ حسرت کے پاس آتے تھے جس میں خود اردوئے معلیٰ کے سال بھر کے مصارف شامل تھے اگر ان مصارف کو منہا کر کے خالص آمدنی حسرت دیکھی جاتی تو شاید دس بارہ روپیہ ماہوار سے کسی طرح زائد نہ ہو سکتی مگر اس حالت میں حسرت خوش رہے۔ نہ کبھی کسی سے امداد و اعانت کے خواستگار ہوئے اور نہ قوم و ملک ہی کی طرف سے کوئی حوصلہ افزائی انکی کی گئی۔ کیا اس دورِ حرص و ہوا اور اس عہد کبر و ریا میں ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ اس قدر مصائب و مشکلات کے باوجود وہ اپنے کسی ایسے عقیدہ پر قائم رہے ہوں جن میں ان کا کوئی ذاتی مفاد مطلق وابستہ نہ ہو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ایسی مثالیں موجود نہیں ہیں لیکن اس میں کلام نہیں کہ مسلمانوں میں بہت ہی کم ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں خصوصًا آج سے پانچ سات سو برس قبل تو کم از کم

ظاہری اسٹیج پر حسرت کے ایثار و خدویت کی کوئی مثال موجود نہ تھی یہ ایسے حالات ہیں اور ابتلا و آزمائش کا وہ نازک دور ہے جہاں بڑے بڑے مدعیان عزم و ثبات کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں مگر حسرت کا قدم جس جگہ پہلے دن تھا آخر تک وہیں جما رہا اور مشکلات و طوفان اور طاقت کا کوئی دباؤ اس کو اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔ ؎

درویشانہ زندگی کا ایک اور ثبوت

مولانا اور بیگم حسرت کی اس درویشانہ زندگی کا اندازہ آپ کو بیگم حسرت کی زندگی کے سلسلہ میں پنڈت کشن پرشاد کول کے تذکرہ سے ہو گیا ہو گا اب اس سلسلہ میں ہندوستان کے مشہور کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر اشرف کی آپ بیتی سے یہ واقعہ نقل کر کے مزید گواہی کا سامان بہم پہنچایا جاتا ہے ڈاکٹر اشرف لکھتے ہیں کہ میرا گھرانہ یوں تو میرٹھ سے متعلق ہے مگر میرے دادا ضلع علی گڑھ کے ایک گاؤں میں بس گئے تھے۔ چنانچہ جب میری چھٹی ہوتی تھی تو میں ان سے ملنے کے لئے علی گڑھ جایا کرتا تھا اس زمانہ میں مجھے شوق ہوا کہ حسرت اور بیگم حسرت کی زیارت کی جائے۔ یہ خواہش اس لئے بھی تھی کہ حسرت علی گڑھ کے پہلے گریجویٹ تھے جنہوں نے سودیشی تحریک میں حصہ لیا تھا وہ اس وقت جیل میں تھے۔ مگر بیگم نے رسل گنج میں سودیشی کپڑے کی دوکان کھول لی تھی میں نے پہلی بار بیگم حسرت کو سیاہ ترکی برقعے میں اسی دوکان پر دیکھا۔ وہ اخلاق کیا۔ مادرانہ شفقت سے پیش آئیں اور میرے اوپر ان کی محبت کا اثر یوں بھی ہوا کہ میں ماں کی شفقت سے محروم ہو چکا تھا دوسرے دن انہوں نے مجھے اپنے در دولت پر یاد کیا تھا دراصل دھرم پور کوٹھی میں نوکروں کے رہنے کا کمرہ تھا اور بیگم صاحبہ اسی شاگرد پیشہ میں زندگی بسر کر رہی تھیں ان کی دوکان کا سارا اثاثہ غالباً دو سو روپیہ سے بھی کم ہو گا۔ بکری بھی برائے نام تھی خفیہ پولیس برابر نگرانی کرتی تھی گرفتاری اور تلاشی کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا مگر بیگم صاحبہ کے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا دنیا بھر کی دولت اور ہر قسم کا آرام انہیں نصیب ہے ان کی اور حسرت کی فاقہ مستی زندگی بھر رہی اور مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت سی

محسوس ہوتی ہے کہ میں ان کی شفقت سے کبھی محروم نہیں رہا۔ مشکل البتہ یہ آئی کہ اس دورِ ابتلا سے گذرنے کے بعد جب حسرت اور بیگم حسرت عملی طور پر میرے سامنے آئے تو ایک زمانہ تک اس کسوٹی پر کوئی دوسرا آدمی پورا نہ اتر سکا۔ مولانا کو اپنوں کی عزت اور کنارہ کشی کا احساس درجہ تھا کہ وہ خود بھی لوگوں کے پاس جاتے ہوئے کتراتے تھے سید سلیمان ندوی نے اپنے مضمون حسرت کی سیاسی زندگی میں ان سے اپنی پہلی ملاقات کے ذکر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے مولانا ندوی فرماتے ہیں کہ "حسرت سے میری ملاقات ان کے قید سے چھوٹنے کے بعد ۱۹۱۰ء میں ہوئی اور وہ اس طرح کہ میں دارالعلوم ندوہ سے فارغ ہو کر الندوہ کا سب اڈیٹر اور مدرسہ میں مدرس بن چکا تھا۔ اور مدرسہ کے قریب ہی گولہ گنج میں نواب مرشد آباد کے مکان کے ایک کمرہ میں رہتا تھا۔ یہ وہی مکان ہے جس میں اخبار حق کا دفتر ہے میں اپنی کوٹھری میں تھا کہ ایک صاحب نے آکر اطلاع دی کہ باہر ایک صاحب کھڑے ہوئے تم کو بلا رہے ہیں۔ باہر نکلا تو حسرت تھے میں نے کہا کہ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ اندر کیوں نہ چلے آئے۔ اس زمانہ کی سیاسی پستی کا اندازہ کیجئے کہ حسرت نے جواب دیا کہ چونکہ لوگ مجھ سے ملتے ہوئے گھبراتے ہیں اس لئے میں نے احتیاط کی راہ اختیار کر کے مطلع کر دیا۔ میں حسرت کو اپنے کلبۂ افراں میں لایا۔ اور چھت پر جو کمرہ تھا اس میں بستی اور گورکھپور کے کچھ احباب تھے جو کرسچین کالج میں پڑھتے تھے آرام کے خیال سے رات کو سونے کے لئے وہاں ان کا انتظام ہوا۔ یہاں یہ بتا دینا چاہئے کہ اس وقت سیاست میں سودیشی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا یہ سردی کا زمانہ تھا۔ میزبانوں نے پائینتی کمبل رکھ دیا یہ کمبل ولایتی تھا حسرت نے رات سردی میں اسی طرح کاٹ دی مگر کمبل نہیں اوڑھا اس کے بعد حسرت کا جب کبھی لکھنؤ آنا ہوتا تھا تو ہمارے دارالاقامہ میں آتے اور سیاست پر باتیں کرتے اور تلک مہاراج کے سیاسی خیالات اور سیاسی عزائم کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کرتے اور ہندوستان کی آزادی کی پیشین گوئی جس یقین اور عقیدہ کی پختگی کے ساتھ کرتے اس پر ہم سب کو بڑا تعجب ہوتا اور سیاست کی ہمہ

مشکل آسان نظر آنے لگی۔

اردوئے معلیٰ کی اہمیت

۱۹۱۱ء اور اس کے لگ بھگ مولانا نے اردوئے معلیٰ کے ذریعہ اپنے خیالات کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا اور اس زمانہ میں بعض بہت اچھے مضامین خود بھی شائع کئے اور اپنے ساتھیوں کے گراں قدر خیالات کو بھی مضامین کی شکل میں شائع کیا مولانا نے اس دوران دو مضمون بڑے معرکے کے تحریر کئے۔ ایک کا عنوان تھا "سنیاس اور پالٹیکس" جو اپنے ساتھی اروبند گھوش سے متعلق تھا دوسرا "ہندوستان کے پولٹیکل قیدی" تھا انہوں نے اس دوران چوہدری الطاف الرحمٰن قدوائی کا ایک مضمون بھی شائع کیا جس کا عنوان تھا "قومیت اور خود داری" ان سب کی اشاعت سے ان کی استقامت اور اردوئے معلیٰ کی حیات تازہ کے انداز سے آگاہی حاصل ہوتی ہے انہوں نے اس زمانہ میں جو غزلیں اور کلام منظوم کیا اس میں جا بجا مسٹر تلک کا ذکر تھا ان سب باتوں کے تجزیہ سے مولانا کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس موقع پر ان کے اور گرم دل کے رہنماؤں کے ربط اور روابط کا تذکرہ ہو جائے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے مولانا ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۶ء تک کانگریس کے رکن رہے اور مسلمانوں میں کانگریسی خیالات کے نقیب اور داعی رہے لیکن انہوں نے ۱۹۰۷ء میں مسٹر تلک اور جناب اروبند گھوش سے اپنی عقیدت اور محبت کی بنا پر ان کے ہمراہ کانگریس کو خیرباد کہہ دیا۔ وہ تلک کے اس فقرہ کو بار بار دہرایا کرتے تھے کہ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ اس کے بعد وہ گرم دل کے نظریات کے مبلغ بن گئے اور ان کی تقریروں اور تحریروں میں جا بجا گرم دل کے رہنماؤں کا مخلصانہ تذکرہ ملنے لگا۔ خود سلیمان ندوی نے بھی اپنے مضمون میں جس کا حوالہ پہلے بھی دیا جا چکا ہے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دوران نظر بندی جب علی گڑھ کے مجسٹریٹ نے انہیں اخبارات کے مطالعہ کی اجازت دے دی تھی تو بیگم حسرت ان کے پسندیدہ اخبارات ان تک پہنچا دیا کرتی تھی۔ انہیں اسی

زمانہ میں تلک کے گرفتار ہونے کی خبر ملی جس سے وہ متاثر ہوئے۔ اور انہوں نے لکھا کہ "ختم مقدمہ تک اخبار دیکھنے کی اجازت مجسٹریٹ علی گڑھ سے مل گئی تھی اس لئے جن جن اخبارات کی نسبت میری پسند کا انہیں علم تھا (بیگم حسرت کو) وہ روزانہ بھیج دیا کرتی تھیں دو ہی روز بعد مسٹر تلک کی گرفتاری کا علم ہوا (یہ گرفتاری مسٹر تلک کے ایک مضمون کے سلسلہ میں ہوئی تھی جو انکے مرہٹی اخبار کیسری میں شائع ہوا تھا حکومت نے اس ضمن میں ان پر مقدمہ چلایا تھا اور تلک کو ۶ ماہ قید با مشقت کی سزا دی) جس کے افسوس میں راقم کو اپنی تمام مصیبتیں فراموش ہو گئیں۔ مسٹر تلک کے ڈیفنس ایڈریس کو پڑھ کر البتہ روح تازہ اور ہمت بلند ہو گئی اور مجھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایڈریس کی سماعت کے بعد اگر جج انصاف سے کام لے گا تو مسٹر تلک خود بخود بری ہو جائیں گے لیکن جج کے فیصلہ نے ان ساری امیدوں کا خون کر دیا اس کبیدگی خاطر کے دوران ایک رباعی ذہن میں آئی تھی جو ہدیۂ ناظرین ہے۔

طاعت ہے فرنگیوں کی جن کا دستور
کیا خاک انہیں ہو دادگری کا شعور
انصاف کے دشمنو داور ہے لقب
برعکس نہند نام زنگی کافور

تلک سے عقیدت

مولانا نے اس زمانہ میں تلک کے بارے میں دو نظمیں تحریر کیں جن میں ایک ذکر اوپر ہو چکا ہے دوسری پیش خدمت ہے۔

آزادی ہند کی خواہش کو مقبول خواص و عام کیا
دل اہل ستم کے بیٹھ گئے وہ بال تلک نے کام کیا
سب ہند کے گرم اخباروں میں مضمون لکھے کیسے کیسے
جس سے کہ فرنگی ڈرتے تھے اس کام کو سرانجام کیا
ہو جور و جفا یا ظلم و ستم ہٹتے ہی نہیں پیچھے کو قدم
جس نے یہ کہا اب جائینگے ہٹ واللہ خیال خام کیا

بطونت تلک ۔اے فخرِ وطن بے جُرم اسیر دام وطن
یاد آئی تری جس دم فوراً حسرت نے جھک کے سلام کیا

مولانا نے اس کے علاوہ "کون تلک" کے عنوان سے اردوئے معلیٰ میں ایک مضمون بھی سپردِ قلم کیا جس کا اقتباس ہدیۂ ناظرین ہے اس اقتباس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مسٹر گاندھی کے اُفقِ سیاست پر ابھرنے سے قبل برصغیر فرقہ واریت کا شکار نہیں ہوا تھا اور اس زمانہ کی قیادت ہندؤں اور مسلمانوں میں تقسیم نہیں تھی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جن کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر حریت اور وطن پرستی کو اپنی ذاتِ پاک پر ہزار ہا ناز ہے جنہوں نے ساری عمر اور ساری ہمت ملک اور صرف ملک کی خدمت میں صرف کر دی جنہوں نے عیش و آرام اور مال و آزادی کو ہاتھ سے دینا بخوشی گوارا کیا لیکن اعلان کلمۃ الحق سے باز نہیں آئے۔ جن کے مقلدوں کو اس بات پر بجا ناز ہے کہ ہمارے لیڈر نے اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکالی جسے بعد میں کسی کے خوف سے یا گوکھلے کی طرح بہ عذر مصلحت بعد میں واپس لینا پڑا۔ جو رہنمائی کے بلند ترین منصب پر فائز رہنے کے باوجود اصول جمہوریت کے اس درجہ پابند ہیں کہ انہیں عوام کے ساتھ رہنے، سہنے، کھانے، پینے، اٹھنے، بیٹھنے، صلاح مشورہ کرنے اور بعض اوقات ان کی رائے کو اپنی رائے پر ترجیح دینے میں تامل کی بجائے حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے جن کی صحبت میں بیٹھنے سے دلوں میں بالیدگی اور حوصلوں کو بلندی حاصل ہوتی ہے جنہوں نے ملک کی خاطر سخت سے سخت مصائب کو بخوشی برداشت کیا۔ اور اب بھی برداشت کرنے پر آمادہ ہیں جو اپنے ہم وطنوں کو ذلیل نہیں سمجھتے بلکہ ان کی ظاہری اور باطنی قابلیتوں پر اعتماد کر کے اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ ایک دن وہ اپنی ضائع شدہ قوت و جبروت کو دوبارہ یقیناً حاصل کر لیں گے غرضیکہ جن کی عمر کا ہر لحظہ اسی فکر میں گذرتا ہے کہ کس طرح ہندوستان اور اہل ہندوستان کو آزادی نصیب ہو اور بس۔ اس سلسلہ میں اگر انکا ایک شعر اور پیش کر دیا جائے۔ جو انہوں نے تلک کے بارے میں کہا ہے تو مناسب ہو گا۔

مغموم نہ ہو خاطر حسرت کہ تلک تک
پیغام وفا بادِ صبا لے کے گئی ہے

تلک کے ساتھ مولانا کو جو ربط اور وارفتگی، خلوص اور عقیدت مندی تھی وہ ہمیشہ ترقی پذیر ہی رہی۔ اخلاص اور عقیدت مندی کا یہ سلسلہ ان کی رحلت تک جاری رہا چنانچہ انہوں نے تلک کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا اس سے ان کے جذبات واحساسات کا پتہ چلتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

ماتم نہ ہو کیوں بھارت میں بپا۔ دنیا سے سدھائے آج تلک
بلونت تلک مہراج تلک، آزادی کے سرتاج تلک
جب تک وہ رہے دنیا میں رہا ہم سب کے دل میں زور انکا
اب رہ کے بہشت میں نزد خدا روحوں پہ کریں گے راج تلک
ہر ہندو کا مضبوط ہے جی۔ گیتا کی یہ بات ہے دل پہ لکھی
آخر میں جو خود بھی کہا ہے یہی پھر آئیں گے مہاراج تلک

مولانا کو مسٹر تلک سے اس درجہ عقیدت تھی کہ تلک نام کے لوگوں سے بھی بہت جلد مانوس ہو جاتے تھے چنانچہ مشاہدات زنداں میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ حسن اتفاق کا کرشمہ یہ بھی قابل التفات ہے مسٹر تلک کے پیرو کو جیل میں بھی ہر جگہ پہلے پہل تلک ہی کے ہم نام لوگوں سے سابقہ پڑا پرانی تکلیف میں میرٹھ کے مشہور نشورانیشٹ قیدی تلک سنگھ نے اس کا خیر مقدم کیا اور پرانے احاطہ میں ابتدائے کلام تلک رام سے ہوئی۔

لیکن مولانا کی تلک کے ساتھ عقیدت صرف میدان سیاست تک ہی محدود تھی جناب ضیاءالدین فرماتے ہیں کہ "ایک مرتبہ میں نے مولانا سے کہا کہ آپ تلک مہاراج کے مقلد ہیں حالانکہ انہوں نے اس اتحاد کو توڑ دیا جس کی وجہ سے مہاراشٹر کے ہندو مسلمان مل کر محرم منایا کرتے تھے اور پھر ہندوں کو گنپتی کے تہوار میں لگا دیا تاکہ وہ دوسری طرف مشغول نہ ہوں۔ اس پہ مولانا نے فرمایا کہ میں اسی حد تک ان کے مسلک کو پسند کرتا ہوں جس حد تک وہ ہندوستان سے انگریز کو نکالنے کے حامی ہیں باقی امور میں ان کے مسلک کا پابند نہیں"

اروبندو گھوش

تلک مہاراج کے ذکر کے بعد گرم دل کی دوسری بڑی شخصیت جس سے

مولانا متاثر ہوئے وہ ارو بندو گھوش کی تھی لہٰذا اس ضمن میں مولانا کے خیالات کی پذیرائی فرمائیے یہ خیالات خواجہ حسن نظامی کے اس مضمون کے جواب میں پیش کئے گئے جو انہوں نے خونی درویش کے عنوان سے نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۱ء میں لکھا تھا خواجہ حسن نظامی نے اس مضمون میں تحریر کیا تھا۔ کہ درویشوں، صوفیوں یا سنیاسیوں کو سیاسی امور سے تعلق نہیں رکھنا چاہیئے مولانا نے خواجہ صاحب کے اس بیان کی رو میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ درج ذیل ہیں "خواجہ حسن نظامی نے سرگروہ احرار بابو اروبندو گھوش سے بمقام کلکتہ اپنی ملاقات کا جو حال بیان کیا ہے اس میں اگر سیاسی امور کا نام لے کر فقیری لباس کی آڑ میں حصول مملکت کے منصوبے پورے کرنا۔ بم اندازی اور پستول اندازی کے کرشمے دکھانا مراد ہو تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ درویشوں یا سنیاسیوں کو اس قسم کی ریاکاریوں سے کوسوں دور رہنا چاہیئے لیکن اس عذر بے محل کو پیش کر کے اہل تصوف کو اعلائے کلمۃ الحق سے بر بنائے خوف قیدبندی وسخت گیری حکومت اجتناب کا سبق دینا ہم کو خواجہ صاحب کی شان تصوف سے بالکل بعید معلوم ہوتا ہے ہم کو اس امر سے بحث نہیں کہ آرو بندو درحقیقۃ سنیاسی ہو گئے ہیں یا نہیں۔ لیکن ان کے میلان فقر کی نسبت خواجہ صاحب کا اس بنا پر شک کرنا کہ آرو بندو کا لباس درویشی نہیں ہے اور نہ ان کے گرد و پیش کوئی ایسا لباس نظر آتا مناسب نہیں تھا کیونکہ سنیاس کا تعلق دل سے ہے نہ کہ ظاہری لباس سے آرو بندو نے اس بارے میں خواجہ صاحب کو جو جواب دیا وہ صحیح ہے۔ آرو بندو گھوش کا یہ کہنا کہ میں بہ اعتبار ظاہری سنیاسی نہیں ہوں مگر میرا دل سنیاس کو پسند کرتا ہے اور وہ سنیاسی ہو چکا ہے اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ مولانا نے آگے چل کر اسی جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ "خلوص آرو بندو کے تمام کارناموں کا حقیقی جوہر ہے وہ جو کچھ کہتے ہیں ملک کی بہتری کے لئے کہتے ہیں یا کم ازکم اس بات کا ان کے دل میں یقین کامل ہوتا ہے" ایک اور موقعہ پر مولانا مسٹر آرو بندو گھوش کے بارے میں اردوئے معلی میں فرماتے ہیں کہ "بابو آرو بندو گھوش نے جیل سے نکل مری کرشن

مہاراجہ کے درشن کا جو حال ظاہر کیا ہے اسے بعض کور باطن محض ایک فرضی افسانہ قرار دیتے ہیں لیکن ہم کو ان کے بیان کی صحت میں مطلق شبہ نہیں اس لئے کہ ہم نے بذات خود اس عجیب وغریب انند کو محسوس کیا ہے جو سری کرشن کا نام آتے ہی دل میں پڑتا ہے۔ اس معاملہ میں مولانا مسٹر آروبندو گھوش کے ہم خیال تھے اور وہ سری کرشن مہاراج کو پیغمبر مانتے تھے اور راقم الحروف نے ان کے گھر پر سری کرشن کی مورتی کو خود دیکھا ہے۔ نامناسب نہیں اگر اس موقعہ پر اربندو گھوش کے ایک پیغام کا ذکر ہو جائے جو گرم دل کے اس عظیم رہنما نے قوم کو دیا تھا اس لئے کہ آج کے ماحول میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ان کی عظمت اور اہمیت سے واقف ہیں۔ یہ مضمون بھی اردوئے معلی میں شائع ہوا تھا۔ مسٹر گھوش لکھتے ہیں کہ "ریفارم اسکیم کی ناکامی اور متحدہ کانگریس کے خیال کی ناکامی نے وطن پرستوں کے تمام فریق پر یہ امر لازم کر دیا ہے کہ وہ اپنی سستی کو خیرباد کہہ کر از سر نو کام شروع کر دیں انہوں نے تجویز کیا کہ ایک نیشنلسٹ کونسل کی بنیاد ڈالی جائے جس کی شاخیں تمام ملک میں قائم کی جائیں اس کونسل کا اجلاس مارچ یا اپریل میں منعقد ہو جس میں وطن پرست گروہ کا پروگرام تیار کیا جائے۔ مسٹر آروبندو گھوش کی رائے میں واقعات نے اس بات کو قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ جب تک قومی پریس ان کی امداد کے لئے پس پشت موجود نہ ہو اس وقت تک حکومت کے مقابلہ میں نرم فریق کے جانب سے کسی امید کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ پس اگر نیشنلسٹ اب بھی آگے نہیں بڑھیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قومی تحریک نابود ہو جائے گی یا اس کے بجائے مذموم اور مفسدانہ تحریک وجود میں آجائے گی اور صاف ظاہر ہے ان دونوں نتائج کو بہی خواہان ملک پسند نہیں کر سکتے۔ مسٹر گھوش نے آگے چل کر اس مضمون میں لکھا ہے کہ انتظار کا زمانہ گذر چکا ہے اور اب ہم پر دو باتیں واضح ہو گئی ہیں اوّل یہ کہ قوم کا مستقبل وطن پرستوں کے ہاتھ میں ہے دوسرے یہ کہ اس مستقبل کو قائم کرنے میں ہم کو فریق نرم سے کسی قسم کی حقیقی اعانت کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے بلکہ جو کچھ کرنا ہے اپنی قوت اور ہمت کے بھروسہ پر کرنا ہوگا پس خدا نے جو خدمت

ہم کو سپرد کی ہے اسے قبول کرنا ہم پر واجب ہے۔ کام اہم ہے پس اس کے حصول کے لئے بھی بڑی حوصلہ مندی اور بہت بڑے ایثار کی ضرورت ہے اس باب میں جن لوگوں کو جبر و ستم کا خطرہ ہو وہ وطن پرستوں کے گروہ سے علیحدہ رہیں جن لوگوں کا یہ خیال ہو کر اینگلو انڈینس کی چاپلوسی یا لبرل لیگ کی خوشامد سے بغیر کوشش کئے یا خطرے میں پڑے بغیر کام نکل جائے گا وہ بھی علیحدہ رہیں صرف وہ لوگ جو حقیقی طور پر وطن پرست کہلانے کے مستحق ہیں آگے آئیں اور اس بار عظیم کو اٹھائیں۔ قانون کا خوف ان لوگوں کو ہوتا ہے جو قانون توڑتے ہیں ہمارے مقاصد اہم اور اعلیٰ، بے لوث اور بے داغ ہیں اور ہمارا طرز عمل باوجود بیباکی اور استقلال صلح جو اور بے شر ہے ہم قانون کی خلاف ورزی نہیں کریں گے اس لئے کہ ہم کو قانون سے کوئی عار نہیں ہے لیکن اگر ناکارہ و ابتر پولیس یا غیر محتاط افسر ہمارے پولیٹیکل طرز عمل کی اشاعت پر خلاف قانون فرمانوں، جھوٹی شہادتوں یا خلاف انصاف فیصلوں کے ذریعہ سے ہمارے پیش پیش رہنے والے وطن پرستوں کو تنگ کریں تو ہم کو وطن کی راہ میں اس قلیل محصول کے ادا کرنے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہئیے۔ ان حالات میں کیا ہمیں اپنے خیالات کو پوشیدہ رکھنا اور ترک عمل کا ذلیل طریقہ اختیار کر لینا چاہئیے..... نہیں..... نہیں، ہرگز نہیں۔ ہم اپنی انجمن ضرور قائم کریں گے اور اپنے اصولوں کی اشاعت کے ذرائع پیدا کریں گے اگر ہماری کارروائی بے ضابطہ اشتہاروں اور فرمانوں کے ذریعہ دبا دی جائیگی تو ہم کو یہ اطمینان تو ہو گا کہ مادر وطن کی خدمت میں ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا اور اس کے بعد ہم اس دیوانگی کے نتائج کے ذمہ دار نہ ہوں گے جو اعلانیہ اور باضابطہ سیاسی تحریکوں کو دبا کر مایوس و مغموم قوم کے افراد کو ان کے جذبات کے حوالہ کر دیتی ہے جن کے خوفناک جوش اور بیباکی کا اظہار ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر ہونے لگا ہے جب تک صلح و آشتی کے ساتھ کام کرنے کا ایک بھی ذریعہ باقی رہے گا ہم کوشش ترک نہیں کریں گے لیکن اگر حالات بد سے بدتر ہو جائیں تو وہ بھی اس سے زائد خراب نہیں ہو سکتے جس کے مقابلے میں ہمارے اہل وطن ٹرانسوال میں کر رہے ہیں وہ قلی اور چھوٹے چھوٹے دکاندار

اپنی قومی عزت اور بہبود کے لئے تمام مصائب کو بخوشی برداشت کر رہے ہیں کیا پس کیا ہم لوگ جو ہندوستانی تعلیم و تہذیب کے لئے سرمایۂ فخر سمجھے جاتے ہیں ان قلیوں کے برابر حوصلہ اور ہمت کا اظہار نہیں کریں گے؟"

یہ ہے خلاصہ مسٹر اروبندو گھوش کے پیغام کا جو انہوں نے اپنے ہم قوموں کو دیا اور جسے مولانا نے اپنے رسالے اردوئے معلیٰ میں شائع کیا۔ یہ پیغام اپنے دور کے تمام ہموطنوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے سارا پیغام پڑھ جایئے۔ اس میں صرف اخلاص اور حب الوطنی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنڈت مالویہ اور مسٹر گاندھی کے فرسودہ فرقہ وارانہ خیالات نے ہندوستان کی سیاسی فضا کو مسموم اور زہر آلود نہیں کیا تھا۔ مولانا اور مسٹر گھوش کے برادرانہ اور مخلصانہ تعلقات اخیر عمر تک برقرار رہے۔ یہاں تک کہ مسٹر گھوش نے جب ترک وطن کیا اور ان پر اخبارات میں لے دے ہوئی تو مولانا نے اس مسئلہ پر ایک گراں قدر مقالہ سپرد کیا۔ اور اسے اردوئے معلیٰ کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۱۰ء میں شائع فرمایا۔ اب یہ بات لوگ بھول گئے ہیں کہ مسٹر گھوش کون تھے اور انہوں کن حالات میں ترک وطن کیا اور اس اقدام سے اس دور کے سیاسی حالات پر کیا اثرات مرتب ہوئے مگر مولانا کی سیاسی زندگی میں یہ واقعہ بڑی اہمیت کا حامل تھا لہٰذا اس مضمون کا اقتباس نقل کرنا ضروری ہو گیا ہے اس سے ایک طرف تو مسٹر گھوش کے افعال اور کردار پر روشنی ڈالی ہے دوسرے اس واقعہ سے متعلق گروہ احرار کے نظریات کا علم ہوتا ہے ملاحظہ فرمایئے۔ حال میں بابو اروبندو گھوش کے واقعہ مفقود الخبری سے بعض خوشامدی اور نرم اخباروں کو وطن پرستوں کی توہین اور تضحیک اور اپنے اظہار وفاداری کا ایک ایسا موقعہ اور حاصل ہوا ہے۔ جسے بیش نظر دکھ کر انہوں نے گروہ احرار کی بار بار ہنسی اڑائی اور اپنے زعم میں انہیں لاجواب کر دیا۔ بابو اروبندو گھوش نے پریس ایکٹ کے پاس ہو جانے کے بعد اپنے اخبار کرم یوگی میں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے پولیٹیکل واقعات پر نوٹ لکھنا قطعی طور پر بند کر دیا تھا کیونکہ یہ چیز خوشامد اور چاپلوسی۔ بہر حال بہتر تھی۔ اس پر معنی خاموشی کو ابھی تھوڑے

ہی دن گذرے تھے کہ ان کی مفقود الخبری کا حال اخباروں میں شائع ہوا جس
پر مختلف لوگوں نے مختلف پہلوؤں سے رائے زنی کی اتفاق سے بابو صاحب کے
غائب ہونے کے چند روز بعد کرم یوگی پر ایک مقدمہ سڈیشن کا قائم ہوا اور اس
ضمن میں آروبند بابو کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہوا جس پر تربیون اخبار
نے عام طور پر نیز اردو اخبار لکھنؤ نے چاپلوسی کے جذبۂ سفلی کی تحریک پر بابو صاحب
کو اخلاقی کمزوری کا مجرم قرار دیا اور لکھا کہ انہوں نے مقدمہ سڈیشن سے بچنے
کے لئے راہ فرار اختیار کی ہے حالانکہ یہ بات ابھی تک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی
کہ بابو صاحب وارنٹ گرفتاری کے ڈر سے روپوش ہو گئے ہیں یا خود گورنمنٹ
نے ان کے غائب ہونے اور کسی خفیہ تجویز میں مصروف ہونے کے خوف سے خواہ مخواہ
ایک ایسے پرانے آرٹیکل کے متعلق سڈیشن کا مقدمہ قائم کر دیا جس کی نسبت
ولایت کے تمام اخبارات متفق ہیں کہ اسے فتنہ انگیز قرار دینا پرلے درجہ کی مضحکہ
خیز بات ہے اگر پہلی بات صحیح مان لی جائے تو یہ لازم آتا ہے کہ خفیہ پولیس
کے اندر وطن پرستوں کی ایک دوسری خفیہ پولیس کی موجودگی تسلیم کی جائے جو بابو
صاحب موصوف کو گورنمنٹ کے تمام اخباروں سے پندرہ یوم قبل پہلے اطلاع پہنچانے
پر قادر تھی۔ حالانکہ ایسا ہونا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا اور فرض کیجئے کہ آخر
میں یہ بات سچ ثابت ہو کہ انہیں کسی نہ کسی طرح وارنٹ کی خبر مل گئی اس لئے
وہ دیدہ ودانستہ روپوش ہو گئے تب بھی ہمارے بابو صاحب کا یہ فعل ٹریبون اور اردو
اخبار کے سے بندگان خوشامد کی ملامت کا کسی طرح مستحق قرار نہیں پا سکتا۔ کیونکہ
بابو صاحب اس وقت وطن پرستوں کے مسلمہ لیڈر ہیں اور ایک رہنما کے لئے خطرے
کی حالت میں دو ہی صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ وہ تمام خطروں کا بلا
لحاظ مقابلہ کرے جیسا فخر ہند مسٹر تلک نے کیا دوسرے یہ کہ قومی کاموں کی تکمیل کیلئے
وہ کسی نہ کسی طور پر اپنی آزادی قائم رکھے جیسے بابو نے کیا ہم تسلیم کرتے ہیں
کہ پہلی صورت زیادہ پسندیدہ ہے لیکن دوسری صورت کو بھی کوئی شخص قابل
ملامت قرار نہیں دے سکتا بشرطیکہ اس کی بقا محض خدمت وطن و حریت پرستی
کے جذبات پر قائم ہوا۔ اور خوف کا اس میں شائبہ تک نہ ہو اور ہم بلا خوف تردید

کہہ سکتے ہیں کہ اروبندو بابو کی بہ نسبت خوف یا بزدلی کا گمان ایک ایسا گناہ کبیرہ ہے جس کے مرتکب صرف وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو خود تو مارے ڈر کے ہر وقت اپنے اخباروں میں برٹش وفاداری کے راگ الاپا کرتے تھے لیکن وطن پرستوں کے ہر فعل کی بڑی سختی سے تنقید کرنے اور ان کی ذرا ذرا سی مصلحتی کمزوریوں کو بھی بزدلی سے موسوم کرتے ہیں صرف اس وجہ سے بے باک نظر آتے ہیں کہ پریس ایکٹ کی سختی نے وطن پرستوں کو خاموش کر رکھا ہے اور اس لئے ان بہادران بزدل کو ان کی لاف زنی کے مقابلہ میں ان کے جوابی حملوں سے قطعی محفوظ کر دیا ہے۔" مولانا نے اپنے مضمون میں آگے چل کر لکھا ہے کہ "حال کی خبروں سے یہ تاثر پایا جاتا ہے۔ کہ کہ اروبندو گھوش یا تو ترکِ وطن کر کے فرانس چلے گئے ہیں یا نہیں تو عنقریب جانے والے ہیں۔ اب ہم ان بہادر دوستوں سے دریافت کرتے ہیں کہ آزاد رہ کر خدمتِ وطن کی خاطر اپنی بیوی۔ بچوں اور عزیزوں اور مال و متاع غرضیکہ ہر چیز سے ایک نامعلوم میعاد کے لئے قطع تعلق کر لینا کیا کچھ کم ایثار ہے ہمارے نزدیک تو اس میں اور حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور میں صرف ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ دریائے شور میں رہ کر کوئی شخص وطن کی خدمت نہیں کر سکتا اور اس خود امتیازی جلا وطنی میں بہت کچھ ممکن ہے۔"

ایک اور اعتراض کا جواب

مولانا نے اپنے اس مضمون میں نرم فریق کے اس طعنہ کا بھی جواب دیا ہے کہ جب وطن پرستوں کے تمام لیڈر ایک ایک کر کے جلا وطنی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ تو پھر ان دیوانوں اور خیال پرستوں کی کامیابی کس طرح پر بروئے کار آئے گی اس سوال کے جواب میں جو اس زمانہ میں خاصی اہمیت رکھتا تھا مولانا نے نہایت مدلل دلائل پیش کئے" فرماتے ہیں کہ قدرت کی مخفی طاقتوں اور آنے والے واقعات کا علم نہ مجھ کو ہے اور نہ ہی ان کو ہے اور نہ کسی اور کو ہے تاہم اگر ہماری طلب صادق ہے اور ارادہ مستقل تو صرف ہمارے رہنماؤں کی جلا وطنی یا بے سر و سامانی ہماری امیدوں کے یک قلم مذموم ہونے کی کسی طرح دلیل نہیں بن سکتی۔ جو دشمن

ان کی موجودہ آشفتہ حالی پر خندہ زنی کرتا ہے اے اوّل آنکہ ایسے لوگوں کو اب تک کی تاریخ عالم کو آنکھیں کھول کر مطالعہ کرنا لازم ہے اگر بیت المقدس خود جلا وطن یا آوارہ گرد رہنے سے اہل اطالیہ کے نزدیک مذینی کی کوئی توہین نہیں ہوئی نہ وہ بزدل قرار پایا تو آرو بندو گھوش کی خود اختیار جلا وطنی پر بھی حرف رکھنے سے کم از کم اہل ہند کو شرم آنی چاہیئے۔ اگر نوجوان ترکوں کو سال ہا سال تک غریبی۔ کسمپرسی اور ناچاری کی حالت بسر کرنے کے بعد کامیابی نصیب ہوئی اور کامرانی کا رُخ روشن دیکھنا مقدر ہوا تو وطن پرستوں کے مقصد حریت کی نسبت ناکامی جاوید کا فتویٰ دینے کا کسی کو حق حاصل نہیں۔ ہم اپنے نرم دوستوں سے یہ نہیں چاہتے کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف خواہ مخواہ ہمارے ہم نوا ہو جائیں لیکن غالباً اتنا عرض کرنے کا ہمیں بھی ضرور حق حاصل ہے۔ کہ وطن پرستوں کا ذکر کرتے وقت انہیں انصاف اور تہذیب کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے" یہ وہ زمانہ تھا کہ ہر چہار طرف سے مسٹر گھوش پر لعن طعن ہو رہی تھی انہیں بھگوڑا کہا جا رہا تھا اور یہ حملے اغیار ہی کی طرف سے نہیں بلکہ اپنوں کی طرف سے بھی تھے اور غیر ملکیوں کی خوشامد میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کو دلائل سے یہ ثابت کرنا پڑا۔ کہ مسٹر گھوش بھگوڑے نہیں تھے بلکہ بدستور سرکردہ احرار تھے۔ مذکورہ بالا دلائل کے بعد وہ اسی مضمون میں اعتراض کنندگان کی پول کھولتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "تبدیلیٔ زمانہ کا حال ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جو لوگ کسی وقت نیشنلزم کا دم بھرتے تھے وہ وہ اب نرم فریق سے گذر کر سرد فریق کی ٹولیوں میں شامل ہونے جاتے ہیں مثلاً بابو موتی لال گھوش کلکتہ میں انجمن وفاداراں کی بنا ڈالنے پر آمادہ ہیں تو بابو دینا ناتھ اپنے اخبار ہندوستان کی وفاداری کے متعلق انگریز حکام کے سرٹیفکیٹ پیش کرنے پر نازاں۔ خیر ہمیں ان لوگوں کے طریق عمل سے کچھ سروکار نہیں وہ اپنی مصلحتوں کو خوب سمجھتے ہوں گے پنجاب میں لالہ دینا ناتھ اپنے حریفوں سے بھی زیادہ وفادار بنیں اور شوق سے بنیں لیکن ان کے پاس صرف یہی ایک ذریعہ باقی رہ گیا ہے کہ آرو بندو کی نسبت

ہندوستان میں کہاں ہیں کی جگہ کہاں ہے اور مفقود الخبری کی جگہ بھاگ گیا بھجتا ہے لکھیں۔ مولانا اس کے بعد آخر میں لکھتے ہیں اور بڑے طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں۔ مگر اگر اظہار وفاداری کے یہی طریقے ہیں تو اسی وفاداری پر تف ہے اور ہزار بار تف۔

مسٹر گھوش پانڈیچری میں

مسٹر اروبندو گھوش جن کی مفقود الخبری پر ہندوستان میں اتنا واویلا ہوا ترک وطن کرکے ہندوستان کے فرانسیسی مقبوضہ علاقہ پانڈیچری میں منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے حریت پرستوں کا ایک آشرم قائم کیا اور حصول آزادی کے وقت تک وہیں مقیم رہے اور وہیں انتقال فرمایا۔ مولانا کا ان سے دیرینہ تعلق برابر قائم رہا۔ اور انہوں نے اپنی زندگی کے کسی بھی حصے میں ان کے خلوص پر شبہ نہیں کیا مولانا نے اس مضمون کے بیس برس بعد اپنے اخبار "مستقل" کی اشاعت مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۳۰ء میں پانڈیچری میں اور بندو گھوش کے دلچسپ حالات کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا جس میں مسٹر گھوش کے بھائی بارینددرکمار گھوش کے حوالے وہاں کے واقعات کو پیش کیا۔ مضمون میں درج ہے کہ "شری اروبندو آشرم میں اس وقت ۸۵ سادھک ہیں اور ہندوستان اور دوسرے ممالک سے اکثر تلاش حق میں وہاں وارد ہوتے ہیں تمام سادھک ۱۹ مکانوں میں رہتے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر مکان کرایہ پر لئے گئے ہیں جہاں شری اروبندو رہتے ہیں وہ مکان بھی اس سے ملحق ہیں ہر ایک سادھک کو ایک کوٹھڑی ملی ہوئی ہے جہاں وہ اپنے سادھن میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں آشرم کی مہتمم میراں دیوی ہیں سب ان کو ماں کہہ کر خطاب کرتے ہیں اس لئے کہ سادھک جو بھی طلب کرتے ہیں وہی بہم پہنچاتی ہیں اور یہ سب سامان آشرم فنڈ سے مہیا کیا جاتا ہے آشرم کے سادھکوں کے علاوہ آشرم سے باہر جو سادھک رہتے ہیں وہ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ آشرم کی نذر کرتے ہیں اور یہ کوشش ہو رہی ہے کہ آشرم اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ آشرم میں ایک لائبریری بھی ہے اور اس کے چند شعبہ جات بھی ہیں آشرم میں سادھک صبح سویرے بیدار ہوتے ہیں اشنان کرنے کے بعد

ماں کے درشن کے لئے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ہر ایک ماں کا آشیرباد لے کر اپنی کوٹھڑی میں چلا جاتا ہے اور وہاں یوگ ابھیاس کرتا ہے یعنی بھجن گانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ تمام سادھک ایک ہی جگہ پر ایک ہی وقت میں کھانا کھاتے ہیں باقی دوسرے وقت اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں رہتے ہیں جو سب کے ساتھ بھوجن کرنا نہیں چاہتا۔ اسے بھوجن اس کی کوٹھڑی میں بھیج پہنچایا جاتا ہے کسی کے سادھن میں خلل نہ ہونے کی غرض سے اشرم میں بالکل خاموش رہتی ہے۔ آشرم کا مقصد روحانی طاقت حاصل کرنا۔ ضمیر کی پاسداری اور روحانی انکشافات ہیں دوسری باتیں اس کے بعد ہیں۔ سادھکوں میں اکثر لوگ ہندوستان کے ہیں اور ان میں بھی بنگال اور گجرات کے لوگ زیادہ ہیں۔ مہاراشٹر کا ایک بھی سادھیک نہیں ہے۔ آشرم میں سات مسلمان اور چار عورتیں ہیں۔ بنگال کے مشہور علم و ادب کے ماہر سوشیل چندر چکرورتی۔ تلسی کانت گپتا اور انل رائے اسی جگہ پر ہیں ان کے علاوہ بعض امریکی فرنچ اور انگریز سادھک بھی ہیں کافی فنڈ فراہم ہونے پر آشرم کی تعمیر کا ارادہ ہے۔ یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ آشرم کا تمام انتظام میرا دیوی کے ہاتھ میں ہے شری بندو بالکل تنہائی میں رہتے ہیں اور شاذ و نادر ہی باہر نکلتے ہیں سال بھر میں صرف تین دن ان کے باہر نکلنے کے ہوتے ہیں یعنی ۲۱ر فروری کو اپنی والدہ کے جنم دن پر ۱۵ر اگست کو خود اپنی سالگرہ پر اور ۲۴ر نومبر کو جس دن انہوں نے سنیاس لیا۔ ان دنوں میں صرف ان ہی سادھیکوں کو درشن دینے جاتے ہیں جو آشرم میں رہتے ہیں لیکن وہ اس وقت کوئی تقریر نہیں کرتے اور باہر کے کسی شخص کو ان کے درشن نہیں ہوتے وہ دنیوی معاملات میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔ صرف روحانی دولت حاصل کرنے میں مشغول رہتے ہیں جس سے دنیا میں انقلاب پیدا ہو جائے گا شری اروبندو سادھیکوں کو تحریری طور پر تین دفعہ پیغام دیتے ہیں اور ان کا آخری پیغام یہ ہے کہ جو شخص یوگ کے لئے اپنا سب کچھ تج دیتا ہے اسے ایشور کا وصال نصیب ہوتا ہے اور ایسے خوش نصیب کو شانتی روحانی طاقت کلیان اور آزادی وغیرہ کا گیان اور انند حاصل ہوتا ہے مولانا نے ان معلومات کے ساتھ ہی ساتھ صاحب معلومات

جناب باریندر کمار کا بھی حال لکھا ہے اور بتایا ہے کہ وہ علی پور بم کیس کے شہرہ آفاق ملزم ہیں اور پانڈیچری میں ۶ سال گذارنے کے بعد آج کل کلکتہ آئے ہوئے ہیں۔ جسم سڈول ہے اور بال بڑھے ہوئے ہیں ان کی بول چال میں سلامت روی ہے اور آنکھوں میں ایک قسم کا جلال پایا جاتا ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس مضمون کے ایک ایک لفظ سے مسٹر اروبندو گھوش کی محبت اور عقیدت ہوتی ہے انہوں نے یہی نہیں بلکہ مستقبل کی اشاعت مورخہ ۲۲ اپریل مسٹر پال رچرڈ کے اس لیکچر کو بھی نقل کیا تھا جو موصوف نے بوسٹن میں ہندوستان کی چار عظیم شخصیتوں کے عنوان سے دیا تھا جس میں مقرر نے ٹیگور، گاندھی اور جگدیش چندر بوس کے ذکر کے ساتھ مسٹر اروبندو گھوش کا بھی ذکر کیا تھا۔ مولانا نے اس تقریر کے اس حصہ کو نمایاں طور پر جگہ دی جس میں سرگروہ احرار مسٹر اروبندو کا ذکر تھا۔ اس تقریر کا یہ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے "ہندوستان کے چوتھے اور سب سے بڑے آدمی اروبند گھوش ہیں (یہ اعتراف ایک امریکی سفیر کا ہے) جو آج کل پانڈیچری میں خلوت گزیں ہیں۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے بنگال میں تحریک آزادی کی ابتدا کی تھی آپ ایک سال کے لئے شاہی مہمان رہ چکے ہیں جیل خانہ سے باہر آتے ہی آپ نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی آزادی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ جب اپنی روحانی طاقت مکمل کر لی جائے لہٰذا وہ پانڈیچری میں مقیم ہو گئے اور وہاں اب تک روحانی طاقتوں کے حصول میں مصروف ہیں ہر سال انڈین نیشنل کانگریس کے نمائندے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر تقاضہ کرتے ہیں کہ وہ کانگریس کی صدارت قبول فرمائیں مگر وہ ہمیشہ انکار کرتے رہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی صرف روحانی طاقت ہی کے ذریعہ سے مل سکتی ہے چنانچہ وہ اپنے شغل میں مصروف رہتے ہیں پہلی بار ملاقات ان سے پانڈیچری ہی میں ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کسی رشی منی سے ملاقات کروں۔ لیکن لوگ کہتے تھے کہ اب وہ رشی منی کہاں لیکن پانڈیچری پہنچا تو میرا مقصد حاصل ہو گیا اور اگرچہ ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے مگر ایک دل دوسرے کی طرف کھینچا آتا تھا میں نے گھوش کا نیاز حاصل کیا اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا

تلک اور اروبندو گھوش کا تذکرہ مولانا کی سیاسی زندگی میں اس لئے ضروری تھا کہ وہ ان دونوں عظیم شخصیتوں سے بے حد متاثر تھے پھر یہ کہ ان دونوں بزرگوں کے ذکر سے خود مولانا کے اپنے نظریات جھلکتے تھے اس ضمن میں نرم دل، گرم دل اور سرد دل کے نظریات ان کے آپس کے تضاد اور اختلافات بھی دائرہ تحریر میں آگئے، جن سے واقفیت رکھنا برصغیر کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے حد ضروری تھا۔

سودیشی تحریک

اب ان سرکردہ حضرات کے تذکرہ کے بعد سودیشی تحریک کا ذکر بھی ہو جائے۔ جو مولانا کی سیاسی زندگی کا جزو لاینفک ہے اس ضمن میں انشاء اللہ وہ غلط فہمی دور ہو جائے گی کہ مولانا کے علاوہ کوئی اور شخصیت بھی اس تحریک کا بانی ہو سکتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مولانا برصغیر میں نہ صرف سودیشی تحریک کے بانی اور علمبردار تھے بلکہ انہوں نے ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۱۳ء تک جس جوش و خروش سے اس تحریک کو چلایا اس پر وہ آخر عمر تک کاربند رہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے مولانا گفتار ہی کے غازی نہیں تھے بلکہ کردار کے بھی غازی تھے اور وہ جو کچھ چاہتے تھے اس پر عمل کرتے تھے صاحب حالات حسرت تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا سودیشی تحریک کے ابتداء ہی سے حامی اور مؤید تھے اور ہمیشہ اس تحریک کو وسعت و فروغ دینے میں ساعی اور خواہش مند رہے۔ وہ سودیشی تحریک کو ہندوستان کی اقتصادی ترقی کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے ایسی حالت میں ناممکن تھا کہ اس قدر مفید اور سود مند تحریک کامیاب بنانے میں ان کا دست عمل حرکت نہ کرتا۔ دنیا جانتی ہے کہ حسرت کا وجود ایک پیکر عمل ہے ان کے مذہب و عقیدہ کا تعلق صرف قلب سے نہیں بلکہ وہ اس کو اک عملی تشکل میں دیکھنا پسند کرتے ہیں چنانچہ اس تحریک کے متعلق بھی ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ جس قدر ممکن ہو اس کی وسعت تمام ہندوستان کو اپنی آغوش میں لے لے۔ اس میدان میں سب سے پہلا قدم ان کا خود اپنے نفس اور اپنے متعلقین کی طرف بڑھا

یعنی سب سے پہلے انہوں نے خود اپنے اور اپنے متعلقین کے اوپر غیر ملکی مصنوعات کو حرام کر لیا اس کے بعد اس تحریک کو وسعت دینے میں مصروف ہو گئے چنانچہ آپ کی سعی اور کوشش سے کم از کم اسلامی حلقہ میں اس تحریک کو بہت کچھ ہر دلعزیزی حاصل ہوئی بہت سے لوگوں پر صرف آپ کی مخلصانہ عملی زندگی کا اثر پڑا۔ بہت سے لوگ آپ کی نصیحت و وعظ اور تقریر و تحریر سے متاثر ہوئے اور اس تحریک کو کامیاب بنانے میں عملاً شریک ہو گئے ایسے لوگوں کی تعداد تو بہت ہے جنہوں نے کم از کم ملکی مصنوعات کو استعمال کرنا اور غیر ملکی مصنوعات پر اسے ترجیح دینا شروع کر دیا لیکن حسرت کی عملی زندگی یہاں پر ختم نہیں ہو گئی بلکہ انہوں نے اس تحریک کو زیادہ وسیع پیمانہ پر کامیاب بنانے کی تدابیر اختیار کیں۔ یعنی انہوں نے کوشش کر کے ایک سودیشی اسٹور قائم کر دیا اور اس میں انہوں نے روزمرہ کے استعمال کی تمام ضروری چیزیں فراہم کیں حسرت نے یہ سودیشی اسٹور کچھ اپنے ذاتی سرمایہ سے نہیں کھولا تھا یعنی ان کے پاس اس قدر سرمایہ کبھی تھا نہ ہے کہ وہ اوسط پیمانہ پر بھی کوئی دوکان جاری کر سکتے وہ مولانا شبلی اور نواب وقار الملک کے ذریعہ سر فاضل بھائی کریم بھائی سے اور مولانا کی سفارش سے سر فضل بھائی سے قرض کپڑا خریدا۔ اسی طرح دوسری تھوک چیزیں دوسرے تھوک فروشوں سے قرض لیں۔ اس شرط پر کہ فروخت کریں گے اور اس سے قیمت ادا کریں گے غرضیکہ ان کوششوں سے آپ نے سودیشی اسٹور کھول دیا اور رفتہ رفتہ تمام ضروریات کی چیزیں اس میں مہیا کر لیں۔ چونکہ حسرت کی طبیعت سراپا استقلال ہے اس نے اس کام کو بھی اسی قدر مستقل مزاجی اور محنت کے ساتھ آپ نے انجام دیا کہ یہ دوکان چل نکلی اور اس میں خاصی کامیابی ہوئی۔ متعدد بار تھوک فروشوں کا قرض ادا کیا گیا اور ان سے مال منگوایا گیا۔ چنانچہ حسرت کی اس تجارتی سرگرمی کو دیکھ کر مذاقاً مولانا شبلی مرحوم نے فرمایا کہ تم آدمی ہو یا جن پہلے شاعر تھے پھر پالیٹیشن بنے۔ اور اب بنئے ہو گئے۔ شاید آپ خیال کرتے ہوں گے کہ حسرت کا جوش عمل اب اس منزل پر ضرور ختم ہو گیا ہو گا لیکن یقین کیجئے کہ حسرت کی نسبت ایسا خیال

کرنا ان کے ولولۂ عمل اور جذبۂ صادق کی توہین ہے حسرت کی مساعی یہیں
تک محدود نہیں رہیں بلکہ انہوں نے اس تحریک کو مزید وسعت دینے کے لئے اکثر
مقامات کے دورے کئے اور جا جا کر اس تحریک کی خوبیاں لوگوں کے ذہن نشین
کرائیں اور تجارتی نفع کا یقین دلا کر بہت سے قصبات اور شہروں میں سودیشی
دوکانیں کھلوائیں جو اب تک کامیابی کے ساتھ چل رہی ہیں غرضیکہ حسرت ملک
کی اقتصادی حالت کے درست کرنے میں بھی بالکل اسی طرح سرگرمی سے مساعی
رہے جس طرح وہ میدان سیاست میں سرگرم کار تھے اور ان کا یہ سلسلہ ۱۹۰۵ء
سے جاری ہے یعنی انڈسٹریل کانفرنس میں وہ اسی سال سے شریک ہیں۔ اور بیگم
حسرت موہانی فرماتی ہیں کہ حسرت کا قطعی ارادہ ہے کہ صوبے کے ہر ضلع میں سودیشی
اسٹور قائم کر کے رہیں گے" مولانا کی دور رس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان
کی مردہ اور بے جان صنعتوں میں اس وقت تک جان نہیں پڑے گی۔ اور
انہیں فروغ حاصل نہ ہوگا جب تک ہندوستانی خود اس طرف متوجہ نہیں ہونگے
وہ جب ۱۹۰۵ء میں پہلے پہل انڈسٹریل کانفرنس کے ممبر بنے تو انہیں یہ دیکھ
بڑی حیرت ہوئی کہ اس مسئلہ پر کانگریس کے نرم اور گرم دل آپس میں نبرد آزما
ہیں مولانا کا ایمان تھا کہ انگریز کبھی سودیشی تحریک کی حمایت نہیں کرے گا
جب کہ پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے زعما کا خیال تھا کہ انگریز سودیشی
تحریک کا حامی ہے مولانا نے حسب معمول اپنے ایک مضمون میں اس ضمن میں فریق نرم
کی بعض غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کی۔ انہوں نے سب سے پہلے سودیشی
اور بائیکاٹ کے مسئلہ کو لیا اور اس مضمون میں اس مسئلہ کو اولیت دی گئی
پورا مضمون انتخاب اردوئے معلیٰ کے حصہ دوئم کی زینت ہے جس میں ۱۹۰۳ء
سے لے کر ۱۹۰۸ء تک کے بہترین مضامین نثر و نظم کو جمع کر دیا گیا تھا۔ مولانا کو
اس مسئلہ کی اقتصادی اہمیت کا پورا اندازہ تھا اور انہیں اس بات کا یقین
ہو گیا تھا کہ انگریز ہندوستان کے سیاسی تسلط سے زیادہ اقتصادی تسلط کا
خواہاں ہے اور اس مقصد کے تحت ملکی صنعتوں کا استحکام اور فروغ اس کے
حق میں نہیں جاتا۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ انگریز سودیشی تحریک کی نہ صرف ممد

کے ساتھ مخالفت کرے گا بلکہ اسے بزور کچلنے اور ناکام بنانے کی بھی جد و جہد
کرے گا لیکن جیسا کہ ترک موالات کے مسئلہ پر مولانا کا ذہن اپنے دور کے تمام
رہنماؤں سے آگے سوچتا تھا اور انہوں نے اس سلسلہ میں آزادی کی جو تجویز
احمد آباد کانگریس میں پیش کی تھی اس پر کانگریس نے ۱۹۲۹ء میں عمل کیا اسی
طرح یہ سودیشی تحریک بھی تھی۔ مولانا کا یہ مضمون سودیشی تحریک کے بارے
میں پنڈت موتی لال اور دوسرے زعماء کے تمام دلائل کا مکمل رد تھا۔ اس
مضمون کے مطالعہ سے یہ بات بھی بخوبی عیاں ہو جاتی ہے مولانا کا زاویہ اور گرم
دل کے رہنماؤں کے مقابلہ میں زیادہ صاف اور واضح تھا۔ مولانا نے سودیشی
اور بائیکاٹ کے مسئلہ کے تحت لکھتے ہوئے فرمایا کہ "نرم دل کے ارکان کو اپنی غلط
فہمی کو دور کر لینا چاہئے کہ اہل برطانیہ سودیشی تحریک کے حامی ہیں" اس سلسلہ
میں یو پی پراونشیل کانفرنس کے نرم صدر پنڈت موتی لال نہرو کے اس قول کا حوالہ
دیتے ہوئے کہ "سودیشی کے انگریز منکر نہیں ہو سکتے اس لئے کہ وہ خود پکے
سودیشی ہیں۔ بلکہ وہ لوگ اور ان میں لارڈ کرزن بھی شامل ہیں بار بار سودیشی
کی امداد کا وعدہ کرتے رہتے ہیں۔"

مولانا نے فرمایا "انکے خیال میں تو اس قول کے دونوں حصے از سرتا پا غلط ہیں
اس بات کو دیکھ کر کہ انگریز اپنے ملک کی چیزوں کو اشیائے ممالک غیر پر بہرحال
ترجیح دینا چاہتے ہیں یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ ہندوستان کی سودیشی تحریک کے
بھی معاون ہوں گے اول درجہ کی سادہ لوحی ہے (بعد کے واقعات نے مولانا کی
پیش گوئی کو صحیح ثابت کر دیا اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ ۱۹۰۷ء پنڈت موتی لال
نہرو اور ان کے ہمنوا کتنی زبردست غلط فہمی کا شکار تھے) مولانا مزید فرماتے ہیں
کہ "انگریز تو اپنے ملک میں بھی آزادی کے بڑے حامی ہیں لیکن کیا کوئی ہوش
مند شخص اس سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ وہ اہل ہند کو بھی پولیٹیکل آزادی دینے
کے دل سے خواہاں ہیں" (پنڈت موتی لال نہرو شاید اس زمانہ میں اتنے ہوشمند
نہ تھے) مولانا کے یہ مضامین آج کتنے ہی حقیقت پسند کیوں نہ معلوم ہوتے ہوں
لیکن اس زمانے میں ان کی حیثیت پیشین گوئیوں سے زیادہ نہیں تھی سنیئے آگے

چل کر مولانا پنڈت موتی لال نہرو کے قول کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "رہا لارڈ کرزن کا پر فریب وعدۂ اعانت اور دیگر انگریزوں کا مصنوعی اظہار ہمدردی تو اس کی حقیقت بھی ملاحظہ ہو۔ لارڈ کرزن نے اس زمانہ میں ملکی چیزوں کی تعریف کی تھی جب موجودہ سودیشی تحریکوں کا آغاز نہیں تھا اس لئے ہم کو اس کا کچھ اعتبار نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ غافل لوگوں اور قوموں سے جن کی نسبت یہ یقین ہو کہ وہ اپنے حقوق کے فوری مطالبہ کرنے کی مدت تک قابل نہیں ہو سکتیں بڑے بڑے وعدے کر لینا برٹش پالیسی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے دلکتا صحیح تجزیہ ہے اور وہ بھی ۱۹۰۸ء میں، مثلاً جب اہل ہند اپنے حقوق سے ناواقف یا غافل رہے اس وقت تک ملکہ معظمہ کا یہ اعلان بدستور رہا کہ حکومت ہند انگریزوں اور ہندوستانیوں سے بلا لحاظ قوم و مذہب و رنگ یکساں برتاؤ کرے گی لیکن جب اہل ہند کی آنکھیں کھلیں تو لارڈ کرزن نے سینہ تان کر اس کا مفہوم بدل دیا اور ہم کو یہ خیال کرنے پر مجبور کر دیا کہ اعلان ملکہ معظمہ کی وقعت ایک نمائشی اشتہار سے زیادہ نہیں (اس وقت تک تقسیم بنگال کے اعلان کی منسوخی کا فیصلہ صادر نہیں ہوا تھا) علیٰ ہذا القیاس برٹش مدبروں نے مدتوں تک اہل ہند کو اس دھوکہ میں رکھا کہ حکومت ملک میں حصہ لینے سے وہ صرف اس وقت تک کے لئے محروم ہیں جب تک ان میں کافی قابلیت نہ پیدا ہو جائے لیکن جب ان میں جذبۂ وطن پرستی کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تو لارڈ مارلے نے بھی صاف کہہ دیا کہ ہندوستان کی حکومت ہمیشہ شخصی رہے گی نیز یہ کہ ہندوستانیوں میں اپنے ملک کے انتظام کی قابلیت ہی نہیں ہے۔" مولانا مزید فرماتے ہیں کہ "اب ہم یہ کہتے ہیں کہ سودیشی تحریک کے باب میں بھی انگریزوں کی وہی چالاک پالیسی کام کر رہی ہے کیا معنی کہ جب تک ہم نے حب وطنی کا کوئی عملی ثبوت پیش نہیں کیا اس وقت تک بے شک لارڈ کرزن نے بھی سودیشی کی حمایت کی ہو گی لیکن جس وقت سے ہم میں وطن پرستوں کا ایک آزاد گروہ وجود میں آیا جسے بعض لوگ طنز سے ایجٹیمیسٹ یا فریق گرم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ایکسٹریمیسٹ

کا لفظ ہم نے دانستہ طور پر استعمال کیا ہے۔ اس لئے کہ تماشائی طور پر لارڈ منٹو وغیرہ نے جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی حقیقت ہم کو خوب معلوم ہے لارڈ صاحب سودیشی کے حامی نہیں البتہ سچی سودیشی کے ضرور معاون ہیں مولانا خود آگے چل کر اس سچی سودیشی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ ان کے نزدیک سچی سودیشی اس تحریک کا نام ہے جس سے انگریزوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے مثلاً کپڑوں کے متعلق سودیشی، جھوٹی سودیشی ہے کیونکہ اس سے مانچسٹر کا نقصان ہوتا ہے۔ البتہ شکر کی سودیشی ہے کیونکہ اس کا انگریزوں کی تجارت سے کوئی تعلق نہیں" یہ لکھ کر مولانا دریافت فرماتے ہیں کہ "انگریز تو خیر جھوٹی سودیشی اور بائیکاٹ کے مخالف ہیں کہ وہ ان کے فوائد کے خلاف ہے لیکن فریق نرم کی مخالفت کی بنا کیا ہے" مولانا نے پھر اس کی خود ہی یوں تاویل کی کہ "فریق نرم کو یہ غلط فہمی ہے کہ برطانیہ بھی انہی کی طرح سادہ لوح ہے حالانکہ ان سے زیادہ ہوشیار کوئی دوسری قوم اس وقت دنیا میں موجود نہیں" مولانا نے پھر تحریر فرمایا کہ "انگریز کو تو محض اپنا مفاد عزیز ہے اور وہ لوگ مخالفت صرف اس تحریک کی کرتے ہیں جس سے ان کو نقصان پہنچے اگر بائیکاٹ سے ان کی تجارت کو نقصان نہیں پہنچے گا تو پنڈت موتی لال کے کہنے کے باوجود وہ اس تحریک کی مخالفت نہیں کریں گے اور اگر اس میں نقصان ہوگا تو پنڈت موتی لال کے منع کرنے کے باوجود وہ اس کی مخالفت کریں گے۔ آپ چاہیں اس کو کچھ ہی نام کیوں نہ دیں۔ انگریز تو صرف اپنے فائدے ہی کی بات کرتے ہیں" مختصر یہ کہ بقول مولانا "اگر سودیشی تحریک سے ہندوستان کی مالی حالت درست ہو گی تو اس سے انگلستان کی تجارت کو ضرور نقصان پہنچے گا اور جب یہ ہوگا تو انگریزوں کا ناراض ہونا یقینی ہے" لہٰذا اگر انگریزوں کا خیال ضروری ہے تو سودیشی سے انحراف کیجئے ورنہ سودیشی کے ساتھ بائیکاٹ بھی لازمی سمجھئے کیونکہ اس کے بغیر سودیشی کامیاب نہیں ہو سکتی" مولانا نے ان دلائل کے بعد فریق نرم کی ایک اور غلط فہمی کا بھی ذکر کیا اور فرمایا کہ پنڈت موتی لال نہرو کو یہ غلط فہمی ہے کہ سودیشی تحریک بائیکاٹ کئے بغیر کامیاب ہو سکتی ہے۔ پنڈت

موتی لال نہرو لکھتے ہیں کہ کیا حُبِ وطن کے پاک اور رُوحانی جذبہ کی
بِن پر سودیشی تحریک کا دار و مدار ہے ذاتی قوت کافی نہیں کہ ہم اس میں
شمنی اور عداوت کے ادنیٰ جذبوں کو بھی شریک کرتے ہیں۔“ آپ کا یہ قول بھی
ہ بدیشی چیزوں کی آمد تب ہی قطعی طور پر بند ہو سکتی ہے جب سودیشی
یزیں ان سے اچھی اور سستی بننے لگیں جب ہم اس قابل ہو جائیں گے۔ تو
یشی چیزوں کی آمد روکنے کے لئے بائیکاٹ کی ضرورت ہی نہ رہے گی“ یہ
تراضات اس زمانہ میں کیا اس کے بعد بھی مغرب زدہ طبقہ کی زبان پر جاری
ساری رہتے ہیں چنانچہ مولانا نے ان دلائل کے رد میں جو خیالات اس وقت
پنڈت موتی لال نہرو کے سامنے پیش کئے وہ آج بھی (مغرب زدہ) لوگوں کے لئے
مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں مولانا فرماتے ہیں کہ ”امر اول کی نسبت ہم یہی
ہتے ہیں کہ انگریز سودیشی تحریک کی مخالفت نہ کرتے تو اس کی قطعی ترقی کے
ئے صرف پاک اور رُوحانی جذبہ کافی ہو سکتا تھا“ مولانا دراصل اس قسم کے فلسفیا
یالات پر مطلق اعتبار نہیں کرتے تھے کیونکہ تاریخی واقعات کی بنا پر یہ کہنا کہ
ئی قوم فلسفہ اور صلح کلی کے اصول کی پیروی کر کے سرسبز نہیں ہو سکتی زیادہ
یح ہے بہ نسبت فریق دوم کے اس قول کے کوئی قوم صرف نفرت اور دشمنی کے
بالات سے کامیاب نہیں ہو سکتی“ مگر مولانا نے مذکورہ بات صرف بطور استدلال
بان فرمائی ہے چنانچہ یہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ”جب حکومت کی جانب سے
ودیشی کی مخالفت میں صریحی طور پر سیاسی دباؤ ڈالا جائے تو پھر اس کے جواب
یں سیاسی اور مذہبی دباؤ کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ ہمارے خیال میں لازمی ہو
جاتا ہے ورنہ حکومت کی عظیم الشان اور باقاعدہ مزاحمت کے مقابلہ میں اس
تحریک کا صرف اخلاقی طور پر قائم رہنا یقیناً ناممکن ہے“ اسی طرح پنڈت
موتی لال نہرو کی دوسری دلیل کے بارے میں مولانا نے یہ اظہارِ خیال فرمایا ہے
پنڈت صاحب کا دوسرا قول۔ اس کی صحت کا ہم کو اقرار ہے لیکن سوال یہ
ہے کہ سودیشی چیزیں سستی اور اچھی کیونکر بنیں۔ ہمارے خیال میں اس کی صورت
سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ ہندوستان کی برباد شدہ صنعت و حرفت

جس کا خون بلا شبہ غرض پرستان برطانیہ کے سر ہے دوبارہ درجۂ عظمت و کامیابی پر فائز ہو اور یہ امر مسلم ہے کہ کسی ملک کی تباہ شدہ صنعت دوبارہ قائم نہیں ہو سکتی جب تک حکومت کی جانب سے کم از کم ابتدا میں اس کی حفاظت ممالک غیر کی چیزوں پر محصول لگا کر نہ کی جائے چنانچہ خود انگلستان کی صنعت پارچہ بافی کی ابتدا اور ترقی اسی طرح ہوئی کہ اس نے پہلے ہندوستان کی قیمت پارچہ بافی کو اصل قیمت سے دگنا چوگنا بلکہ دس گنا محصول لگا کر بالکل مٹا دیا۔ اب اگر ہندوستان خود مختار ہوتا تو وہ بھی یہی تدبیر اختیار کرتا۔ لیکن چونکہ اس کی حکومت دوسروں کے قبضے میں ہے اس لئے اہل ہند کے لئے اپنی صنعت کو دوبارہ قائم کرنے کی سوائے اس کے اور کوئی شکل ہی نہیں ہے کہ وہ کم از کم کچھ روز ہی کے لئے بائیکاٹ کو اپنے اوپر لازم کر لیں کیونکہ سب سے بڑی تجارت یعنی کپڑے کی تجارت جس کا انتظام ہندوستان میں سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ مانچسٹر والوں کے قبضے میں ہے۔ طبقۂ متوسط کو بے شک کچھ دنوں تک گراں مال خریدنا پڑے گا لیکن ان کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ نقصان بالکل اسی نقصان کے مشابہ ہے جو طلبا کے والدین اپنے لڑکوں کی تعلیم پر بخوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ جہاں تک غرباء کا تعلق ہے انہیں مالی نقصان برداشت کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے ان کا طریقہ کار یہ ہونا چاہئے کہ چند سال تک بجائے ململ کے موٹے دیسی کپڑے استعمال کریں جس میں کسی قدر تکلیف تو ضرور ہوگی لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ دام بھی بچ جائیں گے جہاں تک متوسط طبقہ کا خیال ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے والدین اپنے بچوں کی تعلیم پر روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ کیا معنی کہ جس طرح تعلیم یافتہ ہو کر وہ خرچ شدہ رقم سے بہت زیادہ روپیہ پیدا کر لیتے ہیں اسی طرح ۵ یا دس سال تک قلیل نقصان برداشت کرنے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ملک میں صدہا کارخانے قائم ہو جائیں گے اور جب ان میں آپس میں مقابلہ ہوگا تو یہ چیزیں بھی اچھی بنیں گی جو انگریزی چیزوں سے اچھی ہوں گی اور انگریزی چیزوں سے سستی بھی ہوں گی کیونکہ اوّل تو انگلستان میں مزدوری کی شرح بہت زیادہ ہے

دوسرے خام پیداوار کے ہندوستان سے انگلستان جانے پر اور پھر وہاں تیار مال بن کر آنے پر ڈبل محصول کا علیحدہ اضافہ ہوتا ہے جس سے بدیشی چیزوں کی قیمت بھی بڑھ جاتی ہے۔ جس وقت یہ صورت حال پیدا ہو جائے گی اس وقت بجائے نقصان کے ہم کو عظیم اور دوامی فائدہ ہو گا اور زمانۂ بائیکاٹ کے ۱۰،۸ برس کا نقصان چند ماہ میں پورا ہو جائے گا غرضیکہ جو لوگ بائیکاٹ پر اس بنا پر اعتراض کرتے ہیں کہ ارزاں شئے کے مقابلہ میں گراں چیز خریدنا انسانی طبیعت کے خلاف ہے ان کو اچھی طرح سن لینا چاہیئے کہ بائیکاٹ کوئی دوامی تحریک نہیں ہے بلکہ اس کا بھی یہی منشا ہے کہ گراں بدیشی اشیاء کی جگہ ارزاں دیسی چیزیں رائج ہو جائیں پس جس وقت مذکورہ بالا طریقے کے مطابق صورت ہو جائے گی اس وقت بائیکاٹ کی مطلق ضرورت باقی نہ رہے گی لیکن بائیکاٹ کو دوامی تحریک سمجھنے کے علاوہ ہمارے نرم لیڈروں کی چوتھی غلط فہمی یہ ہے کہ بائیکاٹ یا تو کامل ہونا چاہیئے یا نہ ہونا چاہیئے اور اس غلط فہمی کی تائید میں وہ لفظ بائیکاٹ کے لغوی معنی پیش کرتے ہیں ہم کہتے ہیں کہ ہندوستان کی حالت زار اس امر کی مقتضی نہیں کہ ہم اپنے فوائد کے مقابلہ میں کسی لفظ کے لغوی یا اصطلاحی معنوں کے پھیر میں پڑے رہیں۔ ہم یقیناً بائیکاٹ کی وہی صورت اختیار کریں گے جو سب سے زیادہ مفید طلب ہو۔ اور جس پر ہم سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ کاربند ہو سکتے ہوں اور اس صورت کا نام تدریجی بائیکاٹ ہے یعنی یہ کہ جن چیزوں کو ہم کم دشواری کے ساتھ ترک کر سکتے ہوں انکو بلا تامل ترک کر دیں اور آئندہ کے لئے ان متروک چیزوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش میں دل و جان سے مصروف رہیں بعض لوگ تدریجی بائیکاٹ کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن ہم ان کو آگاہ کئے دیتے ہیں کہ بائیکاٹ کی یہ قسم ہندوستان کی ایجاد کردہ نہیں ہے بلکہ ہم سے پہلے اور بھی کئی ملک اس پر عمل کر کے کامیاب ہو چکے ہیں حال ہی میں نیویارک کے مشہور بیرسٹر نلپس نے بابو بپن چندر پال کے نام ایک نہایت پر معنی خط لکھا ہے جس میں امریکہ کی گذشتہ ماتحتیٔ انگلستان کا ہندوستان کی موجودہ حالت سے مقابلہ کیا ہے۔ اس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ برٹش پالیسی سے ناراض ہو کر امریکہ نے انگلستان

کے مال کے خلاف تدریجی بائیکاٹ کا ہی اصول اختیار کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہم امریکہ کی صنعت و حرفت کو انگلستان سے بھی بہتر حالت میں پاتے ہیں۔ رہا یہ شبہ کہ امریکی بائیکاٹ کی طرح ہندوستانی بائیکاٹ بھی اس وقت تک کامل طور پر کامیاب نہیں ہوا اس کا سبب کچھ تو یہ ہے کہ اقوام ہند میں باشندگان امریکہ کی طرح اتحاد نہیں ہے لیکن قوی سبب یہ ہے کہ ہمارے نرم لیڈر نادان دوست کی حیثیت سے عوام کو بجائے بائیکاٹ پر آمادہ کرنے کے خواہ انہیں ڈراتے اور پست ہمت بناتے ہیں اور اسی میں اپنی اور اپنے ملک کی بہتری تصور کرتے ہیں اللہ ان کو راہ راست پر لائے" مولانا نے اپنے اس مضمون میں سودیشی تحریک کے اسباب و علل اور اس کی کامیابی کا جو سائنسی تجزیہ پیش کیا تھا اس کو اس وقت کے سرکردہ لوگ ماننے پر تیار نہیں تھے۔ کاش یہ تجویز اس وقت مان لی جاتی تو ہندوستان کی آزادی کی تاریخ اور قریب آجاتی ہے حیرت تو ہے کہ اس مضمون کی اشاعت کے دس برس بعد بھی جب مولانا نے کانگریس میں انگریزی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی تحریک کی حمایت کی قرارداد پیش کی تو مسٹر گاندھی نے جو ہندوستان کی آزادی کے باوا آدم کہے جاتے ہیں اس کی مخالفت کی جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔ فی الحال سودیشی تحریک کا ذکر ہی جاری رہے گا۔ مولانا نے درمے قدمے سودیشی تحریک کی حمایت کی اور جیسا کہ صاحب حالات حسرت نے لکھا ہے اور اس کا اوپر حوالہ بھی دیا جا چکا ہے مولانا نے اس کے لئے ملک گیر دورے کئے یہاں تک کہ علمائے کرام سے بھی سودیشی تحریک کی حمایت میں فتویٰ حاصل فرمائے اور ان کی اشاعت کی اور جب دوسری گرفتاری اور نظر بندی کے بعد وہ رہا ہوئے تو انہوں نے علی گڑھ سے ترک سکونت کی اور کانپور آکر آباد ہوئے۔ یہاں آکر انہوں نے خلافت سودیشی اسٹور لمٹیڈ کے نام سے سودیشی کپڑے اور دیگر مصنوعات کے لئے دس لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے ایک فرم قائم کی جس کی رسم افتتاح ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نے انجام دی۔ بلاشبہ مولانا کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ تھا وہ خود اس فرم کے منیجنگ ڈائرکٹر تھے یہ واقعہ ہے کہ سودیشی تحریک کے اس پرجوش مبلغ نے پھر ساری عمر غیر ملکی کپڑا استعمال نہیں کیا اور ۱۹۰۷ء میں

پنڈت موتی لال نہرو کے خیالات کے جواب جو مضمون انہوں نے لکھا تھا۔ اور اس میں جو دلائل پیش کئے تھے ان پر وہ آخر وقت تک قائم رہے یہاں تک کہ بدیشی کپڑے کی ایک دھجی بھی اپنے گھر کی چہار دیواری میں داخل نہ ہونے دی صرف کپڑا ہی نہیں وہ ہر حال اور ہر قیمت پر ہندوستانی مصنوعات ہی استعمال کرتے تھے۔کوئی ایسی چیز جو ملک میں تیار نہیں ہو سکتی اسے اول تو مولانا استعمال کرنے سے سخت احتراز کرتے تھے اور اگر کسی پیٹنٹ دوا، عینک یا گھڑی وغیرہ کے استعمال پر مجبور ہو جاتے تو بھی برطانیہ کی بنی ہوئی کسی بھی چیز کے استعمال کو اپنے لئے ناجائز سمجھتے تھے کانپور کا یہ سودیشی اسٹور کیا تھا اور کیسا تھا اس کے لئے ملا رموزی، کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے " ابھی میں نہیں پہچانتا تھا کہ حسرت کون ہیں اور کیسے ہیں کہ ایک دن ۴ بجے شام کو قبلہ آزاد سبحانی کے ہمراہ سرسید گھاٹ کے چوراہے سے واپس کو گھوما تو میں نے دیکھا کہ ایک نہایت کشادہ کپڑے کی دوکان میں مولانا سبحانی داخل ہوئے ہیں ابھی مجھے حسرت نظر نہیں آئے تھے مگر میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹے قد کے آدمی نے آزاد سے مصافحہ کیا جو سنہری عینک لگائے ہوئے تھے اس وقت حضرت آزاد نے مجھے بھی دیکھ لیا اور آواز دیکر بلا لیا اور فرمایا کہ میرے پاس بیٹھو جیسے ہی میں قریب ہوا کہ مردم شناس حسرت نے قدرے اونچے ہو کر مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اخاہ تم تو میرے دوست کے بھتیجے ہو شاید میرے حاضر ہونے سے پہلے حضرت آزاد حسرت قبلہ کو بتا چکے تھے کہ یہ لڑکا علامہ برکت اللہ بھوپالی صدر غدر پارٹی امریکہ برائے ہندوستان کا حقیقی بھتیجا ہے اس کے بعد کچھ مسلمان گاہک آئے مولانا ان سے گفتگو میں منہمک ہو گئے۔خاص بات یہ ہے کہ اس تاریک عہد میں حسرت قبلہ نے کھادی۔کھدر کو ترقی دینے کے مقصد سے یہ دوکان کھولی تھی جس پر ہر طرف کھادی ہی کھادی نظر آتی تھی مگر مولانا خود فرماتے تھے کہ ہندؤں کی چھوت چھات اور مسلمانوں سے علیحدگی اور نفرت کا یہ حال ہے۔کہ میری دوکان سے کھادی خریدنے میں بھی انہیں تکلیف ہوتی ہے " اس کی وجہ مسٹر گاندھی کی فرقہ پرستانہ پالیسی تھی۔جس کے اثرات اب نمایاں ہونے لگے تھے

یہی وہ زمانہ تھا کہ جب مولانا نے کانگریس اور خلافت کے جلسوں میں بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تجویز پیش کی اس واقعہ کا تذکرہ خود مسٹر گاندھی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری تلاش حق میں کیا ہے اور انہی کے الفاظ میں اس کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ خود ان کے اپنے الفاظ میں مولانا کی فکری اور ذہنی بلندی کی گواہی دلائی جائے گاندھی جی لکھتے ہیں کہ مولانا حسرت موہانی اس جلسہ میں موجود تھے میں انہیں پہلے سے جانتا تھا۔ مگر یہ اس کانفرنس میں آکر معلوم ہوا کہ وہ کس غضب کے لڑنے والے ہیں مجھ میں اور ان میں ابتدا سے اختلاف رائے تھا اور بعض مسئلوں میں اب تک ہے۔ منجملہ اور بہت سے ریزولیشنوں کے جو کانفرنس میں پاس ہوئے ایک یہ بھی تھا کہ ہندو اور مسلمان سودیشی چیزوں کے استعمال کا عہد کریں اور اس بناء پر بدیشی چیزوں کا مقاطعہ کریں کھدر کی ابھی اتنی قدر نہیں تھی جتنی ہونی چاہیئے (گاندھی جی اس وقت بساط سیاست ہند کے ایک بڑے شاطر تھے انہیں شاید یہ معلوم نہیں تھا۔ کہ مولانا بہت عرصہ سے سودیشی تحریک سے دلچسپی ہے لہذا فرماتے ہیں کہ یہ ریزولیشن حسرت صاحب کے مذاق کا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر خلافت کے معاملہ میں سلطنت برطانیہ انصاف نہ کرے تو اس سے اس کا بدلہ لیا جائے اس لئے انہوں نے اس مقابلہ میں یہ تجویز پیش کی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے برطانوی چیزوں کا مقاطعہ کیا جائے۔ میں نے اصولی اور عملی نقطۂ نگاہ سے اس تجویز کی مخالفت کی اور ان ہی دلیلوں سے کام لیا۔ جن سے لوگ اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں میں نے کانفرنس کے سامنے اپنا عدم تشدد کا اصول بھی پیش کیا میں نے دیکھا کہ حاضرین پر میری دلیلوں کا بہت اچھا اثر ہوا مجھ سے پہلے حسرت صاحب کی تقریر پر اس قدر نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے تھے کہ مجھے خوف تھا کہ میری بات کوئی نہیں سنے گا۔ میں نے محض اس خیال سے زبان کھولنے کی جرأت کی کہ اگر میں اپنے خیالات کانفرنس کے سامنے پیش نہ کروں تو یہ ادائے فرض میں کوتاہی ہو گی لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی کہ حاضرین نے میری تقریر بہت توجہ سے سنی اور جو لوگ پلیٹ فارم پر تھے انہوں نے یکے بعد دیگرے میری تائید میں تقریریں کیں۔ لیڈروں کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ برطانوی چیزوں کا

مقاطعہ چلنے والا نہیں اور اس کوشش سے کچھ حاصل نہ ہوگا بلکہ مفت میں جگ ہنسائی ہوگی اس مجمع میں شاید ہی کوئی شخص ہو۔ جس کے جسم پر برطانوی ساخت کی کوئی نہ کوئی چیز موجود نہ ہو۔ اس لئے اکثر حاضرین کو یہ محسوس ہوا کہ ایسا ریزولیشن پاس کرنے سے جس کی تعمیل خود ووٹ ڈالنے والوں کے لئے ناممکن تھی سراسر نقصان ہو گا مولانا نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ محض بدیشی کپڑے کا مقاطعہ ہی ہمارے لئے کافی نہیں۔ خدا جانے وہ دن کب آئے کہ سودیشی کپڑا کافی مقدار میں تیار ہو سکے۔ اور بدیشی کپڑے کا مقاطعہ پوری طرح کامیاب ہو۔ ہمیں تو کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے جس کا اثر برطانیہ والوں پر فوراً پڑے آپ شوق سے بدیشی کپڑے کا مقاطعہ کیجئے ہمیں اس سے کوئی عذر نہیں مگر اس کے علاوہ بھی کوئی ایسی تجویز ہونی چاہئے جس پر فوراً عمل ہو سکے جس وقت وہ یہ الفاظ کہہ رہے تھے میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ واقعی ہمیں بدیشی کپڑے کے علاوہ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے میرا بھی یہی خیال تھا کہ بدیشی کپڑے کا فوری مقاطعہ ناممکن ہے اس وقت تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اگر ہم چاہیں تو اپنی ضروریات کے لئے کافی کھدر تیار کر سکتے ہیں (یہ اعتراف حقیقت نہیں تو پھر کیا ہے کہ مولانا کی کوششوں سے اس وقت کھادی کا استعمال بڑھ چکا تھا) یہ حقیقت مجھ پر آگے چل کر کھلی زبان کو اپدیش کے معاملہ میں بھی حقیقت بہت بعد میں واضح ہوئی، مگر اتنا میں جانتا تھا۔ کہ اگر ہم بدیشی کپڑوں کے مقاطعہ کے پابند رہیں تو دھوکہ کھائیں گے میں ابھی اس الجھن میں تھا کہ مولانا کی تقریر ختم ہو گئی"

مسٹر گاندھی نے اپنے ایک خط میں بھی جو انہوں نے ۱۵ ستمبر ۱۹۲۴ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کو تحریر کیا تھا لکھا تھا کہ مولانا حسرت چرخہ کاتنے کے خلاف ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ کانگریس سے الگ ہو کر اس کام میں تن من دھن سے لگ جاؤں اس لئے کہ یہ بجائے خود ایک بہت بڑا کام ہے مگر لوگ اس کے لئے بھی تیار نہیں ہوئے۔ گاندھی جی نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ مولانا حسرت آج یہاں آئے تھے اور ان سے میں نے کافی دیر تک چرخہ کاتنے کے مسئلہ پر بات کی تھی لیکن وہ اسے فضول سمجھتے تھے۔ اگر گاندھی جی اس زمانہ میں بدیشی مال کے بائیکاٹ

کی تجویز مان لیتے تو ہم یقیناً ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی آزاد ہو جاتے۔

اگرچہ مولانا کا خلافت سودیشی اسٹور زیادہ عرصہ تک کامیابی کے ساتھ نہیں چلا مگر مولانا اور بیگم حسرت دونوں اپنی اس دھن میں مصروف و منہمک رہے سرسید گھاٹ سے یہ اسٹور منتقل ہو کر کشن روڈ پر آگیا اور پھر وہاں سے ۱۹۳۰ء میں میڈ بازار میں منتقل ہو گیا اس کے کئی نام بدلے مگر مولانا کسی نہ کسی طرح سودیشی تحریک کو چلاتے رہے اور جب کانگریس نے آخر کار جھک مار کر مولانا کے نظریات کو قبول کیا اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک چلائی تو حالانکہ مولانا اس وقت تک کانگریس سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور ان کے خیال میں مسلمانوں کو کانگریس کی تحریک سول نافرمانی سے الگ رہنا زیادہ مناسب تھا مگر اس کے باوجود انہوں نے لکھا کہ اگر مسلمان ولایتی کپڑے کے بائیکاٹ کے سلسلہ میں دوکانوں کی پکیٹنگ نہ کریں تو کم از کم بائیکاٹ کی کسی کارروائی کی مخالفت بھی نہ کریں۔ مولانا نے اس سلسلہ میں تحریک آزادی اور مسلمان کانپور کے عنوان سے اخبار مستقل کی اشاعت مورخہ ۹ مئی ۱۹۳۰ء میں ایک اداریہ سپرد قلم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ولایتی مال کے بائیکاٹ کی تحریک کو ناکام بنانے کی کوشش کرنا اور ولایتی کپڑے کی خریداری پر اعلانیہ فخر اور اصرار کرنا ہمارے نزدیک کسی غیور اور باحمیت مسلمان کے شایان شان نہیں۔" مولانا نے خود ۱۹۰۷ء میں بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تجویز نہ صرف پیش کی تھی بلکہ ان کا اپنا طرز عمل بھی بدیشی مال کے بائیکاٹ کا مکمل نمونہ تھا یہ افسوس کی بات ہے کہ جو بات مولانا نے ۱۹۰۷ء میں کہی تھی کانگریسی رہنماؤں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ ۱۹۳۰ء میں کیا جب دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی مولانا جس طرح بدیشی مال کے بائیکاٹ کے حامی تھے اسی طرح وہ سول نافرمانی کے بھی حامی تھے حالانکہ کانگریس سے ان کا اب کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ کانگریس پر مسٹر گاندھی کے غلبہ کو ملک و قوم کیلئے نقصان دہ سمجھتے تھے مگر ان کو اس بات کا افسوس تھا کہ ہندو کانپور نے جمہور مسلمین کے ساتھ مفاہمت اور مصالحت کی نہ کبھی کوئی کوشش کی اور نہ اس کی ضرورت سمجھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اگر مسلمانوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تو کچھ بے جا نہ ہوا

کہ جب برادران وطن کو بظاہر نہ ہماری پروا ہے اور نہ ضرورت تو پھر خواہ مخواہ قید اور گرفتاری کی زحمت اور کشمکش کے جھگڑوں میں پڑنے کی بجائے ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ ہم اس تحریک سے علیحدہ رہیں اور غیر جانبداروں کی طرح تماشائی بنے رہیں۔ مولانا نے مذکورہ بالا جملوں میں جس تلخ حقیقت کا انکشاف کیا اس سے کوئی بالغ نظر انکار نہیں کر سکتا۔ ہندوؤں کی اس بے پروا ہی کا باعث مسٹر گاندھی تھے ورنہ ان کی آمد سے قبل جیسا کہ مولانا کے بیانات اور نظریات سے پتہ چلتا ہے ہندوؤں اور مسلمانوں میں برابر میل ملاپ تھا۔ اور سوچنے کا ڈھنگ مخلصانہ اور وطن پرستانہ تھا مسٹر گاندھی نے ہندوستان کے میدان سیاست میں داخل ہو کر اسے مذہبی تعصب سے آلودہ کیا اور ہندو قوم کو غرور اور تکبر کا ایسا سبق دیا کہ وہ بقول مولانا مسلمانوں کو بالکل بھول گئی اور اسے آزادی کی جد وجہد میں مسلمانوں کی امداد و اعانت کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ مولانا جیسا سمجھدار، غیور، مخلص اور محب وطن جب اس تلخ حقیقت کا اظہار کرے تو کون ہے جو اس کی حقیقت اور وجود سے انکار کر سکتا ہے۔ یہ صرف مولانا کی اصول پرستی اور کمال استقلال تھا کہ انہوں نے یہ محسوس کرنے کے باوجود مسلمانوں کو کانگریس کی تحریک سول نافرمانی اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی مہم کی مخالفت نہیں کرنا چاہئے تو کہ یہ اپیل مقصد سے ہم آہنگی کے باعث تھی طریقۂ کار سے ہم آہنگی کے باعث نہیں اور یہ بات بھی صرف وہی کہہ سکتے تھے جو اخلاص کی اس منزل میں تھے جہاں مسٹر گاندھی اور ان کے حواریوں کے کبھی قدم تک نہ پہنچ سکتے تھے۔

یہی نہیں بلکہ اس تلخ حقیقت کے اظہار کے بعد بھی جس کو ملا رموزی نے اپنے مضمون میں بیان کیا ہے مولانا نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو مستقل میں ایک اور مضمون شائع کیا کہ ہندوستان سے سالانہ ایک ارب ۱۹ کروڑ روپیہ مختلف اشیائے صرف کی قیمت میں انگلستان جا رہا ہے انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے اخبار میں بدیشی مال کے بائیکاٹ کی خبروں کو بھی نمایاں طور پر شائع کیا۔ ملک میں سودیشی تحریک کو فروغ دینے کی جو اسکیم کانگریس کے تحت نافذ ہوئی تھی

اسے اپنے اخبار کے صفحۂ اوّل پر شائع فرمایا چونکہ یہ اسکیم اس سودیشی تحریک کا حصہ ہے جس کا مولانا ۱۹۱۸ء سے پرچار کر رہے تھے اس لئے اس کا اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔

"بمبئی کے ان غیر ملکی پارچہ فروشوں کو امداد دینے کے متعلق جن کے مال پر کانگرس نے مہر لگا دی ہے سودیشی کارخانہ داروں اور غیر ملکی پارچہ فروشوں کے مابین جو معاہدہ ہو گا۔ اس کی شرائط حسبِ ذیل ہیں۔

۱:۔ پارچہ فروش یہ عہد کریں کہ وہ آئندہ غیر ملکی کپڑے کی تجارت نہ کریں گے

۲:۔ پارچہ فروش اپنے غیر ملکی کپڑے کا اسٹاک کارخانہ داروں یا فروخت کنندہ آڑھتیوں کے حوالے کر دیں جو اسٹاک کو اپنے قبضہ میں بطور ضمانت اس وقت تک رکھیں جب تک موجودہ معاہدہ پر عملدرآمد رہے گا۔

۳:۔ کارخانہ اور آڑھتی موجودہ غیر ملکی پارچہ فروشوں کو اس غیر ملکی پارچہ کی ۸۰ فیصد مال قرض دیں گے جو ان کے پاس بطورِ ضمانت جمع ہو گا۔

۴:۔ حسابات ہر ماہ طے کئے جائیں گے یعنی جو مال ایک ماہ کے اندر فروخت ہو اس کی قیمت فوراً کارخانہ داروں اور آڑھتیوں کو اس ماہ کے ختم ہوتے ہی ادا کر دی جائے اور بشرطِ ضرورت اس قیمت کا کپڑا پھر قرض دیا جائے گا۔

۵:۔ اس معاہدہ پر اس وقت تک عمل در آمد رہے گا جب تک کانگرس غیر ملکی کپڑے کا بائیکاٹ کرتی رہے گی۔

۶:۔ غیر ملکی کپڑے کا جو اسٹاک کارخانہ دار اور آڑھتی بطور ضمانت اپنے پاس رکھیں گے وہ صرف کانگرس کے فیصلہ کے مطابق فروخت کیا یا باہر بھیجا جا سکے گا اور کانگرس کا فیصلہ ماننے کو دونوں فریق پابند ہونگے

۷:۔ اگر فریقین میں کوئی اختلاف رائے ہو جائے تو معاملہ پنچایت میں پیش جائے گا۔"

آپ ان شرائط کو دیکھیں اور پھر ۱۹۲۸ء میں پنڈت موتی لال نہرو کے جواب میں مولانا کا مدلل مضمون مطالعہ فرمائیں تو پتہ چلے گا کہ مولانا نے جو بات

اس وقت بھی تھی اس پر اگر اس وقت عمل ہو جاتا تو ملک و ملت کی آزادی کی راہ کتنی جلد سر ہو جاتی۔ پھر اس وقت ملک میں ہندو مسلم تعصب بھی نہیں تھا اور برصغیر کے تمام لوگ ایک جان و دو قالب تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں کانگریس نے جس بدیشی مال کے بائیکاٹ کی مہم چلائی اس وقت مسٹر گاندھی کی کوششوں سے ہندو اور مسلمانوں میں اختلاف کی بنیاد مستحکم ہو چکی تھی اور کانگریس گاندھی جی کی منشا اور مقصد کے بموجب خالص ہندو جماعت بن چکی تھی اور بقول مولانا ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ ہندو آزادی کی جد وجہد میں مسلمانوں کی شمولیت کی جانب سے بے پرواہ ہو گئے تھے یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کو جس کی کامیابی کے مولانا بھی متمنی تھے کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔

سودیشی تحریک کو کامیاب بنانے میں مولانا کے ساتھ ساتھ بیگم حسرت بھی پیش پیش تھیں وہ جب تک زندہ رہیں یہ تحریک کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہی۔ جیسا کہ بیگم حسرت کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے علی گڑھ میں موہانی سودیشی اسٹور کی روح رواں بیگم حسرت تھیں اس کے بعد جب مولانا سودیشی تحریک کو کامیاب بنانے کی خاطر علی گڑھ سے کانپور منتقل ہوئے جو اس زمانہ میں شمالی ہند کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا اور یہاں سنہ ۱۹۲۰ء میں خلافت سودیشی اسٹور لمیٹڈ قائم ہوا تو بیگم صاحبہ یہاں بھی پیش پیش تھیں۔ مولانا کی دوسری گرفتاری کے زمانہ میں سنہ ۱۹۱۶ء سے لے کر سنہ ۱۹۱۸ء تک اور پھر ان کی تیسری گرفتاری کے دوران سنہ ۱۹۲۲ء سے سنہ ۱۹۲۴ء تک علی گڑھ میں موہانی اسٹور اور کانپور میں موہانی سودیشی اسٹور خلافت سودیشی اسٹور چلانے کی تمام تر ذمہ داری بیگم حسرت موہانی پر تھی موہانی سودیشی اسٹور تو مالی اعتبار سے زیادہ منفعت بخش ثابت نہیں ہوا۔ لیکن خلافت سودیشی اسٹور اپنے ابتدائی ایام میں اس درجہ کامیاب ہوا کہ حصہ داروں میں منافع تقسیم ہوا۔ میاں بیوی میں اکثر خط وکتابت کا موضوع بھی یہی سودیشی اسٹور ہوا کرتا تھا جس کا ذکر بیگم حسرت کے حالات میں بیان ہو چکا ہے خلافت سودیشی اسٹور کے سلسلہ میں بیگم صاحبہ کے عزم کا پتہ اس خط سے پتہ چلتا ہے جو انہوں نے اس ضمن میں

۹ جمادی الاوّل مطابق ۱۹۲۳ء کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو پونا سے تحریر کیا جس میں خلافت سودیشی اسٹور کے بارے میں مولانا فرنگی محلی کو مطلع کیا کہ خلافت جنرل اسٹور کی میٹنگ ۵ ۔فروری کو ہوئی۔ مولانا حکیم صاحب (حکیم اجمل خان) ہدایت حسین بیرسٹر (سابق صدر آل انڈیا مسلم لیگ) اور محمد اصغر (ڈائریکٹر) کو شروع جنوری میں تار روانہ کئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح اسٹور ٹوٹنے نہ پائے میں نے بھی سب کو تاکیدی خطوط لکھے نتیجہ خدا کو معلوم ہے" مولانا کی خواہش کے مطابق اسٹور تو باقی رہا۔ مگر مولانا کی ڈھائی سال کی عدم موجودگی کے باعث جس عرصہ میں بیگم حسرت موہانی بھی بیشتر وقت ان کی رفاقت کے لئے احمد آباد اور پونا میں قیام پذیر رہیں کاروبار ایسا گڑ گیا کہ جیل سے رہائی کے بعد اس کو بند ہی کرنا پڑا اور بقیہ سرمایہ شرکا میں بقدر حصہ رسدی تقسیم کر دیا گیا۔ مولانا نے اس پر بھی ہمت نہ ہاری اور موہانی سودیشی اسٹور کے نام سے ایک ادارہ پہلے تو مشٹن روڈ پر اور پھر وہاں سے میدہ بازار میں چلاتے رہے اور اس عرصہ میں بقول پروفیسر عبدالشکور جب تک بیگم حسرت زندہ رہیں یہ اسٹور کسی نہ کسی طرح چلتا رہا گویا یہ اسٹور ۱۹۳۷ء تک جس سن میں بیگم صاحبہ کی وفات ہوئی موجود رہا۔

خلافت سودیشی اسٹور

خلافت اسٹور نے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں جو کردار ادا کیا اس کے بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے یہ اسٹور ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۲۵ء تک ہندوستان کی سیاست کا مرکز تھا اور یہیں سے مولانا کو ۱۹۲۲ء میں گرفتار کیا گیا اور یہیں مولانا کی رہائی کے زمانہ میں ملک کے گوشہ گوشہ سے رہنمایان قوم آکر ان سے سیاسی مشورے کرتے ہیں یہ محض دعویٰ نہیں بلکہ اس سلسلہ میں جناب سردار علی صابری سابق ایڈیٹر انجام کراچی کی گواہی بھی پیش کی جاتی ہے جنہوں نے اس اسٹور کی دیکھ بھال میں کئی سال بسر کئے اور جو مولانا اور بیگم حسرت موہانی کی عدم موجودگی میں اس کے نگران تھے۔ صابری صاحب لکھتے

ہیں کہ کانپور میں سید الاحرار مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کے خلافت
سودیشی اسٹور لمیٹڈ کا بنیادی مقصد قیام تو یہ تھا کہ یو۔پی میں سودیشی
کپڑے کی تھوک تجارت کا ایک بڑا ادارہ قائم ہو جائے لیکن اس نے بڑی تیزی
کے ساتھ تحریک آزادی ہند اور دیگر سیاسی اور نیم سیاسی تحریکوں کے ایک
اہم مرکز کی شکل اختیار کر لی۔ خلافت اسٹور کی زندگی کی پہلی سانس ۱۹۲۰ء سے
لے کر آخری سانس ۱۹۳۵ء تک ہندوستان میں جتنی قابل ذکر تحریکیں جاری ہوئیں
چاہے وہ گاندھی جی کی تحریک ترک موالات ہو یا علی برادران کی تحریک خلافت
آل انڈیا مسلم لیگ ہو یا پنڈت موتی لال نہرو کی جوابی تعاون کی تحریک۔ دیش
بندھو چترنجن داس کی سوراجیہ پارٹی ہو لالہ لاجپت رائے کی پیپلز پارٹی،
سردار کھڑک سنگھ کی بیرا کالی پارٹی ہو ہم ایسے سر پھرے نوجوانوں کی ساختہ نوجوان
بھارت سبھا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی تنظیم ہو یا مولانا غلام بھیک نیرنگ کی
تبلیغ۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا احمد سعید کی جمعیۃ العلمائے ہند یا حضرت
مولانا قیام الدین عبدالباری اور راجہ صاحب سلیم پور کی خادم الحرمین۔ غرضیکہ
ان بے شمار تحریکوں میں کون سی تحریک ایسی تھی جس کے مشہور ہندو و مسلم زعماً
وارکین ہندوستان کے مختلف حصوں سے آکر اور سید الاحرار مولانا حسرت موہانی
کے خلافت اسٹور میں مجتمع ہو کر تبادلۂ خیالات نہ کرتے ہوں۔ لطف یہ ہے کہ این
سی کیلکر۔ بھائی پرمانند۔ ڈاکٹر مونجے اور سوامی ستیہ دیو جیسی نئی جوانی کے
غیر اندیشی زمانہ میں سوامی ستیہ دیو کہہ کر بہت پریشان کرتا تھا اور جنہوں نے
مسلمانوں کے خلاف فرقہ پرستی کی آگ بھڑکانے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا ان سے بھی
حسرت موہانی کے دوستانہ مراسم تھے اور جب وہ کانپور آتے تو سیاسی اختلافات کے
باوجود مولانا سے ملنے کے لئے خلافت اسٹور ضرور آتے۔ خلافت سودیشی اسٹور
برسرزمین یا کھلے بندوں کام کرنے والے سیاسی لیڈروں کے علاوہ زیر زمین یا چوری
چھپے کام کرنے والوں کا بھی اڈہ تھا۔ ہرتی روما۔ اکبر علی صدیقی۔ سردار بھگت سنگھ
یش پال چندر شیکھر آزاد خیالی رام۔ شوکت عثمانی (جو بعد میں کانپور کے مشہور مقدمہ
سازش میں سزایاب ہوئے) طبیدر تیواری (بعد میں اس کی غداری سے مقدمہ

سازش کانپور کے کئی ملزم گرفتار ہوئے، غرضیکہ بہت سے انقلاب پسند (جن میں اول الذکر دو افراد کالے پانی کی سزا کاٹ کر واپس آئے تھے اور کئی افراد نے کئی کئی سال قید و بند کے مصائب برداشت کئے تھے) صرف یہی نہیں کہ خلافت سودیشی اسٹور میں جمع رہتے تھے بلکہ دو چار حضرات تو دن رات پڑے رہتے تھے اور ان کے تمام مصارف اسٹور کے مینیجنگ ڈائرکٹر مولانا حسرت موہانی کے حساب میں خلافت سودیشی اسٹور برداشت کرتا تھا۔"

جناب سردار علی صابری فرماتے ہیں کہ "ستمبر ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات کے عروج پر میں نے سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کے حکم سے لکھنؤ میں اپنی تعلیم ترک کردی تھی اور مولانا نے مجھے اپنے ساتھ کانپور لاکر خلافت اسٹور میں کا ونٹر مقرر کردیا تھا۔

۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۲۳ء تک جب کہ مولانا کی سیاسی سرگرمیاں پورے شباب پر تھیں اور آئے دن یا تو سارے ہندوستان کا دورہ کیا کرتے تھے یا یرودا جیل (پونا) میں اپنی زندگی کے ایام اسیری گذارتے ہوتے تھے ناگزیر ہنگامی حالات کی بنا پر نوبنا عمری یا ناتجربہ کاری کے باوجود خلافت سودیشی اسٹور کی ساری ذمہ داریاں میرے سر تھیں اور میں ہی مہمانوں کی خاطر مدارات وغیرہ کے فرائض سرانجام دیتا تھا میری ساری عمر اس وقت سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی اور سیاسی تحریکوں کے سبھی مشہور رہنما اور پرانے کارکن زیادہ عمر کے تھے اس لئے بات چیت میں حفظ مراتب کا خیال رکھنا پڑتا تھا لیکن ۱۹۲۲ء کے مہمانوں میں چند حضرات ایسے تھے جن سے میں بہت بے تکلف ہو گیا تھا اور ان میں سردار بھگت سنگھ مسٹر ہوتی لال درما اور مسٹر ستیہ بھگت شامل ہیں سردار صاحب عمر میں مجھ سے ایک دو سال بڑے تھے اور ہم لوگ انہیں سجّاد رسنگھ کے نام سے پکارتے تھے ہوتی لال درما کالے پانی میں چودہ سال گذار کر واپس آئے تھے عمر تو چالیس بیالیس سے کم نہیں تھی لیکن جسمانی ساخت کچھ اس قسم کی تھی اور چہرہ پر عنفوان شباب کا اتنا گہرا رنگ تھا کہ ان کی عمر کا اندازہ ۲۳، ۲۴ سال سے زیادہ نہیں کیا جا سکتا تھا گفتگو میں شیرینی لہجے میں اتنا لوچ کہ میں بعض اوقات متحیر رہ جاتا تھا کہ اس قدر

نرم و نازک انسان جس کی معصومانہ صورت سے بھی بھولا پن ظاہر ہوتا ہے ایسا خطرناک انارکسٹ کیسے ہو سکتا تھا تیسرے صاحب مسٹر سیتہ بھگت کی عمر تیس بتیس سال کے درمیان ہوگی چھریرہ جسم سانولا رنگ چہرے پر آثار وحشت زبان میں ہکلاپن، مشین سے ترشے ہوئے بال۔ اتنے سخت کہ اگر ان کے سر پر ہاتھ پھیرا جائے تو سوئی کی نوک کی طرح چبھتے تھے موٹے کھدر کی دھوتی اور زرد رنگ کا لمبا کرتہ یہ ان کی محبوب پوشاک تھی کالے کالے گرد آلود بالوں کا حسن تو تیل سے دوبالا ہوتا رہتا تھا لیکن سر ٹوپی کی ضرورت سے ہمیشہ بے نیاز رہا۔ مطالعہ وسیع تھا ہندی زبان کے اچھے ادیب تھے اور بعد میں شاید الہ آباد کے رسالہ چاند کے ایڈیٹر بھی ہو گئے تھے۔ سیاسی مسائل پر خوب بحثیں ہوتی تھیں سردار بھگت سنگھ (بھگت سنگھ) کی رائے یہ تھی کہ جب تک نوجوانوں کو خفیہ طور پر فوجی تربیت دے کر انگریزوں کے خلاف گوریلا جنگ نہ شروع کی جائے۔ ہندوستان کو غلامی کے شکنجے سے نجات نہیں مل سکتی۔ ہوتی ز ما کا کہنا تھا کہ موجودہ حالات میں گوریلا دستوں کی تنظیم و تربیت غیر ممکن ہے ہندوستان کو آزاد کرانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جگہ جگہ بم پھینکے جائیں سرکاری بنکوں اور خزانوں کو لوٹا جائے اور انگریزوں کو ہر ممکن طریقہ سے دہشت زدہ کیا جائے۔ مسٹر سیتہ بھگت کا ارشاد تھا کہ نہ تو وسیع پیمانے گوریلا دستے منظم کئے جا سکتے ہیں نہ بم بازیوں اور جسمانی حملوں اور لوٹ مار کے ذریعہ انگریزوں کو ہندوستان سے بھاگنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ فاقہ کش مزدوروں اور کسانوں کو برطانوی امپیریلزم (اس وقت سامراج کا لفظ مروج نہیں ہوا تھا) کے خلاف متحد کیا جائے۔ سردار بھگت سنگھ اور میں تقریباً ہم عمر تھے اور مزاج کے لحاظ سے دونوں جھلے۔ لہٰذا بحث کے دوران اکثر لڑائی ہو جایا کرتی تھی اور بحث نامکمل رہتی تھی۔ ہوتی ز ما عملی آدمی تھے انہیں بحث تو کچھ زیادہ پسند نہیں تھی لیکن بم بنانے اور غیر قانونی چیزیں چھپانے کے طریقے بڑی وضاحت کے ساتھ بتاتے تھے۔ اور جب ذاتی تجربات کا ذکر آتے تو گرمیٔ سخن میں کوئی بات چھپاتے نہ تھے

اگل دیتے تھے لیکن ان کے برعکس مسٹر سیتہ بھگت پیٹ کے بہت بھاری تھے
مہاتما لینن اور مہاتما اسٹالن کی تعریفوں کے راگ الاپتے رہتے تھے کمیونزم
کا پروپیگنڈہ بھی ہم نوجوانوں میں خوب کرتے لیکن وہ بے تکلفی کے باوجود اپنا
راز نہیں بتاتے تھے" خلافت سودیشی اسٹور کو اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت
حاصل ہے کہ اسی جگہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی بنیاد پڑی جس کا ذکر اپنی
جگہ پر آئے گا بہر حال مولانا کے خلافت سودیشی اسٹور سے آزادی کی ایسی
شعاعیں پھوٹیں جن سے سارا برصغیر متاثر ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ اسٹور بند ہو
گیا لیکن کیا یہ بات مولانا کی پامردی اور کردار کی مضبوطی کے سلسلہ میں نہیں
کہی جا سکتی کہ جس سودیشی تحریک میں انہوں نے ۱۹۰۵ء میں شمولیت کی جس
کی انہوں نے ۱۹۰۷ء میں ترویج کی جس کو فروغ دینے کے لئے ۱۹۱۰ء میں
سودیشی اسٹور قائم کیا جس کے لئے انہوں نے سارے ملک کا ایک بار نہیں
متعدد بار دورہ کیا جس کے لئے انہوں نے علماء سے فتوی لئے جس کے لئے
انہوں نے کانگریس اور خلافت کے جلسوں میں دھواں دھار تقریریں کیں جس
کے لئے ایک مرکزی ادارہ خلافت سودیشی اسٹور کے نام سے ۱۹۲۰ء میں قائم
کیا وہ اگرچہ ۱۹۹۵ء میں بند ہو گیا لیکن ان کا مشن دن دگنی رات چوگنی ترقی
کرتا رہا یہاں تک کہ جس کانگریسی رہنما موتی لال نہرو نے ۱۹۰۷ء اور جس
آزادی کے رہنما مسٹر گاندھی نے ۱۹۲۰ء میں سودیشی کی مخالفت کی۔ انہی
رہنماؤں کی مرکزی جماعت کانگریس نے ۱۹۳۰ء میں اس تحریک کو اپنایا اور اسی
سودیشی تحریک کو انگریزوں کے خلاف بطور ایک کامیاب حربہ کے استعمال کیا
یہ صحیح ہے کہ مولانا سودیشی اسٹور کو اپنی زندگی کے خلاف بطور ایک کامیاب
حربہ کے استعمال کیا۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا سودیشی اسٹور کو اپنی زندگی کی آخری
سانسوں تک قائم اور دائم نہیں رکھ سکے لیکن سودیشی اسٹور منتہائے مقصود
نہیں تھا یہ کام تو تحریک کے جاری رکھنے اور اسے قبولِ عام بنانے کا ایک
ذریعہ تھا البتہ یہ بات ضرور خوشی کی تھی کہ مولانا نے جو کام ۱۹۰۵ء میں
شروع کیا - ان کی ثابت قدمی کے باعث کانگریس اس کام کو ۱۹۳۰ء میں

ایک عقیدہ کا درجہ دیا بڑا حرّیت اور آزادی کے میدان میں اس فتح و کامرانی کا سہرا یقیناً مولانا کے سر ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اس موضوع پر اظہارِ خیال ختم کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اکبر الہ آبادی کے اس قطعہ کو پیش کر دیا جائے جو انہوں نے سودیشی اور مولانا کے بارے میں منظوم فرمایا تھا جناب اکبر تحریر فرمایا کرتے ہیں۔

تھا دلِ حسرت بھرا ارمان میں
ہم نے کچھ بھیجا انہیں موہان میں
بھائی صاحب رکھدو تم اپنا قلم
ہاتھ میں لو اب تجارت کا علم

ہو چکی غیروں سے خوشی کی بہار
بس دکھاؤ اب سودیشی کی بہار

دوسری مصروفیات

۱۹۱۰ء سے لیکر ۱۹۱۳ء کے دور میں ملکی سیاست سے مولانا کی دلچسپی مضمون نگاری کی حد تک ہی نہیں تھی اگرچہ جیل سے نکلنے کے بعد انہوں نے سودیشی کی تبلیغ میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور اس کی توسیع و اشاعت میں خاصا وقت صرف کیا لیکن اس کے ساتھ انہوں نے انجمن خدام کعبہ اور ہلال احمر کی تحریکوں میں بھی حصہ لیا اور متعدد مضامین مغرب کی کارستانیوں کے خلاف اردوئے معلیٰ میں تحریر فرمائے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے پہلی قید فرنگ سے آزاد ہونے کے بعد ان کا جذبۂ جہاد اور بھی ترقی کر گیا تھا یہی وہ زمانہ تھا کہ طرابلس اور اٹلی کے درمیان جنگ چھڑی اور مولانا نے جو سودیشی تحریک کے داعی اور بدیشی مال کے بائیکاٹ پر ایمان رکھتے تھے مسلمانانِ ہند سے اپیل کی کہ وہ اٹلی کے تیار کردہ مال کا مکمل بائیکاٹ کریں جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان نے عالم اسلام کو بے چین کر دیا مولانا نے اس سلسلہ میں بڑی سرگرمی دکھائی ترکوں کے لئے

چندہ جمع کیا اور اسے ترکی روانہ کیا۔

اردوئے معلیٰ پریس کی ضبطی

ان کا رسالہ اردوئے معلیٰ برابر نکل رہا تھا اور اگرچہ اس رسالہ میں ایک مضمون کی اشاعت کے سلسلہ میں وہ جیل جا چکے تھے مگر اس کے باوجود رسالہ عوام سے رابطہ کے سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا اور مؤثر ذریعہ تھا۔ سٹر اردو بند وگھوش کے سلسلہ میں پریس ایکٹ کا ذکر ہو چکا ہے۔ خود مولانا کی پہلی گرفتاری بھی اس پریس ایکٹ کی مرہون منت تھی لیکن جب انگریزوں نے دیکھا کہ اردوئے معلیٰ اور اس کا ایڈیٹر برابر جدوجہد آزادی میں مصروف ہے اور نینی جیل کے مصائب اور شدائد کا اس پر الٹا اثر ہوا ہے اور وہ اسی رسالہ کے ذریعہ لوگوں کو شراب حریت پلا رہے ہیں تو سر جیمس مسٹن گورنر یو۔پی کی حکومت کو یہ رسالہ کھٹکنے لگا اور اس مرتبہ اخبار کی جگہ نزلہ پریس پر گرا۔ صاحب حالات حسرت لکھتے ہیں کہ "قانون مطابع کی جابرانہ دست درازیاں جس وقت سے اسلامی ہند پر شروع ہوئیں۔ تو ہندوستان میں سب سے پہلے جس اسلامی پریس پر تلوار چلائی گئی وہ مولانا کا اردو پریس تھا جس کی تمام کائنات اور ساری حقیقت ایک کاٹھ کی دستی مشین اور تین پتھر تھے جس میں دو جزو کا ماہوار اردوئے معلیٰ چھپتا تھا بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ خود مولانا نے مشین چلائی اور تیلیوں کی طرح کام کر کے رسالہ کو وقت پر شائع کیا۔ ایسے بے حقیقت پریس سے جس سے ایک حبہ کی آمدنی بھی نہیں ہوتی سر جیمس مسٹن کی گورنمنٹ نے پورے تین ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کر لی۔ یعنی اپنے پورے اختیارات غریب حسرت کے پریس کے برباد کرنے پر صرف کر ڈالے ایک ایسے پریس سے جس میں کوئی آمدنی نہ ہوتی ہو اور ایک ایسے شخص سے جو سو دو سو روپیہ کا بھی انتظام نہ کر سکتا ہو (اپنی خودداری کے باعث) اس سے تین ہزار کی ضمانت طلب کر لینا سوائے جذبہ انتقام کے اور کس امر پر محمول کیا جا سکتا ہے اس ضمانت کا مدعا اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ پریس قطعی طور پر بند کر دیا جائے۔ حالانکہ ضمانت وغیرہ کا لینا صرف اس غرض سے ہوتا ہے کہ آئندہ احتیاط کی جائے نہ یہ کہ سرے سے پریس"

غارت کیا جائے۔ اس چیز کو کوئی مہذب حکومت جائز نہیں رکھتی مگر حسرت کے صداقت شعار دل نے اسے بھی برداشت کر لیا اور جس شخص کے جذبۂ صادق کو زندان فرنگ کی آہنی بیڑیاں بھی زائل نہ کر سکیں اور جو قید کی پُر مشقت زندگی بسر کرنے کے بعد بھی اپنے عقیدہ میں ترمیم پر آمادہ نہ ہوا۔ ایسے پیکرِ صدق و صفا اور ایسے مجسم خلوص مولانا کو پریس ایکٹ کی جابرانہ سختیاں اپنی جگہ سے کیا جنبش دے سکتی تھیں چنانچہ ان کے قلب پر اس واقعہ کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا یہ صحیح ہے کہ وہ تین ہزار کی رقم جمع نہیں کر سکتے تھے اور بالآخر ان کو پریس اور اس کے ساتھ اردوئے معلیٰ بند کرنا پڑا۔ تاہم انہوں نے آخری پرچہ میں اعلان کر دیا کہ گو اردوئے معلیٰ بند کر دیا گیا مگر میری زبان میرا دل اور میری قوتِ عمل بدستور آزاد ہے اور میں جس طرح پہلے کام کرتا تھا۔ اب بھی خدا کی بخشی ہوئی طاقتوں سے کام لوں گا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ طرابلس میں جنگ ہوئی تھی اور مولانا نے اٹلی کے مال کے بائیکاٹ کا فتویٰ جاری کیا تھا انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں کو اس امر پر تیار کر رہے تھے کہ وہ اٹلی کا مال خریدنا بند کر دیں۔ حسرت کی یہ پالیسی گورنمنٹ کو پسند نہیں آئی اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اسی جد و جہد اور سعی و کوشش کو روکنے کے لئے یہ تدبیر کی گئی تھی مگر گورنمنٹ کے طرزِ عمل سے مولانا کا جوشِ عمل اور بھی ترقی کر گیا اور وہ ہمہ تن اس تحریک کو فروغ دینے میں مصروف ہو گئے ” اس موقعہ پر انہوں نے رسالہ اردوئے معلیٰ کے آخری پرچہ میں جو مضمون شائع کیا جس کا اقتباس پیش خدمت ہے۔ مضمون کا عنوان تھا ” اردو پریس کا خاتمہ اور ضمانت کے لئے نوٹس “ اس عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ ۱۳ مئی ۱۹۱۳ء کو ۹ بجے شب کے قریب علی گڑھ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بذات خود وارد ہو کر راقم الحروف کے سامنے حکومت کی جانب سے ایک نوٹس پیش کیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اردو پریس میں چونکہ از روئے پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء میں چند الفاظ خلاف چھپے تھے اس لئے ایک ہفتہ کے اندر اندر تین ہزار روپیہ کی ضمانت مجسٹریٹ ضلع کے پاس جمع کرنا چاہئے۔ واضح ہو کہ اردو پریس کی مکمل کائنات ایک لکڑی کا پریس اور تین پتھروں پر مشتمل ہے جس کی مجموعی قیمت پانچسو روپے سے زائد نہیں ایسے بے بضاعت پریس سے تین ہزار

روپیہ کی ضمانت طلب کرنا مضحکہ خیز ہونے کے علاوہ، جبر سے گذر کر
کینہ پروری کی حد تک پہنچ گیا ہے جس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ
نہیں ہو سکتا کہ اردو پریس کے جاری رہنے کا کسی صورت کوئی امکان
باقی نہ رہے۔ خیر ۱۹ مئی کو پریس بند کر دیا جائے گا مگر بند ہو کر اپنے
بعد جیمس مسٹن کا یہ افسانہ یادگار چھوڑ جائے گا۔ کہ آپ نے ایک
بے مایہ دستی پریس سے اتنی کثیر رقم طلب کی جس سے زیادہ اس
وقت تک شاید ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے اسٹیم پریس سے
بھی نہیں لی گئی۔ ہم جناب موصوف کی اس خاص نوازش کو بمصداق
ہرچہ از دوست می رسد نیکوست بخوشی برداشت کرتے ہیں۔ ایک
بات البتہ قابل اطمینان اور لائق شکر ہے اور وہ یہ کہ اس نوٹس سے راقم
کو کسی قسم کا مالی، جسمانی یا روحانی صدمہ نہ اس وقت پہنچا اور نہ آئندہ
پہنچے گا۔ انا ماشاء اللہ تعالیٰ، سر جیمس مسٹن اور ان کے مانند جملہ ارباب
قہر و غرور کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی ناراضگی اہل دولت وجاہ
کے لئے خواہ کیسی ہی مہیب اور اہم کیوں نہ ہو۔ مگر ہم سے آزاد فقیروں
کا اس سے مرعوب و مغلوب ہونا کسی صورت میں ممکن نہیں۔ اردو پریس
۱۹ مئی کو بند ہو جائے گا الحمد للہ کہ وہ اپنا فرض ادا کر کے بند ہو
گا جن جن تحریکوں کے پیش نظر یہ پریس جاری کیا گیا تھا وہ اس
وقت جملہ اہل ملک کو معلوم ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ نایاب ادبی
کتابوں کی اشاعت بہت کچھ ہو چکی ہے باقی آئندہ ہوتی رہے گی
آزادیٔ خیال اور طلب حریت کا جذبہ عام ہو چکا ہے۔ سودیشی
اور بائیکاٹ کی روز افزوں ترقی کا زمانہ شروع ہو گیا ہے
اور اب آخر کار انجمن خدام کعبہ کی تجویز بھی مسلمانوں کے رو برو
پیش کر دی گئی ہے۔ ہم نے اپنے دل میں عہد کر لیا ہے کہ ان
تمام تحریکوں کی اعانت ہر حال میں اور ہر وقت اپنے اوپر لازم سمجھیں
گے۔ اگر تحریر کے ذریعہ ممکن نہ ہو گا تو تقریر کے ذریعہ اور اس سے

بھی نہ ہو سکے گا تو عملی کارروائی تحریر و تقریر دونوں سے زیادہ مفید اور زیادہ ضروری ہے اور اس سے ہم کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ "با توفیق الا البشر"

مولانا آزاد کا تبصرہ

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اس موقعہ پر حکومت یو۔پی کے اس اقدام پر اپنے مشہور جریدہ الہلال میں تبصرہ کیا جو پیش خدمت ہے "تین ہزار روپیہ کی ضمانت پریس ایکٹ کی مقدار مقررہ کے انتہائی حدود کے اندر ضرور ہے لیکن عملاً پانچ سو یا ہزار سے زیادہ طلب نہیں کی جاتی اور صرف ایک دو مثالیں دو ہزار کی گئیں ہیں پھر ہزآنر جیمس مسٹن بالقابہ کا دوبار سطوت و جلال نہیں معلوم اتنی بڑی سنگین رقم کے لئے کیا وجہ بیان کر سکتا ہے گورنمنٹ اس سے بے خبر نہیں کہ اردو پریس اور اس کے مالک کی حالت کیا ہے حسرت موہانی جب سے قید سے رہا ہو کر آیا تو کوئی چیز اس دنیا میں ایسی باقی نہیں تھی جو اس کے لئے ذریعہ تقویت مال ہوتی۔ ڈیڑھ دو روپیہ ماہوار کا ایک جھونپڑا ہے جس کے اندر ایک چھوٹی سی صحنچی اور کوٹھڑی ہے اور باہر بھی اتنی ہی مکانیت ہے اندرونِ کوہ وقار حسرت مع اپنی کوہ عزم و ثبات بیوی کے ساتھ خود بستا ہے اور باہر کاٹھ کا دستی پریس اور دو چار پتھر ہیں لیا اوقات ایسا بھی ہوا کہ خود اس نے اپنے ہاتھوں سے اردوئے معلیٰ کی کاپیاں لکھی ہیں خود ہی پتھر پر جماتی ہیں اور خود ہی پریس چلایا ہے یہ کل کائنات اردو پریس اور اس کے مالک کی ہے کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی نہیں ہے اور نہ اس کی طبع غیور کسی کا شرمندہ احسان ہونا پسند کرتی ہے اردوئے معلیٰ کے دو چار سو خریدار ہیں اس کی قیمت سے شاید چند روپیہ مہینے میں بچ رہتے ہوں اور اس سے دو وقت کی روٹی کھا کر وہ نشہ آزادی کی بے خودی اور دولت لازوال حق و صداقت کی تمنائے غیر فانی میں مست رہتا ہے۔

بہ ہیں حقیر گدایانِ عشق را کہ قدم
شہان بے کمر و خسروان بے کلاہ اند

اصل دولت دل کی دولت ہے اور غنا و فقر کے آگے دنیا کے تمام ساز و سامان ہیچ ہیں۔ جو زندگی فقر و فلاکت ہیں حق و حریت کی مصیبت اور گرد و خاک میں بسر ہو وہ سونے چاندی کے بنے ہوئے ایسے ایوانِ تعیش کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کے اندر حق کے چراغ کی روشنی نہ ہو۔ خدا کے دروازے کا فقیر ہونا، بندگانِ دولت کے فقیر ہونے سے کیا بہتر نہیں! یہی تو اس راہ کے منازل امتحان ہیں۔ ان حالات کے ساتھ ایک ایسے فقیر زندگی شخص سے تین ہزار کی ضمانت طلب کرنا یقیناً ایک ایسا واقعہ ہے جو برٹش انڈیا کی تاریخ اور گورنمنٹ کے اظہارِ سطوت و جلال کو ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا۔"

مسلم یونیورسٹی کی تحریک

اردوئے معلی کے بند ہونے کے بعد جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے مولانا نے سودیشی اسٹور میں دلچسپی لینا شروع کیا جس کا تفصیلی تذکرہ سودیشی تحریک کے سلسلہ میں آچکا ہے۔ انھوں نے لکھنے لکھانے کا مشغلہ ترک نہیں کیا اور اس مقصد کے تحت ایک رسالہ تذکرۃ الشعرا کے نام سے جاری کیا۔ جنگ طرابلس کے ساتھ جب جنگِ بلقان کا آغاز ہوا تو جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے مولانا نے اس میں بھی حصہ لیا۔ اور ۱۹۱۲ء میں مسجد کانپور کا واقعہ ہوا تو مولانا اس میں بھی پیش پیش تھے، لیکن ان کی توجہ کا مرکز سودیشی تحریک ہی رہی۔ البتہ جب مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ پیدا ہوا تو پھر ان کی تمام تر توجہ اس طرف مبذول ہوگئی اور یہی دلچسپی اور رشیمی رومال کی تحریک سے انکی عملی لیکن خفیہ وابستگی انکی دوسری گرفتاری کا باعث بنی جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

بہر حال جب مسلم یونیورسٹی کے فاؤنڈیشن کا مسئلہ پیدا ہوا تو مولانا کا اس مسئلہ میں دلچسپی لینا بالکل ایک بدیہی امر تھا۔ مولانا علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ اور علی گڑھ کے ایک شہری کی حیثیت سے اس مسئلہ میں اہل الرائے کا درجہ رکھتے تھے۔ مولانا صرف سیاست اور ادب ہی کے مرد میدان نہیں تھے بلکہ علی گڑھ کالج سے

قدیم وابستگی اور علی گڑھ کے قیام کی وجہ سے انھیں اصلاحِ ملک اور تعلیم کے میدان میں بھی تمام تحریکوں سے دلچسپی تھی لیکن جو چیز سب سے زیادہ ان کے ذہن پر حاوی تھی وہ یہ تھی کہ ہماری قومی تعلیمی زندگی کو غیر ملکی اثرات سے پاک ہونا چاہیے تاکہ ہماری تعلیم گاہیں صحیح معنوں میں قومی جذبات و احساسات کی آئینہ دار بن جائیں۔ مولانا نے یہ رائے اپنی تعلیمی زندگی ہی کے دوران علی گڑھ کالج کے متکبر انگریز پرنسپل کے رویّہ سے مجبور ہوکر قائم کی تھی۔ انھیں اس بات کا اسی زمانہ میں اندازہ ہو گیا تھا کہ جب تک انگریز ہماری تعلیمی زندگی پر حاوی رہیں گے نوجوان نسل میں حریت اور آزادی کے جذبات پروان نہیں چڑھیں گے۔ لہٰذا جب فاؤنڈیشن کا مسئلہ پیش آیا تو مولانا کی بھی رائے ہوئی کہ علی گڑھ کالج کو مسلمانوں کا ایک آزاد دارالعلوم بنایا جائے۔ کیوں کہ ان کی نگاہ میں انگریز پرنسپل کی موجودگی میں اسے قومی کالج کہنا درحقیقت قوم کی ہتک تھی۔ مولانا نے اردوئے معلیٰ مورخہ ۷ مارچ ۱۹۰۷ء میں ہنگامۂ مدرسۃ العلوم کے تحت جو مضمون سپردِ قلم کیا تھا اس میں بھی انھوں نے یہی لکھا تھا کہ پولیٹیکل حیثیت سے مسلمانوں کو ہمیشہ غلام رکھنا مسٹر بیک (پرنسپل) کا عام مشن ہے اور علی گڑھ کالج کو بالکل انگریزوں کے اختیار میں رکھنا ان کی خاص پالیسی ہے۔ چنانچہ ٹرسٹیوں کے مقابلہ میں پرنسپل کی قوت کو بتدریج بڑھا کر موجودہ حالت میں پہنچا دینے کا باعث مسٹر بیک ہی ہوئے ہیں۔" مولانا اس کے بعد فرماتے ہیں کہ "جب تک ہمارے انتظامی معاملات بالکل ہمارے ہاتھ میں نہ ہوں گے، اس وقت تک کالج کی حقیقی اصلاح بہت دشوار ہے جس کی اس کے سوا اور کوئی شکل ہی نہیں ہے کہ ہم پرنسپل اور پروفیسروں کے عہدوں کے لیے سرسید کے قدیم اور غالباً مصلحتی اصول یعنی یورپین کی قید کو بالکل اڑا دیں جو سرسید مرحوم کے عہد کے لیے شاید موزوں ہو لیکن زمانہ کی ترقی کے ساتھ ہمیشہ موزوں نہیں رہ سکتا اور اگر فی الحال ایسا ممکن نہ ہو تو اتنا تو ضرور ہی کریں کہ انگریزوں کے اختیارات کو اس حد تک کم کر دیں کہ وہ کالج میں ایک استاد کی حیثیت سے طالب علموں کو تعلیم دیں، نہ کہ ایک پولیٹیکل افسر کی حیثیت سے ان پر جابرانہ حکومت کو بھی جائز سمجھنے لگیں۔" مولانا نے اس ضمن میں ان تمام ٹرسٹیوں کو جو انگریزوں سے اختلاف کی جرأت نہیں پاتے، استعفا دینے کا مشورہ بھی دیا۔ مولانا کی یہ

رائے بھی ہر طرح سے صائب تھی مگر اس پر اس وقت عمل نہیں کیا گیا جب مولانا
نے اسے پیش کیا تھا مگر بعد میں اس رائے پر عمل ہوا۔ مولانا نے جب استعفا والی رائے
پیش کی تو حسبِ معمول کسی نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا بلکہ ایڈیٹر "البشیر" نے تو اس
ضمن میں مولانا پر الزامات لگائے اور لکھا کہ وہ کانگریس کے پرائیویٹ اور تنخواہ دار
ملازم ہیں۔ مولانا نے اس کے جواب میں لکھا کہ "مجھے اپنے اخبار میں درپردہ کانگریس
کا ایجنٹ قرار دینا ایک قابلِ افسوس کذب ہے جس کی نسبت سخت سے سخت کلمہ
حقارت کے استعمال کو بھی کوئی شخص ناواجب نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد مولانا نے
فرمایا کہ "اصل یہ ہے کہ جو لوگ قومی ذرائع ہونے کا دعوا رکھتے ہیں لیکن جن کو
کالج کی خدمت کے لیے سفری خرچ کے علاوہ زمانۂ خدمت کے لیے قرار واقعی معاوضہ
کا مطالبہ کرتے ہوئے شرم نہیں آتی اگر ان کو کسی کی بے غرض اور بلا معاوضہ ملکی خدمت
کا یقین نہ آتا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیوں کہ ؎

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

مولانا نے اس زمانہ میں صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اردوئے معلی کی اس
اشاعت میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو نیشنل کالج بنانے کی ضرورت پر بھی زور دیا اور
اس ضمن میں ایک گراں قدر مقالہ بھی سپردِ قلم کیا جس میں اس بات پر اظہارِ افسوس
کیا گیا کہ مسلمان ٹرسٹی انگریز پرنسپل کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بے دست و پا تصور
کرتے ہیں اس لیے اس کے تدارک کا ساماں ہونا چاہیے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "اگر
ٹرسٹی صاحبان اتنے ہی بے دست و پا ہیں تو اس صورت میں کالج کو محمڈن کالج کہنا
قطعی طور پر غلط بیانی ہے۔" مولانا نے اس ضمن میں آگے چل کر فرمایا کہ "جس وقت
کالج کے پرنسپل نے باوجود لڑکوں کی عاجزی کے اور سیکرٹری کی استدعا کے کالج
کے قابل ترین لڑکوں کو نکال دینے کا حکم جاری کیا تھا اور ساتھ ہی پرائیویٹ طور

کو موقوف کیا گیا تو پھر کوئی انگریز کالج میں تعلیم کے لیے نہیں آئے گا۔ (۲) انگریزوں کے ساتھ ایسا کرنے سے ممکن ہے کہ گورنمنٹ کالج کی طرف سے اپنی نظرِ عنایت پھیر لیے اور گورنمنٹ کی کم التفاتی کا یہ بھی نتیجہ ہو کر ہندوستانی والیانِ ریاست بھی اپنی امداد روک دیں۔"

مولانا نے اس تجزیے کے بعد فرمایا کہ "ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ٹرسٹیوں کا یہ خوف بالکل بے بنیاد ہے لیکن ہم اتنا ضرور بتائے دیتے ہیں کہ اگر مدرستہ العلوم کو درحقیقت ایک قومی کالج کی حیثیت سے قائم رکھنا ہے تو بہی خواہانِ قوم کو لازم ہے کہ بجائے اس قسم کے خطروں سے بچنے کے اپنی ساری ہمت ان کے دور کرنے پر صرف کریں اور یہ خوب سمجھ لیں کہ دنیا کا کوئی بڑا کام اس وقت تک سرانجام نہیں پا سکتا جب تک اس کے متعلق دقتوں کا مردانہ مقابلہ نہ کیا جائے۔ ان تمہیدی جملوں کے بعد مولانا ان دو مذکورہ اندیشوں کا جائزہ لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ٹرسٹیوں کو جو اس بات کا خوف ہے کہ انگریز پروفیسر کالج میں نہ آسکیں گے تو اول تو ہم اس سے انکار کرتے ہیں کہ معقول تنخواہ پر کوئی انگریز ملازمت پر آمادہ نہ ہو گا لیکن بالفرضِ محال ایسا ہو بھی تو ہمارے نزدیک مسلمانوں کو انگریزوں کی عدم موجودگی پر بجائے خوف زدہ ہونے کی خوش ہونا چاہیے اور اگر فی الوقت اس سے نجات کی صورت نہ ہو تو کم از کم ہمارا مقصدِ آخری تو یہی قرار پانا چاہیے کہ مدرستہ العلوم ایک ایسا قومی کالج ہو جس کے کل پروفیسر اور پرنسپل مسلمان ہوں اور اگر کوئی انگریز ہو بھی تو صرف تعلیم دینے کے واسطے ہو نہ کہ ہماری مصلحت اور پالیسی میں دخل دینے کے لیے۔ اس موقعہ پر غالباً یہ اعتراض کیا جائے گا کہ بحالت موجودہ مسلمان پرنسپل اور مسلمان پروفیسروں کا دستیاب ہونا دشوار ہے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس افسوسناک مجبوری کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس وقت تک مسلمانوں نے اس پر توجہ نہیں دی ورنہ غیر ممکن تھا کہ اس وقت ہم میں ایک دو نہیں دس بیس مسلمان تعلیم یافتہ ایسے موجود نہ ہوتے جو اپنے قومی کالج کی خدمت اس خلوص اور عمدگی کے ساتھ کرنے پر آمادہ ہو جاتے جس کا نظارہ اس وقت فرگوسن کالج، دیانند کالج اور سب سے بڑھ کر کلکتہ کے نیشنل کالج میں ہر محبِ وطن کے لیے مسرت کا باعث

ہو رہا ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ اگر آج ہم کالج کو نیشنل کالج بنانے پر آمادہ ہو جائیں تو آج بھی ہم کو ایک معقول تعداد ایسے مسلمان پروفیسروں کی مل سکتی ہے جو موجودہ انگریز پروفیسروں سے بہرحال قابل ترجیح ہوں اور بالفرض محال اس وقت ایسا ممکن نہ ہو تو تین سال کے اندر اندر تو قطعی طور پر سارا انتظام حسب دلخواہ ہو سکتا ہے اور اس طرح ہو سکتا ہے کہ خاص خاص ضرورتوں کے لیے خاص خاص مسلمان منتخب کر کے بغرضِ تعلیم یورپ بھیجے جائیں جو تین سال میں کامل ہو کر واپس آسکتے ہیں اگر کالج کو ایک آزاد اور قومی ادارہ بنانا ہے اور اسے ایک قومی دارالعلوم کا درجہ دینا ہے تو پرنسپل اور پروفیسروں سے متعلق سرسید مرحوم کی اس بوسیدہ شرط کو کہ ان میں سے ایک معین تعداد ہمیشہ یورپین ہو یک قلم اڑا دینا چاہیے اور اگر ٹرسٹیوں کو اپنی قدامت پرستی کی بنا پر اس اشد ضروری ریفارم کو منظور کرنے میں تامل ہو تو تمام قوم کو اعلانیہ طور پر اس امر کا اظہار کر دینا چاہیے کہ ہم کو موجودہ ٹرسٹیوں کی قابلیت اور ہمت پر قطعی طور پر بھروسہ نہیں ہے۔ مناسب ہے کہ وہ خود مستعفی ہو جائیں ورنہ قوم ان کو مجبور کرے"۔ مولانا نے یہ جملے تحریر فرمانے کے بعد یہ لکھا کہ "بعض کمزور طبیعت لوگوں کو شاید یہ خواہش عجیب و غریب اور ناممکن معلوم ہو گی لیکن حقیقت امر یہی ہے کہ جب تک پرنسپل انگریز رہے گا اس وقت تک کالج کو کسی طرح آزادی میسر نہیں آسکتی"۔ مولانا فرماتے ہیں اور کتنا صحیح فرماتے ہیں کہ "انگریز کیسا ہی نیک طینت اور شریف مزاج کیوں نہ ہو اس سے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ بعض مسلمانوں کی طرح وہ بھی اپنی قومیت بھول جائے گا"۔ اس کے بعد ٹرسٹیوں کے خوف کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ "انگریز پروفیسروں کے ناراض ہو جانے سے گورنمنٹ کی خفگی اور گورنمنٹ کی خفگی سے دیگر ہمدردانِ کالج کی ناراضگی اور سخت مالی نقصان کا اندیشہ بے بنیاد ہے"۔ چنانچہ آگے چل کر آپ نے کہا کہ "اس مسئلہ کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں جن کا دور کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ اول یہ کہ ہم گورنمنٹ کی امداد کو ایک احسانِ عظیم شمار کرتے ہیں۔ دوئم یہ کہ ہماری ذرا سی بھی آزاد خیالی گورنمنٹ کی نظر میں ناشکر گزاری سمجھی جائے گی۔ اور وہ اپنی امداد بند کر دے گی، سوئم یہ کہ ہر انگریز بجائے خود گورنمنٹ

ہوتا ہے اور اس لیے کسی انگریز کا چھیڑنا گویا گورنمنٹ سے دشمنی پیدا کرنا ہے۔ چہارم یہ کہ اگر بالفرض محال گورنمنٹ اپنی امداد روک دے تو ہم کسی طرح کالج نہیں چلا سکتے۔ سو پہلی غلط فہمی کا باعث یہ ہے کہ مسلمان عام طور پر اس امر سے ناواقف ہیں کہ اہلِ ہند کو گورنمنٹ کی طرف سے جو تعلیمی امداد ملتی ہے وہ دیگر مقبوضاتِ انگلستان کے مقابلہ میں تقریباً نفی کے برابر ہے۔ کسی دوسری جگہ پر گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی کے متعلق ایک مفصل مضمون درج کیا گیا ہے جس کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ دوران حالیکہ برٹش عمل داری کے دوسرے حصوں میں تعلیم رعایا کے لیے حکومت کی طرف سے فی کس سالانہ خرچ ۹ روپیہ اور ۸ روپیہ سے کم نہیں لیکن ہندوستان کے عوام کے حصہ میں فی کس سالانہ صرف ۸ پائی کا اوسط بیٹھتا ہے۔ ع

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

اس بیان سے ثابت ہے کہ تعلیمی معاملات میں سرکاری امداد کا جو استحقاق ہم کو حاصل ہے اس کا عشر عشیر بھی ہمیں نہیں ملتا۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ قلت امداد کی سخت شکایت کے عوض ہم اسے ایک احسانِ عظیم تصور کریں اور اس کے مقابلے میں اپنے دیگر حقوق انسانی سے کیوں دست بردار ہو جائیں لیکن ہمارے سادہ لوح ٹرسٹی صرف ۱۷ روپیہ ماہوار میں مسلمانانِ ہند کے تمام حقوق فروخت کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں اور دوئم و سوئم کے متعلق ہم جہاں تک غور کرتے ہیں ہم کو گورنمنٹ کی ہوشیاری سے یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے کہ وہ بغیر کسی سخت مجبوری کے علی گڑھ کالج کی امداد بند کر کے تمام مسلمانوں کو اپنا دشمن بنا لے گی۔ مشرقی بنگال کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ بلند ہمت اور آزاد خیال بنگالیوں نے باوجودیکہ سر فلر کی گورنمنٹ کو تنگ کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا لیکن لارڈ منٹو نے اس کے دو اسکولوں کی امداد بند کر دینے پر سر فلر کے اخراج کو ترجیح دی۔" مولانا کا خیال تھا کہ گورنمنٹ ہند ایسی بے وقوف نہیں کہ چند انگریز پروفیسروں کی خاطر اپنی ملکی پالیسی بدل دے اور مسلمانوں کو بھی اپنا مخالف بنا کر حکومت خود ہی ہندوستان کو دینے کا بندوبست کر دے۔" مولانا نے اس کے بعد لکھا کہ: "اگر گورنمنٹ اپنی عاقبت نا اندیشی سے ایسا کرے تو ہم کو بھی اس کے صدمے سے بچنے کے لیے تیار رہنا چاہیے اور وہ یوں

کہ موجودہ سال کے عرصے میں کم از کم ۵ لاکھ روپیہ کا ایک نیشنل ریزرو فنڈ فراہم کرلیں تاکہ گورنمنٹ امداد بند ہونے کی صورت میں اس سے استفادہ کیا جائے۔" مولانا نے مضمون کے آخر میں لکھا کہ "علی گڑھ کالج اور تمام مسلمان اداروں کی درستی اور ریفارم ایک انقلاب عظیم کی محتاج ہے اور بغیر اس انقلاب کے فلاحِ دائمی کی امید رکھنا کسی دانش مند کا کام نہیں۔ کاش کہ مسلمان ہمارے اس مضمون کو پڑھیں اور اس پر غور کریں۔"

جہاں مولانا کو مدرسۃ العلوم کے بارے میں یہ خیال تھا کہ اسے قومی کالج کا درجہ دیا جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے قومی ریزرو فنڈ قائم کیا جائے۔ اسی طرح وہ جمہور اہل اسلام کے لیے ثانوی تعلیم کی سخت ضرورت سے بھی آشنا تھے تاکہ مسلمان عام طور پر صنعت و تجارت اور زراعت وغیرہ میں شریک ہوسکیں۔ اس خیال کی بنا پر وہ اسکولوں کے قیام کو کالجوں پر فوقیت دیتے تھے اور اسی بنا پر وہ اسکولوں کے الحاق کے بغیر مسلم یونیورسٹی کے قیام کو مفید نہیں گردانتے تھے، چنانچہ جب فاؤنڈیشن کے مسئلہ نے زور پکڑا اور سر آغا خاں کی تحریک پر مسلم یونیورسٹی کے لیے سارے ملک میں سرمایہ کی فراہمی کا آغاز ہوا اور مسلمان اس کی طرف متوجہ ہوئے تو چند ہی روز میں یہ تحریک ایک اضطراب کا پیش خیمہ بن گئی اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے مولانا نے اپنے ذہن کے مطابق اور اپنے سابقہ بیان کردہ نظریات کی روشنی میں اس میں حصہ لیا۔ جھگڑا اس بات پر تھا کہ کن شرائط اور اختیارات کے ساتھ یونیورسٹی کو قبول کیا جائے۔ یہی وہ وقت تھا جب مسلمانوں میں گروہِ احرار نے جنم لیا، جس میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی پیش پیش تھے یہیں سے مولانا محمد علی کو رئیس الاحرار اور مولانا حسرت موہانی کو سید الاحرار کے خطابات قوم کی طرف سے دیے گئے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے فاؤنڈیشن کے مسئلہ پر کانگریس کی طرح مسلمانوں میں بھی نرم اور گرم فریق پیدا ہو گئے تھے۔ ایک فریق سر آغا خاں کی قیادت میں ہر قیمت اور ہر شرط پر مسلم یونیورسٹی چاہتا تھا اور دوسرا فریق گروہِ احرار کی قیادت میں ایک آزاد اور خود مختار یونیورسٹی کا خواہاں تھا۔ گروہِ احرار کے ایک معزز رکن کی حیثیت سے مولانا کا موقف بالکل واضح تھا۔ انھوں نے "آخر وقت

تک اس امر کی کوشش کی کہ جب تک آزاد یونیورسٹی نہ ملے، اس وقت تک ... گورنمنٹ کے محدود اور غیر آزادی بخش چارٹر کو قبول نہ کیا جائے۔ مولانا جس خیال کے مطابق اس امر کی مساعی کر رہے تھے وہ تنہا گروہِ احرار اور جمہوریت کی رائے نہیں تھی، اس کے ساتھ ساتھ جیسا کہ مذکورہ مضامین سے ظاہر ہوتا ہے خود ان کی ذاتی رائے بھی یہی تھی کہ جب تک آزاد یونیورسٹی نہ ملے، اس وقت تک وہ غیر مفید ہے اور اسی لیے ایسی یونیورسٹی قبول نہیں کرنی چاہیے، جس وقت تک مولانا محمد علی اور مولانا ابو الکلام آزاد نظر بند نہیں ہوئے تھے، اس وقت تک یونیورسٹی کے متعلق مولانا کی جدوجہد کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں تھا کیوں کہ یہ دونوں بزرگ کام کرنے والے موجود تھے اور سارے ملک میں آزاد یونیورسٹی کا غلغلہ بلند تھا، تاہم مولانا چونکہ علی گڑھ میں موجود تھے اس لیے وہ مقامی طور پر اس میں حصہ لے رہے تھے اور ان مجالس میں جو مسئلۂ مذکور کے متعلق وقتاً فوقتاً منعقد ہوتی رہتی تھیں، ہمیشہ پورے جوش اور اعتماد کے ساتھ شریک ہوتے اور اس امر کی کوشش کرتے کہ عام اسلامی جذبات کو پامال نہ ہونے دیا جائے لیکن جب مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا محمد علی نظر بند ہوئے اس وقت سے مولانا نے اپنی جدوجہد کی رفتار کو تیز تر کر دیا اور نہایت سرگرمی کے ساتھ اس بات کی کوشش میں مصروف ہو گئے کہ کوئی فیصلہ ایسا نہ کیا جائے جو عام رائے کے خلاف ہو، ان کی ایک رباعی اس ضمن میں ان کے خیالات کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔

ارباب فریب کی ہے یہ بھی اک چال
بے کار ہے بہترین و بہتر کا خیال
گنجائشِ بہتری، غلامی میں کہاں
لاریب ہے اجتماعِ ضدین محال

چنانچہ جب لکھنؤ میں فاؤنڈیشن کمیٹی کا جلسہ طلب کیا گیا تو مولانا نے دیکھا کہ عام رائے اور جماعت احرار کی کوئی سپورٹ کرنے والا موجود نہیں تو انھوں نے اس غرض کے تحت ایک وسیع دورہ کیا اور اس مسئلہ میں کثرت سے لوگوں کو فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسہ میں شرکت پر آمادہ کیا چنانچہ مولانا کی کوششوں سے

جدوجہد اور سعی سے یہ نتیجہ نکلا کہ احرار کو شکست فاش ملنے سے رہ گئی حالانکہ افواہ مشہور تھا کہ اس مرتبہ میدان صاف ہے لہٰذا پالا اربابِ استبداد کے ہاتھ رہے گا، مگر الحمد اللہ کہ جب تک مولانا آزاد رہے اس وقت تک اس کا کوئی موقع اربابِ حل وعقدہ کو نہیں ملا۔ اگرچہ اس کے بعد جب مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی اور مولانا حسرت موہانی جیسے مقتدائے ملت نہ رہے تو پانسہ پلٹ گیا۔ مولانا کی نظر بندی کے بعد سیاسی فضا کچھ سے کچھ ہوگئی تھی جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی اور سرزمینِ ہند میں نئی نئی سیاسی اور معاشرتی تحریکیں نمایاں ہو چکی تھیں۔ مسلمان پریشان حال تھے اور مولانا کی قسمت میں یہ لکھا تھا کہ وہ جو بات کہیں کم از کم اس وقت اس پر عمل نہ کیا جائے۔ چاروناچار قوم کو یونیورسٹی کا وہی چارٹر منظور کرنا پڑا جو حکومت دینے پر آمادہ تھی۔ مولانا اس زمانہ میں نظر بند ہو چکے تھے مگر اس زمانہ میں انھوں نے اس موضوع پر جو نظم لکھی اس سے ان کے جذبات کا پتہ چلتا ہے۔

گو بظاہر شیر ہوں، باطن میں بودے دل کے ہیں
مظہر الحق نام ہے، پیرو مگر باطل کے ہیں
فوج کو اپنی ہی دینا، مل کے دشمن سے شکست
یہ نتیجے آپ ہی کی فکرِ لاطائل کے ہیں
ناز تھا شوقِ شہادت پہ ابھی کل تک جنھیں
دست وبازو آج گویا خود ہی وہ قاتل کے ہیں
مل چکی سرکارِ استبداد میں جئے امام
حوصلے بے کار اس تجویزِ بے حاصل کے ہیں
پائیں گے البتہ آغا خان ثانی کا خطاب
گرچہ ہی اندازان کے فہمِ ناقابل کے ہیں
مظہر وانصارِ مظہر نے یہ ثابت کردیا
ہم میں اب بھی کچھ نمونے ناجنسِ کامل کے ہیں

کیوں نہ ہو خطرے میں حسرت قافلہ احرار کا
راہ زن ہوں جب وہی جو راہبر منزل کے ہیں

اس غزل سے مولانا اور جماعت احرار کے نقطۂ نگاہ کا بخوبی پتہ چل جاتا ہے۔ مولانا نے مسلم یونیورسٹی کے بارے میں آخر وقت تک جو صحیح سمجھا اسے کہا اور خوب کہا اور اس میں کسی قسم کی منافقت سے کام نہیں لیا۔

دوسری گرفتاری کے وقت

ظاہر ہے کہ مولانا کے اس گستاخانہ طرز عمل سے حکومت کو ناراضگی ہونی چاہیے تھی حالاں کہ اردو پریس ضبط ہو چکا تھا، اردوئے معلّٰی بند تھا مگر اس کے باوجود مولانا کی قوت عمل میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی تھی۔ اس لیے ان کے خلاف سازشوں کا آغاز ہوا اور انھیں دوسرے مقدمات میں پھنسانے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ لاہور اور بنارس کے مقدمات سازش میں بعض سرکاری گواہوں نے شرارت سے مولانا کا نام بھی اپنے بیان میں لیا، اس کے متعلق لوگوں نے مولانا سے کہا اور بہت کچھ اصرار کیا کہ آپ اپنی وفاداری کا بیان پائنیر وغیرہ میں شائع کرائیں تاکہ گورنمنٹ کا شبہ رفع ہو اور خاص کر ایسی صورت میں کہ مولانا واقعی ان سازشوں میں ملوث نہیں تھے مگر مولانا حکومت کی تمام سازشوں سے باخبر تھے، اس لیے انھوں نے خاموشی ہی اختیار کی، کسی قسم کا بیان نہیں دیا۔ اس کے بعد یہ افواہ پھیلائی گئی کہ لارڈ منٹو پر بم پھینکنے کے سلسلہ میں انھوں نے انارکسٹوں کی مدد کی، حالاں کہ پہلے کی طرح یہ بات بھی غلط تھی اور خود بیگم حسرت نے اس کی تردید کی لیکن جہاں یہ فیصلہ ہو چکا ہو کہ انھیں گرفتار کیا جائے گا، جہاں اس بات کا احساس کر لیا گیا ہو کہ مولانا کی موجودگی میں علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام حکومت کی مرضی کے مطابق عمل میں نہیں آسکتا اور جہاں یہ اندازہ ہو کہ بے دست و پا حسرت جنگ کی تیاریوں میں خطرناک ثابت ہو سکتا ہے وہاں کسی بیان، کسی اظہارِ وفاداری اور کسی قسم کی یقین دہانی کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ حیرت اس بات پر نہیں تھی کہ ان کی گرفتاری کے لیے سازشوں

پر سازشیں ہو رہی تھیں بلکہ تعجب اس بات پر تھا کہ ایسے عہد تاریک اور دورِ فساد و نفاق میں جب نئے نئے طریقے وضع ہو رہے ہوں اور ظلم و زیادتی کے قوانین بنائے جا رہے ہوں، مولانا جیسے پرستارِ حق و حریت کس طرح آزاد ہیں اور ایک سخت گیر حکومت کی گرفت سے کیسے بچے ہوئے ہیں۔ لوگ متحیر تھے کہ آخر مولانا کی خدمت گزاری، حق و صداقت کا معاوضہ اب تک کیوں ادا نہیں کیا جاتا۔ اور وہ حسرت جو قربان گاہِ ابتلا و آزمائش میں ہمیشہ سب سے آگے رہا اور خدمت و ایثار کے میدانِ امتحان میں سب پر سبقت لے گیا تھا۔ آج جب کہ اقلیم وصداقت کو ویران کر کے جیل خانے آباد کیے جا رہے ہیں، کیوں دوسروں سے پیچھے رہ گیا... کیوں کہ جس طرح وہ ہمیشہ برداشتِ مصائب و آلام میں آگے رہا، اب کیوں پیچھے ہے... لیکن اس مرتبہ بھی گو قدرے پیچھے رہا مگر تمام پرستارانِ حریت و آزادی میں سب سے ممتاز رہا۔ یعنی دوسرے تمام بزرگانِ قوم و رہنمایانِ ملک و ملت کی طرح وہ صرف نظر بندی نہیں رہا۔ اس کے پاؤں کی حرکت اور زبان کی جنبش کسی ایک شہر محدود نہیں رہی بلکہ اس کی حریت پرستی اور صداقت کیشی جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری کی مستحق پڑی اور وہ سرگروہ سربازان حریت و صداقت اپنے مرتبت اعلیٰ و اقدس کے مطابق جیل میں معتکف ہوا۔

دوسری گرفتاری

یوں تو مولانا کو پہلی قید سے رہائی کے بعد کبھی بھی حقیقی آزادی حاصل نہیں ہوئی۔ یعنی ہمیشہ اور ہمہ وقت سی آئی ڈی کے آدمی حضر و سفر میں ان کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے مگر مولانا کے لیے یہ کوئی قید و بند نہیں تھی کہ اگر جائیں تو جائیں و غیرہ لے کر جائیں۔ اس کام کی ذمہ داری سی آئی ڈی پر تھی۔ اس حال میں مولانا اپریل ۱۹۱۶ء تک آزاد رہے لیکن مئی ۱۹۱۶ء میں جب وہ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی میں شرکت کے بعد... لکھنؤ سے علی گڑھ واپس آئے تو دو تین روز کے بعد ان کی خانہ تلاشی ہوئی اور پھر نظر بندی کا حکم صادر ہوا۔ صاحبِ حالاتِ حسرت تحریر فرماتے ہیں کہ "مولانا نے اس حکم کے خلاف لوکل گورنمنٹ سے خط و کتابت کی اور

ایک عرض داشت ارسال کی مگر چونکہ جس وقت حکم سنایا گیا تھا اس وقت مولانا نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ آپ بفحوائے ضمیر ہر اس حکم کی پابندی کو مذہبًا ناجائز سمجھتے تھے جس میں نہ جرم کی نوعیت سے آگاہ کیا جائے اور نہ ملزم کو صفائی کا موقع دیا جائے۔ اس بناپر آپ کو علی گڑھ سے للت پور لے جایا گیا حالانکہ انصافًا مقامی حکام کو یہ حق حاصل نہ تھا، کیونکہ مولانا کا معاملہ ابھی لوکل گورنمنٹ کے زیر غور تھا اور وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا تھا اور جب تک وہاں سے جواب نہ آجاتا اس وقت تک مولانا پر عدول حکمی کا مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا لیکن اس کی پرواہ نہیں کی گئی اور لوکل گورنمنٹ کے احکام کا انتظار کیے بغیر مولانا کو ان کی مرضی کے خلاف للت پور بھیج دیا گیا اور وہیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اجلاس میں عدول حکمی کا مقدمہ دائر کر دیا گیا اور مجسٹریٹ نے آناً فاناً چند گھنٹوں میں فیصلہ سنا دیا اور تین مختلف الزامات میں دو سال کی قید محض تجویز کر دی، اس سلسلہ میں کئی نا انصافیاں مولانا کے ساتھ کی گئیں۔

(۱) قانونِ تحفظِ ہند کے جرائم کی تحقیقات صرف لوکل گورنمنٹ کے مقرر کردہ کمشنر ہی کر سکتے ہیں، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اس بارے میں مطلق کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

(۲) ملزم کو اس کی مرضی کے خلاف للت پور لایا گیا تو مقدمہ للت پور میں نہیں ہو سکتا۔

(۳) جب لوکل گورنمنٹ کے ساتھ خط و کتابت جاری تھی اور حکم نظر بندی کے خلاف ملزم کی عرض داشت لوکل گورنمنٹ کے زیر غور تھی تو اس پر عدول حکمی کا مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔

اس کے علاوہ سب سے بڑی زیادتی اور نا انصافی یہ کی گئی کہ ملزم کو مقدمہ کی پیروی کرنے اور اپنی صفائی پیش کرنے کا مطلق موقعہ نہیں دیا گیا، ظاہر ہے کہ ایسے دور افتادہ مقام پر جہاں نہ مولانا کا کوئی شناسا ہو نہ دوست و ملاقاتی، وہاں وہ چند گھنٹوں میں کیا کر سکتے تھے۔ نہ بحث کے لیے کوئی وکیل اور نہ ہی اتنی مہلت کہ مقدمہ کی کارروائی کو ترتیب دے کر جو غلط الزامات لگائے گئے تھے ان کی صفائی

پیش کی جا سکے۔ گویا بالکل خود مختارانہ طریق سے یک طرفہ فیصلہ کر دیا گیا۔ مولانا نے اس جابرانہ اور نامنصفانہ فیصلہ کی اپیل سیشن جج کی عدالت میں پیش کی مگر جہاں انتظامی اور عدالتی حکام میں کوئی تمیز نہ ہو اور انتظامی عمّال کا دستِ دراز ہمیشہ کار فرما ہے وہاں ایسے معاملات میں انصاف پروری اور عدل گستری کی توقع رکھنا ایک مضحکہ خیز امر ہے۔ سیشن جج نے بھی اپیل نامنظور کر دی۔ اس کے بعد مولانا نے ہائی کورٹ میں اپیل کی اجازت چاہی مگر یہ بھی مسترد کر دی گئی۔ اور درخواست نامنظور کر کے ہمیشہ کے لیے انصاف کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

اس مرتبہ مولانا کی نظر بندی اور جیل پر ملک و قوم کی طرف سے سرد مہری اور بے نیازی کا وہ اظہار نہیں کیا گیا، جو ۱۹۰۸ء میں کیا گیا تھا بلکہ اس کے برخلاف مولانا کی صداقت پسندی، حق گوئی اور اعلیٰ صفات و اخلاق سے دنیا اچھی طرح واقف ہو چکی تھی اور ان صفات عالیہ کی قدر و منزلت سے ذوق آشنا ہو گئی تھی یا یوں کہیے کہ حسرت کی اصول پرستی کو تمام باطل عقائدِ سیاست پر کامل غلبہ اور فتح حاصل ہو چکی تھی، اس لیے گو جس اہمیت کا سزاوار مولانا کا معاملہ تھا اس کا اظہار نہیں کیا گیا تاہم ملک کے ہر گوشے سے مولانا کی بے قصور سزا دہی اور نظر بندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی اور گورنمنٹ کی توجہ دلائی گئی۔ خصوصاً ذیل کے مقامات پر کئی کئی بار جلسے ہوئے اور ان میں گورنمنٹ کے خلاف اظہار ناراضگی کیا گیا۔ متھرا، فیض آباد، میرٹھ، حیدر آباد سندھ، دلی، کلکتہ، سلطان پور، لکھیم پور، کانپور، علی گڑھ، لکھنؤ، الٰہ آباد، بریلی، مراد آباد اور آگرہ۔ ان مقامات پر تو متعدد بار جلسے ہوئے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی اکثر مقامات پر پُر زور جلسے ہوئے اور ان میں ملک کے ممتاز مقررین نے تقریریں کیں۔ علیٰ ہٰذا صحافت وطنی نے بھی اپنی پوری قوت سے ان جابرانہ احکام کے خلاف صدائیں بلند کیں اور نہ صرف اردو اخبارات نے بلکہ انگریزی اخبارات میں بھی مضامین لکھے گئے لیکن اس کے باوجود گورنمنٹ اپنی ضد پر اڑی رہی بلکہ روز بروز اور سختی اختیار کرتی گئی۔ مثلاً یہ کہ ان کو کسی ایک جیل میں بھی نہیں رہنے دیا گیا بلکہ مختلف مقامات کے جیل خانوں میں ان کو چک پھیری پھروائی گئی۔ پہلے للت پور رکھا گیا کیوں کہ وہیں

سزا دی گئی تھی۔ اس کے بعد بلا وجہ جھانسی تبدیل کر دیا گیا اور پھر جھانسی سے الہ آباد جیل روانہ کر دیا گیا۔ الہ آباد میں تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا کہ پرتاپ گڑھ بھیج دیا گیا۔ یہاں بھی خوف دامن گیر ہوا کہ مبادا یے دست و پا حسرت کو کوئی آفت نہ ڈھائے۔ چنانچہ پرتاپ گڑھ سے آپ کو فیض آباد بھیجا گیا لیکن پھر بھی وہم نے ستایا تو لکھنؤ جیل میں مناسب خیال کیا گیا مگر بہت زمانہ نہ گزرنے پایا تھا کہ حکام کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ آج کل لکھنؤ کی سرزمین سیاست کی رزم گاہ بنی ہوئی ہے اور یہاں حسرت کا رہنا خوف و خطرے سے خالی نہیں چنانچہ پھر لکھنؤ سے فیض آباد جیل منتقل کیا گیا۔ آخر میں فیض آباد سے میرٹھ جیل میں۔ اس جبریہ زنداں نوردی کی مدت میعادِ سزا کے ساتھ ختم ہوئی۔ اس زبردستی اور بلا وجہ کی چک پھیری کا نتیجہ غریب حسرت کے لیے یہ نکلا کہ ان کی جسمانی صحت نہایت خراب ہو گئی اور روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی گئی، یہاں تک کہ ان کا وزن چالیس پونڈ گھٹ گیا۔

خرابیٔ صحت

خرابیٔ صحت کی تمام تر ذمہ داری گورنمنٹ پر عاید ہوتی ہے۔ اوّل تو جہاں کہیں بھی ان کو رکھا گیا وہاں کی آب و ہوا حسرت کے ناموافق ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ اگر کسی ایک ہی مقام پر ان کو رکھا جاتا تو شاید رفتہ رفتہ اس مقام کی آب و ہوا کی طبیعت خوگر ہو جاتی مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ جہاں دو چار مہینے ایک مقام پر گزرے اور طبیعت وہاں کی آب و ہوا سے مانوس ہونے لگی تو فوراً ہی گورنمنٹ نے دوسرے مقام پر تبدیل کر دیا اور اس یکایک نئے اور نامانوس مقام پر جانے سے اور وہاں رہنے سے پھر صحت خراب ہو گئی۔ غرض کہ اس طرح سارا زمانہ علالت اور بیماری میں گزرا۔ یوں تو عموماً ملک و قوم کی طرف سے گورنمنٹ کے طرزِ عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی اور ریزولیشن کی صورت میں گورنمنٹ سے خواہش کی گئی کہ کم از کم حسرت کو علی گڑھ جیل میں قیام کرنے کی اجازت دی جائے مگر خصوصیت کے ساتھ مولانا حسرت کی بیگم صاحبہ کو ان کی خرابیٔ صحت کی وجہ سے زیادہ اضطراب رہا اور انھوں نے کوشش کی کہ حسرت کو علی گڑھ جیل

میں رکھا جائے چنانچہ اس غرض سے بیگم صاحبہ محترمہ نے کوشش کی کہ وہ ہز آنرسر جیمس مسٹن سے ملاقات کریں اور عرض داشت پیش کریں۔ اس کام کے لیے انھوں نے سیدال نبی وغیرہ کا توسط تلاش کیا مگر بیگم صاحبہ پھر بھی ہز آنر سے ملاقات نہیں کر سکیں، صرف سیدال نبی کے ذریعہ سے اپنی عرضداشت روانہ کی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ بیگم صاحبہ کی تشویش کا اندازہ اس خط سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے اس ضمن میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو لکھا تھا اور مولانا کی ازدواجی زندگی کے تحت اپنی جگہ پر درج ہے۔ بہرحال مولانا کی خرابیٔ صحت سے تمام ملک میں تشویش و اضطراب پھیل گیا اور اخبارات نے آخر وقت تک گورنمنٹ کی توجہ دلائی کہ وہ اس کو، کہ آج یہاں، کل وہاں، چھوڑ کر مولانا کو علی گڑھ میں رہنے کی اجازت عطا فرمائے مگر سر جیمس مسٹن کی حکومت کو خدا معلوم حسرت کے وجود میں ایسی کیا مخفی قوتیں نظر آتی تھیں کہ علی گڑھ پہنچتے ہی زندانِ فرنگ کی زنجیروں اور بیڑیوں کے باوجود ایک طوفانِ عظیم برپا ہونے کا خوف ہمیشہ دامن گیر رہا اور شاید کچھ ایسی ہی وجوہ ہوں گی جن کی بنا پر حسرت کو علی گڑھ رہنے کی اجازت نہ دی گئی۔ مولانا حسرت پر ابتداً کسی الزام کی تحقیق نہیں کی گئی بلکہ عام نظر بندوں کی طرح وہی معمولی الفاظ کے ذریعہ حکمِ نظر بندی دیا گیا تھا، مگر بار بار کونسلروں کے سوالات کے بعد بالآخر حکومت نے مہر ثبوت توڑ دی بھی تو عجب بے بنیاد الزام ان پر لگا دیا کہ وہ گورنمنٹ کے خلاف سخت ترین افعال کے مرتکب ہوئے ہیں یا ہونے والے ہیں، اس وجہ سے ان کی نظر بندی عمل میں لائی گئی جس نے آخر میں سزائے جیل کی صورت اختیار کر لی۔ حسرت کے لیے یہ کوئی خلافِ توقع الزام نہیں تھا۔ اس لیے کہ گورنمنٹ نے اکثر نظر بندوں کے متعلق جب پبلک کا اصرار و مطالبہ بڑھ گیا اور ایجی ٹیشن ناقابلِ برداشت ہونے لگا تو یہی طرزِ عمل اختیار کیا کہ کسی پر ترکی سے عندالانہ خط و کتابت کا الزام لگا دیا، جیسا مولانا ابوالکلام آزاد پر اور کسی پر ترکوں سے اظہارِ ہمدردی کا الزام رکھ دیا جیسے مولانا محمد علی اور شوکت علی پر۔ حالاں کہ ان تمام حضرات نے گورنمنٹ کو چیلنج دیا کہ اگر اس کے پاس ثبوت کافی ہے تو اعلانیہ کھلی عدالت میں مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال کامل ایک سال بعد

مولانا کی نسبت گورنمنٹ نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ وہ کس وجہ سے نظر بند کر دیے گئے تھے لیکن صرف گورنمنٹ کا یہ کہہ دینا کہ فلاں شخص قابل اعتراض اقدامات کا مرتکب ہوا ہے پبلک کے لیے تشفی بخش نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو کہ گورنمنٹ کے ذرائع معلومات درحقیقت قابلِ وثوق بھی ہیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ گورنمنٹ محض سی آئی ڈی کی رپورٹ پر حسرت کے معاملہ میں مطمئن نہیں ہوئی بلکہ اس سے زائد قابل اعتماد ذرائع سے اس نے معلومات حاصل کی ہیں۔ اس اظہار الزام کے بعد قوم و ملک کی طرف سے پھر بھی بے اطمینانی کا اظہار برابر ہوتا رہا اور تمام اسلامی ہند خصوصاً اور تمام متحدہ ہندوستان عموماً حسرت کو بے قصور اور گورنمنٹ کے طرز عمل کو ناروا اور ناواجب تصور کرتا رہا۔ مگر وہ حکومت جو ایک دفعہ پورا یقین دلانے کے بعد کہ اکثر نظر بندوں کے مسئلہ پر دوبارہ غور کیا جائے گا اور ان کو رہا کر دیا جائے گا، پھر دوبارہ اپنی سخت گیر پالیسی پر لوٹ آئی اور کسی ایک نظر بند کو بھی آزادی نہ بخشی ہو، بھلا وہ غریب حسرت کے معاملہ پر کیا غور کرتی۔

میموریل

حسرت کے متعلق تمام پبلک جلسوں کے ریزولیشنوں اور اخبارات کے مضامین جب بالکل بے اثر ثابت ہوئے تو آخر میں صوبہ جات متحدہ کی کونسل کے غیر سرکاری ہندو مسلم آنر ایبل ممبران نے ایک متفقہ اور متحدہ میموریل سر جیمس مسٹن کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس میموریل میں صوبہ متحدہ کے تمام غیر سرکاری ممبران کونسل کے دستخط ثبت تھے اور اس میں مولانا حسرت کے معاملہ پر رحم آمیز طریقہ سے دوبارہ توجہ کرنے کی گورنمنٹ سے اپیل کی گئی تھی لیکن اس کا حشر یہ ہوا کہ پہلے تو تین چار ماہ تک اس میموریل پر کوئی توجہ نہیں کی گئی حالانکہ تمام اخبارات میں اس کا ذکر برابر ہوتا رہا اور گورنمنٹ کو یاد دہانی بھی کرائی گئی۔ چنانچہ جب کئی ماہ تک اس میموریل کے متعلق گورنمنٹ کا منشا معلوم نہ ہوا تو آخر مجبور ہو کر آنر ایبل مسٹر چنتامنی نے حسب ذیل سوال کیا کہ کیا گورنمنٹ کو باثر افراد کا دستخط شدہ میموریل موصول ہوا

ہے جس میں ہز آنر سے مسٹر فضل الحسن حسرت موہانی کے معاملہ میں رحم آمیز طریقہ سے غور کرنے کی التجا کی گئی ہے۔ کیا گورنمنٹ مہربانی سے بتائے گی کہ ہز آنر نے ازراہِ کرم اس پر کیا حکم صادر فرمایا۔ اس اجلاس کونسل میں آنر ایبل پنڈت گوکرن ناتھ مصرا نے بھی دو سوالات مولانا حسرت موہانی کے بارے میں کیے تھے مگر ان کو آنر ایبل مسٹر چنتامنی کے سوال کے بعد رکھا گیا تھا۔ پنڈت جی کا پہلا سوال تو میموریل ہی کے فیصلہ کے متعلق تھا مگر دوسرا سوال موصوف نے ایک مفید اظہارِ خیال کی صورت میں ترغیب دے کر پیش کیا تھا۔ پنڈت صاحب موصوف نے گورنمنٹ سے دریافت کیا تھا کہ اگر حکومت کے نزدیک وجوہ کے باعث ان بندشوں کو ہٹانا پسندیدہ نہ ہو جو سید فضل الحسن حسرت موہانی پر ازروئے قانون تحفظ بندی کی گئی ہے تو کیا گورنمنٹ برائے مہربانی سید فضل الحسن کو جیل خانہ سے رہا کرکے انھیں ان کے مکان واقع علی گڑھ میں ایسی بندشوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے گی جو ضروری سمجھی جائیں

ان سوالات کا نتیجہ سمجھیے یا کچھ اور، بہر حال اس میموریل کی رسید گورنمنٹ گورنمنٹ کی طرف سے حسبِ ذیل الفاظ میں آنر ایبل جگت نرائن کے پاس جن کے ۔۔۔۔ توسط سے میموریل بھیجا گیا تھا موصول ہوئی۔ یہ رسید گورنمنٹ صوبجات متحدہ کے چیف سیکرٹری کی معرفت یا ان کی روانہ کی ہوئی آئی تھی جو ذیل میں درج ہے۔

"مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں یہ تحریر کروں کہ باشندگانِ صوبجاتِ متحدہ کا وہ میموریل موصول ہوا جس میں استدعا کی گئی ہے کہ سید فضل الحسن حسرت موہانی جیل سے رہا کیے جائیں۔ زیر قانونِ تحفظ ہند جو پابندیاں قائم کی گئی ہیں، وہ ہٹا دی جائیں۔ میموریل پر وہ توجہ ہو گی، جس کا اس کی وزنی حمایت اسے مستحق بناتی ہے لیکن جناب لاٹ صاحب بہادر یہ امید نہیں دلا سکتے کہ سید فضل الحسن حسرت موہانی پر جو پابندی زیر قانونِ تحفظِ ہند قائم کی گئی ہے وہ ہٹا دی جائے گی۔ سید فضل الحسن حسرت موہانی کسی سیاسی ایجی ٹیشن کے باعث ان پابندیوں میں نہیں رکھے گئے بلکہ سرکار کے خلاف نہایت سنگین قسم کے افعال سرزد ہونے کے باعث یہ پابندیاں ان پر عائد کی گئی ہیں۔ اور بدیں وجہ ان کے حق میں ان قیود کا سلسلہ ضرور جاری رہنا چاہیے۔" جس الزام کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں، اس کا علم پہلی مرتبہ اس تحریر کے ذریعے ہوا تھا لیکن باوجود

اس سخت وسنگین الزام کے قائم کر دینے کے پھر بھی حکومت نے امید دلائی تھی کہ میموریل کی وزنی حمایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس پر غور و توجہ کی جائے گی۔ گورنمنٹ کے جواب سے تمام ملک میں کم از کم اس امر کا اطمینان ہو گیا تھا کہ اب مولانا حسرت کو بجائے جیل میں رکھنے کے علی گڑھ میں رہنے کی اجازت دی جائے گی۔ گو قیود نظر بندی ان پر سے نہ ہٹائی جا سکیں گی۔

آنرایبل پنڈت گوکرن ناتھ نے جو سوال کیا تھا، اس سے بھی اس خیال کو تقویت حاصل ہوئی تھی کہ گورنمنٹ کم از کم اس سوال میں جو مقصد ظاہر کیا گیا ہے، اس کو ضرور پورا کر دے گی، اگرچہ یہ کچھ ایسی زیادہ رعایت نہ ہوتی جس کے لیے گورنمنٹ کے آگے درخواستِ رحم کی گئی تھی۔ مگر ایسی حالت میں کہ مولانا کی صحت روز بروز گر رہی تھی اور ان کا وزن دن بہ دن گھٹتا جا رہا تھا، اسی کو غنیمت جانا کہ علی گڑھ میں قیام کی اجازت مل جائے گی۔ اب اس رسید کو آئے اور شائع ہوئے بھی خاصا زمانہ گزر گیا اور سر جیمس مسٹن کے دورِ حکومت کے خاتمہ کا وقت بھی قریب آ گیا مگر ہنوز اس وزنی حمایت والے میموریل کا کوئی نتیجہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ جس زمانہ میں سر جیمس مسٹن کو الوداعی دعوتیں دی جا رہی تھیں اور آپ با حسرت و یاس جوابی الوداعی تقریریں فرما رہے تھے، عین اسی زمانہ میں پھر یہ آوازیں بلند ہوئیں کہ کم از کم اپنے عہدِ آخریں کی یادگار کے طور پر تو بزآنر مولانا حسرت کے معاملہ کو یکسو کیے جائیں۔

حکومت کا اعلان اور بیگم حسرت کا جواب

ہندوستان سر جیمس مسٹن کی چشم التفات کی گردش کا بہت اضطراب و بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہا تھا کہ یکایک پیش گاہ حکومت سے ایک خبر شائع ہوئی کہ حکومت چند شرائط کے ساتھ مولانا حسرت کو آزاد کرنے پر رضامند تھی مگر انھوں نے آزادی حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ خبر ایسی نہ تھی کہ تمام اسلامی ہند کو خصوصاً اور متحدہ ہندوستان کو عموماً محوِ حیرت و استعجاب نہ کر دے لیکن ابھی بہت زمانہ نہ گزرا تھا کہ دو ہی ایک روز کے بعد بیگم صاحبہ حسرت موہانی نے اس طلسمِ حیرت و استعجاب کو اپنی ایک تحریر سے توڑ کر رکھ دیا۔ بیگم صاحبہ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ جس کو

رہائی کہا جا رہا ہے وہ رہائی نہیں بلکہ قید سے بھی بدتر ہے۔

محترمہ بیگم صاحبہ نے حسب ذیل تحریر پریس کو روانہ کی تھی "۲۰ر فروری کو ۱۲ بجے دن کے سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک یوروپین افسر کے ساتھ مولانا حسرت کے پاس جیل میں آئے اور حسرت سے کہا گورنمنٹ تم کو رہا کرنا چاہتی ہے مگر اس شرط پر کہ کھتور ضلع میرٹھ کے بنگلہ میں جولب سڑک ہے نظربندی کی جملہ قیود کے ساتھ رہنا منظور کرو" ان قیود کی ایک نقل حسرت کو بھی دی۔ گاڑی بھی ہمراہ لائے تھے مگر حسرت نے اسے منظور نہیں کیا اور انگریزی میں ایک تحریر لکھ کر واپس کر دی۔ غالباً حسرت کی تحریر گورنمنٹ کو روانہ کر دی گئی تھی۔ دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ خیر، جو کچھ بھی ہو حسرت نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا ہے۔ حسرت نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے، اس میں ضد اور خودرائی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ میں نے حسرت کی اس کارروائی کو بے حد اطمینان اور خوشی کے ساتھ دیکھا نظربندی سے قید ہر حال میں بہتر ہے۔ حسرت نے خوب کیا۔ مجھے ان سے یہی امید تھی۔ مولانا حسرت نے گورنمنٹ کے مقید و مشروط حکم نامہ پر جو تحریر لکھ کر واپس کر دی تھی، اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے: "میں اب بھی اپنے اس اعلان پر ثابت قدم ہوں جو میں نے ۱۹۱۶ء میں کیا تھا۔ اب بھی میرا ایمان اور ضمیر مجھے اس کی اجازت نہیں دیتا کہ میں کسی ایسے حکم کی تعمیل کروں جو قانون تحفظ ہند کے ماتحت دیا گیا ہو اور جس کے ذریعہ مجھے ایک ایسے جرم کی سزا دی جاتی جس میں مجھے اپنی صفائی یا تردید کا بھی موقع نہ دیا جائے، البتہ میں اتنا اضافہ کر سکتا ہوں کہ اگر بغیر کسی شرط کے آزادی دی جائے تو میں بطور خود اس بات کا وعدہ کرنے کو تیار ہوں کہ حکام کے وہم و شکوک کو رفع کرنے کے لیے کم و بیش گورنمنٹ کے مصالح کا خیال رکھوں گا۔"

بیگم حسرت موہانی اور خود مولانا کی تحریر سے آپ صرف اس قدر اندازہ کر سکے ہوں گے کہ مولانا نے کیوں کھتور میں رہنے سے جیل میں

رہنے کو ترجیح دی اور یہ کہ مولانا ہنوز احکام نظربندی کو ناجائز سمجھتے ہیں لیکن دنئی حمایت والے میموریل پر ہمدردانہ غور و توجہ کا جو وعدہ کیا گیا تھا جس کا ذکر چیف سیکرٹری صاحب نے اپنی رسید میں کیا۔ ساتھ ہی مولانا کی ناراضامندی کی پوری حقیقت اس وقت منکشف ہوگی جب آپ کے سامنے وہ شرائط بھی آجائیں جو اس نام نہاد چند روزہ آزادی کے بالمقابل گورنمنٹ نے تجویز کی تھیں۔ اگرچہ حکم نامہ کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مولانا حسرت کو شرائط و قیود کی وہ طویل و عریض فہرست بھی مہیا کی تھی جن کی پابندی کے بغیر آزادی نہیں مل سکتی تھی مگر شاید مولانا نے وہ شرطیں اپنی بیگم صاحبہ کو نہیں بھیجی تھیں یا سنتری نے روک لی تھیں بہرحال کئی روز تک کیا، بلکہ کئی مہینہ تک اس کا علم پبلک کو نہیں ہوسکا اور جو سرکاری کمیونک شائع کیا گیا اس میں صرف یہ ظاہر کیا گیا کہ حکومت ہند اپنی شرطوں کے ساتھ حسرت کی بقیہ میعاد قید کو معاف کرنے کے لیے تیار تھی مگر انھوں نے منظور نہیں کیا۔

شرائط کا اعلان

جب شرائط کی اشاعت میں زیادہ تاخیر ہوئی تو بالآخر مسٹر چنتامنی نے کونسل میں سوال کیا کہ براے مہربانی وہ شرطیں بتلائیں لیکن اس پر بھی وہ شرطیں نہیں بتائی گئیں۔ پھر بعد میں ایک اور سوال کے جواب میں آخر کار حکومت کو وہ شرطیں ظاہر کرنی پڑیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) تم کو تا صدور حکم ثانی کٹھور ضلع میرٹھ کے حدود میں کسی ایسے مکان میں جو مجسٹریٹ ضلع منظور کرے ٹھہرنا ہوگا۔

(۲) تم کو مجسٹریٹ ضلع یا اس کی جانب سے کسی حاکم بااختیار کی تحریری اجازت لیے بغیر مذکورہ حدود کو چھوڑنے کی اجازت نہیں۔

(۳) تم کو روزانہ ذاتی طور پر ۱۰ اور ۵ بجے کے درمیان بجز سخت بیماری یا انتہائی ضعف کے جس کی تمھیں افسر متعلق کو فوراً خبر کر دینی چاہیے۔ افسر انچارج تھانہ کٹھور کو اپنی موجودگی کی رپورٹ کرنی ہوگی۔

(۴) تم کو اس کی ممانعت ہے کہ مقررہ حدود کے باہر جن میں رہنے کی تم سے خواہش کی گئی ہے۔ سورج نکلنے یا ڈوبنے کے درمیان کسی کو لینے یا رخصت کرنے کے لیے جاؤ۔

(۵) تمھیں پولیس انچارج کو ان سب لوگوں کے نام بتانے ہوں گے جو تمھاری فرودگاہ پر آئیں، بجز باشندگان قصبہ مذکورہ اور ان لوگوں کے نام بھی بتانے ہوں گے جن کو تم خط کے علاوہ کسی اور طریقے سے پیغام بھیجو یا خطوط، اگر تم کو کوئی پیام (خط کے علاوہ کسی اور طریقہ سے ملیں) اگر یہ پیام کسی شخص کے ذریعے سے ملیں تو اس شخص کے اقامت گاہ سے رخصت ہونے یا تمھارے پیام بھیجنے یا وصول کرنے سے تین گھنٹہ پیشتر تم کو اطلاع دینی چاہیے۔

(۶) تم سارے تار، اشیائے ڈاک یا دستی خطوط کے جواب جو تمھارے پتہ پر آئیں بلا توقف اور بغیر کھولے ہوئے پولیس افسر مذکورہ کے پاس بھیج دو گے۔ تم کو کسی شخص کے ساتھ اس وقت تک مراسلت رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہو گی۔ جب تک افسر مذکور اس خط و کتابت کی جانچ پڑتال نہ کر لے۔

(۷) تم اس مکان میں جس میں رہنے کی تم سے خواہش کی گئی ہے وہاں کے افسر انچارج تھانہ مذکور یا مجسٹریٹ ضلع یا کسی افسر کو جو درجہ میں پولیس انچارج تھانہ یا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے بالا ہو تمام اوقات میں آزادی سے آنے جانے دو گے۔

یہ ہیں وہ شرطیں جن کی بنا پر بیگم حسرت موہانی نے اپنی تحریر میں لکھا تھا کہ نظربندی سے قید ہر حال میں اچھی ہے۔

مگر ذرا چشم عبرت و تامل سے آغاز میموریل سے اس وقت تک کے واقعات و حالات کو دیکھ جائیے، اس وقت آپ اندازہ کر سکیں گے کہ وزنی حمایت والے میموریل پر ہمدردانہ توجہ جس کا وعدہ کیا گیا تھا، وہ کس عجیب عنوان کے ساتھ مولانا کے حال پر کی گئی۔

ایک ایسے میموریل پر جس پر صوبہ کے تمام باستثنا اصحاب عینی کونسل کے تمام غیر سرکاری آزیبل ممبران کے دستخط ہوں اور جس میموریل کے وزنی ہونے کا خود گورنمنٹ نے اعتراف کیا ہو اور جس کی رسید میں ظاہر کر دیا گیا ہو کہ میموریل کے وزنی ہونے کا اعتراف خود گورنمنٹ نے

کیا ہو اور جس کی رسید میں ظاہر کر دیا گیا ہو کہ میموریل اپنی وزنی حمایت کے لحاظ سے بھی غور و توجہ کا مستحق ہے وہ اس پر کی جائے گی اور پھر اس میموریل کے جانے کے بعد مختلف آنرایبل ممبران نے جو عاجزانہ سوالات کیے۔ نیز ملک و قوم نے اور خود بیگم صاحبہ کے مطالبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر شخص با آسانی اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ کم از کم حکومت حسرت کو علی گڑھ میں اپنے مکان پر نظر بندی کی قیود کے ساتھ رہنے کی اجازت دے گی۔ اور آنرایبل پنڈت گوکرن ناتھ مصرا کے میموریل کی رسید موصول ہونے کے بعد وہ اپنے ایک سوال میں ملک و قوم کی کم سے کم خواہش کو گورنمنٹ پر ظاہر کر چکے تھے کہ حسرت کو مناسب قیود کے ساتھ علی گڑھ میں رہنے کی اجازت دے دی جائے، لیکن ان تمام التجاؤں، عاجزیوں، منت اور خوشامد طرازیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اوّل تو میموریل پر اس قدر غور و فکر کیا گیا کہ کئی ماہ اس میں گزر گئے اور جب غریب حسرت کی میعادِ قید ختم ہونے کے بالکل قریب آ گئی یعنی بمشکل دو ڈھائی مہینے رہ گئے اس وقت ہمدردانہ غور و توجہ کے یہ نتائج نکلے کہ کوئی خوددار آدمی اس کو منظور نہیں کر سکتا۔ موجودہ شرائط کے ساتھ کسی دوسرے مقام اور جیل میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا بلکہ ایسی سخت شرائط پر ہر شخص جیل ہی کو ترجیح دے گا۔ خصوصاً مولانا حسرت جیسا باضمیر و ایمان پرست انسان جو پہلے ہی سے اس قانون اور اس کی پابندی کو ناجائز سمجھتا ہو، بھلا وہ کیوں کر گورنمنٹ کے اس فیصلہ کو تسلیم کر سکتا ہے جس میں ذرّہ برابر سابقہ حالات سے تجاوز نہ کیا گیا ہو اور قصداً مولانا کی طبیعت کو ملحوظ رکھ کر ایسے احکام صادر کئے گئے ہوں جن کو وہ تسلیم کرنے سے بالکل معذور ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ انگریز قوم کبھی دبتی نہیں ہے، جس قدر اس کو مجبور کیا جاتا ہے اسی قدر اس کا عزم و حوصلہ بڑھتا ہے لیکن اس کے برخلاف حسن طلب اور صلح آشتی کے مقابلہ میں انگریز نرم ہو جاتے ہیں اور معاملات کو افہام و تفہیم کی فضا میں طے کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن مولانا حسرت کے معاملہ میں شروع سے آخر تک تمام واقعات پر غور کیجیے، آپ کہیں بھی متانت و سنجیدگی کے خلاف یا حکومت کے ادب و احترام کے مخالف کوئی چیز نظر نہیں آئے گی لیکن باوجود اس کے حسرت کے معاملہ میں انگریزی کریکٹر کی وہ خوبی آپ کو کہیں نظر نہیں آئے گی جس کے وہ مدعی

ہیں۔ مولانا حسرت کے متعلق گورنمنٹ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ غیر متوقع نہ ہو لیکن حالات کا تجزیہ کرنے سے اس میں مزید بدبختی و بدعقیدگی کی اسپرٹ پیدا ہونے کا احتمال ہے کیونکہ اس کے احکام میں یہ بات نمایاں نظر آتی ہے کہ قصداً ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ جس سے حسرت اپنے ضمیر و اطمینان کے فیصلہ کو ملحوظ رکھ کر مستفید نہ ہو سکیں۔ اس نام نہاد عطائے حریت و بخشش آزادی کو جس طرح بے نیازانہ انداز میں مولانا حسرت نے عطائے تو بہ لقائے تو کہہ کر واپس کیا اور حکم حاکم کے جواب میں جو تحریر حسرت نے لکھی ہے، وہ صرف حسرت ہی کا حصہ تھی اور ان کی عدیم المثال قوت ایمانی اور لازوال اعتماد علی اللہ کی ایک کھلی ہوئی نشانی ہے۔

وہ لوگ جن کے قلوب و ارواح ذوقِ ایمان کی شیرینی سے محروم ہیں اور ذرا سی نگاہِ کرم غیر پر کتوں کی طرح پاؤں پر لوٹنے لگتے ہیں یا چشم عتاب آلود کی ایک ہی گردش صبر و ثبات عزم و ارادہ اور ایمان و ضمیر کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں ان کو مولانا حسرت اور ان کی مقدس تحریروں سے درس عبرت حاصل کرنا چاہیے۔ یہی وہ مقام ابتلا و آزمائش ہے جہاں کھوٹے اور کھرے کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے اور خلوص و للہیت اور نمود و نمائش دو جداگانہ حقیقتوں میں تقسیم ہو جایا کرتی ہیں۔ بہرحال گورنمنٹ کی عنایت و نوازش کا جو دریا امڈا تھا، اس کی موجوں کا شور بلند ہوا اور بس بلند ہو کر رہ گیا۔ جو تشنہ کام تھے، اب بھی ویسے ہی العطش العطش کے فریادی ہیں۔

۲۰ر فروری کو بخشش و آزادی کا فرمان پیش گاہ حکومت سے صادر ہوا اور ۲۲ر مئی ۱۹۲۲ء کو میعاد قید ختم ہونے والی تھی یعنی کل تین ماہ کی قلیل مدت کے لیے یہ طوفان رحمت و رافت برپا ہوا تھا مگر ایک حقیر ذرّہ کی خشکی کو سیرابی و تری میں تبدیل کیے بغیر جہاں سے یہ فتنہ اٹھا تھا پھر وہیں آکر ختم ہو گیا۔ تین ماہ کی مدت گو حکومت کے نزدیک طویل ہو جس کو ختم کرانے کے لیے اس نے اپنے جذبۂ رحم کو حرکت دی تھی تاہم بلاکشان راہِ حریت و آزادی کے نزدیک یہ مدت زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ چنانچہ بحمداللہ کہ حسرت نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ اس زمانہ کو بھی گزار دیا۔

آزادی کی تاریخ

۲۳ مئی کی تاریخ اگرچہ آزادی و رہائی کا دن تھا مگر یوم مسرت و خوشی نہ تھا بلکہ پیام جلد امتحان و آزمائش تھا، یعنی مسلسل دو سال کی قید کے بعد پھر از سر نو وہی منزلِ امتحان اور آزمائش درپیش تھا جس کی وجہ سے آج سے دو سال قبل حسرت نے قانون تحفظ ہند کے احکام کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا وہی وجہ آج بھی موجود تھی اور ایمانی قوت اور ضمیری فیصلہ میں آج بھی دو سال کی متواتر مصیبتوں اور کلفتوں کے برداشت کرنے کے بعد بھی کوئی ضعف و تزلزل واقع نہیں ہوا تھا۔ ایک طرف حکومت کی ضد اور زبردستی اپنی انتہائی طاقت کی نمائش کر رہی تھی اور دوسری طرف ایمان و ضمیر کی حق پرستی و حق شعاری اس کے مقابلہ کے لیے تیار تھی حسرت کے قدردان مضطرب و پریشان تھے کہ کہیں یہ شہنشاہ اقلیم حریت و ایمان پرستی پھر جیل کی پر صعوبت چہار دیواری کے اندر مقید نہ کر دیا جائے کیوں کہ ایمان کا دربار اور حق پرست ضمیر کے فیصلے انسانی خودرائی اور ضد کے مقابلہ میں کبھی زبون و خوار اور مغلوب و سرنگوں نہیں ہوا کرتے۔ دوسری طرف استبداد و جبر کی قوتیں اپنی اعادۂ قوت و طاقت کے لیے بالکل آمادہ نظر آتی تھیں، یعنی اپنے ۱۹۱۶ء کے نامنصفانہ فیصلہ کی یاد کو پھر ایک دفعہ زندہ کرنے کو تیار تھیں۔

غرضیکہ حق و باطل، استبداد و حریت، خودرائی و ضمیر پرستی کا ایک معرکہ تھا جو بظاہر ضعیف و ناتواں اور کمزور و بے سروساماں حسرت و طاقت و غرورِ حکومت کے درمیان تھا۔ شاید بعض کمزور ہستیاں اور وہ لوگ جن کو ایمان و ضمیر کی دولت نہیں ملی یا کم ملی ہے وہ اس امر کے متوقع ہوں کہ اب دو سال کی سزائے قید کے مصائب و آلام برداشت کرنے کے بعد حکومت کی دانستہ یا نادانستہ ضد اور خودرائی کے مقابلہ میں حسرت اپنی سپر ڈال دیں گے مگر وہ لوگ جو لذت ایمان سے محروم اور قوت ضمیر کی نیرنگ سازیوں سے ناآشنا ہیں وہ حسرت کے عزم و استقلال کا اندازہ کیوں کر لگا سکتے ہیں۔ بہرحال وہ آنے والی تاریخ آئی اور حسرت نے اس معرکۂ حق و باطل میں وہی کیا جس کی ان سے توقع تھی۔ حکومت نے ان کی میعادِ سزا

ختم ہونے پر ان کو رہائی دی اور ساتھ ہی احکامِ نظر بندی بھی دینے چاہے مگر حسرت نے ان کو لینے میں یک قلم انکار کر دیا۔ اس موقع پر بیگم حسرت موہانی اور سینٹرل پیرو کے کارکن مسٹر تاج الدین اور نواب اسحاق خان صاحب قبلہ (نواب محمد اسماعیل کے والد اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے فرزندِ ارجمند) پہلے ہی میرٹھ پہنچ گئے تھے۔ نواب صاحب قبلہ نے اس موقع پر بہت کچھ رفاقت کی اور مولانا حسرت کو چند روز کے لیے اس امر پر آمادہ کر لیا کہ وہ بطورِ خود کھٹور میں قیام کر لیں تا کہ اس عرصہ میں حکومت سے مزید گفتگو کی جا سکے۔ چنانچہ مولانا نے اپنی خوشی سے بطور خود کھٹور میں رہنا منظور کر لیا اور ایک تار حکومت کو دیا گیا کہ اگر حکومت نظر بندی کے احکام کا نوٹس جاری نہ کرے تو وہ اپنی خوشی سے کم و بیش حکومت کی شرطوں کا خیال رکھیں گے۔ یہی اس وقت حسرت نے بھی کہا تھا جب کہ فرمانِ آزادی آج سے تین ماہ قبل صادر ہوا تھا مگر اس وقت حکومت نے حسرت کی اس شرط کو منظور کر کے جاری شدہ احکامات نظر بندی کو اٹھا لیا اور نوٹس کو منسوخ کر دیا۔ اس کے بعد قاضی بشیر الدین صاحب مشیر قانونی اور آنرایبل سید ال نبی کی معرفت ایک میموریل گورنمنٹ کی خدمت میں نینی تال روانہ کیا گیا اس میں گورنمنٹ سے خواہش کی گئی کہ ان کو علی گڑھ میں رہنے کی اجازت دی جائے مگر حکومت نے اس کو منظور نہیں کیا لیکن بجائے کھٹور میں رہنے کے میرٹھ میں رہنے کی اجازت دے دی۔ لیکن سعی و کوشش کا سلسلہ جاری رہا۔ ادھر تو نواب اسحاق خان گورنمنٹ کے پاس ایک وفد لے کر جانے کی فکر کر رہے تھے اور ادھر اس نازک موقع کے لیے پہلے ہی ہندوستان کے مشہور و ممتاز وکلا اور بیرسٹروں کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی جس میں بفضلہٖ بڑی حد تک کامیابی ہوئی اور پیروی مقدمہ کی تیاریاں تقریباً مکمل ہو گئی تھیں لیکن گورنمنٹ سے جو گفت و شنید جاری تھی اس کا آخر کار یہ نتیجہ نکلا کہ مولانا کو موہان میں رہنے کی اجازت دے دی گئی اور حکومت نے نظر بندی کا حکم جاری کرنے سے احتراز کیا مگر مولانا برابر اصرار کرتے رہے کہ ان کو دو چار دن کے لیے علی گڑھ جانے کی اجازت دی جائے۔ گورنمنٹ اس خواہش کو پورا کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھی اور شاید یہ راج ہٹ پھر معاملات کو پیچیدہ کر دیتی

مگر آنر ایبل مرزا سمیع اللہ کی کوشش کے نتیجہ میں آخر حکومت نے مولانا حسرت کو دو چار دن کے لیے علی گڑھ جانے کی اجازت دے دی۔ اس طرح بہت سی خرابیوں کے بعد آخر مولانا کے لیے یک گونہ سکون و اطمینان کی راہ نکل گئی لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حکومت نے اس تمام کش مکش میں ایک لمحہ کے لیے بھی انصاف اور عدالت کا کوئی دل پذیر نمونہ پیش کیا ہو۔ اِدھر ضد تھی اور اُدھر قوتِ ایمانی۔ بہر حال اس عہدِ ابتلاء و مصائب میں ان لوگوں کے لیے جن کے دل مولانا کے مصائب پر خون رو رہے تھے یہ جو کچھ کہ ہوا وہ بھی غنیمت ہے۔

رہائی کا دن

رہائی کے وقت من جانب پولیس جو انتظامات کیے گئے تھے ان کا معلوم کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ حکومت کے نزدیک حسرت کا وجود اس قدر خطرناک سمجھا گیا تھا کہ جیل کے گرد و پیش تمام سڑکوں اور ناکوں پر پولیس کا باقاعدہ پہرا قائم کر دیا گیا تھا تاکہ پرندہ بھی پر نہ مار سکے۔ ہمدم اور جمہور کے نامہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مسلح پولیس کا اس قدر شاندار انتظام کیا گیا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا ویسرائے یا کوئی اعلیٰ افسر ادھر سے گزرنے والا ہو۔ اس ناکہ اور پہرا چوکی کا یہ اثر ہوا کہ میرٹھ کی کمزور طبیعت مخلوق سہم کر رہ گئی اور کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ حسرت کے استقبال کے لیے آگے بڑھے۔ خدا معلوم حسرت کے وجود کے اندر وہ ایسی کیا خوفناک قوتِ برق موجود تھی جو اُن سے نکل کر خرمنِ امن اماں کو نذرِ آتش کر دیتی۔ حکام میرٹھ کی یہ سختی قابلِ اعتراض تھی کہ مسلمانوں کو اپنے ایک واجب الاکرام لیڈر کے استقبال اور زیارت سے محروم کر دیا جائے۔ اس نظر بندی اور اسیری میں ابتداً جو سختیاں نا انصافیاں اور زبردستیاں حسرت کے ساتھ ہوئیں ان میں سے اکثر کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں لیکن وہ سختیاں جیل کے اندر ان کے ساتھ یا ان سے متعلق دوسروں کے ساتھ کی گئیں وہ ابھی باقی ہیں ہندوستان میں پولیٹیکل محبوسین کے ساتھ جیسا توہین آمیز اور اعزازِ نفس و احترامِ ذاتی کے منافی سلوک و برتاؤ کیا جاتا ہے وہ بجائے خود قابلِ نفرت و حقارت ہے اور

اور موجودہ ترقی یافتہ دور میں ہندوستان کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن حسرت کے ساتھ جو غیر منصفانہ سختیاں کی گئیں وہ ہندوستان میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے ناجائز اور ذلت آمیز سلوک سے مجبور ہو کر مولانا کو اس قید ثانی میں ایک دفعہ بطور احتجاج الہ آباد جیل میں چار روز کھانا وغیرہ ترک کرنا پڑا۔ بالآخر جب کئی وقت کھائے پئے بغیر گزر گئے تو مجسٹریٹ ضلع کو مجبوراً مولانا کا مطالبہ پورا کرنا پڑا اور جس تکلیف میں ان کو مبتلا رکھا گیا تھا اس سے نجات ملی۔

نار وا برتاؤ

مہذب دنیا میں پولیٹکل قیدیوں کو تمام قیدیوں سے ممتاز رکھا جاتا ہے۔ اور ان کے ساتھ نسبتاً بہتر سلوک کیا جاتا ہے مگر یہاں مطلق اس بات کا پاس ولحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ حکام کو ان سے کچھ زیادہ ہی بغض وعناد ہوتا ہے اور ان پر نسبتاً زیادہ سختی کی جاتی تھی۔ چنانچہ عام قیدیوں سے ہفتہ میں ایک مرتبہ ان کے اعزاواحباب مل سکتے تھے مگر حسرت کے ساتھ اس قدر سختی برتی گئی کہ اس دو سال کی طویل مدت میں بہت کم لوگوں کو ان سے ملنے دیا گیا۔ یہاں تک کہ جو لوگ ان سے ملنے یا ان کو کسی اپنے طریقے سے مدد پہنچانے کی غرض سے ان کے پاس گئے۔ ان کے ساتھ بھی پولیس افسران اور مقامی حکام نہایت ذلت آفریں اور نہایت قابل نفرت وحقارت طریقہ سے پیش آئے بلکہ ان پر ناجائز دباؤ ڈال کر ان کو طرح طرح کی دھمکیاں دے کر مولانا کی اعانت اور امداد سے باز رکھا۔ ذیل میں اس بیان کے ثبوت کے طور پر ایک مراسلت درج کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا حسرت کے ساتھ بعض مقامی حکام کیسا منتقمانہ جوش اور معاندانہ جذبہ رکھتے تھے۔ یہ مراسلت سید افضال حسین صاحب رضوی وکیل ہردوئی ضلع بارہ بنکی نے ۲۵ر اگست ۱۹۱۶ء کے اخبار نئی روشنی الہ آباد میں شائع کرائی تھی۔ موصوف مولانا حسرت کے مقدمہ اپیل کی پیروی کے لیے جھانسی تشریف لے گئے اور وہاں جو واقعات پیش آئے تھے ان کا اظہار اس مراسلت میں آپ نے کیا ہے۔

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کی مظلومی اور درد اسلامی سے متاثر ہو کر

میں نے پیروی اپیل کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اپنے وطن ہردوئی سے سوار ہوکر ۱۸؍جون ۱۹۱۲ء کی شام کو قریب پانچ بجے میل ٹرین سے جھانسی پہنچا اور سرائے میں مقیم ہوا۔ حسبِ معمول پولیس ۸ بجے شب کو مسافرانِ سرائے کا جائزہ لینے آئی۔ مجھ سے بھی میرا نام و پتہ اور وجہِ قیامِ جھانسی دریافت کی۔ میں نے کہہ دیا کہ میں حسرت کی پیروی مقدمہ اپیل کے لیے آیا ہوں اور بشرطِ موقع و فرصت انجمن رفاہ المسلمین قصبہ ہردوئی کے لیے چندہ وصول کرنے کی بھی کوشش کروں گا۔ ۱۹؍جون ۱۹۱۲ء کو بذریعہ درخواست مولانا حسرت سے جیل میں ملاقات کی۔ واپس آیا پھر ۲۰؍جون کو جیل گیا مگر حسرت سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ناکام واپس ہوکر سرائے میں کھانا کھا رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل صاحب نے آکر کہا، سب انسپکٹر پولیس آپ کو بلا رہے ہیں۔ ناچار جانا پڑا۔ انھوں نے نام پتہ اور وجہِ قیامِ جھانسی دریافت کر کے ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس چلنے کو کہا۔ وہاں بھی گیا اس دربار کی کچھ گفتگو بطور مکالمہ تحریر کرتا ہوں۔ میرے مقابل مسٹر ایچ اے انگلش پولیس افسر تھے۔

افسر پولیس: "آپ کا نام؟"

میں: "افضال حسین رضوی۔"

افسر پولیس: "باپ کا نام؟"

میں: "مولوی سید محمد حسین رضوی"

افسر پولیس: "کہاں مکان ہے؟"

میں: "ہردوئی ضلع بارہ بنکی۔"

افسر پولیس: "کون تھانہ ہے؟"

میں: "جلسر۔"

افسر پولیس: "یہاں کیوں آئے؟"

میں: "مولانا سید فضل الحسن کے مقدمے کی پیروی کے واسطے۔"

افسر پولیس: "حسرت آپ کے کون ہیں؟"

میں: "میرا بھائی ہے۔"

افسر پولیس: "کیسا بھائی ہے؟"

میں "وہ بھی مسلمان ہے میں بھی مسلمان ہوں۔ وہ بھی ہندوستانی ہے اور میں بھی ہندوستانی ہوں۔ کوئی خاص رشتہ نہیں ہے۔"

افسر پولیس "حسرت کے مقدمہ کی پیروی کے لیے کیوں آیا؟"

میں "محض برنائے اخوت و ہمدردی اسلامی۔"

افسر پولیس (غضب ناک ہو کر) "کیا آپ کو معلوم ہے کہ جھانسی کی آب و ہوا مسلمانوں کے لیے ناموافق ہے۔ آپ یہاں کیوں آیا۔ جیل جائے گا تو پھر نہ آئے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حسرت کس جرم کا مجرم ہے؟"

میں "نہیں۔ کیا خود مجرم بھی اپنے جرم سے ناواقف ہے؟"

اس پر افسر نے میری نسبت بہت ہی غیر مہذب اور نا ملائم الفاظ استعمال کر کے اور بگڑ کر کہا۔ "تم کو نہیں معلوم۔"

افسر پولیس "آپ چندہ بھی جمع کریں گے حسرت کے واسطے؟"

میں "نہیں، حسرت کے لیے نہیں بلکہ انجمن رفاہ المسلمین قصبہ ہردوئی ضلع بارہ بنکی کے لیے۔ وہ بھی بشرط فرصت و موقع۔"

وصول چندہ کا ثبوت طلب کرنے پر میں نے انجمن کا ایک مطبوعہ اشتہار دکھایا جس کے بعد مجھے صاحب کلکٹر کے پاس جانے کا حکم ملا۔ وہاں بھی مجھ سے حال دریافت کیا گیا مگر پیرایۂ متانت و تہذیب کے ساتھ۔ اور آخری حکم یہ ملا کہ میں تا حکم ثانی حدود میونسپل کمیٹی سے باہر نہ جاؤں۔ میں نے اس کی پابندی کی مگر پولیس کی نگرانی اعلانیہ اور خفیہ جاری رہی۔ کئی دن کے بعد یہ حکم اٹھا لیا گیا۔ اب میں بظاہر آزاد تھا مقدمہ کی تاریخ یکم جولائی مقرر تھی۔ تاریخ مذکورہ پر اخراج اپیل کا حکم سننے کے بعد نقل لے کر وطن واپس آنے کا ارادہ تھا کہ وہی ننھے خاں کانسٹیبل جو پہلے دن میری عیادت کو آئے تھے پھر میرے پاس آئے اور حکم نادری سنایا کہ آپ فوراً جھانسی سے چلے جائیے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ میں نے کہا کہ نقل اخراج اپیل لے کر اور میرے پاس خرچ نہیں ہے۔ مکان سے یا علی گڑھ سے خرچ آنے پر جس کی امید ہے واپس جاؤں گا۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا اور میرا چلا جانا ناگزیر ہے تو حکم تحریری لاؤ اور سرکار ریل کا ٹکٹ بھی خرید کر مجھے دے تو میں جھانسی ابھی چھوڑتا ہوں۔ بہر حال

نقل لینے کے بعد ۵ ر جولائی ۱۹۱۶ء کو میں جھانسی سے روانہ ہو کر صحیح و سالم وطن پہنچا۔ بیگم حسرت موہانی کا ایک پرائیویٹ خط میرے پاس تھا جس کو کانسٹیبل پولیس لے گیا تھا مگر باوجود اس کے کہ اسسٹنٹ پولیس نے مجھ سے واپسی کا وعدہ کیا تھا لیکن ابھی تک وہ خط مجھ کو نہیں ملا ہے۔ اب جائے انصاف ہے کہ افسر پولیس کا ایسے نا ملائم الفاظ استعمال کرنا جائز تھا یا ناجائز" خادم کمترین سید افضال حسین رضوی محلہ سالار قصبہ ہردوئی ضلع بارہ بنکی۔

اس مراسلت کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے اور پھر حکومت کے طرزِ عمل کو دیکھیے جو وہ حسرت کے معاملہ میں کیے ہوئے ہے جب ایک ایسے شخص کے ساتھ جو حسرت کے مقدمہ کی پیروی کرنا چاہتا ہو ایسا معاندانہ سلوک کیا جائے اور صرف اس جرم میں کہ وہ مظلوم حسرت کا ہمدرد ہے ایسی سختی اور درشتی کی جائے اور ایسا غیر مہذب طرزِ عمل اختیار کیا جائے تو آپ ان سخت گیریوں اور سختیوں کا اندازہ کر سکتے ہیں جو خود غریب حسرت کے ساتھ کی گئی ہوں گی۔ اس قسم کی سخت گیریوں کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو گیا بلکہ اور بہت سے لوگوں نے ان سے ملنا چاہا لیکن بہت کم لوگوں کو اجازت ملی، مثلاً ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مسٹر تاج الدین سپرنٹنڈنٹ سینٹرل بیورو نے ملنے کی اجازت طلب کی تاکہ ان کے مالی معاملات درست کرنے کے لیے ان سے مشورہ کریں مگر حکومت نے ان کو ملنے کی اجازت نہیں دی۔ اسی طرح لکھنؤ جیل میں ۵ معزز ہندو اور مسلمانوں نے مولانا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ان میں مرحوم راجہ غلام حسین بھی تھے مگر لکھنؤ کے ڈپٹی کمشنر صاحب نے ان کو بھی ملنے سے روک دیا گیا۔ اس پر ایک مؤقر انگریزی اخبار لیڈر نے لکھا تھا کہ آیا مسٹر جاہلنگ نے یہ اقدام اپنی ذمہ داری پر کیا ہے یا اعلیٰ حکام کی منظوری پر کیا ہے۔ ایک ستم رسیدہ محبِ وطن سے ان پانچ لوگوں کی ملاقات سے کیا گومتی میں آگ لگ جاتی یا جیل خانہ کے ڈسپلن میں ابتری پیدا ہو جاتی۔ کیا گورنمنٹ کو اس بات کا علم نہیں کہ سیاسی آراء سے قطع نظر قوم حسرت موہانی کی قدر و منزلت ان کے اعلیٰ کیریکٹر اور بے ریا حبِّ وطن کی وجہ سے کرتی ہے۔ اگر گورنمنٹ ناواقف ہے تو خفیہ پولیس کا محکمہ جس پر ہزاروں روپے صرف

کیے جاتے ہیں، کس قسم کی اطلاعیں بہم پہنچاتا ہے۔ حکومت کو تو ان باتوں کا بخوبی علم ہونا چاہیے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ حکومت کا منشا اور اس کی مصلحت اس روک تھام سے کیا تھی اور کیا ہے البتہ اس سے مولانا حسرت کا جس قدر نقصان ہوا وہ افسوسناک ہے کیوں کہ کوئی شخص ان سے ان کے کاروبار کے سلسلہ میں کوئی مشورہ نہ کر سکا، اس کے علاوہ ان کی تکالیف کا بھی کم لوگوں کو علم ہو سکا۔ اور شاید گورنمنٹ کا یہی منشا اور مقصد بھی تھا۔ مولانا نے حکومت کی ہٹ دھرمی کا ذکر کرتے ہوئے اس شعر میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

کہتے ہیں وہ کہ تیری گزارش ہے ناقبول
اک بار کر چکے ہیں جو ارشاد کر چکے

گرفتاری کی وجہ

حکومت نے تو اس گرفتاری کے سلسلہ میں کوئی تفصیل نہیں مہیا کی مگر خلافت اور عدم تعاون کے عنوان سے مسٹر پی سی بیڈ فورڈ نے جو حکومت ہند کے محکمہ سراغرسانی کے ڈپٹی ڈائریکٹر تھے جو رسالہ لکھا تھا اور جو حکومت ہند کے پریس میں چھپا تھا اس میں درج ہے کہ فضل الحسن حسرت موہانی علی گڑھ کے مشہور شورش پسند کو حکومت صوبجات متحدہ نے للت پور جھانسی میں لا کر نظر بند کر دیا ہے۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کا اور ابو کلام آزاد کا ارادہ کابل جانے کا تھا۔ یہ بھی خبر ملی ہے کہ اس کو اور آزاد کو برکت اللہ کی عارضی حکومت ہند سے مراسلات موصول ہوتے تھے اور اور بعد میں اس بات کی دوسرے شواہد سے بھی اب تصدیق ہو چکی ہے۔

نظر بندی یا قید

اس قید کے سلسلہ میں ایک نمایاں بات یہ تھی کہ ابتداً مولانا کو نظر بند کیا گیا مگر مولانا نظر بندی کے مقابلہ میں جیل کو ترجیح دیتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے نظر بندی قبول نہیں کی اور جیل چلے گئے لیکن ان کے احباب جن میں مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل تھے، یہ چاہتے تھے کہ مولانا نظر بندی قبول کر لیں، اس لیے کہ نظر بندی جیل سے بہتر ہے۔ خود ان کے مرشد زادے مولانا عبدالباری فرنگی محلی جو بجیر

مولانا مرشدی کا درجہ دیتے تھے بھی یہی چاہتے تھے اور اس بارے میں مولانا بیگم حسرت میں اس دوران جو مراسلت ہوتی رہی اور جو مولانا کی خانگی زندگی کے باب میں درج ہے اس بات کا اشارہ بھی کیا گیا ہے مگر مولانا اپنے خیال میں قائم رہے اور انھوں نے اس ضمن میں اپنے مرشدزادے کو تین خط لکھے ابتدائی دو خطوں میں تو مقدمہ سے متعلق اپنے خیالات پیش کیے اور تیسرے خط میں ان وجوہ پر روشنی ڈالی جن کی بنا پر وہ قید کو نظربندی پر ترجیح دیتے تھے چونکہ یہ تینوں خطوط اس زمانہ میں مولانا کے نقطہ نگاہ کی مکمل ترجمانی کرتے ہیں اس لیے انھیں پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱)

زللت پور، ۱۴ مئی ۱۹۱۹ء از فقیر حسرت موہانی

مخدومی و مطاعی! السلام علیکم۔ جناب کے دو گرامی نامے جواب میں نے لکھ دیا تھا، غالباً نظر مبارک سے گزرا ہوگا اور جناب نے اسے بعد ملاحظہ حسب گزارشِ خاکسار مولانا ابوالکلام کو بھیج دیا ہوگا۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ جناب اجمیر شریف بغرض شرکتِ عرس تشریف لائے ہوں گے اس لیے اور کوئی عریضہ حاضر نہیں کیا۔ چند روز کے بعد یہاں کے مجسٹریٹ نے پرائیوٹ طور پر مجھے اجازت دے دی تھی کہ بغیر حکم ملنے ہوئے تم للت پور میں رہ کر گورنمنٹ سے اپنے معاملہ میں خط و کتابت کرو چنانچہ میں نے کئی تحریریں اور اب آخر میں کل یعنی ۱۳ مئی کو ایک طویل تار اس مضمون کا روانہ کیا کہ میرا انکار ضد کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اخلاقی اور مذہبی عذرات کے باعث ہے، چنانچہ میں علی گڑھ میں نظربندی قبول کر سکتا ہوں بشرطیکہ حکم نظربندی میں کسی جرم کی تصریح یا اشارہ نہ ہوتا کہ اس کے قبول کرنے کے متعلق میرا اصولی اعتراض رفع ہو جائے۔ دوئم مجھ کو کسبِ رزقِ حلال بذریعہ اشاعت تذکرۃ الشعرا وغیرہ کی اجازت ہو تاکہ مجھ کو وظیفہ بدخیرات لینے کی ضرورت نہ ہو۔ سوئم سلبِ آزادی کا مجھ کو نقد معاوضہ اس قدر یک مشت دیا جائے جو کاروباری نقصان کی تلافی کر سکے۔ اس کا جواب میں نے کل یعنی ۱۵ مئی دوپہر سے قبل مانگا ہے کیونکہ یہ وقت میرے خلاف مقدمہ عدول حکم کے آغاز کا مقرر ہے۔ اگر جواب حسب دلخواہ

نہ ہوا تو مقدمہ شروع ہو گا۔ میں نے چاہا تھا کہ اس مقدمہ میں میری مدد کے لیے کوئی وکیل یا بیرسٹر معتبر موجود ہوتا تو اچھا تھا لیکن ان کا کچھ انتظام نہ ہو سکا۔ میں نے کئی بیرسٹروں کو بذریعہ جوابی تار بلایا تھا مگر بعض نے رقم کثیر پیشگی طلب کی اور بعض نے عدم فرصت کا عذر کیا۔ مجبوراً میں خود پیروی کروں گا۔ آپ دعا فرمائیں کہ سب امور حسب مراد طے ہو جائیں۔ اگر مقدمہ شروع ہوا تو میں تین ابتدائی اعتراض کروں گا۔ (۱) خلاف ورزی حکم جو علی گڑھ میں گئی اس لیے مقدمہ وہیں ہونا چاہیے (۲) للت پور میں مجھے مالی یا قانونی مدد نہیں مل سکتی اس لیے مقدمہ یہاں نہ ہو (۳) حکام للت پور صرف لفٹیننٹ گورنر کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں انصاف نہیں کرتے جس کا وہ خود مجھ سے اقرار کر چکے ہیں۔ اس لیے وہ سماعتِ مقدمہ کے ناقابل ہیں اگر یہ عذر مسموع نہ ہوں گے تو میں التوائے مقدمہ کی درخواست کروں گا تاکہ ہائی کورٹ میں تحریک کروں۔

فقط، حسرت

(۲)

از للت پور ۱۹۱۶ء، ۱۶ر مئی۔

مخدومی ومطاعی۔ کل ۱۵ر مئی کو میرا مقدمہ شروع ہوا مگر میں نے ابتدائی اعتراضات کیے کہ مقدمہ یہاں نہیں ہو سکتا، علی گڑھ میں ہونا چاہیے۔ الحمدللہ کہ مجھے بظاہر کامیابی ہوئی مجسٹریٹ کچھ نہ کر سکا۔ مجبوراً دریافتِ حال کے لیے غالباً جھانسی یا کہیں اور مسل روانہ کی ہے۔ میں ان شاءاللہ کامیاب رہوں گا۔ آپ دعا فرماتے رہیں۔

فقط خاکسار، سید فضل الحسن حسرت موہانی۔

(۳)

للت پور ۱۸ر مئی ۱۹۱۶ء

مخدومی ومطاعی: آج جناب کے گرامی نامہ نے عزت افزائی کی۔ آپ دریافت فرماتے ہیں کہ میں نظر بندی پر قید کو کیوں ترجیح دیتا ہوں۔ میں نے جناب کی سمع خراشی کے خیال سے پہلے نہیں کہا تھا اب عرض کرتا ہوں کہ قانون تحفظِ ہند

چونکہ جلدی میں بنایا گیا ہے، اس لیے اس میں بہت سی خامیاں رہ گئی ہیں۔ میں ان سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں

اصل حال یہ ہے اس قانون کی رو سے میرا مقدمہ یہاں کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں نہیں ہو سکتا۔ یا تو ہائی کورٹ میں ہو گا یا پھر مسٹر جیمس مسٹن کو گورنر جنرل سے اجازت لے کر پہلے قانون تحفظِ ہند کی ۹ دفعات کو صوبجات متحدہ میں یا کسی مقام پر جہاں میرا مقدمہ ہو گا نافذ کرنا پڑے گا۔ اس لیے ان صوبجات میں ابھی صرف دو دفعات نافذ ہیں۔ ان دوسری دفعات کے نفاذ کے بغیر لیفٹیننٹ گورنر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد البتہ وہ اسپیشل کمشنر مقرر کر سکتا ہے جو خاص میرے مقدمہ کے لیے مقرر کیے جائیں گے۔ اوّل تو اسپیشل کمشنروں کے تقرر کی نسبت خدا کے فضل سے بعض ایسی قانونی باریکیاں میرے ذہن میں آئی ہیں جس کا اظہار اس وقت نہیں کر سکتا مگر جن کی بنا پر ان کمشنروں کو میرے مقدمہ چلانے میں سخت دقت پیش آئے گی اور اگر بالفرض انھوں نے زبردستی مقدمہ چلایا بھی تو قیدِ سخت کی سزا تو وہ دے سکتے ہی نہیں، اس لیے کہ میرے اعتراضات سب اخلاقی یا مذہبی ہیں اور صاف ظاہر ہے کہ کوئی عدالت کسی شخص کو اپنے اخلاق اور مذہب کے خلاف عمل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی نہ ایسے احکام کی خلاف ورزی پر جو اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے کسی شخص کے نزدیک ناقابل قبول ہوں، قیدِ سخت کی سزا دے سکتی ہے۔ پس رہی قیدِ محض۔ اس میں اور نظر بندی میں کوئی فرق نہیں۔ اور جب حال یہ ہے تو ظاہر کہ میں نظر بندی کو منظور کر کے جبر و ستم کے سامنے عاجزی و ناچاری کے ساتھ سر جھکا دینے کی ناقابل برداشت ذلت کو خواہ مخواہ کیوں گوارا کروں۔ فرض کیجیے میرا یہ خیال صحیح ثابت نہ ہو اور قیدِ سخت ہی کی سزا مجھے دی جائے تو میں اس حکم قید کے ماننے سے بھی انکار کروں گا خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہمیں کس قدر تکلیف برداشت کرنی پڑے گی لیکن اپنی ذات کو اس تھوڑی سی تکلیف سے بچانے کے لیے میں اپنے اس اصول کو نہیں چھوڑ سکتا کہ تسلیم ستم بشرطیکہ امکان ہر حال میں ناجائز ہے۔ مسٹر محمد علی نے اس باب میں ہم کو ایک طول طویل خط لکھا تھا اور جناب نے

بھی علی گڑھ کے خط میں تحریر فرمایا تھا لقدکان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور حضور کا امیرالامور کو اختیار کرنا تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ میں نے اس وقت جواب لکھ دیا تھا اور آپ کی خدمت میں گزارش ہے کہ حضور کے ذاتِ گرامی کے ساتھ بنائے اسلام و قیامِ اسلام کا ایک اس درجہ اہم امر وابستہ تھا جس کے لحاظ سے اس ذاتِ مقدس کی حفاظت کے لیے جو کچھ کیا جاتا مناسب تھا لیکن ہر عامی کا وجود ہرگز اتنا اہم نہیں ہو سکتا کہ اس کے لیے بھی وہی عذر قابلِ قبول سمجھے جائیں۔ دنیاوی مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ بادشاہ یا فوج کے جنرل کے لیے حالتِ جنگ میں ایسی بہت سی باتیں جائز ہوتی ہیں جو ایک سپاہی کے لیے ہرگز ہرگز جائز نہیں ہو سکتیں۔ اور ظاہر ہے کہ موجودہ جنگِ کذب و صداقت میں میری حیثیت ایک سپاہی سے زیادہ نہیں۔ بس میرے لیے صرف اپنی ذات کی حفاظت کے لحاظ سے پیٹھ دکھانا یا جبر و ستم کے مقابلہ میں صبر کر کے بیٹھ رہنا کسی طرح مباح نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو غالباً امام حسین کی شہادت واقع نہ ہوتی۔ حالانکہ یہ امر مسلم ہے کہ امام رضی اللہ عنہ کی ذاتِ مبارک اس عہد کی افضل ترین ذات تھی جس کی حفاظت بہت زیادہ جائز سمجھا جا سکتا تھا بہرحال میری یہ توجیہہ صحیح ہو یا غلط میرا دل کسی طرح اس حکم نامعقول کو گوارا نہیں کر سکتا۔ گورنمنٹ سے جو امداد نظربندوں کو دی جاتی ہے وہ سب خیراتی فنڈ سے دی جاتی ہے، چنانچہ میرے نام جو حکم اس ضمن میں دیا گیا، اس میں صاف لکھا ہوا تھا۔ مجھے اس کے لینے میں بے شک تامل ہے۔ ایک مذہبی اعتبار سے دوسرے اس خیال سے بھی کہ انکار حکم نظربندی کے اسباب میں سے میں ایک سبب اس واقعہ کو بھی قرار دینا چاہتا ہوں اور مشتبہ ہونے کی حالت میں میرا فائدہ اسی میں ہے کہ میں اس کو مذہبی سبب قرار دوں۔ علاوہ ازیں ظلم کو تسلیم نہ کرنے کی بابت جتنی آیتیں میں نے منتخب کی ہیں اس کی نسبت بھی میرا وطیرہ یہی ہو گا کہ اگر ان سے جواز انکار کا شائبہ بھی نکلتا ہو گا تو میں ان کو اپنے لیے دلیل مذہبی قرار دوں گا کیونکہ اسی میں میرا فائدہ ہے۔ فائدہ مذہبی بھی . . . . اور فائدہ دنیاوی بھی۔ مذہبی لحاظ سے اگر کسی امر کے جائز یا ناجائز ہونے میں شبہ ہو

تو جو طرزِ عمل مذہب کی رو سے بہتر معلوم ہوا اور جس میں گناہ کا اندیشہ بھی نہ ہو وہی اختیار کرنا چاہیے اور بنیادی طور پر وجوہ انکار کے اخلاقی و مذہبی ثابت ہونے پر کوئی عدالت قیدِ سخت کی سزا غالباً نہیں دے سکتی۔ میں نے کارڈ سے پہلے ایک لفافہ بھی جناب کی خدمت میں ارسال کیا تھا، جس میں آخر میں لکھ دیا تھا کہ بعد ملاحظہ عالی وہ مولانا ابوالکلام کو بھیج دیا جائے۔ غالباً جناب نے بھیج دیا ہو۔ یہ عریضہ بھی بعد ملاحظہ ان کو بھیج دیا جائے تو بہتر ہے کیوں انھوں نے بھی قریب قریب وہی باتیں مجھ کو لکھی ہیں، جو جناب نے تحریر فرمائی ہیں اور ان کو بھی وہی جواب دوں گا جو آپ کو دیا ہے۔ پتہ ان کا یہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ایڈیٹر البلاغ بذریعہ پوسٹ ماسٹر رانچی۔ میں نے لیفٹیننٹ گورنر کے پاس جو تجویز روانہ کی ہے، اس کا کچھ جواب نہیں آیا، شاید غور کر رہے ہوں کہ کیا کرنا چاہیے کیوں کہ بظاہر ان کو بھی یہ آسان نظر نہ آتا ہوگا۔ مقدمہ معلوم نہیں اب کس تاریخ کو اور کہاں پیش ہوگا۔ آپ دعا فرماتے رہیں، یہی کافی ہوگا۔ باقی بیرسٹر کی جیسا غالباً میری بیوی نے آپ سے عرض کیا ہوگا بظاہر اب بھی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی۔ اچھا ہوا کہ کوئی صاحب تشریف نہیں لائے کہ انھیں مفت میں زحمت ہوتی اور میں بے کار زیر بار احسان ہوتا۔

فقط، کمترین حسرت۔

حضرت مولانا عبدالباری صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اس خط کا جو جواب دیا تھا، وہ بھی ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جواب از طرف مولانا عبدالباری صاحب۔ آپ کا طویل خط پہنچا۔ مجھے آپ کے مقصد کا پہلے علم نہ تھا اس واسطے میں اس مسئلہ کو ظاہر کرتا تھا، لہٰذا اب بھی کہتا ہوں کہ جو مفید اور مناسب ہو عمل کیجیے۔ ہر فعل جو قابلِ شکایتِ کفار ہو جائز ہے چاہے اس میں خطرۂ جاں ہی کیوں نہ ہو۔ مگر کوئی فعل جس میں بجز اہانت مسلم کوئی اور مقصد نہ ہو شرعاً جائز نہیں اور ہمارے حضور نے شریعت پر عمل کر کے دکھایا ہے۔ اس باب میں کوئی بات حضور کی از خود خصوصیت نہیں رکھتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ خداوندِ عالم کسی اور کو حضور کے ساتھ مختص کر دے۔ بہر حال میری تحریر آپ

طرزِ عمل کے منافی بھی نہیں ہے۔ میں بلاشبہ آپ کی بیوی کی پریشانی کے خیال سے کسی شخص کے بھیجنے کی فکر میں تھا تعجب ہے کہ خلاف امید مجھے شیخ شاہد حسین نے کہلا بھیجا کہ اگر کہو تو میں بلا فیس حسرت کی تائید کے لیے جا سکتا ہوں۔ اگر آپ کی رائے ہو تو مطلع کیجیے۔ میں نے خود ان کو ابھی جواب نہیں دیا ہے۔ میں آپ کے لیے دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جو امر آپ کے فلاح دارین کا ہو اس کی توفیق دے۔ والسلام۔

مرشد زادے سے عقیدت

مولانا کو حضرت مولانا عبدالباری سے بے انتہا عقیدت تھی مگر اصول کے معاملہ میں مولانا کی رائے کسی سے متاثر نہیں ہوتی تھی۔ یہ ان کی فطرت کا خاصہ تھا۔ لیکن عقیدت واحترام اپنی جگہ قائم ودائم تھا۔ چنانچہ اس کا اکثر وبیشتر مقامات پر اظہار ہوا ہے۔ مثال کے طور پر اس خط ہی کو لیجیے جو مولانا نے ۲۶ جنوری ۱۹۱۳ کو مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی کو تحریر فرمایا۔ اسی خط میں تحریر ہے کہ "آج انڈین ٹیلی گراف کے لوکل کالم میں انجمن سعید الاسلام کے جلسہ کی خبر پڑھ کر میرے دل پر خاص اثر ہوا۔ اللہ تعالیٰ مولانا عبدالباری صاحب کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اپنے کو لاخوف علیہم ولا ہم یحزنون کا پورا مصداق ثابت کیا۔ لاریب انھوں نے وہی کیا جو ایک اظہارِ امرِ حق میں بے باک عالم اور درویش کو پیش کرنا چاہیے۔ جناب ممدوح کی خدمت میں میری جانب سے بعد آداب خادمانہ مبارک باد عرض کر دیجیے۔ مولانا عبدالباری کو بھی مولانا سے بہت محبت تھی، اس لیے اصولوں پر اختلاف کو ہنسی خوشی برداشت کرتے تھے۔ مولانا نے ہمیشہ ہر معاملہ میں خواہ وہ ذاتی ہوں یا غیر ذاتی مولانا عبدالباری سے مشورہ کیا اور اس پر عمل کیا۔ مولانا اور ان کی بیگم جیسا کہ مولانا کی ازدواجی زندگی کے باب میں ذکر ہو چکا ہے، اپنی ہر پریشانی کا تذکرہ مولانا عبدالباری سے کر کے دعا کے طالب ہوتے تھے۔ انھیں بلاشبہ مولانا عبدالباری کا قرب حاصل تھا۔ ذیل کے اسی خط سے بھی اس تعلقِ خاص کا اندازہ ہوتا ہے۔

"مخدومی ومطاعی! مکرمی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی حاضرِ خدمت ہوتے ہیں۔ آپ مولانا عبدالقدیر بدایونی کے بھی معتقد ہیں۔ یہ اپنا حال خود بیان کریں گے۔ میں نے

یہ چند الفاظ بطور تعارف تحریر کر دیے ہیں۔ فقط خاکسار حسرت موہانی

بیگم حسرت کی پریشانی

بہر حال اس دوسری قید کے دوران بیگم حسرت کو مولانا کی خرابی صحت کی وجہ سے بہت پریشانی رہی، جس کا تفصیلی تذکرہ ازدواجی زندگی کے باب میں ہو چکا ہے۔ یہاں اس بات کے تذکرہ سے یہ بات مقصود ہے کہ بیگم صاحبہ اس سارے عرصہ میں بے حد پریشان رہیں لیکن انھوں نے اس کا ذکر مولانا سے نہیں کیا۔ اور جب مولانا نے نظر بندی پر قید کو ترجیح دی تو اگرچہ ان کی رائے اس معاملہ میں اپنے مرشد کی رائے سے ملتی تھی، انھوں نے مولانا کی ہمت شکنی نہیں کی اور یہی کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح اصول کو قربان کیے بغیر مولانا کی پریشانی میں کمی ہو۔

اشعار

اس قیدِ ثانی کے دوران مولانا پر جو مصائب اور شدائد توڑے گئے، اس کا اوپر تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے مگر انھوں نے حسبِ دستورِ سابق ان صعوبتوں کو ہنسی خوشی برداشت کیا جس کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے جو مولانا نے اس قید کے دوران کہے چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے جو شعر اس قید کے دوران کہا وہ یہ ہے۔

حادثے سن آٹھ میں گزرے بہت اب دیکھیے
کیا دکھائے گردشِ لیل و نہار اب کے برس

پھر نظر بندی کے احکام کے سلسلہ میں انھوں نے یہ شعر کہا۔

حضور آپ نہ ضائع کریں عطا اپنی
کہ مستحق ہوں جفا ہائے التزامی کا

یا

بے پر و بال کہاں چھوٹ کے جائیں صیاد
ہم اسیرانِ وفا کیش کو آزاد نہ کر

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس مرتبہ مولانا کو متعدد مقامات پر قید رکھا گیا، چنانچہ جب وہ علی گڑھ جیل سے للت پور لے جائے گئے تو انھوں نے یہ شعر کہا۔

سر پہ حاضر ہے جو ارشاد ہو مرجانے کو
کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو

للت پور سے جب آپ کو جھانسی لے جایا گیا تو آپ نے یہ شعر کہا۔

حسرت آئے گی کسی کو یہاں روحِ نسیم
قید ہو آئے ہیں جھانسی جو للت پور سے ہم

جھانسی کے بعد الٰہ آباد، پرتاب گڑھ، فیض آباد، لکھنؤ اور میرٹھ کے جیل خانوں میں انھیں رکھا گیا۔ میرٹھ اور فیض آباد کے جیل خانوں کا یہ شعر قابلِ ذکر ہے۔

کیا وہ اب نادم ہیں اپنے جور کی رُوداد سے
لائے ہیں میرٹھ جو آخر مجھ کو فیض آباد سے

اس زمانہ کے اکثر اشعار میں اپنے عزم کی بلندی، خیالات کی پختگی اور فکر میں جامعیت کا بھی ذکر ملتا ہے۔

یہ سارا زمانہ مسلمانوں کے لیے بڑا صبر آزما تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے باعث چونکہ ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا لہٰذا مسلمانوں کی ہمدردیاں عام طور پر جرمنی کے ساتھ تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ انگریزوں نے عیاری اور مکاری سے شریفِ مکہ کو ترکوں کے خلاف کر دیا اور بھائی کو بھائی سے لڑا کر آپس میں اس قدر نفرت پیدا کر دی جو ۵۰ برس گزر جانے کے باوجود آج بھی موجود ہے اور جس کی وجہ سے آج تک مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان عربوں ترکوں اور ایرانیوں میں تقسیم ہو کر اسرائیل جیسے چھوٹے ملک کے مقابلہ میں اپنی صفوں کو درست کرنے میں کام یاب نہیں ہو سکے۔ اس سازش کی وجہ سے انگریز شریف مکہ کی امداد و اعانت سے حضرت شیخ الہند کو مکہ سے گرفتار کر کے مالٹا لے جانے میں کام یاب ہو گئے اور ایک طویل عرصہ تک انھیں مالٹا کی مرطوب آب و ہوا میں نظر بند رکھ کر ان کی جلد موت کا باعث ہوئے اور ادھر ہندوستان میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو

جھنڈواڑہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کو رانچی میں نظر بند کیا گیا اور انکی خرابی صحت کی وجہ سے کہ

دنیا بدل چکی تھی

مولانا جب جیل سے باہر آئے تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ یونیورسٹی فاؤنڈیشن بل منظور ہو چکا تھا۔ جون ۱۹۱۸ء میں جب مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ شائع ہوئی تو اس میں ہوم رول کی پیش کش تھی۔ اعتدال پسندوں نے اسے لبیک کہا اور بڑے جوش خروش سے لیکن حریت پسند اس ادھوری آزادی کو کب پسند کرتے، اس لیے ان کے حلقوں میں اظہار ناراضگی کیا گیا۔ مولانا جیسے حریت پسند بھی اسے کب پسند کرتے۔ چنانچہ ان کی جانب سے بھی ان اصلاحات کی مخالفت ہوئی اور انھوں نے درج ذیل اشعار میں ان کی دھجیاں بکھیر دیں۔

کس درجہ فریب ہے مملو — تجویز ریفارم مانٹیگو

مشہورِ زمانہ ہیں مسلّم — دستور کے حسبِ ذیل پہلو

قانون پہ اختیار کامل — عمال پہ زور، زر پہ قابو

ان میں سے نہ ہو جب ایک کی بھی — گل ہائے ریفارم میں کہیں بو

کاغذ کے ہیں جیسے پھول ان کو — جن میں نہیں نام کو بھی خوشبو

مدراس کے ڈاکٹر کا یہ قول — کس درجہ ہے دلپذیر دیکھو

مقصود ہے صرف یہ کہ تاجنگ — ہم سب رہیں صرف ایس نگاہو

اے ہندی سادہ دل خبردار — ہر گز نہ چلے یہ تجھ پہ جادو

کیا پائے گا خاک پھر جب اس سے — اس وقت بھی کچھ نہ لے سکا اگر تو

واقعہ یہ ہے کہ ان اصلاحات میں انتظامیہ، خزانہ اور امنِ عامہ کے تینوں اہم محکمے گورنر کے قبضۂ قدرت میں رکھے گئے اور بعض مبصرین کا تو یہ خیال ہے کہ منتقلی اختیارات کے ضمن میں منٹو مارلے ریفارمس مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات سے بہتر تھیں۔

رولٹ ایکٹ ابھی مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے چرچے ہی ہو رہے تھے اور ان

کے مفید و غیر مفید ہونے کی بحث جاری تھی کہ حکومت کی مشینری پھر حرکت میں آئی اور پتہ چلا کہ رولٹ ایکٹ منظور کر لیا گیا جس کے مطابق ان تمام قوانین کو تحفظ دے دیا گیا جو زمانۂ جنگ میں ضرورتِ حالات کے تحت نافذ تھے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ جنگ کے بہانے عوام کی جو شہری آزادیاں ضبط کی گئی تھیں انھیں زمانۂ امن میں بھی بدستور ضبط رکھنے کی اسکیم کو عملی شکل دے دی گئی۔ اس صریح ناانصافی اور ظلم کے خلاف حسبِ توقع آواز بلند کی گئی اور لوگوں میں عام طور پہ بے چینی پھیل گئی۔ جابجا غم و غصہ کا اظہار کیا گیا اور حکومت کی اس ہٹ دھرمی اور ظلم کے خلاف اظہار نفرت و حقارت کیا گیا۔ جن ناانصافیوں کو جنگ کے نام پر بادل نخواستہ قبول کیا گیا تھا انھیں زمانۂ جنگ کے بعد قائم و دائم رکھنے پر ملک کے گوشہ گوشہ میں صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ جلسے ہوئے، جلوس نکلے، قراردادیں منظور کی گئیں لیکن حکومت جس کی نیت ظلم کو استحکام بخشنے اور عوام کی شخصی آزادیں سلب کرنے میں تھی۔ ان شکوہ ہائے قوم پر کیا کان دھرتی اور انھیں کس طرح درخور اعتنا قرار دیتی جب ظلم مقصد ہو اور ناانصافی مذہب ہو تو صدائے حق بھی نعرۂ نارسا اور دور کی آواز بن جاتی ہے اور اس کا جواب تلخی اور تغافل سے دیا جاتا ہے اور اربابِ حکومت کے نزدیک شکایت، بغاوت اور شکوہ کی شیرینی سوئے ادب بن جاتی ہے۔ مولانا جو حکمرانوں کے سچے مزاج داں اور اربابِ حریت کے صحیح قائد اور جذباتِ آزادی کے صحیح نقیب تھے، ان حالات میں کیسے خاموشی کو روا رکھتے۔ انھوں نے بھی عوام کے اس شکوہ و شکایت میں حصہ لیا اور بھرپور حصہ لیا اور حکومت کی ہر طرح مخالفت کی۔ ذیل کے اشعار اس ضمن میں ان کے جذبات کی صحیح غمازی کرتے ہیں۔

ہمارے شکوہ ہائے سخت جانی پردہ کہتے ہیں
ابھی دیکھی نہیں ہے آپ نے رنج رواں میری
تمھارے جور بے پروا سے اب یہ چھپ نہیں سکتی
غم پنہاں کی شدت سے جو حالت ہے عیاں میری

اور ان اشعار میں تو طنز اور بھی گہرا ہو گیا ہے۔

ہیں رضا کار تو ہم پر ہے بہر حال یہ فرض شکرِ حق لب پہ رہے شکوۂ اعدا نہ کریں
مان لیں فیصلۂ دوست کو بے چون و چرا فکرِ امروز ہی رکھیں غمِ فردا نہ کریں

مولانا تو انگریزوں کے دشمن جانی تھے، اس لیے کہ انگریز قوم سے انھیں کوئی خاص مخاصمت تھی بلکہ وہ ایک حد تک انگریزوں کے ذاتی کردار کے معترف تھے۔ لیکن انھوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ انگریز بدستور ہندوستان کو اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتے ہیں اور جب تک انگریزوں کی طاقت کو ختم نہیں کیا جائے گا، برصغیر کی آزادی ممکن نہیں۔ وہ صاحبِ بصیرت اور مجسم فراست تھے۔ انھیں صحیح اندازہ تھا کہ انگریز زبان سے ہندوستان کی آزادی دینے کا وعدہ ضرور کرتے ہیں لیکن انگریز سامراجیت کی مصلحت کبھی بھی ہندوستان کی آزادی کو گوارا نہیں کر سکتی۔ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات اور رولٹ ایکٹ کے نفاذ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس ضمن میں مولانا کی فہم و فراست نے جو تجویز کیا ہے وہ ہر اعتبار سے صحیح اور درست ہے۔ مولانا کا یہ یقین کہ جب تک ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت اور نفرت کے جذبات کو فروغ نہ دیا جائے گا اور انھیں ملک سے نکالا نہیں جائے گا وہ از خود عوام کو آزادی نہیں دیں گے اور یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک عوام میں قید اور گرفتاری کا خوف رہے گا۔ اسی لیے انھوں نے اس دور میں اکثر مقامات پر قید اور گرفتاری کا تمسخر اڑایا ہے تاکہ قوم ذہنی طور پر جیل جانے اور جیل کی صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ذیل کے اشعار ان کی مذکورہ جدوجہد کا عکس پیش کرتے ہیں۔

بیکار ڈراتے ہو مجھے قیدِ ستم سے واں روحِ وفا اور بھی آزاد رہے گی

○

آزاد ہیں قید میں بھی حسرتؔ ہم دل شدگانِ خود فراموش

○

کر کے وہی رہے گا جو دل میں ٹھان لی ہے
روشن ہے ہم پہ حسرتؔ عزم امور تیرا

○

بیکار ہے اظہارِ غضب اہلِ ستم کا — ڈرتا ہوں میں ان سے نہ ڈروں گا نہ ڈرائیں
شاہوں کے تکبر سے بھی دب کر نہ رہونگا — کس بار گرِ خاص کا آخر ہوں گدائیں

کانپور میں قیام

رہائی کے بعد انھوں نے دو کام کیے۔ ایک تو یہ کہ علی گڑھ سے کانپور کو نقل مکانی کی اس تبدیلیٔ سکونت کے اسباب و علل تفصیل کے ساتھ سودیشی تحریک کے ضمن میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ رہائی کے فوراً بعد انھوں نے اپنے ذاتی حالات کو ساز گار بنائے بغیر امر تسر کانگریس میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ یہ اجلاس ان کی رہائی کے بعد ۱۹۱۹ء میں منعقد ہوا۔ مولانا محمد علی نے بھی نظر بندی سے رہائی کے بعد اسی اجلاس میں شرکت کی تھی اور وہی اس اجلاس کے صدر تھے۔ امر تسر کانگریس کو برصغیر کو آزادی کی راہ میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہیں مسلم لیگ کا بھی سالانہ اجلاس ہوا تھا اور مولانا اس میں بھی شریک ہوئے تھے۔ لیکن اس کا ذکر مسلم لیگ کے ضمن میں آئے گا۔ امر تسر کانگریس میں مولانا کی شرکت کا ذکر اس خط میں بھی ہے جو مولانا نے اپنی رہائی کے بعد اپنے رفیقِ سیاست مولانا سلامت علی فرنگی محلی کو لکھا تھا۔ خط درج ذیل ہے۔

"مخدومی اسلام علیکم۔

آپ کا خط حیات الحسن صاحب کے ذریعہ سے ملا جس میں آپ نے مجھے مشورہ کی غرض سے بلایا تھا مگر چونکہ حیات الحسن صاحب موہان چلے گئے تھے، اس لیے ان کا خط موہان گیا اور پھر وہاں سے کئی روز کے بعد انھوں نے مجھ کو بھیجا، چنانچہ وہ خط آج مجھ کو ملا۔ دو چار روز میں امر تسر جانا ہوگا۔ غالباً آپ حضرات بھی وہاں آئیں گے اور وہیں ملاقات ہو جائے گی۔ سید فضل الرحمٰن صاحب اگر رہا ہو کر لکھنؤ میں ہوں تو ان کو بھی امر تسر بھجوائیے گا۔ مجھ کو ان سے ضروری کام ہے۔"

چنانچہ مولانا نے امر تسر کانگریس میں شرکت کی اور وہیں یہ فیصلہ ہوا اور مسٹر گاندھی کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ خلافت کو بچانے کے لیے تحریک چلانے سے قبل اتمامِ حجت کے لیے وائسرائے سے بات کی جائے۔ مولانا اگرچہ اس ملاقات کو

بے سود سمجھتے تھے لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ اکابر ہند اس ملاقات کو ضروری سمجھتے ہیں تو پھر وہ بھی اس پر آمادہ ہو گئے۔ وفد کی ملاقات درحقیقت تحریک خلافت کا پیش خیمہ تھی جس کا تفصیلی ذکر اپنی جگہ پر آئے گا لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ اکابر ہند شملہ جانا چاہتے تو پھر انھوں نے اسی رائے کو تسلیم کر لیا تاکہ واقعات کے تسلسل میں فرق نہ آئے۔ امرتسر فیصلہ کی روشنی میں وائسرائے سے درخواست کی گئی کہ وہ اکابر ہند کے ایک وفد کو ملاقات کا شرف بخشیں اور وائسرائے نے اس درخواست کو منظور کر کے ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کی تاریخ مقرر کر دی۔ مولانا بھی چونکہ وفد کے ارکان میں شامل تھے اس لیے وہ امرتسر سے واپس آ کر علی گڑھ سے موہان چلے گئے اور چند روز وہاں مقیم رہے اور حکومت کی جانب سے انھیں نظر بندی الاؤنس پیش کیا گیا لیکن انھوں نے اور بیگم صاحبہ نے اسے قبول نہیں کیا اور تاریخ مقررہ سے قبل دلی پہنچ گئے جہاں وائسرائے سے وفد کو ملنا تھا۔ اس وفد میں تمام نقطہ ہائے خیال کے ارکان شامل تھے جن میں حکیم محمد اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، سیٹھ چھوٹانی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مسٹر گاندھی اور مسٹر شار دھاسند، مولانا نثار احمد کانپوری، ممتاز حسین، مفتی کفایت اللہ، سید حسین مولانا شوکت علی، مولانا عبدالماجد بدایونی، سید ظہور احمد، مولانا فاخر الٰہ آبادی، آغا محمد صفدر، مہاراجہ محمود آباد، پنڈت موتی لال نہرو اور راجہ صاحب جہانگیر آباد قابل ذکر ہیں۔ وفد کے دوسرے دو ارکان مسٹر محمد علی جناح اور پنڈت جواہر لال نہرو وقت پر نہ پہنچ سکے مگر انھوں نے تار سے اطلاع دی کہ وہ وفد کے نقطۂ نگاہ سے متفق ہیں۔ ارکان وفد کی تعداد ۳۵ تھی اور اس تعداد کے باوجود بعض جاہ پسند افراد محض وائسرائے سے ملاقات کے شوق میں اس میں شامل ہونے کے لیے بے چین و بے قرار تھے لیکن انھیں اپنے مشن میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن دو مسلمان رہنماؤں کی شان اس ضمن میں بالکل نرالی تھی ایک مولانا ابوالکلام آزاد جو مشوروں میں شریک تھے جلسوں میں شریک تھے مگر وفد میں شامل ہونے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے وفد میں شامل نہ ہوئے اگرچہ حکیم اجمل خاں اور دوسرے احباب نے بہت زور دیا مگر ان کا انکار ہر اصرار پر غالب رہا مگر اس سے زیادہ نرالی شان

مولانا کی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد والے طریق میں کسی نہ کسی حد تک اپنی ذات کے اعتنا کا اظہار ہوتا تھا مگر مولانا نے یہ کیا کہ ایک طرف تو خاموشی کے ساتھ وفد میں شمولیت کی اور تھرو وائسرائے میں ارکان وفد کے ہمراہ موجود رہے لیکن عرض معروض اور جواب کے بعد جب وائسرائے سے مصافحہ کا اعزازی لمحہ آیا تو مولانا چپکے سے اٹھ کر بے ہاتھ ملائے کترا کر نکل گئے کہ کسی نے محسوس بھی نہیں کیا۔ وائسرائے سے ملاقات جیسے کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ۱۹ جنوری کو ہوئی تھی اور اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ حکومتِ ہند سے اتمام حجت کر لیا جائے۔ ارکانِ وفد کی یہ خواہش تھی کہ حکومت ہند پر یہ بات واضح کر دیا جائے کہ مسلمانوں کی ہمدردیاں ترکوں کے ساتھ ہوں اس لیے حکومت برطانیہ کی صلح کانفرنس میں ترکی کے بارے میں فیصلہ کرنے سے قبل مسلمانان ہند کا خصوصاً اور ہندوستانیوں کا عموماً عندیہ معلوم کر کے اس کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ ارکان وفد نے وائسرائے کو بتا دیا کہ اگر حکومت برطانیہ نے ترکی کے سلسلہ میں اہل ہند کے صحیح جذبات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور ایک ظالم فاتح کی حیثیت سے ترکی کے ساتھ ناانصافی کی اور سلطان ترکی کو جو مسلمانانِ عالم کے خلیفہ ہیں زک پہنچائی تو اس سے اہل ہند کے جذبات مجروح ہوں گے اور وہ حکومت کے خلاف تحریک چلانے میں قطعی طور پر حق بجانب ہوں گے اور اس کی ساری ذمّہ داری حکومتِ برطانیہ پر ہوگی۔ وفد کے ارکان نے وائسرائے کو بتایا کہ ہندوستانیوں نے جنگ میں برطانیہ کی ہر طرح مدد کی۔ اب برطانیہ کی حکومت کا فرض ہے کہ وہ بھی ہندوستانیوں کے جذبات واحساسات کی قدر کرے اور صلح کانفرنس میں ترکی کے ساتھ بات چیت کرتے وقت ان کا پاس کرے۔ وائسرائے نے وفد کی معروضات کو توجہ کے ساتھ سنا اور وعدہ کیا کہ وہ اربابِ ہند کے جذبات حکومت برطانیہ تک پہنچا دیں گے لیکن ہوا وہی جو مولانا نے کہا تھا یعنی اس وفد کی معروضات پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ لیکن اس کا تذکرہ آگے آئے گا۔

ترک موالات یہ سال (۱۹۲۰) برصغیر کی تاریخ میں بے حد اہم ہے اس لیے

کہ مولانا نے ۱۹۰۷ء میں جس دفاعی مزاحمت کی تجویز پیش کی تھی اس کو کانگریس نے اس سال اپنے اجلاس ناگپور میں شریک کیا اور اعلان کیا کہ اگر ۳۱ دسمبر ۱۹۲۱ء تک برطانیہ نے ہندوستان کو آزاد نہ کیا تو ترکِ موالات کی تحریک چلائی جائے گی۔ مولانا اپنی اہلیہ کے ساتھ اس اجلاس میں شریک تھے اور اس بات پر یقینی طور پر خوش تھے کہ انھوں نے تیرہ برس پہلے جس دفاعی مزاحمت کی تجویز پیش کی تھی اسے کانگریس نے من وعن منظور کیا ہے لیکن اس تجویز کی منظوری کے باوجود مسٹر گاندھی اور ان کے حواریوں کی نیت صاف نہیں تھی۔

آزادیٔ کامل

اور جب دسمبر ۱۹۲۱ء کے اواخر میں کانگریس کا اجلاس احمد آباد میں منعقد ہوا اور مولانا نے تجویز پیش کی کہ چونکہ حکومت ہند نے حسبِ قراردادِ کانگریس آزادی نہیں بخشی لہٰذا یکم جنوری ۱۹۲۲ء سے آزادیٔ کامل کا اعلان کر دیا جائے۔ تو مسٹر گاندھی اور ان کی کانگریس نے اس منطقی قرارداد کو منظور نہیں ہونے دیا۔ سید سلیمان ندوی نے جو مولانا کے ساتھ ناگپور کانگریس اور احمد آباد کانگریس میں شریک تھے اس ریاکاری اور ذہنیت کا آنکھوں دیکھا حال پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "اب ۱۹۲۱ء کا سال آیا جب گاندھی جی کانگریس پر چھائے ہوئے تھے اور ادھر خلافت کے لیڈر محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا ظفر علی خاں، تصدق حسین خاں شیروانی۔ ڈاکٹر سید محمود مولانا ابوالکلام آزاد اور حسرت وغیرہ تھے ترکِ موالات کا زور تھا۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے ہندوستان کے سوراج ملنے کی آخری تاریخ مقرر کی ہوئی تھی احمد آباد میں کانگریس کا یہ تاریخی جلسہ تھا۔ محمد علی، شوکت علی اور ابوالکلام آزاد نظر بند تھے باقی سب حضرات شریک تھے۔ ڈاکٹر انصاری اور سید محمود کے ہمراہ جلسہ میں میں بھی تھا۔ اجلاس کے پنڈال سے باہر مسلمانوں کی قیام گاہ کے سامنے ایک شامیانے میں خاص مسلمانوں کا جلسہ تھا۔ حکیم صاحب وغیرہ موجود تھے۔ گاندھی جی خاص طور سے مسلمانوں کو کچھ کہنے آئے ہوئے تھے۔ اتنے میں دیکھا کہ کانگریس کی سبجیکٹس

کمیٹی سے گھبرائے ہوئے بھاگتے ہوئے دو والنٹیر آئے اور گاندھی جی سے نہایت اضطراب کے عالم میں کہا کہ جلدی چلیے سبجیکٹس کمیٹی میں حسرت موہانی صاحب نے ہندوستان کے استقلال کی تجویز پیش کر دی ہے (آزادیٔ کامل) اور کسی طرح واپس نہیں لے رہے ہیں۔ فضا میں ایسا محسوس ہوا کہ کوئی غیبی گولہ آپڑا ہو چنانچہ گاندھی جی وغیرہ بھی گھبرائے ہوئے جلسہ سے اٹھ کر سبجیکٹس کمیٹی میں چلے گئے مگر یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔

مولانا کی تجویز یہ تھی کہ چونکہ حکومتِ ہند نے مقررہ تاریخ پر سوراج نہیں دیا لہٰذا یکم جنوری ۱۹۲۲ء سے کامل آزادی کا اعلان کر دیا جائے اور ہندوستان میں متحدہ ریاست ہائے ہند UNITED STATAS OF INDIA کے نام سے ایک امریکن ریپبلک قسم کی ایک جمہوریت قائم کی جائے۔ لیکن مسٹر گاندھی اور کانگریس برطانوی ہند کی حکومتِ برطانیہ سے علیحدگی کے خلاف تھے اور وہ ایک جمہوری حکومت بلکہ وحدانی حکومت زیرِ سایہ حکومتِ برطانیہ قائم کرنا چاہتے تھے۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ "حسرت بدستور اپنی بات پر اڑے رہے اور نوٹس دیا کہ وہ اسے کھلے اجلاس میں پیش کریں گے چنانچہ وہ وقت آیا جب کھلے اجلاس میں حسرت نے ہندوستان کے استقلال کی تجویز پیش کی اور انھوں نے دیکھا کہ ہزاروں کے اس مجمع میں ایک بھی آواز تائید کے لیے بلند نہیں ہوئی یہی چیز مولانا اور کانگریس اور مولانا اور مسٹر گاندھی میں اختلافات کے آغاز کا باعث ہوئی اور مولانا نے یہ محسوس کر لیا مسٹر گاندھی اپنی تمام تر رہنمائیت کے باوجود ایک متعصب ہندو ہیں اور سچے حریت پسند نہیں۔ مولانا کی اس قرارداد کی جو تصورِ پاکستان کے پیش خیمہ کی حیثیت رکھتی ہے، بیگم حسرت نے تائید کی جس کا تذکرہ مولانا کی ازدواجی زندگی میں آ چکا ہے۔ اس قرارداد کو تحریکِ پاکستان کا پیش خیمہ کہنا چاہیے کہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندو اکثریت کے خلاف مسلمان اقلیت کو محفوظ رکھنے کے لیے امریکی طرز پر متحدہ ریاست ہائے ہند کے نام سے ایک مملکت کے قیام کی باقاعدہ اور باضابطہ تجویز پیش کی گئی۔

جناب رضوان احمد صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کو اس لحاظ سے

بڑی اہمیت تھی کہ اس میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقد ہوئے۔ مولانا ان تینوں جلسوں میں شریک تھے اور اس عزم کے ساتھ شریک تھے کہ ہر سہ پلیٹ فارم سے کامل آزادی کی تجویز منظور کرائیں گے۔ مولانا کو اس پر اصرار تھا کہ یہ تجویز کانگریس کے اجلاس میں ضرور پاس ہو۔ مولانا نے اس ضمن میں بڑی جد وجہد کی اور کانگریس کیمپ میں تمام صوبوں کے نمائندوں سے الگ الگ ملے اور کامل آزادی کی تجویز پاس کرانے کے لیے زبردست کنویسنگ کی اور ہندو اکثریت کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔ مسٹر گاندھی کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بوکھلا گئے۔ انھوں نے مولانا کی اس تحریک کی سخت مخالفت شروع کر دی۔ مسٹر گاندھی کامل آزادی کے خلاف تھے۔ وہ صرف سوراج چاہتے تھے۔ مولانا حسرت کے خیال میں سوراج کوئی مستند سیاسی اصطلاح نہیں تھی۔ اس لیے مولانا نے مسٹر گاندھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ سوراج کی تعریف مکمل آزادی کر دیں تو میں سوراج منظور کرلوں گا۔ مسٹر گاندھی نے یہ تعریف کرنے سے انکار کر دیا۔ مسٹر گاندھی مکمل آزادی اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ ان کے خیال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پورا اتحاد نہیں تھا اس لیے وہ مکمل آزادی کو قبل از وقت سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس مولانا حسرت کا یہ خیال تھا کہ اس وقت دوران خلافت تحریک، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جتنا اتحاد تھا وہ آیندہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ مولانا نے مسٹر گاندھی کو صاف صاف بتا دیا کہ آپ مکمل آزادی کی بجائے ڈومینسن اسٹیٹس چاہتے ہیں اور وہ اس نظریے کے تحت کہ انگریزوں کے زیرِ سایہ ہندوستان پر حکومت کی جائے۔ مسٹر گاندھی کا سوراج صحیح معنوں میں ہندو راج تھا۔ مولانا کانگریس کے عقیدۂ سوراج کی نئی تعبیر میں تمام بیرونی قبضوں میں مکمل آزادی پیش کر رہے تھے۔ مولانا نے اعلان کر دیا کہ ڈومینسن اسٹیٹس چکّی کے دو پاٹوں کے برابر ہے اور میں مسلمانوں کو ان دو پاٹوں کے درمیان میں نہیں پسنے دوں گا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان ڈومینسن اسٹیٹس کسی قیمت پر قبول نہیں کریں گے۔ مسٹر گاندھی کی سخت مخالفت کی وجہ سے یہ تجویز کانگریس کے اجلاس میں منظور نہ ہو سکی۔ لیکن ان کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ اندھرا، بنگال اور سی پی کے تمام کانگریسی

نمائندوں نے ماسوائے ایک کے' ان کی تائید کی۔ یہی نہیں بلکہ بمبئی اور دلی کے بھی بعض کانگریسی نمائندوں نے آزادیٔ کامل کی حمایت کی مگر مولانا کی قرارداد کو اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہو سکی۔ تاریخ کانگریس کے مصنف ڈاکٹر پتابھی سیتا رمیہ نے ۱۹۳۷ء میں سبھاش چندر بوس کے مقابلہ میں کانگریس کی صدارت کے لیے گاندھی جی کے نمائندے تھے، لکھا ہے کہ "اب میں اس بحث کی طرف آؤں گا جو مولانا حسرت موہانی نے شروع کی تھی جنھوں نے تجویز کیا تھا کہ کانگریس کے نصب العین میں جس جگہ سوراج کا لفظ آیا ہے اس سے مراد مکمل آزادی، ایسی آزادی جو بیرونی کنٹرول سے آزاد ہو، لیا جائے۔ آج کل کے حالات میں اگر غور کیا جائے تو وہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے سلسلہ میں یہ ایک فطری عمل تھا اور اس لیے اس بات پر تعجب ہو سکتا ہے کہ آخر کانگریس اور گاندھی نے کیوں اس کی مخالفت کی"۔ ڈاکٹر سیتا رمیہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "اس ترمیم پر تقریر کرتے ہوئے گاندھی جی نے کانگریس قائدین کی سرزنش کی اور کہا کہ آپ لوگوں نے اس ترمیم پر جن جذبات کا کا اظہار کیا ہے اس سے مجھے افسوس ہوا۔ مجھے اس بات کا غم ہے کہ آپ لوگ غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ہمیں ناگپور اور کلکتہ کے تاریخی دور کی طرف واپس جانا چاہیے۔ مسٹر گاندھی نے اپنی تقریر میں آگے چل کر کہا کہ دنیا کے اہل الرائے حضرات ہم پر الزام لگائیں گے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں ہم اس کے نتائج سے بے خبر ہیں۔ ہمیں اندازہ لگا لینا چاہیے کہ وقت آنے دیجیے جب ہندو اور مسلمان ناقابلِ تنسیخ رشتۂ اتحاد میں منسلک ہو جائیں۔ کیا آج پورے اعتماد سے کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہاں آج ہندوستانی قومیت کے میدان میں ہندو مسلم اتحاد ایک ناقابلِ تنسیخ حقیقت بن چکا ہے۔ کوئی ہے جو مجھ سے کہے کہ پارسی اور سکھ اور عیسائی اور یہودی اور وہ اچھوت جن کے بارے میں آج تیسرے پہر بہت کچھ کہا گیا ہے کل یہی لوگ اس قسم کے اعلان کے خلاف اٹھ کھڑے نہ ہوں گے۔ اس موقع پر صرف ایک ہی دلیل کارگر ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ پہلے ہمیں اپنی قوت کو مجتمع کر لینا چاہیے۔ ہمیں اس گہرائی کا اندازہ لگانا چاہیے جس میں اس وقت ہم کھڑے ہیں اور ہمیں اس پانی میں نہیں جانا چاہیے جس کی گہرائی کا ہمیں اندازہ

ہیں اور مولانا حسرت موہانی کی تجویز ہمیں اس سمندر میں لے جا رہی ہے جس کی گہرائی کا ہمیں اندازہ نہیں۔

یہ ہیں وہ الفاظ جو مسٹر گاندھی نے مولانا کی سادہ اور عام فہم ترمیم کے خلاف احمد آباد کانگریس میں کہے تھے۔ اب آپ خود ہی سوچیے کہ اس کہنے سے کانگریس کے نصب العین میں جہاں جہاں لفظ سوراج آیا ہے اس سے کامل آزادی مراد لی جائے، کون سا ایسا سانحہ تھا جس پر مسٹر گاندھی کو اتنے سخت الفاظ میں سرزنش کی ضرورت پیش آئی۔ دراصل وہی مسئلہ تھا جس کا ذکر مولانا اوپر کر چکے ہیں اور جس کا تذکرہ انھوں نے بعد میں بھی کیا۔

کامل آزادی کی مخالفت کے اسباب

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا نے جو بات ۱۹۲۱ء میں کہی اور جس آزادیٔ کامل کا انھوں نے اجلاس کانگریس، اجلاس خلافت اور اجلاس مسلم لیگ میں نعرہ بلند کیا اسے کانگریس نے ۱۹۲۹ء اور مسلم لیگ نے ۱۹۳۷ء میں منظور کیا لیکن مولانا نے جو بات اس کے ساتھ کہی یعنی امریکہ کے طرز پر ریاست ہائے متحدہ ہندوستان کی تشکیل اسے کانگریس نے تقسیم ملک کے وقت تک قبول نہیں کیا، البتہ مسلم لیگ نے دستور کے اس تصور کو مولانا کی فرمائش کے مطابق ۱۹۳۷ء میں اپنے نصب العین میں شامل کر لیا۔ آخر کانگریس کو ۱۹۲۱ء میں کیوں آزادیٔ کامل قبول نہیں کی تھی۔ اور اس نے ریاست ہائے متحدہ ہندوستان کے دستور کو کیوں نہیں اپنایا اس کا واضح ثبوت خود مولانا نے ۱۹۳۰ء میں فراہم کیا جب انھوں نے کانگریس کی آزادیٔ کامل والی قرارداد پر اظہارِ خیال کیا اور مولانا نے جو کچھ کہا اس کو اس دور کا ہر مسلم قائد سمجھ سکتا تھا، بشرطیکہ وہ اسی فہم و فراست کا مالک ہوتا جو قدرت نے مولانا کو ودیعت کی تھی لیکن مسلمانانِ ہند کی بدقسمتی تھی کہ قوم نے مولانا کے خیالات کی پذیرائی تو ہمیشہ کی لیکن ان کے مشوروں پر کبھی عمل نہیں کیا۔ مسٹر گاندھی اور ان کے حواری درحقیقت یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کی آزادی سے مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچے اور وہ بھی اسی طرح آزاد ہوں جس طرح ہندو۔ ان کے نزدیک آزادی کا مفہوم ہندوراج

تھا۔ اگر ہندوستان کی اکثریت کا رویہ اتنا ہی فراغ دلانہ ہوتا جو مصر میں مسلمانوں کی اکثریت کا تھا تو شاید آج برصغیر کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ گاندھی جی اپنے ظاہری علم و تدبر اور وسیع النظری کے باوجود مصر کے قائد سعد زاغلول کے مدمقابل نہیں تھے میثاق لکھنو اور نہرو رپورٹ ہی کو دیکھ لیجیے، کیا ہندو مسلم مسئلہ کا وہ علاج نہیں ہو سکتا تھا جو مصر کی وفد پارٹی نے مصری عیسائیوں کے بارے میں تجویز کیا۔ مسٹر گاندھی سعد زاغول پاشا کی طرح سادہ کاغذ پر دستخط کرکے مسلمانوں سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ آپ لوگ اس سادہ کاغذ پر اپنی شرائط خود تحریر کر لیجیے، ہمیں مسلمانوں کی تمام شرائط منظور ہیں۔ مگر یہ سیاسی اقدام صرف وسیع النظر اور فراغ دل قوم اور اس کا لیڈر ہی اٹھا سکتا تھا۔ اور ہندو قوم میں ساری خوبیاں ہو سکتی ہیں لیکن وسیع النظری اس کے بس کی بات نہیں۔ سادے کاغذ پر دستخط کرنے سے ہندو قوم کا قلع قمع نہیں ہو جاتا اور نہ مسلمان اتنے کوتاہ نظر تھے کہ وہ ہندوؤں کی اس فیاضی کا غلط فائدہ اٹھاتے۔ یہ تو محض باہمی اعتماد کی بات تھی اور اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں سے ہمیشہ کے لیے بدگمانیاں اور غلط فہمیاں دور ہو جاتیں۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مولانا نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا اسے حسب معمول قوم نے اس وقت درخورِ اعتنا نہیں سمجھا مگر آخر کار بعد از خرابیٔ بسیار مسلمانوں نے وہی کیا جو مولانا نے سب سے پہلے اور بہت پہلے کہا تھا۔ مولانا نے اس مضمون میں لکھا تھا کہ "۱۹۲۱ء کا وہ دور جب کہ ملک قانون شکنی کے لیے بالکل تیار تھا۔ ہندو مسلم متحد ہو رہے تھے اور تحریکِ عدم تعاون شہروں اور قصبوں سے گزر کر دور دراز دیہاتوں تک پہنچ چکی تھی۔ ۸۰ فیصد مسلمان اور ۲۰ فیصد ہندو جیلوں میں ٹھونس دیے گئے تھے (ایک اندازے کے مطابق صرف ایک دن کے اندر ۳۰ ہزار مسلمانوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ اسکولوں اور کالجوں پر آفت تھی۔ یونیورسٹیاں بند ہو رہی تھیں۔ انھوں نے (مسٹر گاندھی) ملک کو اس سے باز رکھا اور وقت کا انتظار کرنے کا بہانہ کیا (مسٹر گاندھی نے مولانا کی اس قرارداد استقلال کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا ہمیں ابھی اور انتظار کرنا چاہیے حالانکہ انھوں نے خود حصول آزادی کے لیے ایک سال کی میعاد مقرر کی تھی) ان کی اس چال میں کیا

یہ راز مضمر نہ تھا کہ اگر اس وقت قانون شکنی کی قرارداد کانگریس نے پاس کر دی تو یقیناً ہندوستان کسی نہ کسی حد تک انگریزوں سے ضرور آزاد ہو جائے گا اور اس آزادی میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا حصّہ ہو گا بلکہ مسلمانوں کا زیادہ حصّہ ہو گا کیوں کہ وہ زیادہ تعداد میں قید ہوئے اور انھوں نے ترک موالات میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لیا اور مسلمانوں کی آزادی سے فیض یاب ہونے سے ہندو قوم اور ہندو لیڈر کا ہرگز مفاد نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے دو رخی پالیسی اختیار کی اور اوّل اوّل در پردہ اور پھر بعد میں صریحاً مسلمانوں کے حقوق کو پامال کرنا شروع کر دیا، حتّیٰ کہ ان کی غدّاری اور مکر کی وجہ سے مولانا محمد علی جیسے صادق رفیق کار کو ان (گاندھی) سے اختلاف کرنا پڑا۔ لارڈ ریڈنگ کی دعوتِ صلح کے باوجود انھوں نے اس وقت ان سے کیوں مفاہمت نہیں کی۔ یہ بھی ایک سوال ہے جو اکثر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا جواب بھی وہی ہے کہ اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد تھا۔ ایسے عالم میں جو بھی بات طے پاتی اس میں رواداری کے لحاظ سے اور شرما شرمی کے باعث مسلمانوں کے حقوق یقیناً کھلم کھلا ہضم نہیں کیے جا سکتے تھے۔

ہندو آزادیٔ کامل کے خواہاں نہیں

مولانا کا فرمانا تھا کہ ہندو حقیقی معنوں میں آزادیٔ کامل کے خواہاں نہیں بلکہ زیر سایہ برطانیہ ہندو راج قائم کرنا چاہتے تھے جس کا نقشہ بعد میں نہرو رپورٹ کی صورت میں ظاہر ہوا اور جو عارضی طور پر اب کچھ عرصہ کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے مکمل آزادی کے اعلان کے ساتھ کانگریس نے گول میز کانفرنس کا مقاطعہ بھی کیا ہے۔ ہمارے خیال میں گاندھی نہرو صاحبان کی یہ بھی زبردست چال ہے۔ کیوں کہ اگر یہ اصحاب گول میز کانفرنس میں شریک ہوتے تو اتنا فائدہ ہندو قوم کو نہ پہنچتا جتنا اب پہنچے گا۔

عدم تشدد کی مخالفت یوں تو احمد آباد کانگریس میں مولانا کو مسٹر گاندھی کے مقابلہ

میں شکست ہو گئی لیکن یہ شکست عارضی تھی۔ اس لیے اس اجلاس کانگریس میں ایک ایسی جماعت منظر عام پر آئی جس نے مقاصدِ کانگریس کے حصول کے لیے رسمی طور پر عدم تشدد کی مخالفت کی اور مسٹر گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدد کی دھجیاں فضا میں بکھیر دیں۔ درحقیقت اس قسم کی جماعت کا قیام مسٹر گاندھی کی قیادت کو ایک زبردست چیلنج تھا جو آخر کار مسٹر سبھاش چندر بوس کے ہاتھوں مسٹر گاندھی کی شکست میں ظاہر ہوا لیکن اس وقت اگرچہ مولانا نے سبجیکٹس کمیٹی اور اس کے بعد کانگریس کے اجلاس عام میں زور دیا کہ کانگریس کے اجلاس عام میں تبدیلی کی جائے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اعلانیہ تشدد کی حمایت کی اور گوریلا جنگ پر زور دیا تاکہ ہندوستان جلد از جلد آزاد ہو۔ مولانا چاہتے تھے عدم تشدد کی نرم پالیسی کی وجہ سے ہندوستان میں انگریزوں کے قدم اور مضبوط ہو جائیں گے اور ملک میں آزادی کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو گا لیکن گاندھی جی اب تک پورے بے نقاب نہیں ہوئے تھے۔ وہ عدم تشدد کی آڑ میں انگریزوں سے سودے بازی کرنا چاہتے تھے اور اس کوشش میں تھے کہ انگریزوں کے ساتھ مل کر داخلی خود مختاری حاصل کی جائے اور انگریز استعماریت کی امداد اور انگریز سنگینوں کے سایہ میں برہمن راج قائم کیا جا سکے۔ اس لیے مولانا کو اس سلسلہ میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی اور وہ مسٹر گاندھی سے روز بروز دور ہوتے چلے گئے۔

یوپی کانگریس کی صدارت

مولانا اسی زمانہ میں یوپی کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے اور بیگم حسرت موہانی کو آل انڈیا کانگریس کی مجلسِ عاملہ کا رکن نامزد کیا گیا لیکن یہ دور مولانا اور کانگریس کے اتحادِ فکر و عمل کا آخری دور تھا۔ اس لیے کہ جیسے جیسے کانگریس پر مسٹر گاندھی کا اقتدار مضبوط ہوتا رہا اور ہندوستان میں فرقہ پرستی کا رجحان عام ہوتا جا رہا تھا، مولانا اس کا ذمہ دار مسٹر گاندھی کو قرار دے کر ان سے اختلاف میں شدت پیدا کرتے جا رہے تھے لیکن کانگریسیوں میں مولانا کی بدستور عزت تھی اور نوجوان تو خاص طور پر ان سے متاثر تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ۲۲ نومبر ۱۹۵۵ء کو حسرت

موہانی میموریل سوسائٹی کراچی کے نام ایک پیغام میں لکھا تھا کہ مولانا صاحب غالباً ۱۹۶۱ء کے لگ بھگ اتر پردیش صوبہ کانگریس کے صدر رہے اور برطانوی راج کے خلاف مسلسل جدوجہد کرنے اور اس جدوجہد کے دوران میں مظالم اٹھانے کی وجہ سے اتر پردیش میں ان کی بڑی عزت تھی۔ اگرچہ اس بیان میں مولانا کی ملک گیر شخصیت کو گھٹانے کی کوشش کی گئی مگر یہ تحریر بھی ایک طرح کا خراج عقیدت ہے۔ اسی طرح پنڈت نہرو کی شائع شدہ تقریروں کے مجموعہ میں ان کی وہ تقریر بھی شامل ہے جو انھوں نے ۱۳/ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو یوپی پراونشل کانگریس کمیٹی کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس میں کی تھی۔ جس میں انھوں نے نہایت شاندار الفاظ میں مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ تقریر کا متعلقہ اقتباس درج ذیل ہے۔

"میں اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے اپنے ایک پیش رو کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جس کی ساری زندگی قوم کی خاطر ہنسی خوشی مصیبتیں اٹھاتے گزری۔ میری مراد مولانا حسرت موہانی سے ہے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف اس وقت بھی جہاد کیا جب عدم تعاون کی تحریک کو شروع ہوتے اور جیل جانے کی عادت کو آسان اور سہل بننے میں ایک عرصہ درکار تھا۔ وہ آزادی کے ایک ایسے جری اور نڈر سپاہی تھے جن کو دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت صراطِ مستقیم سے نہیں ہٹا سکتی اور جو اس سلسلہ میں غیر ملکی حکومت تو کیا اپنے ساتھیوں کی معترضات سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ انھیں جیل کے دوران جب کہ وہ ایک طویل قید کے ایام بسر کر رہے تھے۔ احکامات جیل کی خلاف ورزی میں مزید ۲ سال کی قید سزا دی گئی (یہ مولانا کی تیسری گرفتاری کے دوران کا واقعہ ہے) حکومت کا شاید خیال یہ ہے اگر وہ اسی قسم کی منتقمانہ اور جابرانہ اقدامات کے ذریعہ ان کو ڈرا دھمکا سکتی ہے اور انھیں مرعوب کر سکتی ہے لیکن اس کے مطلب یہ ہیں کہ وہ شاید ان کے صحیح مقام سے آشنا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس موقع پر اپنے صوبے کے اس انمول اور چمک دار ہیرے کو اپنی ہمدردی اور تشکر کے جذبات سے نوازیں گے۔ بھارت کے وزیراعظم نہرو کے پیغام اور تقریر کو ملاحظہ فرمایئے۔ وزیراعظم نہرو یہ نہیں چاہتے کہ برصغیر کی تحریک کی علمبرداری کا سہرا کسی اور کو پہنچے اس لیے ان کے پیغام میں مولانا کو صرف ایک صوبہ کا واجب الاحترام قائد کہا گیا

ہے۔لیکن قائد عوام نہرو اور اس وقت کے نہرو نے جو ابھی صوبائی سطح کا لیڈر تھا جن شاندار الفاظ میں مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا اسی سے اس کے اخلاص اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔وزیر اعظم نہرو ایک ایک لفظ سوچ کر لکھتے ہیں مبادہ وہ کوئی ایسی بات لکھ دیں جو مستقبل میں ان کے یا کانگریس کے کردار اور رول پہ حرف زنی کا باعث ہو لیکن قائد عوام نہرو جو بولتا تھا دل سے بولتا تھا اس میں مستقبل کی احتیاط نہیں بلکہ حال کا اضطراب ہے اور اس لیے وہ جو عرض حال کرتا ہے صحیح اور درست کرتا ہے۔ پیغام اور تقریر دونوں کا مرکز ایک ہی شخصیت ہے لیکن ذرا اس تضاد کو دیکھیے کہ پیغام میں مولانا کو ایک صوبائی لیڈر اور تقریر میں انھیں ایک انمول اور چمک دار ہیرے سے تعبیر کیا گیا ہے۔سچی بات یہ ہے کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

کمیونزم سے دلچسپی

مولانا ابتدا تا انتہا انقلابی تھے۔وہ حریت پسند، حریت نواز اور حریت گیر تھے اور ان کے نزدیک کمیونزم اسلام سے بڑی حد تک مطابقت رکھتا تھا۔ وہ ڈسی کمیونزم کے بانی لینن کے بارے میں بھی اچھے خیالات رکھتے تھے۔انھوں نے لکھا ہے کہ روسی قائدین میں لینن کے خیالات دیگر روسی قائدین سے زیادہ بہتر تھے۔ اور وہ آزادی اور انقلاب کے بارے میں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر خیالات کے حامل تھے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ "لینن کے اصول تو اس سے بھی زیادہ وسیع معنی رکھتے ہیں اور وہ حقیر سے حقیر مرد کو بھی قوم کا ذمہ دار بناتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے لازمی ہے کہ ہر باورچی کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ وہ صدر کے منصب عالی پر فائز ہو جائے، اگرچہ عملی حیثیت سے لینن کے اصول دشوار ہیں مگر پھر بھی ہم کو ماننا پڑے گا کہ باوجود نقائص کے وہ اس طرح پھیل رہے ہیں جس طرح خشک گھاس شعلہ ہائے آتش۔ یہ روسی انقلاب جو اس وقت زیر بحث ہے کسی ایک منزل پر نہیں رک گیا بلکہ روزانہ ترقی کرتا جاتا ہے، آپ روس کی سڑکوں پر دیکھیں گے کہ

عورتوں کی ایک جماعت موٹر ڈرائیوں کی خدمت انتہائی بیباکی اور اطمینان کے ساتھ انجام دے رہی ہے۔ روسی خواتین اب مردوں کی طرح حکومت کے بڑے بڑے مناصب پر فائز ہیں اس طرح وہ حکومت کی بڑی بڑی مجالس میں ملک وملت کی نمائندگی کا امتیاز بھی رکھتی ہیں۔"

روس کا پانچ سالہ منصوبہ

مولانا نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ روسی ۵ سالہ منصوبے پر بھی تبصرہ فرمایا اور لکھا کہ روس اپنی معیشت کو زرعی سے صنعتی بنانے کی زبردست جدوجہد میں مصروف ہے۔ یہ تبصرہ ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۳۳ء کے ۵ سالہ منصوبہ پر ہے۔ اس مضمون کے آخر میں بیان کیا گیا ہے کہ بحیثیتِ مجموعی انگلستان کے نوجوان کام اور تفریح اپنی ذات کے لیے کرتے ہیں لیکن اس کے برخلاف نوجوانانِ روس کہتے ہیں کہ ہمارا ذاتی کام سارے روس کا کام ہے اور ایک دن یہ ساری دنیا کا کام ثابت ہوگا۔" اس سے اگلے ماہ کی اشاعت میں "روس میں مالک اور نوکر کے تعلقات" پر ایک سیر حاصل مضمون شائع کیا گیا جس میں کہا گیا کہ روس میں نوکر اپنے مالک کے گھر میں دس گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کرتا اور اس میں بھی دو گھنٹہ ظہر کے وقت اسے آرام کے لیے ملتے ہیں اور اس کو اس بات کا پورا حق ہے کہ ہفتہ میں ایک دن تعطیل منائے۔ اس نظام پر نہ گھر کے مالک کو اعتراض ہے اور نہ کسی مالک کو۔ نوکروں کی باقاعدہ انجمن ہے اور وہ اس نظام کی پابند کرتی ہے۔ حکومت ان انجمنوں کی مدد پر ہے۔ نوکر کو سال میں دو ہفتہ کی رخصت کا بھی حق ہے۔ جسے وہ جہاں چاہے گزارے۔

تحریکِ خلافت

مولانا نے چونکہ خلافت کی تحریک میں بھی نمایاں حصہ لیا اور چونکہ یہ تحریک بھی ترکِ موالات اور کمونسٹ تحریک کے ابتدائی دور میں ہی پروان چڑھی اس لیے اس موقعہ پر اس کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ درحقیقت خلافت تحریک برِصغیر

کی سب سے پہلی عوامی تحریک تھی جس سے کانگریس اور مسٹر گاندھی نے فائدہ اٹھایا اور ہندستان میں برہمن راج کے لیے راستہ ہموار کرنا چاہا۔ تحریکِ خلافت ہی کی وجہ سے برصغیر کے گوشہ گوشہ میں آزادی اور حریت کا پرچم بلند ہوا اور اس تحریک کے قائدین نے جن میں مولانا عبدالباری، مولانا محمد علی اور مولانا حسرت کا نام قابلِ ذکر ہے اپنی کوششوں سے کانگریس کو بھی ایک عوامی جماعت بنا دیا، یہی وہ تحریک تھی جس نے انگریز کا رعب و دبدبہ چشم زدن میں مٹا دیا اور اربابِ ہند پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں کر دی کہ استبداد پھر استبداد ہے جس کا خاتمہ قرار دادوں اور نیک خواہشات کے ذریعہ نہیں بلکہ جد و جہد اور جیل کی صعوبتوں کے اٹھانے سے کیا جا سکتا ہے۔ مولانا ابتدا میں اس عوامی تحریک کو صرف ترکی میں خلافت کی بحالی تک محدود کرنا چاہتے تھے لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ اس تحریک کے ذریعہ برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر کے اس متحدہ قوت کو آزادی کی راہ میں استعمال کیا جا سکتا ہے تو وہ جی جان سے اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا اس کا اندازہ ان کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

تحریکِ حریت کو جو پایا قرینِ حق
پھر بعد میں معاونِ تحریک ہم ہوئے

مولانا کے خیال میں خلیفہ کا مرتبہ مسجد کے امام اور خانقاہوں کے سجادہ نشین کے برابر نہیں ہونا چاہیے۔ وہ چاہتے تھے کہ خلیفہ اسلام اس دبدبہ اور شخصیت کا مالک ہو جو دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر لے آئے۔ وہ بیک وقت قانونی اور سیاسی سیادت کا مالک ہو لیکن خلافت کا مسئلہ جس انداز سے پیدا ہوا اس میں نظریات سے زیادہ اس بات کی اہمیت تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس انسٹی ٹیوشن کو بچایا جائے جو ہندوستانی مسلمانوں کے خیال کے مطابق انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث مٹنے والا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا تھا، امرتسر کانگریس کے موقعہ مسٹر گاندھی کے مشورہ سے باشندگانِ ہند کا ایک وفد ویسرائے سے ملا تھا مگر اس کا حسبِ دل خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا اور ترکی کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کی پریشانیوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور جب انگریزوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا

تو سارے ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف جلسے اور جلوس ہوئے اور لکھنؤ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی قیادت میں خلافت کمیٹی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ اور دلی میں بھی خلافت کانفرنس کے انعقاد ہوا جس کی صدارت کے لیے شیرِ بنگال مسٹر ابوالقاسم فضل الحق کا نام تجویز کیا گیا۔ یہ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ حکومت برطانیہ کے مخالفانہ رویے کے باعث کوئی ہندوستانی جشنِ صلح میں شریک نہ ہو اور اگر صلح کانفرنس کا فیصلہ ترکوں کے خلاف ہو تو ولایتی اشیا کا بائیکاٹ کیا جائے۔

جناب فضل الحق کانفرنس کی صدارت کے لیے کلکتہ سے روانہ بھی ہوئے مگر راستہ میں طبیعت خراب ہو گئی لہٰذا الہ آباد ہی میں اتر گئے۔ ادھر دلی میں تمام خلافتی لیڈر اور مسلم عمائدین جن میں مولانا عارف ہسوی، مولانا عبداللہ چوڑی والے مولانا حسرت موہانی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اسٹیشن گئے مگر جب صدر اجلاس گاڑی پر نہ ملے تو سب مایوس لوٹے۔ علی برادران اس وقت جیل میں تھے۔ تمام مسلم زعما گاندھی جی سے ملے تا کہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ صدارت کون کرے۔ انھوں نے یہ کہہ کر مشکل حل کر دی کہ صدارت میں کروں گا چنانچہ جب وہ صدارت کے لیے پہنچے تو بہت سے لوگوں کو حیرانی ہوئی اور ان کا استقبال خلافت کانفرنس کی طرف سے مولانا نے کیا اور "اے آمدنت باعثِ آبادئ ما" کہہ کر ان کا خیر مقدم کیا اور گاندھی جی نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں خطبۂ صدارت پیش کیا اور مسئلۂ خلافت میں حکومت کی موجودہ پالیسی کو ملکہ وکٹوریہ کے اس عہد کی خلاف ورزی بتایا جس میں مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی۔ اسی اجلاس میں مولانا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے بھی نہایت شدت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مولانا نے اجلاس کے دوسرے دن خلافت ورکرز کانفرنس بلائی جس میں انھوں نے ورکروں کو انگریزوں کے خلاف منظم ہونے کا مشورہ دیا۔ اس شب میں سید عطاء اللہ بخاری نے پٹوری ہاؤس میں خلافت کے مسئلہ پر ایسی زوردار تقریر کی کہ حکومت کے پرخچے اڑ گئے۔ تحریکِ آزادی کے مصنفین نے لکھا ہے کہ یہ کانفرنس ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء کو منعقد ہوئی تھی اور اس میں یہ قرارداد منظور کی گئی تھی کہ مسلمان صلح کے جشن میں شریک نہ ہوں اور اگر حکومت خلافت کے مسئلہ پر ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کو نہ مانے تو برطانوی مال کا مقاطعہ کیا جائے۔

یہ کانفرنس اس لحاظ سے بڑی اہم تھی کہ اس موقع پر جو قائدین ملک میں موجود تھے ان میں اس کے فیصلوں کی روشنی میں بڑی حد تک ہم آہنگی پیدا ہوئی اور جواہر لال نہرو کے سوانح نگار مورس فرینگ کے مطابق ترک موالات کی تجویز سب سے پہلے اس موقع پر زیر بحث آئی۔ اس کے بعد خلافت کانفرنس کا دوسرا اجلاس امرتسر میں دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخری ہفتہ میں مولانا شوکت علی کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں وائسرائے سے ملاقات کا فیصلہ ہوا۔ اس تجویز کے محرک مسٹر گاندھی تھے۔ کانفرنس نے اپنے اس اجلاس میں خلیفۃ المسلمین کے ساتھ اظہار عقیدت کی قرارداد بھی منظور کی اور یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ اگر وائسرائے کا جواب ہمت افزا نہ ہو تو پھر خلافت کمیٹی کا ایک وفد یورپ جاکر برطانیہ اور دوسرے ممالک کے قائدین کے سامنے ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ پیش کرے۔ علی برادران نے جنوری ۱۹۲۰ء کے وسط میں ایک خلافت مینی فیسٹو جاری کیا جس میں خلافت کے مسئلہ پر عوام کے تعاون کا شکریہ ادا کیا گیا کہ خلافت کا وفد وائسرائے سے مل کر سارے معاملات ان کے سامنے پیش کرے گا۔ وفد کی ملاقات کا حال پہلے بیان کیا جا چکا ہے جب وفد کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو حسب قرارداد خلافت کمیٹی خلافت کا وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں برطانیہ روانہ ہوا۔ ارکان وفد میں ان کے علاوہ سید سلیمان ندوی مسٹر سید حسین اور مسٹر حیات محمود شامل تھے۔ مولوی ابوالقاسم اور شیخ شبیر حسن قدوائی بعد میں وفد میں شامل ہوگئے۔ ابھی یہ وفد وینس ہی پہنچا تھا کہ وہاں ترکی کے مستقبل کے بارے میں انھیں حیرت انگیز خبریں معلوم ہوئیں، چنانچہ وفد کے اراکین نے اتحادی طاقتوں اور وزیر اعظم برطانیہ لائڈ جارج کو تار روانہ کیے۔ ارکان وفد فوراً لندن پہنچے اور ۱۷؍ مارچ ۱۹۲۰ء کو وزیر اعظم برطانیہ سے ملے، لیکن لائڈ جارج ارکان وفد کی معروضات سے متاثر نہیں ہوئے اور انھوں نے وفد کو بتایا کہ ترکی کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہیں کیا جاسکتا۔ وفد جب وہاں سے ناکام واپس لوٹا تو ارکان وفد فرانس گئے اور وہاں مولانا محمد علی نے ۲۱؍ مارچ کو پیرس میں اور پھر دو روز بعد مولانا نے لندن کے ایک ہال میں ایک تقریر کی اور اگلے ماہ کنگس وے ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں حکومت برطانیہ سے ایک قرارداد کے ذریعے اپیل کی گئی کہ وہ خلافت

اور ترکی کے بارے میں ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کے خیالات اور جذبات کا احساس کیے۔ مولانا محمد علی کی عدم موجودگی میں خلافت تحریک ہندوستان میں بہت مقبول ہوئی۔ مولانا محمد علی کی روانگی کے بعد مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا شوکت علی نے پورے ملک کا دورہ کیا اور اس کے بعد یہ قائدین ۲۵ مئی کو بمبئی پہنچے۔ اور خلافت کمیٹی کے اس تاریخی اجلاس میں شریک ہوئے جس میں انگریزوں سے عدم تعاون کی تجویز پاس کی گئی۔ درحقیقت خلافت کانفرنس منعقدہ دلی نے نومبر ۱۹۱۹ ہی میں برطانیہ سے تعاون واپس لینے کی تجویز کی تھی جس کے بعد مدراس خلافت کانفرنس منعقدہ ۱۷ اپریل ۱۹۲۰ء میں توثیق کی گئی تھی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ اپیلوں کا جب کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو سارے ملک میں خلافت ڈے منایا گیا۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں کانگریس، مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمیعت العلماء کے خاص اجلاس منعقد ہوئے جس میں عدم تعاون کی درخواست منظور کی گئی۔ کانگریس کے اجلاس میں جس کی صدر لالہ راجپت رائے تھے خود گاندھی جی نے قرارداد پیش کی۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں جس کی صدارت قائد اعظم فرما رہے تھے یہ قرارداد منظور کی گئی اور اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا کہ مسلمانوں کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ حکومت سے عدم تعاون کریں۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب خلافت کا وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں یورپ اور برطانیہ کے ناکام دورے کے بعد واپس پہنچا تو مولانا محمد علی اور مسٹر گاندھی نے مل کر ہندوستان کا دورہ کیا اور انگریزوں کے خلاف ایک آگ لگادی۔ اسی زمانہ میں ہندوستان میں ہجرت کی تحریک شروع ہوئی اور ایک اندازہ کے مطابق ۵ لاکھ سے لے کر ۸ لاکھ مسلمان اپنا سامان اونے پونے بیچ کر افغانستان چلے گئے جہاں شاہ امان اللہ غازی نے ان کا استقبال کیا۔ اسی زمانہ میں برطانوی حکومت نے ہندوستانی مسلمانوں سے پھر درخواست کی کہ ایک اور وفد برطانیہ بھیجا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ خلافت کے سلسلہ میں جو آگ سارے ملک میں بھڑک رہی تھی اس کی شدت میں کمی ہو۔ یہ وفد فروری ۱۹۲۱ء میں لندن گیا لیکن ارکان وفد کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ وفد کے ارکان یہ تھے۔ سیٹھ چھوٹانی، آغا خان، ڈاکٹر انصاری،

سید حسن امام، شیخ مشیر حسین قدوائی اور قاضی عبدالغفار۔ مولانا بھی ان تمام سرگرمیوں
مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے قدم بہ قدم شریک تھے جس کا اندازہ ان کے اس
شعر سے کیا جا سکتا ہے۔

اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں
پھیلے گی یونہی شورشِ حبِ وطن تمام

اس ضمن میں مولانا عبدالباری اور مولانا کے درمیان مشاورت کا اندازہ ذیل کے خطوط سے ہوتا ہے جو اس زمانہ میں مولانا سلامت اللہ فرنگی کو لکھے۔ ملاحظہ کیجیے:۔ ۲۰؍اکتوبر ۱۹۱۹ء بنام مولوی سلامت اللہ۔ مخدومی السلام علیکم۔ آپ کا کارڈ ملا۔ یوم دعا گزر گیا اور بظاہر حکومت پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا اور بغیر کسی عملی کارروائی کے اثر نہیں ہوتا۔ میں نے جو تجویز بائیکاٹ پیش کی تھی اس پر عمل کرنے کے لیے ہندوستان میں جہاں جہاں خلافت کمیٹیاں قائم ہو گئی ہوں ان کے نمائندوں کو مقررہ تاریخ پر یکجا کرنا ضروری ہے۔ مولانا صاحب (مولانا عبدالباری) سے دریافت کر کے فوراً مجھے اطلاع دیجیے۔ اگر وہ رضامند نہ ہوں تو فوراً تمام اخبارات میں اس مضمون کا اعلان کر دیجیے کہ آئندہ مناسب عملی کارروائی کرنے کے لیے خلافت کمیٹی کے نمائندوں کا ایک جلسۂ مشاورت لکھنؤ میں ۲۵ صفر کے بعد یعنی ۲۶، ۲۷ صفر کو فرنگی محل میں منعقد کیا جائے گا۔ خاص خاص لوگوں کو تار دے کر علیحدہ بلوا لینا چاہیے۔ مدراس بنگال، بمبئی ہر جگہ سے لوگ آنے کے لیے آمادہ کیے جائیں۔ ہمارے علی گڑھ سے تو اس کے متعلق نہایت عمدہ ریزولیشن پاس کرا کے لوگوں کے پاس بھیجا جا چکا ہے۔ اگر لکھنؤ میں انتظام ہو سکے تو اچھا ہے ورنہ مجبوراً علی گڑھ خلافت کمیٹی کو میں آمادہ کر سکتا ہوں۔ جواب دیجیے۔ فقط حسرت موہانی۔

(۲)

از دفتر سودیشی اسٹور علی گڑھ۔ ۱۱؍مارچ ۱۹۲۰ء۔ بنام مولوی سلامت اللہ۔ مخدومی السلام علیکم۔ میرا ارادہ ہے کہ کل یہاں سے بغرض دورہ متعلقہ تجاویز جلسۂ خلافت مورخہ ۱۹؍مارچ کو ۷ بجے دن کی گاڑی سے روانہ ہو کر ۲ بجے سہ پہر لکھنؤ پہنچوں گا۔ امین آباد میں سید جالب کے یہاں اسباب رکھ کر عصر کے وقت حاضر

ہو جاؤں گا۔ جناب مولانا عبدالباری صاحب قبلہ کی خدمت میں یہ اطلاع پہنچا دیجیے گا۔ اگر اس وقت شیخ مشیر حسین قدوائی بھی موجود ہوں تو اور بھی اچھا۔

فقط حسرت موہانی

۸ر جون ۱۹۲۰ء کو کراچی میں خلافت کمیٹی کا ایک تاریخی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں مولانا محمد علی نے ایک قرارداد کے ذریعہ فوج میں ملازم مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے عہدوں اور ملازمتوں سے استعفیٰ دے دیں اور فوج کا بائیکاٹ کریں مولانا حسین احمد مدنی، پیر غلام مجدد سرہندی اور مولانا نثار احمد کانپوری نے بھی قرارداد کی حمایت میں تقریریں کیں۔ اگست ۱۹۲۱ء میں موپلوں نے مالابار میں زبردست تحریک چلائی اور ۲۶ر ستمبر ۱۹۲۱ء میں کراچی مشہور مقدمۂ بغاوت خالق دینا ہال میں شروع ہوا اور مولانا محمد علی، مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے ۴ اکابر اور علماء کو ۲-۲ سال قید سخت کی سزا دی گئی۔ سزا کا ہونا تھا کہ سارے ملک میں ہنگامی حالات پیدا ہو گئے اور کراچی کی خلافت کانفرنس کی قرارداد جس کی بنیاد پر مذکورہ اکابرین ملت کے خلاف مقدمہ چلا تھا۔ جگہ جگہ جلسوں میں دہرائی گئی اور جب پرنس آف ویلز انڈیا آئے تو ان کا مکمل بائیکاٹ کیا گیا۔ اس کے بعد جب دسمبر میں کانگریس کا سالانہ اجلاس احمد آباد میں منعقد ہوا تو مولانا نے جب آزادیٔ کامل کی تحریک پیش کی تو یہ تحریک مسٹر گاندھی کی مخالفت کی وجہ سے منظور نہیں کی جا سکی (اس کی تفصیل اپنے مقام پر بیان کی جا چکی ہے) لیکن مولانا کو مولانا محمد علی اور دوسرے احباب کی مسلسل قید کا بڑا قلق تھا اس لیے انھوں نے ایک خط میں جو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام ہے اس سلسلہ میں ایک تجویز ان کی خدمت میں پیش کی۔ خط ملاحظہ فرمایئے۔

بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی

مخدومی! میری رائے میں محمد علی، شوکت علی صاحبان کے متعلق ویسرائے کے پاس ایک ڈیپوٹیشن جانا چاہیے اور ڈیپوٹیشن روانہ کرنے کی تحریک اور تائید کے لیے جا بجا جلسے ہونے چاہئیں اور ان جلسوں کی کارروائی بذریعہ تار اخبارات میں شائع ہونے چاہیے۔ اس طرح ڈیپوٹیشن کے جانے تک عام طور پر ملک

میں اس کا چرچا رہے گا۔ فقیر حسرت موہانی۔

مولانا کو کانگریس کے اجلاس عام میں پوری کامیابی تو نہ ہو سکی لیکن خلافت کمیٹی کی سبجیکٹس کمیٹی نے مولانا کی قرارداد منظور کر لی مگر حکیم اجمل خان نے جو اجلاسِ عام کے صدر تھے، اسے اس بنا پر اجلاس عام میں پیش کرنے کی اجازت نہیں دی کہ اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ حکیم اجمل خان کے اس رویّہ پر اخبارات میں کافی لے دے ہوئی۔ مولانا کی ان سرگرمیوں کا یوں تو خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ترک موالات کے سلسلہ میں مسٹر گاندھی کو اپنا رویہ سخت کرنا پڑا اور انھوں نے یکم فروری ۱۹۲۲ء کو وَیسرائے سے سوراج کا مطالبہ کیا اور کہا کہ یہ مطالبہ فوراً مان لیا جائے۔ جب میعاد گزر گئی تو ۶ فروری کو ویسرائے نے ایک بیان کے ذریعے اس مطالبہ کو رد کر دیا۔ مسٹر گاندھی نے دوسرے روز پھر ویسرائے کو مخاطب کیا مگر اسی روز اخبارات میں چوراچوری کے واقعات کی تفصیل چھپی جس میں بتایا گیا تھا کہ اس قصبہ میں جو یو۔پی کے ضلع گورکھپور میں ہے، پولیس نے ترک موالات کے سلسلہ میں ہونے والے ایک جلسہ پر حملہ کیا جس سے مشتعل ہو کر مجمع نے گاؤں کے ایک تھانے کو نذرِ آتش کر دیا۔ مسٹر گاندھی نے جو تحریک ترک موالات میں مسلمانوں کے غلبہ سے خائف تھے اس واقعہ کو آڑ بنا کر کانگریس کے صدر حکیم اجمل خان اور جنرل سیکرٹری ڈاکٹر انصاری سے مشورہ کیے بغیر تحریک ترک موالات کو واپس لے لیا اور اسی طرح برصغیر میں آزادی کی متحدہ کوشش کو ناکام بنا کر آزادی کے سنہری موقع کو گنوا دیا۔ ترک موالات کی تحریک کا لازمی طور پر خلافت تحریک پر بھی اثر پڑا اور مسلمانوں میں جو آزادی کی تحریک میں پیش پیش تھے، مایوسی پھیل گئی اور پھر نومبر ۱۹۲۲ء میں خود ترکی نے جو خلافت کا مرکز اور محور تھا پہلے تو خلافت اور سلطنت کو الگ کیا اور بعد میں ۱۹۲۴ء میں خلیفہ کو جلاوطن کر کے ترکی سے ہمیشہ کے لیے خلافت کو ختم کر دیا۔ خلافت کمیٹی نے یوں تو اپنے اجلاس گیا (بہار) میں جو دسمبر ۱۹۲۲ء میں منعقد ہوا تھا سلطان عبدالمجید کو خلیفہ تسلیم کرنے کی تائید کی مگر جب خود ترکی میں خلافت کے خلاف فیصلے ہوئے تو کیا کیا جا سکتا تھا۔ اِدھر تو یہ ہو رہا تھا، اُدھر مولانا نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ صحیح ثابت ہونا شروع ہوئی

اور ہندوستان کا مثالی ہندو مسلم اتحاد ختم ہونے لگا اور جب مولانا محمد علی اگست ۱۹۲۳ء میں جیل سے باہر آئے تو سارے ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور فسادات کا چکر تھا۔ انھوں نے کوکانڈہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے دسمبر ۱۹۲۳ء میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا لیکن یہ آواز بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوئی اور مسٹر گاندھی کی فرقہ واریت نے اتحادِ ہند کی نیک خواہشات کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔ یوں تو خلافت کمیٹی نے اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک اپنا وجود قائم رکھا لیکن مسٹر گاندھی کی غداری سے اس کی نمائندہ حیثیت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ بہرحال اس تحریک کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مسلمانوں کو جنگ آزادی میں شرکت کی سعادت اور تربیت حاصل ہوگئی اور یہ تربیت ہی تحریکِ پاکستان کی کام یابی کا زینہ ثابت ہوئی۔

حجاز کا مسئلہ

ادھر یہ حالات تھے، اُدھر ۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود نے حجاز پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور اپنے عقائد میں شدت کے باعث بزرگانِ اہل بیت اور دوسرے اربابِ قوم کے مزارات منہدم کرا دیے جس سے سارے ملک میں آگ لگ گئی۔ چنانچہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی زیرِ قیادت ایک انجمن خدام الحرمین قائم کی گئی۔ مولانا بھی اپنے مرشد زادے کے ساتھ اس انجمن کے رکن رکین تھے لیکن مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی ابتدا میں اپنے پیر و مرشد کے ساتھ نہیں تھے بلکہ انھوں نے خلافت کمیٹی کی جانب سے سلطان ابنِ سعود کو فتح مدینہ پر مبارک باد کا تار بھی روانہ کیا تھا لیکن جب سلطان ابنِ سعود نے اپنے آپ کو ملک الحجاز و نجد قرار دیا تو مولانا محمد علی کو بہت مایوسی ہوئی۔ پھر انھوں نے ۱۹۲۶ء میں خلافت کمیٹی کے اجلاس میں سلطان ابن سعود کی طلب کردہ موتمر عالم اسلامی میں شرکت کے لیے ایک سہ رکنی وفد کی روانگی کی تجویز منظور کرائی اور اس کانفرنس میں سید سلیمان ندوی اور جناب شعیب قریشی کے ہمراہ رہ کر مسلمانانِ ہند کے جذبات کی ترجمانی کی اور پھر سلطان ابنِ سعود سے ملے مگر دونوں صورتوں میں انھیں سلطان ابنِ سعود کو اپنا نقطۂ نگاہ منوانے میں کامیابی نہیں ہوئی، اس لیے جب انجمن خدام الحرمین کے زیرِ اہتمام لکھنؤ میں

آل انڈیا حجاز کانفرنس منعقد ہوئی تو وہ بھی اس میں شریک ہوئے۔ ان کے علاوہ دوسرے زعمائے ملت بھی، جن میں سید سلیمان ندوی کا نام بھی شامل ہے، اس کانفرنس میں شریک تھے۔ مولانا اس کانفرنس کے صدر تھے اور ان کا درج ذیل خطبۂ صدارت اس کانفرنس کی اہمیت کی نشان دہی کرتا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ "آج کے اجتماع کا خاص مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ابنِ سعود اور اہلِ نجد کے ہاتھوں سرزمینِ حجاز میں مقابر اور مساجد اور بلقصد بے حرمتی اور جو ناشائستہ حرکات اس وقت تک سرزد ہو چکی ہیں، ان کے نسبت ہم اپنی بے زاری کا ایک قطعی اور آخری اعلان کر دیں او رچونکہ نجدیوں کی وحشت اور بربریت کے محرک ان کے مذہبی عقائد ہیں جن پر وہ سختی کے ساتھ قائم ہیں اور رہیں گے اور جن کے وثوق پر وہ تخریبِ حرم کو بہ کمال بے باکی تطہیرِ حرم کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس لیے آیندہ کے لیے بھی ان سے کسی بہتر طرزِ عمل کی توقع رکھتے ہوئے صاف صاف کہہ دیں کہ مقاماتِ مقدسہ پر ان کی حکومت یا اقتدار کو ہم کسی حیثیت سے اور کسی حالت میں ہم منظور یا گوارہ نہیں کر سکتے۔"

مولانا محمد جعفر پھلواری نے جو اس کانفرنس میں شریک تھے مولانا محمد علی کی شرکت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "مولانا محمد علی اپنے بدلے ہوئے تصورات کے ساتھ شریکِ اجلاس تھے۔ یہ حجاز سے لوٹ کر آئے تھے، اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ آئے تھے اور ابنِ سعود کو ان کے منہ پر جلی کٹی سنا آئے تھے، حجاز کانفرنس میں انھوں نے سب کچھ یا بہت کچھ بیان کر دیا جو وہ اپنی آنکھوں سے حجاز میں دیکھ آئے تھے۔ کھدی ہوئی قبریں اور شکستہ مقبروں کے ساتھ انھوں نے ابنِ سعود کی سیاسی غلطیاں بھی بیان کیں۔ مولانا محمد علی کی شرکت سے مرید و مرشد کے درمیان کی غلط فہمی دور ہو چکی تھی اور حجاز کے مسئلہ پر انجمن خدام الحرمین اور خلافت کانفرنس کے اختلافات اسی کانفرنس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو گئے۔"

مولانا عبدالباری

اس سلسلہ میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت کو بعض لوگوں

نے یہ باور کرایا تھا کہ ان کے مرشد جناب مولانا عبد الباری فرنگی محلی مسئلہ حجاز میں مولانا حسرت موہانی اور شیخ مشیر حسین قدوائی کی رائے سے متاثر ہو کر علی برادران کی مخالفت کر رہے ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے بھی اس تاثر کی تائید کی ہے لیکن مولانا نے حضرت مولانا کے حالاتِ زندگی تحریر کرتے وقت اس تاثر کی واضح طور پر تردید کر دی۔ مولانا کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"بعض افراد آپ کی وفات کے بعد لکھ رہے ہیں کہ آپ کی یہ خاص کمزوری تھی کہ بعض غلط مشورہ دینے والوں پر آپ نے بہت زیادہ اعتماد کر لیا تھا اور اپنی ذاتی عقل و بصیرت کو ان کے تاثرات سے مغلوب کر لیا تھا، حالانکہ حقیقتِ حال جس کا راقم کو ذاتی اور یقینی علم ہے جس کا آپ کے بعد ظاہر کر دینے میں مضائقہ نہیں معلوم ہوتا، یہ ہے کہ اکثر مذہبی اور نیم مذہبی معاملات میں آپ کی رائے ہمیشہ اشارہ ہائے باطن کے تابع رہا کرتی تھی، جس وقت جس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی آپ اس پر بلا تکلف کاربند ہو جاتے۔ اس میں خود رائی یا دوسروں کے مشوروں سے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

حج ٹیکس کی مخالفت

سلطان ابن سعود کی حکومت نے اصلاحات و تطہیر کے نام پر جو قوانین مرتب کیے تھے ان میں حاجیوں پر ٹیکس بھی شامل تھا لیکن مولانا جیسے اصول پرست سے اس بات کی کیسے توقع قائم کی جا سکتی تھی کہ وہ اس غلط قسم کے ٹیکس کو برداشت کر لیتا۔ چنانچہ جب آپ حج پر گئے تو انھوں نے یہ سعودی ٹیکس دینے سے انکار کر دیا اور وہاں کی حکومت کو ان کے سامنے جھکنا پڑا اور یہ ٹیکس ان سے اور ان کے اہل و عیال سے نہیں لیا گیا۔ مولانا کی صاحبزادی نعیمہ بیگم نے لکھا ہے کہ جب وہ حج کی ادائیگی کے لیے ۱۹۳۲ء میں حجاز جانے لگے تو یہ بات والدہ مرحومہ کو یاد آئی کہ مولانا نے حجاز کانفرنس میں ابن سعود کی مخالفت کی تھی اور اس بنا پر انھیں بمقتضائے بشریت کچھ پریشانی بھی ہوئی لیکن مولانا پر اس کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ چنانچہ حجاز پہنچنے پر جب انھیں بتایا گیا کہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کا کرایہ ۶ گنی ہے اور ۴ گنی حج

ٹیکس ہے تو مولانا نے بس کا کرایہ تو ادا کر دیا لیکن حج ٹیکس کی رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا اس پر بس والے نے انھیں ساتھ لیجانے سے انکار کر دیا کیوں کہ ٹیکس کی حصول کی ذمہ داری بس والوں پر تھی۔ جب بات بڑھی تو معاملہ حکام تک پہنچا مگر مولانا چونکہ اپنے ارادے میں محکم تھے اس لیے حج ٹیکس کی ادائیگی پر کسی طرح رضامند نہیں ہوئے۔ آخر کار حکومت کو مولانا کی بات ماننی پڑی اور وہ ٹیکس کی رقم ادا کیے بغیر مدینہ منورہ روانہ ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا حسرت موہانی کی کوششوں سے اس زمانہ میں جمیعتہ العلمائے کانپور کا قیام عمل میں آیا کیوں کہ مولانا عبدالباری جمیعتہ العلمائے ہند کی کارگزاریوں سے مطمئن نہیں تھے۔ اس جمیعتہ کا اجلاس امروہہ میں منعقد ہوا اور یہ ادارہ آگے چل کر مسلم کانفرنس کے قیام کا باعث ہوا۔ (تفصیلات آگے آئیں گی) مولانا نے اس زمانہ میں روزنامہ "مستقل" جاری کیا لیکن یہ اخبار زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رہ سکا، البتہ ان کا رسالہ اردوئے معلی کسی نہ کسی طرح جاری رہا۔

سائمن کمیشن

۱۹۲۹ء میں حکومت برطانیہ کے ایما پر ایک کمیشن جس کے سربراہ سر جان سائمن تھا اصلاحات کے بارے میں ہندوستانیوں کا نقطۂ نگاہ جاننے کے لیے ہندوستان ہوا۔ مسٹر گاندھی کی قیادت میں اس کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا مگر مولانا جو مسٹر گاندھی کی عیارانہ چالوں سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے، اس بات کے حق میں نہیں تھے کہ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے لیکن جمہور اسلام کی رائے جیسا کہ دوسرے معاملات میں تحریر کیا جا چکا ہے اس مسئلہ میں بھی مولانا کی رائے کے مطابق نہیں تھی اس لیے مسلمانوں کی جانب سے کسی نے سائمن کمیشن کے بارے میں مولانا کی حمایت نہیں کی، یہاں تک کہ شفیع لیگ نے بھی مسلمانوں سے اتفاق نہیں کیا لیکن مولانا اپنی رائے پر قائم رہے اور انھوں نے سائمن کمیشن کے سامنے تفصیل سے اپنے خیالات پیش کیے۔ گاندھی جی نے جو سائمن کمیشن کو اپنے مقاصد میں حارج پاتے تھے، سارے ملک کا دورہ کیا اور لوگوں سے اپیل کی کہ وہ سائمن کا بائیکاٹ کریں۔ اس ملک گیر

دورہ کے سلسلے میں جب وہ کانپور پہنچے تو ایک گروہ نے مولانا کی قیادت میں بجائے سائمن کمیشن گو بیک کے گاندھی گو بیک کا نعرہ بلند کیا۔ اس جوابی مظاہرے کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا جب کانگریسی رضا کاروں نے مولانا کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ان کے ساتھی ڈر کے مارے ان کا ساتھ چھوڑ گئے مگر مولانا جو انگریز سامراج کے سامنے سپر انداز نہ ہوئے، ان کانگریسی رضا کاروں سے کیا ڈرتے، وہ تنہا کانگریسیوں کے نرغے میں گاندھی گو بیک کا نعرہ لگاتے رہے۔

یونیٹی کانفرنس

ایک طرف سائمن کمیشن کے بائیکاٹ اور عدم بائیکاٹ کا سلسلہ چل رہا تھا تو دوسری طرف پھر سے ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں جاری تھیں۔ اس موقع پر جو جماعتیں سرگرم عمل تھیں ان میں کانگریس، مسلم لیگ، جمعیۃ العلما اور خلافت کمیٹی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کوششوں کا آغاز کانگریس کے اجلاس گوہاٹی سے ہوا جو دسمبر ۱۹۲۶ میں ہوا تھا۔ اس اجلاس کے بعد کانگریس کی مجلس عاملہ نے ہندو مسلم زعما کے اتحاد کے مسئلہ پر بات چیت کی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ مرکزی اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر مسلمان قائدین کا ایک جلسہ ۲۵ رمارچ ۱۹۲۷ء کو دلی میں منعقد ہوا۔ جس میں قائداعظم کے مشہور چودہ نکات کی منظوری دی گئی۔ اس کے بعد ۱۲ رفروری ۱۹۲۸ء کو دلی میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہندو مسلم مسئلہ پر غور کرنے کے لیے پنڈت موتی لال نہرو کی سرکردگی میں ایک کمیٹی قائم کی جس نے ۲۸ اگست کو نہرو رپورٹ پیش کی (اس کا تفصیلی ذکر مسلم لیگ کے ضمن میں آئے گا)

مسلم کانفرنس

اس زمانہ میں مسلم لیگ دو حلقوں میں بٹ چکی تھی اور اس حیثیت سے اس کی نمائندہ حیثیت متاثر ہوئی تھی۔ اس لیے مسلمانانِ ہند نے مسلم کانفرنس کے نام سے ایک اور ادارہ تشکیل دیا جسے مولانا کی حمایت بھی حاصل تھی۔ یہ ادارہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو معرض وجود میں آیا اور اس کے ایک نمائندہ اجتماع میں جو یکم فروری ۱۹۲۹ء کو دہلی میں

ہز ہائی نس سر آغا خان کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ مسلم کانفرنس نے اہم قومی مسائل پر ایک اہم قرارداد منظور کی جس کے الفاظ درج ذیل ہیں۔

"ہندوستان کی مرکزی حکومت وفاقی ہو اور فاضل اختیارات مختلف ریاستوں اور صوبوں کو حاصل ہوں۔ اگر کسی جماعت کے تین چہارم ممبر کسی بل کی مخالفت کریں تو وہ قانون ساز جماعت کے سامنے پیش نہ ہو۔ مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب اس وقت تک قائم رہے گا جب تک وہ چاہیں۔ مرکزی اور صوبائی کابینہ میں انھیں مؤثر نمائندگی حاصل ہو۔ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو وہاں ان کی موجودہ تعداد میں کمی نہ کی جائے۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمان ارکان کی تعداد ایک تہائی ہو۔ صوبہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر دیا جائے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں سرکاری ملازمتوں میں مسلمان ارکان کی تعداد متناسب ہو۔ مسلمانوں کی تہذیب، زبان، تعلیم، مذہب، پرسنل اوقات کی حفاظت ہو۔ سرکاری تعلیمی امداد میں انھیں مناسب حصہ ملے۔ ارکان میں کوئی تبدیلی بلا رضامندی جملہ ریاستوں اور صوبوں کے نہ کی جائے۔ یہ ادارہ دراصل تمام مسلم سیاسی جماعتوں کی ایک فیڈریشن کا درجہ رکھتا تھا۔

سنہ ۱۹۲۹ کی اہمیت

اس سال کانگریسی مسلمانوں نے مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے زور کو توڑنے کے لیے مسلم نیشنلسٹ پارٹی قائم کی اور مولانا آزاد نے اس کے پہلے اجلاس کی جو الٰہ آباد میں منعقد ہوا تھا، صدارت کی۔ اس سال لاہور میں مجلس احرارِ اسلام قائم ہوئی جس کے زیرِ اہتمام تحریک کشمیر میں صرف سیالکوٹ کے ۳۰ ہزار مسلمانوں نے ایک دن میں اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ مولانا عطاء اللہ بخاری، مولانا مظہر علی اظہر اور ماسٹر تاج الدین اس جماعت کے سرخیل تھے۔ اس کا پہلا جلسہ لاہور میں ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ کو چودھری فضل حق کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ خدائی خدمت گاروں کی تحریک نے بھی اسی سال جنم لیا۔ اسی سال آل انڈیا شیعہ پولٹیکل کانفرنس منعقد ہوئی جس کا پہلا جلسہ ۱۹۳۰ء میں راجہ نواب علی کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ اسی سال مرکزی

اسمبلی نے پبلک سیفٹی ایکٹ منظور کیا جس کی لعنت کسی نہ کسی شکل میں آج تک موجود ہے۔اس سال بدیشی مال کے بائیکاٹ اور شراب بندی کی تحریکوں نے بھی فروغ پایا اور اسی سال ۳۱ر اکتوبر کو لارڈ اردن نے ایک طویل اعلان کیا جس میں ہندوستان کے لیے درجہ نوآبادیات کا اعلان کیا گیا اور جب کانگریس کا وفد ۲۳ر دسمبر کو وسیرائے سے ملا تو لارڈ اردن نے تجویز پیش کی آزادی کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے لندن میں گول میز کانفرنس منعقد کی جائے جس میں تمام عمائدین ہند شرکت کریں لیکن کانگریس نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا اور جب اس سال کے اواخر میں کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور میں پنڈت جواہر لال نہرو کی زیر صدارت منعقد ہوا تو اس اجلاس نے ۳۱ر دسمبر کو نصف شب گزرنے کے بعد کامل آزادی کی قرارداد منظور کرلی۔ قرارداد مسٹر گاندھی نے پیش کی تھی اور اجلاس نے مسٹر سبھاش چندر بوس کی ترمیمیں رد کرنے کے بعد اصل قرارداد کو منظور کرلیا۔

کانگریس کی قراردادِ آزادی

مسٹر گاندھی کی پیش کردہ اور کانگریس کی . . . . منظور کردہ قراردادِ آزادی کا متن درج ذیل ہے: "یہ کانگریس درجہ نوآبادیات سے متعلق ۳۱ر اکتوبر کے وسیرائے کے اعلان پر اس بیان کے سلسلہ میں جو پارٹی لیڈروں اور کانگریس کے ارکان کی جانب سے شائع ہوا تھا اور کانگریسی مجلس عاملہ کی قرارداد کی تائید کرتا ہے اور سوراجیہ کی قومی تحریک کے تصفیہ کے متعلق وسیرائے (لارڈ اردن) کی کوششوں کا اعتراف کرتا ہے لیکن اس وقت سے جو کچھ وقوع میں آیا اسے نیز مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو اور دیگر لیڈروں اور وسیرائے کی ملاقات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کانگریس کی رائے ہے کہ موجودہ حالات میں کانگریس کے نمائندگان کی مجوزہ گول میز کانفرنس میں شرکت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس لیے یہ کانگریس اس ریزولیشن کی روشنی میں جو گزشتہ سال کلکتہ کے اجلاس میں پاس کیا گیا تھا اعلان کرتی ہے کہ کانگریس کے آئین کے آرٹیکل نمبر ا میں لفظ سوراجیہ کے معنی مکمل آزادی کے ہوں گے۔ یہ کانگریس مزید اعلان کرتی ہے کہ نہرو رپورٹ کی ساری اسکیم اب خارج از بحث ہوگئی ہے

اور امید کرتی ہے کہ اب تمام کانگریسی اپنی خاص توجہ ہندوستان کی آزادی پر صرف کریں گے۔ آزادی کی جدوجہد کی تنظیم کی جانب ابتدائی قدم کے طور پر اور کانگریس کی پالیسی کو حتی الامکان عقیدہ کی تبدیلی کے مطابق بنانے کے لیے یہ کانگریس مرکزی اور صوبجاتی مجلس قانون ساز اور حکومت کی قائم کردہ تمام کمیٹیوں کے بائیکاٹ کا اعلان کرتی ہے اور کانگریسیوں نیز دیگر اصحاب سے جو قومی تحریک میں حصہ لے رہے ہیں مطالبہ کرتی ہے کہ وہ آیندہ انتخاب میں بلاواسطہ یا بلاواسطہ طور پر شریک ہونے سے گریز کریں۔ یہ کانگریس مجلس قانون ساز اور سرکاری کمیٹیوں کے تمام کانگریسی ممبران کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ اپنی نشستوں سے استعفیٰ دے دیں۔ یہ کانگریس قوم سے اپیل کرتی ہے کہ کانگریس کے تعمیری پروگرام پر زور کے ساتھ عمل کرے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اختیار دیتی ہے کہ وہ جب کبھی مناسب سمجھے مخصوص رقبہ جات میں یا دیگر طریق پر اور ایسی شرائط کے تحت جنھیں وہ ضروری سمجھے نافرمانی کے پروگرام پر جس میں ٹیکسوں کی عدم ادائیگی بھی شامل ہے شروع کر دے۔

مولانا کا تبصرہ

مولانا نے جو کانگریس کے اس اجلاس میں ایک مبصر کی حیثیت سے شریک تھے اس قرارداد پر جو تبصرہ کیا وہ درج ذیل ہے۔

"خرابیٔ بسیار کے بعد آخر کار خود مہاتما گاندھی کی جانب سے آزادیٔ کامل کی تجویز لاہور کانگریس میں پیش ہو کر پاس ہو گئی مگر تعجب ہے کہ ایسی اہم قرارداد کے منظور ہونے پر نہ حکومت کی جانب سے کسی اندیشہ و اضطراب کا اظہار ہوا ہے نہ جمہور کی طرف سے کسی قسم کے جوش و خروش یا عزم بالجزم کا اعلان۔ ہمارے نزدیک اس کے دو سبب ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ اعلان آزادی اتنی دیر اور اتنے لیت ولعل کے بعد کیا گیا کہ اس کے متعلق عوام کا جوش و خروش مسلسل ناکامیوں کے باعث پہلے ہی سرد ہو چکا تھا۔ دوم یہ کہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو تدبیریں سوچی گئی ہیں وہ سرتاپا ناقص اور ناقابلِ عمل ہیں۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ جب عدم تعاون کے پورے پروگرام پر عمل کر کے جس میں عدالتوں اور اسکولوں کا بائیکاٹ بھی شامل

تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ کوششوں ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں آزادی ناقص بھی حاصل نہ کرسکیں تو صرف کونسلوں کے بائیکاٹ اور کھدر پوشی کے ذریعہ آزادی کامل کے حصول کے لیے کیسے توقع کی جاسکتی ہے۔ وہ بھی ایسے حالات میں کہ من حیث القوم مسلمان کانگریس سے علیحدہ ہیں اور ہندوؤں کا ایک گروہ بھی اس سے عملی طور پر جُدا ہوگیا ہے اور ایک نئی پارٹی اور ایک نیا پروگرام بنا چکا ہے۔" ان خیالات کے اظہار کے بعد مولانا لکھتے ہیں دو بعد کے واقعات حسب دستورِ سابق ان کے ان خیالات کی تائید کرتے ہیں کہ بعض لوگ تو مہاتما گاندھی سے یہاں تک بدگمان ہیں کہ ان کے نزدیک کانگریس کی ان مختلف پارٹیوں کی کش مکش جنگ زرگری کے سوا ور کچھ نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہندو کا معقول گروہ گول میز کانفرنس میں شریک ہوکر حسب سابق نہرو رپورٹ کے منوانے کے درپے رہے اور دوسرا گروہ س کے بائیکاٹ کا ڈھونگ رچا کر فریقِ اوّل کی تقویت کا سامان بہم پہنچا رہا ہے۔ لوگ بھی اس بدگمانی میں حق بجانب ہوں نہ ہوں، اتنا تو ہم کو بھی شبہ ہوتا ہے کہ آزادی کامل کے ایک سخت ترین دشمن کا اس درجہ آسانی کے ساتھ دفعتاً اس کی حمایت پر آمادہ ہو جانا خالی از علت نہیں ہے۔

مرے اصرارِ مضطر میں نہاں ہے میری مایوسی
ترے اقرارِ آساں سے ترا انکار پیدا ہے

پنڈت نہرو کا خطبۂ صدارت

کانگریس کے اس اجلاس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے جو خطبۂ صدارت پیش کیا اس میں انھوں نے اپنے سوشلسٹ ہونے کا اعلان کیا۔ مولانا نے اس سلسلہ میں جو تبصرہ کیا وہ کتنا صحیح ہے، لکھتے ہیں کہ "پنڈت جواہر لال نہرو ہندوؤں کے مسلم لیڈر ہیں۔ انھوں نے اپنے ایڈریس میں اپنے سوشلسٹ ہونے کا اعلان کیا۔ حالاں کہ گاندھی ازم سوشلزم کی ضد ہے۔ غالباً جس طرح انگلستان کے بڑے امراء کے لڑکے سوشلسٹ ہونے کا اعلان کرتے ہیں، اسی طرح پنڈت نہرو نے بھی اعلان کیا ہے۔ اگر پنڈت نہرو صحیح معنوں میں سوشلسٹ ہوتے تو جس وقت آپ کو

گورنمنٹ آف انڈیا نے روس کی سیر اور لیگ مخالف شہنشاہیت میں شمولت کا پاسپورٹ دیا تھا تو وہاں سے بہ عافیت تمام واپس آکر حکومت کے خلاف لفظی جنگ کے سپہ سالار نہ بنتے بلکہ آپ کی جگہ تو ہندوستان سے باہر ہوتی یا جیل خانہ میں ہوتی۔ لاہور کانگریس نے جس طرح گاندھی جی کی قیادت پر مہر تصدیق ثبت کی اور انھوں نے جس طرح کانگریس کو اپنے حامیوں کا ادارہ بنایا اس سے نہ صرف مولانا کو شکایت تھی اور خیر مولانا کی بات تو اور ہے خود سمجھ دار ہندو بھی کانگریس سے الگ ہونے لگے۔ مولانا نے لاہور سے واپسی پر مسلمانوں کو کانگریس اور مسٹر گاندھی کی سازشوں سے باخبر کرنے کے لیے ایک جلسۂ عام میں شرکت کی جس کا اعلان سید ذاکر علی سیکرٹری کان پور خلافت کمیٹی نے کیا۔ اعلان میں بتایا گیا کہ مقامی خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام ۱۹ فروری ۱۹۳۰ء اتوار کے دن تلک پارک میں ٹھیک دو بجے دن بعد نماز ظہر مسلمانانِ کانپور کا ایک جلسۂ عام ہوگا جس میں اجلاس کانگریس کی منظور کردہ تجاویز خصوصاً تحریکِ آزادی اور گول میز کانفرنس کے انعقاد، ملک کے موجودہ سیاسی حالت جس میں ایک قانون صغر سنی کی شادی کی ممانعت اور دوسرا ذبیحہ گاؤ کی ممانعت کا پیش ہے اور مسلمانوں کے سیاسی حقوق پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا جائے گا اور مسلمانوں کو بتایا جائے گا کہ آیندہ ان کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ جناب مولانا حسرت موہانی جو لاہور میں کانگریس اور خلافت کانفرنس کے حالات بچشم خود دیکھ کر آئے ہیں تمام واقعات بیان فرمائیں گے۔ جناب مولانا عبدالماجد قادری بدایونی، جناب مولانا مظہر الدین صاحب مالک الامان کو جلسہ میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ اس کے بعد جب جلسہ ہوا تو اس میں جو قرار دادیں منظور کی گئیں ان کی اشاعت اخبار میں اس طرح کی گئی: "کانپور ۹ا جنوری آج تین بجے سہ پہر سے شام تک خورد عمل پارک میں (جس کا بعد میں تلک پارک نام قرار پایا) خلافت کمیٹی کا طلب کردہ مسلمانان کانپور کا ایک عظیم الشان جلسہ بڑی کامیابی کے ساتھ ہوتا رہا جس میں خاص تقریر سید ذاکر علی سیکرٹری خلافت کمیٹی کی ہوئی۔ آپ نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ مسلمانوں کو خلافت کمیٹی میں شامل ہو کر آل انڈیا نظام کے تحت اپنی مسلسل سیاسی بیداری کا بندوبست کرنا، تصفیہ حقوق کے بعد آزادیٔ کامل کی جنگ میں برادران وطن کے دوش بدوش لڑنا اور

علیحدہ اپنے مقررہ سیاسی پروگرام پر عمل کرنا اور تحریکِ آزادئ کامل کی کسی حالت میں مخالفت نہیں کرنا چاہیے۔

کانگریس ڈیموکریٹک پارٹی

لاہور کانگریس کے بعد جیسا کہ مولانا پہلے تحریر فرما چکے ہیں۔ کانگریس کا اعتدال پسند گروہ جس میں مسٹر سیتہ مورتی، مسٹر سبھاش چندر بوس اور مسٹر سرنیواس آئنگر قابلِ ذکر ہیں۔ مسٹر گاندھی سے اختلاف کے بعد کانگریس سے الگ ہو گیا اور اس نے ایک اور پارٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ جس کا نام کانگریس ڈیموکریٹک پارٹی تجویز کیا گیا۔

مولانا کے شبہات

مولانا بھی کانگریس کے فیصلے سے مطمئن نہیں تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ انھیں اس بات کا شبہ تھا کہ مسٹر گاندھی آزادئ کامل کے کسی طرح حامی بن گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ جو لوگ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جا رہے ہیں۔ کہیں وہ ایسا نہ کر آئیں جس سے آزادی کا مستقبل خطرہ میں پڑ جائے۔ چنانچہ انھوں نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے حسبِ ذیل خیالات کا اظہار کیا: "ایسی حالت میں ہم مدعیانِ آزادئ کامل کے لیے عمل کی طرف دو راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اوّل یہ کہ حسبِ صلاح بھائی پرمانند ہر فریق اپنا اپنا معاملہ اور مطالبہ گول میز کانفرنس کے سامنے پیش کرے اور پھر انگریز جو فیصلہ کر دے اس کو لوگ برضا و رغبت یا بہ جبر و اکراہ تسلیم کر لیں اور اس ساری کارروائی میں پیروانِ کانگریس کوئی حصہ نہ لیں دوئم یہ کہ ہم اپنی ساری قوتوں اور کوششوں کو حصول آزادئ کامل کے لیے محفوظ رکھتے ہوئے مقلدین ہندو سبھا اور مسلم کانفرنس کے درمیان مفاہمت کی کوئی ایسی صورت پیدا کر دیں جس کے تحت وہ لوگ اپنی ہمت اور حیثیت کے مطابق جنگِ آزادی کامل کے عملی آغاز تک سیاست کے ایک ایسے پروگرام پر عمل کرتے رہیں جو آخر کار ہمارے مقصد آزادی کامل کے منافی ثابت نہ ہو۔

یہ الفاظ دیگر ہمارے لیے جنوری کی گول میز کانفرنس کے بائیکاٹ کے ساتھ ہی ساتھ لازم ہے کہ اس لندن کی کانفرنس سے قبل خود ہندوستان میں اقوام ہند کی ایک گول میز کانفرنس کے انعقاد کا ضرور بندوبست کریں جس میں موجود حکومت ہند ریاست ہائے ہند اور اقوام ہند کے درمیان باہمی حقوق و فرائض کا کوئی مناسب فیصلہ ہو جائے۔

قائدِ اعظم کا بیان

قائد اعظم نے بھی اپنے ایک بیان میں جو ۲۰ جنوری ۱۹۳۰ء کو بمبئی سے جاری ہوا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی کارروائی کی مذمت کی اور کہا کہ یہ تشدد کی جانب لے جائے گی نیز اس سے ملک کے بہترین مفاد کو نقصان پہنچے گا۔ قائد اعظم نے اپنے بیان میں آگے چل کر کہا کہ مسٹر گاندھی اور پنڈت نہرو نے وائسرائے کے ساتھ گفت و شنید کو ختم کر کے اپنے اوپر ایک اہم ذمہ داری لی ہے انھوں نے فرمایا مسٹر گاندھی بہت کچھ سمجھتے ہیں لیکن پھر اسے بھول جاتے ہیں۔ باردولی سے قدم واپس ہٹا کر جسے وہ خود ہی ہمالیہ جیسی غلطی سے تعبیر کر چکے ہیں۔ اپنے آپ کو جو نقصان پہنچایا اس کے نتائج انھوں نے اب تک محسوس نہیں کیے۔"

اتحاد اور الجمعیۃ کے اداریے

اسی زمانہ میں مولانا نے اپنے اخبار میں اتحاد پٹنہ اور الجمعیۃ دلی کے اداریے نقل کیے۔ اس میں الجمعیۃ کا اداریہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس اداریہ کا عنوان ہے "آزادی کامل کا اعلان" الجمعیۃ نے لکھا ہے کہ "ہماری رائے میں صرف نہرو رپورٹ کے مسترد کر دینے سے اس غلطی کی تلافی نہیں ہو سکتی جو نہرو رپورٹ کو منظور کر کے کی گئی۔ جب تک کانگریس نے فرقہ وارانہ مسائل میں ہندوؤں کے ساتھ کھلا کھلم جانبداری کا برتاؤ نہیں کیا تھا اس وقت اس کی پوزیشن کچھ اور تھی۔ اور اب جب کہ وہ ایک سال سے اپنے آپ کو ہندو مہا سبھا کے ساتھ مدغم کر چکی ہے۔ اس کی پوزیشن کچھ اور ہے۔ اب یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ محض لفظی وعدوں سے کھویا ہوا

اعتبار دوبارہ بحال ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تصفیہ حقوق کا مسئلہ ہی کانگریسی لیڈروں کے لیے ایک امتحانی مسئلہ ہے۔ اگر انھوں نے آزادی کامل کے اعلان کے باوجود اقلیتوں کو اطمینان دلانے کی کوشش نہ کی تو تمام دنیا یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے گی کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ پورے خلوص اور اعتماد سے نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس موضوع پر دلی کے ایک اور اخبار الامان نے بھی جو کچھ لکھا ہے وہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

الامان کا تبصرہ

الامان نے لکھا ہے کہ "۱۹۲۱ء کی طرح امسال بھی کانگریس کے متعلق بہت کچھ پروپیگنڈہ کیا گیا تھا اور بہت سے دعاوی ہندوستان کی فضا میں گونج رہے تھے۔ یہاں تک کہ گاندھی جی اور نہرو جی نے بارہا یہ کہا تھا کہ اگر ہندوستان کو درجہ مستعمرات عطا نہ کیا گیا تو ہندوستان ۳۱ دسمبر کو آزاد ہو جائے گا اور سول نافرمانی کا اعلان کیا جائے گا۔ دنیا اس قسم کے اعلانات کا یہ مطلب سمجھتی تھی کہ سول نافرمانی فوراً شروع کر دی جائے گی اور ایک متوازی حکومت قائم کر کے آزادی کا اعلان کر دیا جائے گا لیکن اس مکمل آزادی کے اعلان کی حقیقت صرف یہ نکلی کہ کانگریس کے کریڈ میں سوراج کا جو مبہم لفظ تھا اس کی جگہ آزادی کا اندراج کر دیا گیا جس کے معنی یہ ہوئے کہ کانگریس کا نصب العین مکمل آزادی ہے۔ لیکن یہ مکمل آزادی کب اور کتنے عرصہ میں ملے گی اور حاصل کی جائے گی اس کا کچھ ذکر نہ کیا گیا۔ مسٹر سبھاش چندر بوس کی یہ تجویز کہ متوازی حکومت قائم کر کے سول نافرمانی شروع کر دی جائے، منظور کر لی جاتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ کانگریس نے ایک قدم آگے بڑھایا ہے اور وہ اپنے نصب العین میں مسلمانوں سے ایک قدم آگے نکل گئی ہے لیکن اس نے اس تجویز کو مسترد کر دیا یہاں تک کہ جو لوگ ان خیالات کے حامی تھے ان کو کانگریس کی وزارت (مجلس عاملہ) تک میں نہیں لیا گیا۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہندو حقیقی معنوں میں کامل آزادی نہیں چاہتے بلکہ زیرِ سایہ برطانیہ ہندو راج چاہتے ہیں۔ جس کا نقشہ انھوں نے نہرو رپورٹ کی صورت میں مرتب کیا تھا اور جو عارضی

طور پر اب کچھ عرصہ کے لیے ملتوی کر دی گئی ہے۔ مکمل آزادی کے اعلان کے ساتھ کانگریس نے گول میز کانفرنس کا مقاطعہ بھی کیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ گاندھی اور نہرو صاحبان کی ایک چال ہے کیونکہ اگر یہ صاحبان گول میز کانفرنس میں شریک ہوتے تو اتنا فائدہ ہندو صاحبان کو نہ پہنچتا جتنا اب پہنچے گا، اس لیے کہ ڈاکٹر سپرو، مسٹر سری نواس شاستری وغیرہ لبرل فیڈریشن کے اور کیسکر وجیکر مرہٹہ پارٹی کے اور ڈاکٹر مونجے اور مالوی ہندو مہا سبھا کے شامل ہوں گے اور ہندو قوم کی خوب وکالت کریں گے نیز حکومت کو دھمکی دیں گے کہ اگر ہمارے مطالبات منظور نہ کیے گئے تو ہم بھی گاندھی نہرو صاحبان کے ساتھ مل کر مکمل آزادی کا جھنڈا بلند کریں گے اور پھر گاندھی و نہرو مکمل آزادی کا پروپیگنڈہ کر کے مرعوب کرتے رہیں گے اور گاندھی و نہرو کی جگت ' ہندوؤں کی تجاویز کے مطابق اصلاحات دینے کے لیے راضی ہو جائے گی تو مسٹر گاندھی اور نہرو بارودلی کی طرح پھر حکومت سے مل جائیں گے اور اپنی تحریک ملتوی کر دیں گے۔"

ہندو مسلم اختلافات کے خاتمہ کے لیے سہ نکاتی تجویز

مولانا کانگریس کی ان چالوں کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اخبار میں مذکورہ بالا اخباروں کے خیالات درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "ان اخبارات کے مطالبے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب تک بین الملی حقوق کا تصفیہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک اعلان آزادیٔ کامل سے لوگوں کی بدگمانی دور نہیں ہو گی"۔ اس کے بعد مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ "ہمارے نزدیک پنڈت مدن موہن مالویہ مارچ یا اپریل میں جو آل پارٹیز کانفرنس منعقد کرنا چاہتے ہیں اور جس کے لیے انھوں نے دلی کو جو تجویز کیا ہے اس میں ارباب کانگریس و حریت کامل کو بھی کم از کم ثالث بالخیر کی حیثیت سے ضرور شریک ہونا چاہیے ہیں اور کوشش کرنا چاہیے کہ متعلین کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز سہ گانہ کے ذریعہ سے حکومت ہند، ریاست ہائے اور اور اقوام ہند کے درمیان مفاہمت کی صورت نکل آئے (۱) ہندوستان کا دستور اساسی فیڈرل یا ترکیبی قسم کا از سر نو ترتیب دیا جائے۔ (۲) فی الحال ڈومینین اسٹیٹس

کی بجائے صرف مکمل صوبجاتی آزادی پر قناعت کی جائے۔ (۳) اقلیتوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا جائے۔" مولانا نے مستقبل کی اشاعت مورخہ ۱۲ جنوری کو ان سہ مطالبات کو نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان، بالخصوص حریت پسند مسلمان بالخصوص ہندوستان کے مسلمان اس وقت تک تقسیم نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں وہ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ عزت اور آزادی کے ساتھ رہ سکیں اور اپنی زندگی بسر کر سکیں لیکن مسٹر گاندھی کی قیادت اور ذہنیت نے آخر کار مسلمانوں کی تمام آرزوؤں اور امیدوں پر پانی پھیر دیا اور انھیں مجبور ہو کر جداگانہ وطن کے تصور کو اپنانا پڑا۔ مولانا نے اس ضمن میں جو خیالات پیش کیے وہ کتنے مناسب اور موزوں تھے اور اگر متعصب قیادت انھیں اس وقت مان لیتی تو برصغیر ایک بہت بڑے خون خرابے سے بچ جاتا اور آج اس برصغیر کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ مولانا نے اپنی سہ نکاتی تجویز کے بارے میں پہلے نکتہ کی اس طرح وضاحت کی۔

"ہندوستانی کا دستور اساسی اس بنیادی اصول کے پیش نظر مرتب کیا جائے کہ (۱) برٹش انڈیا کے تمام صوبے (۲) بڑی ریاستیں (۳) چھوٹی ریاستوں کے گروپ۔ یہ سب اپنے اندرونی معاملات میں بالکل خود مختار اور آزاد رکھے جائیں۔ یہاں تک کہ صوبے اپنے گورنر خود مقرر کر سکیں اور فی الحال موجودہ روسائے ہند اپنی ریاستوں کے موروثی گورنر بن جائیں اور ہندوستان کی مرکزی حکومت زیادہ تر ان عناصر سہ گانہ کے منتخب اور نامزد نمائندوں سے مرکب ہو اور انتظامی حکومت کے صرف وہ شعبے ان کے زیر اختیار ہوں جن کا تعلق تمام ملک ہند سے ہو اور جن کو مذکورہ بالا عناصر سہ گانہ نے خود اس حکومت کے مرکزیہ کے حوالہ کیا ہو۔ مثلاً فوج، ریل، تار، ممالک غیر سے صلح و جنگ وغیرہ۔ واضح ہو کہ جب تک طرزِ حکومت کا یہ اصول تسلیم نہ کیا جائے گا اس وقت تک روسائے ہند حکومت مشترکہ ہند کی شرکت اور اس کے بعض امور میں اس کی ماتحتی ہرگز ہرگز قبول نہ کریں گے۔ علیٰ ہذا القیاس ایک دائمی اقلیت کی حیثیت سے مسلمان کو بھی کسی وحدانی قسم کی حکومت کے تسلیم کرنے میں قدرتی اور جائز طور پر تامل رہے گا۔"

(۲) جہاں تک دوسری شق کا تعلق ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ فی الحال دومینین اسٹیٹس

کی بجائے صرف مکمل صوبجاتی آزادی پر قناعت کی جائے اور حکومت مرکزیہ میں ہندوستانی نمائندوں کے ساتھ وسیرائے اور دیگر برطانوی نمائندوں کی بھی موجودگی تسلیم کی جائے اور نائب حکومت برطانیہ کی حیثیت سے گورنر جنرل ان کونسل کے مناسب سیاسی اقتدار کی جہاں تک ممکن ہو مخالفت نہ کی جائے بشرطیکہ وہ لوگ بھی صوبجات ہند کی مکمل خود مختاری پر دل سے رضامند ہو جائیں۔ اس تجویز کا فائدہ یہ ہوگا کہ انگریز جو ڈومینین اسٹیٹس کے فدوی مطالبہ کو ماننے پر کسی طرح تیار معلوم نہیں ہوتے ان کی بات بھی رہ جائے گی اور طالبان حریت ہند کا بھی کم از کم نصف مقصد حل ہو جائے گا یعنی آیندہ کی فیڈرل ریپبلک کے اجزاء مرتب و مکمل ہو جائیں گے صرف ان کی ترکیب باقی رہ جائے گی جس کا وقت بھی رفتہ رفتہ اور کبھی نہ کبھی آجائے گا۔"

اپنی تیسری سہ نکاتی اسکیم کے تیسرے نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا نے جداگانہ انتخاب کے اصول کی وضاحت کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "اقلیتوں کو جہاں کہیں وہ ہوں مثلاً مسلمانوں کے لیے حکومت مرکزیہ اور آسام میں، سکھوں کو پنجاب میں اور ہندوؤں کو سندھ میں نیابت متناسبہ کا حق دیا جائے۔ علاوہ بریں جہاں کہیں جو اقلیت ۱۵ فیصد سے بھی کم ہو، مثلاً مسلمانوں کو سی پی مدراس، بہار، بمبئی اور یوپی میں اور ہندوؤں کو صوبہ سرحد میں نیابت متناسبہ دی جائے۔ انتخاب جداگانہ کا موقعہ فراہم کیے جائے، کیوں کہ بہت چھوٹی اقلیتوں کا تحفظ نیابت متناسبہ سے بھی نہیں ہو سکتا۔ اقلیتوں کے مذہبی اور شخصی قوانین و رسوم کا تحفظ دستور اساسی میں اسی تصریح کے ذریعہ کر دیا جائے کہ کسی صوبجاتی کونسل مرکزیہ اسمبلی بلکہ کسی انتخابی جماعت مثلاً میونسپل بورڈ ڈسٹرکٹ بورڈ میں کوئی ایسا قانون پاس ہونا تو درکنار پیش بھی نہیں ہو سکے گا جو کسی فرقہ کے مذہبی اور شخصی قانون سے متصادم ہوتا ہو اور جس سے شکوہ گزار فرقہ کے دو تہائی ممبران موجودہ اظہار اختلاف کرتے ہوں۔"

اس اظہار خیال کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ "ہماری اس اسکیم کا مطلب دوسرے الفاظ میں یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ کانگریس اپنی کوشش کو حصول آزادی کامل کے لیے وقف کر دے یعنی مرکزی حکومت پر کامل اقتدار حاصل کرنے کے درپے رہے اور صوبجات کی مکمل آزادی معتدلین کے لیے چھوڑ دے تاکہ وہ لوگ بھی اپنی

ہمت اور بساط کے مطابق خدمت ملک بجالاتے رہیں۔" اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ ایک اور بات تشریح طلب رہ جاتی ہے کہ نیابت متناسب اور تعین نشست کے انتخاب مشترکہ میں کیا فرق ہے۔ واضح ہو کہ حلقہ ہائے انتخاب دونوں میں مشترک ہوتے ہیں۔ اور مختلف پارٹیوں کی نشستیں آبادی کے تناسب سے طریق نیابت متناسبہ میں خود بخود اور دوسرے طریق میں تصریح و قرارداد باہمی میں متعین ہو جاتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اقلیتوں کے لیے جو جگہیں پہلے سے متعین کر دی جاتی ہیں، انتخاب مشترکہ کے ذریعہ ان پر وہی لوگ قابض ہو سکتے ہیں جن پر اقلیتوں کو کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کی حیثیت اقلیتوں کے نمائندہ ہونے کی بجائے عموماً اکثریت کے نامزد کردہ ممبروں کی سی ہوتی ہے۔ درآں حالیکہ نیابت متناسبہ کے طریق پر عمل کرنے سے اقلیتوں کے جو نمائندے نسبت آبادی یعنی ووٹوں کی تعداد کے حساب سے منتخب ہوتے ہیں وہ زیادہ تر خود ان اقلیتوں کی منتخبہ رائے کی مدد سے منتخب ہوتے ہیں اور اس لیے ان کے معتمد علیہ ہوا کرتے ہیں اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ نیابت متناسبہ کا طریقہ دوسرے طریقے یعنی انتخاب مشترکہ مع تعین نشست کے مقابلہ میں اقلیتوں کے لیے بہر حال قابل ترجیح ہے۔ اس لیے ہم اس کی سفارش کرتے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ سکھوں اور ہندوؤں کو بھی یہی طریقہ منظور و مطلوب ہے۔"

مسلم کانفرنس کا رویّہ

اس مسئلہ پر مسلم کانفرنس کا نظریہ بھی یہی تھا، لہٰذا مولانا اس خیالی ہم آہنگی پر اظہار پسندیدگی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ "آل انڈیا مسلم کانفرنس اور دیگر معتدل اسلامی جماعتوں کا بھی یہی خیال ہے اور ہم خوش ہیں کہ کم از کم اس باب میں ہماری اور معتدلین اسلام کی رائے میں کوئی نمایاں فرق نہیں اور نہ ہو سکتا ہے مگر اس کو ہمارے اور ان کے اتفاق رائے اور اتحاد عمل کی آخری حد سمجھنا چاہیے آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقدہ لاہور تھی جس کی صدارت نواب اسمٰعیل خاں نے فرمائی تھی۔ اس ضمن میں مولانا کی ہم نوا تھی۔

مسلمانوں سے تحریکِ آزادی کی مخالفت نہ کرنے کی اپیل

مولانا نے چونکہ کانگریس کی مکمل آزادی والی قرارداد سے اختلاف کیا تھا اور اسی سلسلہ ان وجوہ کا ذکر کیا تھا جن کی بنا پر وہ کانگریس کی قرارداد کو موثر اور مناسب خیال نہ کرتے تھے تاہم وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ کانگریس حصول آزادی کے نام پر جو جدوجہد کر رہی تھی یا کرنے والی تھی اس میں مسلمان کسی قسم کی مخالفت کریں۔ اس بات کا اندازہ ان قراردادوں سے ہو سکتا ہے جو مسلمانانِ کانپور کے جلسہ عام منعقدہ ۱۹ جنوری ۱۹۳۰ء میں منظور ہوئیں۔

گول میز کانفرنس کے بارے میں مولانا کا رویہ

مولانا کی رائے گول میز کانفرنس کے بارے میں بھی یہی تھی۔ ایک طرف وہ اس کی افادیت کے قائل نہیں تھے لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ مسٹر گاندھی کی سازش کے مطابق جو غیر کانگریس ہندو قائدین کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں انھیں اپنے ناپاک عزائم میں کامیابی ہو۔

حالاتِ حاضرہ کا تجزیہ

ہم نے مذکورہ بالا سطور میں کانگریس سے متعلق مولانا کے خیالات پیش کیے تھے اور اس ادارہ نے آزادیٔ کامل کی جو تجویز منظور کی تھی اس پر مولانا کا ردِّعمل ظاہر کیا تھا۔ اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس زمانہ میں ملک کو جو سیاسی مسائل درپیش تھے اس کے بارے میں مولانا مسلمانانِ ہند کو کس قسم کی راہ نمائی دینا چاہتے تھے اس کا بھی تذکرہ ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ہم مولانا کے حسب ذیل خیالات کو پیش کرتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں کہ جہاں ہم اس بات کے قائل ہیں کہ جب تک اقوام ہند کے درمیان تصفیۂ حقوق کا معاملہ باہمی رضامندی کے ساتھ طے نہیں ہو گا، اس وقت تک کانگریس کے اعلانِ آزادیٔ کامل کے بارے میں مسلمانوں کی غلط فہمی دور نہیں ہو گی، اس بارے میں ہماری یہ بھی رائے ہے کہ مسلمانوں کو کسی حالت میں بھی تحریک آزادیٔ کامل کی مخالفت

نہیں کرنی چاہیے اس لیے کہ بالفرض بحالت آزادیٔ کامل ہندو کی اکثریت مسلمانوں کی اقلیت کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ بھی کرے تو اس کا نتیجہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کو صرف ہندو کی زبردستی قبول کرنی پڑے۔ دراں حالانکہ آزادیٔ ناقص یا ڈومینین اسٹیٹس میں مسلمانوں کے لیے حکومت غیر اور اکثریت ہندو کی دوہری غلامی سے بچنے کی کوئی صورت ممکن معلوم نہیں ہوتی۔" مولانا کے اس خیال سے اس اشتباہ کا پیدا ہونا لازمی ہے کہ پھر اگر یہ صورتِ حال ہے تو کانگریس کی ہم رنگی میں کس لیے احتراز ہے۔ مولانا اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ جب ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ تو پھر ہم سوراجی مسلمانوں کے ہم نوا بن کر کانگریس کی نیشلسٹ مسلم پارٹی کی کیوں تائید نہیں کرتے تو اس کا جواب بالکل صاف ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہمارے نزدیک قصور اور خامی کے اعتبار سے نیشلسٹ مسلم پارٹی اور مسلم کانفرنس والی معتدل پارٹی کے درمیان زیادہ فرق نہیں۔ مسلم کانفرنس والے تصفیہ حقوق باہمی کے درپے ہیں لیکن آزادیٔ کامل کے خلاف ہیں۔ اس کے برخلاف مسلم نیشلسٹ پارٹی والے آزادیٔ کامل کے موافق مگر اسلامی حقوق کے تحفظ سے بالکل بے پروا معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کا صحیح مسلک یہ ہونا چاہیے کہ جہاں آزادیٔ کامل کی پوری اور دل سے تائید کریں وہاں مسلم حقوق خصوصی کے تحفظ کو بھی کسی حالت میں نظر انداز نہ کریں۔ ان باتوں میں اگر کوتاہ بینوں کو کوئی نقص نظر آتا ہے تو آئے۔ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے لیے یہی مسلک برحق ہے جو ان دونوں کے درمیان اور بین بین واقع ہے۔" یہ تھی مولانا کی رائے جو مولانا نے تحریراً، تقریراً دونوں کے ذریعہ مسلمانوں پر ظاہر فرمائی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ مسلک تو یہ ٹھیک ہے کہ کانگریس اور مسلم کانفرنس کے نظریات کے بین بین راستہ اختیار کیا جائے لیکن اگر یہ صورت پیدا ہو جائے کہ کانگریس اپنی قرارداد کی روشنی میں کوئی عملی اقدام کرے اور مسلمانوں کی جانب سے اس کی مخالفت نہ ہونے کی بنا پر اس کو کامیابی ہو یا اس کی کامیابی کا امکان نظر آئے تو پھر مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے تو مولانا نے اس سوال کا جواب بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے یہی دانش مندی ہے کہ وہ کانگریس کے کسی مظاہرے میں

خواہ وہ کتنا ہی اشتعال انگیز اور کتنا ہی کامیاب کیوں نہ نظر آئے کسی قسم کا حصہ نہ لیں"۔ وہ اپنی اس رائے کے جواز میں اسباب وعلل بیان کرتے ہیں اور کانگریسی رہنماؤں خاص کر مسٹر گاندھی کی پرفریب چالوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "آزادی کا نصب العین نہ تو کانگریس کے لیے نیا ہے اور نہ مسلمانوں کے لیے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کے نصب العین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور وہ ہمیشہ اس پر قائم رہے اور ان کا قدم ایک دفعہ اس راہ پر جو اٹھا تھا اس سے پیچھے نہ ہٹا مگر ہمارے برادرانِ وطن جن کے نزدیک سیاست میں دیانت داری گناہ ہے (مراد مسٹر گاندھی ہیں) اور جن کے نزدیک ہوا کے رخ پر چلنا ہی دانش مندی ہے وہ ہمارے دیکھتے دیکھتے ساری دنیا کا چکر لگا کر جہاں سے چلے تھے وہیں پھر واپس آگئے ہیں لیکن یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اس چکر میں انھوں نے بے کار وقت ضائع کیا بلکہ ان کا وہی مقولہ کہ سیاست میں دیانت داری کی کوئی وقعت نہیں، مطمحِ نظر رہا اور در پردہ وہ ملک کی اقلیتوں کو کمزور کر کے انھیں اکثریت کے رحم وکرم پر رکھنے کے لیے یہ دور دراز کا سفر اختیار کرنا پڑا اور جب کانگریس اس نتیجہ پر پہنچ گئی کہ قلیل التعداد اقوام کی آواز بالکل پست ہو گئی ہے اور حکومت برطانیہ بالکل مرعوب ہو گئی ہے تو اس نے اپنے نصب العین کو ذرا اور بلند کر دیا اور سیاسی حقوق کے لیے سودے بازی شروع کر دی۔ بنیوں کا قاعدہ ہے کہ جب گاہک کا میلان چیز کی طرف دیکھتے ہیں تو فوراً اس کی قیمت سے بڑھ کر قیمت بتاتے ہیں کہ گاہک سودا کرتے کرتے اس کی اصل قیمت کی طرف آجائے گا لیکن ان کا مقابلہ انگریزوں سے تھا جو خود بھی سودے بازی کے قائل اور ماہر ہیں، لہٰذا اب سودے بازی کے امکانات نظر آرہے ہیں۔ اب یہ امر یقینی ہے کہ جس کا پلہ بھاری ہوگا، بازی لے جائے گا"۔ مولانا نے اس اظہارِ خیال کے بعد یہ پیش گوئی کی: "اب کانگریس پھر ہندوستانی عوام کو متحرک کرے گی۔ شاندار مظاہرے کرے گی اور طرح طرح کے ہنگاموں سے ملک میں پروپیگنڈہ کر کے اپنی عملی زندگی کا ثبوت بہم پہنچائے گی تاکہ نہرو دستور جو ملتِ اسلامیہ کی موت کے برابر ہے ملک میں رائج ہو جائے"۔

مولانا آگے چل لکھتے ہیں کہ "گاندھی جی جانتے ہیں کہ کامل آزادی کے لیے فی الحال

دن درکار ہیں ہندو قوم کے لیے زیر سایہ برطانیہ کافی ہے۔ اور اس کے لیے ہندؤں کے مطابق نہرو دستور اساسی کافی ہے جسے انگریز حکومت صرف اسی صورت میں منظور کر سکتی ہے کہ ہم اسے زیادہ سے زیادہ مرعوب کر سکیں" اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ "اس وجہ سے کلکتہ میں یہ دھمکی دی گئی کہ اگر ۱۲ بجے رات تک یہ دستور قبول نہ کیا گیا تو پھر اس سے ایک قدم آگے مکمل آزادی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جو ہم مانگتے ہیں وہ دے دو ورنہ ہم سختی سے مقابلہ کریں گے اور گاندھی جی نے جو اس پالیسی کے روح رواں ہیں سچا کر دکھایا چنانچہ جب ۳۱ دسمبر تک حکومت زیر سایہ برطانیہ نہ مل سکی تو انھوں نے سختی کے ساتھ مطالبہ کیا اور کہا کہ یہ نہیں دیتے ہو تو ہم اب آزادی کامل کی تیاریاں کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے نہرو دستور اساسی دفن نہیں بلکہ اس کا سختی کے ساتھ مطالبہ کیا گیا ہے ورنہ خیال تو ہے کہ کامل آزادی کا اعلان ہوتا ہے لیکن ملک کے سامنے کوئی پروگرام نہیں رکھا جاتا۔ اگر حقیقی معنوں میں یہ لوگ کامل آزادی کے خواہاں ہوتے تو اس کو زبان سے نکالنے سے قبل اس کے لیے پروگرام مرتب کرتے لیکن پروگرام مرتب نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ صرف ہندو دستور اساسی منوانے کی ایک اور دھمکی ہے"۔

نہرو رپورٹ کی تفصیلات

اس سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہرو رپورٹ کی تفصیلات یہاں پر ظاہر کر دی جائیں۔ نہرو رپورٹ مختلف الخیال سیاسی جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی نے پیش کی۔ یہ کمیٹی ۱۹۲۸ء میں پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں منعقد کی گئی تھی۔ منشا برصغیر پاک و ہند میں ایک ایسے نظام حکومت کے لیے سفارشات ترتیب دینا تھا جو یہاں کے تمام مذہبی گروہوں، سیاسی جماعتوں اور انجمنوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔ نہرو رپورٹ کا صحیح اندازہ اسی صورت میں لیا جا سکتا ہے جب ان حالات کو سمجھا جائے جن کے پس منظر میں یہ رپورٹ مرتب کی گئی۔ ۱۹۲۸ء سے قبل برصغیر میں جو حالات تھے وہ کچھ اس قسم کے تھے کہ ہندو مسلم کشیدگی بڑھ چکی تھی۔ بنگال، بہار اور کئی صوبوں میں ہندو مسلم فسادات روزمرہ کا معمول بن چکے

تھے۔ چونکہ ہندو مضبوط سیاسی، معاشرتی اور معاشی حیثیت کے مالک تھے اس لیے وہ ان علاقوں میں مسلمانوں پر ہر قسم کا تشدد روا رکھ سکتے تھے اور ان پر بے شمار زیادتیاں کر سکتے تھے۔ لالہ لاجپت رائے جو ابتدا میں گرم دل کے رکن تھے اور جنھوں نے ایک زمانہ میں مولانا کی کتاب "مشاہداتِ زنداں" کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا اور سوامی شاردھانند ہندو ذہنیت کے عکاس بن چکے تھے۔ ہندو ذہنیت میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ اور کوئی قابلِ عزت مقام نہ تھا۔ ہندوؤں کے نزدیک مسلمان ایک الگ قوم تھے (مسلمانوں نے ابھی یہ مطالبہ نہیں کیا تھا) ہندوستان ان کا وطن نہیں تھا، اس لیے اس غیر ملکی قوم کو ہندوستان میں وجود خارج از امکان تھا۔ چنانچہ ان دنوں ہندو مسلمانوں کو ہندوستان سے نکالنے کی فکر میں تھے۔ ہندوؤں کا زاویۂ نگاہ ایسے مسلمان راہنماؤں کے لیے حیرت ناک اور کرب انگیز تھا۔ جنھوں نے تحریکِ خلافت میں ہندوؤں اور بالخصوص گاندھی کا تعاون حاصل کیا تھا۔ گاندھی کی شخصیت ان کی نگاہ میں ہندو مسلم اتحاد کا مجسمہ تھی لیکن انھی مسٹر گاندھی نے کلکتہ میں ہندو مسلم فساد کے موقع پر جب بیان دیا کہ اگر ایسے فسادات ہونا ہی ہیں تو انسانوں کو اپنا خون بہادری کے ساتھ بہانا چاہیے اور یہ کہ ہندو ایک ڈرپوک قوم ہیں، تو اس بیان سے کچھ مسلمان لیڈروں کی آنکھ کھلی۔ اس کے بعد جب گاندھی جی نے ایک طرف تو علی گڑھ یونیورسٹی کو بند کرانے کی کوشش کی مگر بنارس ہندو یونیورسٹی کو بند کرنے پر تیار نہ ہوئے تو خود مولانا محمد علی کو بھی ان کی اصلی ذہنیت کا پتہ چل گیا۔ پھر بھی جب نہرو رپورٹ کی تیاری کے لیے کمیٹی قائم کی گئی تو مسلمانوں نے ہندو مسلم اتحاد کی خاطر جداگانہ طریقِ انتخاب سے جو انھیں ۱۹۰۹ء میں لارڈ منٹو نے دیا تھا از خود دست بردار ہونے کا اعلان کیا۔ یہ اعلان چونکہ قائدِ اعظم نے کیا تھا اس لیے مسلم لیگ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک جناح لیگ اور دوسری شفیع لیگ۔ مگر جداگانہ انتخاب سے مسلمانوں کی دست برداری غیر مشروط نہیں تھی۔ اس سلسلہ میں جناح لیگ نے ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو ہندو مسلم اتحاد کانفرنس دلی میں ایک پانچ نکاتی تجویز پیش کی تھی جو حسبِ ذیل تھی۔

۱۔ سندھ کو بمبئی پریزیڈنسی سے الگ کرکے صوبہ سندھ تخلیق کیا جائے۔
۲۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد میں دیگر صوبوں کے طرز پر اصلاحات کا نفاذ کیا جائے۔
۳۔ پنجاب اور بنگال میں نمائندگی تناسبِ آبادی کے مطابق ہو، یعنی مخلوط انتخابات میں آبادی کی بنا پر نشستیں محفوظ کی جائیں۔
۴۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دی جائیں۔
۵۔ نیز یہ نمائندے مخلوط انتخابات کے ذریعہ محفوظ نشستوں کے لیے منتخب کیے جائیں۔

لیکن نہرو رپورٹ میں اس تجویز کو مکمل طور پر مسترد کر دیا گیا۔ تجویز کے ہر نقطہ پر اعتراض کیا گیا اور اس پر فرقہ وارانہ تفریق کا الزام عاید کیا گیا اور اسے ناقابلِ عمل ٹھہرایا گیا۔ نہرو رپورٹ میں اس تجویز کو جسے دہلی تجویز کا نام دیا گیا تھا اس درجہ بے اعتنائی کا ثبوت دیا گیا کہ لوگوں کو اس کے متعصبانہ رویہ کا احساس ہو گیا۔ کمیٹی میں جو دو مسلمان نمائندے شامل کیے گئے تھے ان میں سے ایک تو تقریباً کمیٹی کے کسی اجلاس میں شریک نہیں ہوئے، دوسرے نمائندہ حضرت بھی صرف ایک دو نشستوں میں موجود رہے۔ نہرو رپورٹ میں تحفظ نشست کے بارے میں عجیب و دلچسپ رویہ اختیار کیا گیا۔ اس کے مرتبین کے خیال میں محفوظ نشستوں کی ضرورت ایسے فرقہ کو پیش آتی ہے جو ہر لحاظ سے کمزور ہو اور جس کی تعداد برائے نام ہو لیکن مسلمانوں کی تعداد چونکہ دس کروڑ ہے اور ان کی تعداد اچھی خاصی اکثریت میں ہے، اس لیے وہ اپنے حقوق کا خود تحفظ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے محفوظ نشستیں مقرر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مرکز میں ایک تہائی نمائندگی اس بنا پر خارج از امکان ہے کہ مسلمان ہندوستان کی آبادی کا ۱/۴ حصہ ہیں انھیں چوتھائی نمائندگی ملنی چاہیے۔ نہرو رپورٹ میں مشروط طور پر سندھ کو الگ صوبہ بنانے کا حق دیا گیا مگر شرط یہ تھی کہ بمبئی پریزیڈنسی نئے صوبہ کو مالی امداد نہیں دے گی اور سندھ کو اپنے اخراجات از خود برداشت کرنے پڑیں گے۔ دوسرے الفاظ میں نہرو کمیٹی ایک مفلوج لولا اور ناقابلِ عمل صوبہ چاہتی تھی، صرف ایک نقطہ پر نہرو کمیٹی بحث و تمحیص کے بعد رضامند ہوئی اور وہ بلوچستان اور صوبۂ سرحد میں اصلاحات

کا نفاذ تھا۔ نہرو رپورٹ میں ایک مضبوط مرکز کی تجویز پیش کی گئی تھی جس میں ہندوؤں کی عددی اکثریت ہو۔ گویا ہندو راج سارے ہندوستان پر محیط کیا جائے اور ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں بھی مسلمانوں کی آزادی حاصل نہ ہونے پائے۔" پنڈت موتی لال نہرو نے جب اپنی رپورٹ پیش کی تو کانگریسی حلقوں میں صرف مولانا نے اس کی پُرزور مخالفت کی۔ پروفیسر نجم الدین شکیب نے لکھا ہے کہ: "کانگریس پر دایاں بازو چھایا ہوا تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو جو مرتبین نہرو رپورٹ کے رئیس التحریر تھے اس دائیں بازو کے سرکاری وکیل تھے۔ وجوہ جو بھی ہوں لیکن عدم تعاون کی خاطر سب کچھ گنوانے اور بیچی بخلیر چھوڑ کر جیل بسانے والوں میں کوئی ایسا مردِ کامل نہ تھا جو انگریزوں سے ترکِ تعلق کا تصور بھی کر سکتا ہو۔ نوآبادیات اور نہرو رپورٹ کے اس جزو کی مخالفت کرتا کہ درجہ نوآبادیات قبول کیا جائے۔ کانگریس کے بعد آزمودہ کار راہنما جو کانگریس کے لیے بھی قابلِ صد فخر واحترام تھے اور جن کی بات مہاسبھا میں بھی قولِ فیصل کا درجہ رکھتی تھی نہرو رپورٹ کے مرید تھے، خود مسٹر گاندھی اس کی تائید میں تھے۔ کانگریس کے بائیں بازو کی راہنمائی جو آج کی طرح پہلے بھی عضوِ ضعیف تھا پنڈت جواہر لال نہرو کے سپرد تھی۔ حسرت موہانی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے نہرو رپورٹ کی اکثر دفعات کے خلاف دوش بدوش کچھ اس طرح جہاد کیا کہ دونوں پر ایک جماعت کے ارکان ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو بڑے باپ کے اقبال مند بیٹے تھے اس لیے ان کی پذیرائی کے لیے سال کا گوشہ گوشہ چشم براہ اور جیبہ جیبہ گوش برآواز معلوم ہوتا تھا لیکن حسرت موہانی ایک لٹے ہوئے قافلہ کے خستہ حال میر کارواں تھا اس لیے اس کی باتیں دلوں سے نہیں پتھر دل سے ٹکرائیں اور بے اثری سے ہم کنار ہو کر فضا میں تحلیل ہو جاتیں۔" مولانا نے کانگریس کے اجلاس میں بھی نہرو رپورٹ کے خلاف اظہارِ خیال کیا اور جب کانگریس کے اجلاس منعقدہ لاہور میں آزادیٔ کامل کی حمایت میں قرارداد منظور ہوئی اور نہرو رپورٹ کے انتقالِ پُرملال کا اعلان کیا گیا تو انھوں نے اس ضمن میں اپنے اخبار "مستقل" میں مسلسل تین اداریے سپردِ قلم فرمائے اور کانگریس کو مشورہ دیا کہ وہ تحریک چلانے سے

قبل تصفیۂ حقوق کا مسئلہ حل کرے۔ ان کے ایک اداریہ کا عنوان ہے: "نہرو رپورٹ کے واپس لینے کی علت"۔ یہ اداریہ اخبار مستقل کی اشاعت ۷ر جنوری میں شائع ہُوا۔ مولانا نے اس اداریہ میں سوال کیا کہ نہرو رپورٹ مسترد کرنے کے بارے میں دونوں قوموں نے مطالبہ کیا تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے اور سکھوں کی طرف سے لیکن یہ دونوں قومیں متضاد نقطہ ہائے نگاہ سے اس رپورٹ کی مخالف تھیں۔ مسلمان کہتے تھے کہ اس رپورٹ نے ہماری پنجاب اور بنگال کی اکثریتوں پر کاری ضرب لگائی ہے۔ جب تک جداگانہ انتخاب اور پنجاب و بنگال کی اکثریتوں کو بحال نہ کیا جائے گا اس وقت تک ہم اسے تسلیم نہ کریں گے۔ سکھوں کا مطالبہ تھا کہ بالغوں کو حق رائے دہی دے کر یہ احتمال ہی کیوں پیدا کیا گیا کہ پنجاب میں ——— کبھی مسلم اکثریت قائم ہو سکے۔ اس کے علاوہ ہندو اکثریت کے صوبوں کو مسلمانوں کو کیوں دس سال کے لیے مخصوص نشستیں دی گئی ہیں اگر مسلمانوں کے لیے ایسا کیا گیا تو سکھوں کو بھی پنجاب میں ۳۰ فیصد نشستیں دی جائیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کانگریس نے کس قوم کے مطالبہ کے احترام میں رپورٹ واپس لی ہے اور آئندہ کس کا مطالبہ تسلیم کرنے کا ارادہ ہے، یا دونوں سے اپنی غرض نکالنا مقصود ہے اور بس۔" انھوں نے "مستقل" مورخہ ۹ر جنوری میں نہرو رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: "کانگریس نے لاہور میں ریزولیشن آزادیٔ کامل کی منظوری کے ساتھ ہی نہرو رپورٹ کی موت کا بھی اعلان کر دیا اور یہ کہہ کر دل کو تسلی کر لی گئی کہ اب بین الملکی جھگڑوں کی جڑ کٹ گئی اور اس قسم کے جملہ اختلافات کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن دیکھنے والے دیکھتے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو اس کا تعلق صرف نیشنل کانگریس سے ہوگا۔ ہندو مہاسبھا، لبرل فیڈریشن کے ہندو اور مسلم لیگ و مسلم کانفرنس کے مسلمانوں کا کیا بنے گا کہ وہ ہنوز اپنی جگہ قائم اور بدستور آمادہ جنگ نظر آتے ہیں۔ مولانا کے اس اخبار میں نواب اسمٰعیل خاں کا خطبۂ صدارتِ خلافت کانفرنس شائع ہوا جس میں اعلان کیا گیا کہ مسلمان اپنے ابنائے وطن کی سیاسی بساط پر ایسا مہرہ نہیں بننا چاہتے ہیں جو ایک شاطر کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے شاطر کے ہاتھ میں چلا جائے مولانا نے اسی اخبار کی

اشاعت ۱۱ر جنوری ۱۹۳۰ء میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر انصاری کا ایک مشترکہ بیان بھی شائع کیا جس میں کہا گیا تھا کہ "چونکہ کانگریس نے نہرو آئین کو مسترد کر دیا ہے اور یہ یقین دلایا ہے کہ آئندہ ہندوستان کے لیے کوئی ایسا آئین تسلیم نہیں کیا جائے گا جو اقلیتوں کے لیے قابلِ اطمینان نہ ہو اس لیے مسلمانوں کے لیے کانگریس کی حمایت کرنا اور بھی ضروری ہے۔" مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے معاصر "انقلاب" کا ایک اداریہ بھی اسی صفحہ پر شائع کیا جس میں تحریر تھا کہ "بعض ناعاقبت اندیش مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ جب تک نہرو رپورٹ برقرار رہی اس وقت تک وہ مسلمانوں کو دعوتیں دیتے رہے بلکہ اپنی استطاعت کے مطابق مجبور کرتے رہے کہ آنکھیں بند کر کے نہرو رپورٹ قبول کر لو خواہ اس کے قبول کرنے میں تمہارے حقوق کا انجام کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو۔ اب نہرو رپورٹ زائد المیعاد ہو کر عملی سیاسیات کے میدان سے باہر آ گئی تو ان لوگوں نے بلا تکلف کہنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں کو آزادیٔ کامل کے لیے قربانیاں کرنی چاہییں اور کوئی حق نہیں مانگنا چاہیے۔" اس اخبار کے اداریہ کا آخری حصہ قابل غور ہے جس میں لکھا ہے کہ "جب نہرو رپورٹ گئی تو کہنا شروع کر دیا کہ سرے سے مطالبات ترک کر دو۔ پھر کیا ہم یہ سمجھیں کہ مقصد آزادیٔ کامل نہیں درجۂ مستعمرات نہیں، انگریزوں کا اخراج نہیں بلکہ صرف مسلمانوں کی تباہی ہے۔ مولانا نے اسی دوران ایک مفصل تجویز بھی پیش کی جسے اگر اسی وقت منظور کر لیا جاتا تو برصغیر کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔

مسلم کانفرنس کی بے راہ روی

مولانا اس وقت مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس سے وابستہ تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے بانیوں میں تھے اور وہ جناح لیگ کے مقابلہ میں جداگانہ انتخاب کی حامی تھی۔ لیکن جب ان دونوں جماعتوں نے بھی آزادیٔ ناقص (درجۂ مستعمرات) کی تجویز منظور کر لی تو مولانا کو بہت دکھ ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ۲۰ر جنوری ۱۹۳۰ء کے "مستقل" میں "مسلم کانفرنس کی بے راہ روی" کے عنوان سے ایک اداریہ سپردِ قلم کیا جس میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ "آل انڈیا مسلم کانفرنس کے قیام اور دوام کی جتنی کوشش

راقم الحروف نے کی اتنی کسی دوسرے مسلمان سے اس وقت تک ظاہر نہیں ہوئی۔ مسلم مفاد کے تحفظ کی غرض سے ہمارے خیال میں اس امر کی ضرورت تھی کہ نرم و گرم و سرد ہر خیال کے سب مسلمان کسی ایک انجمن میں متحد رہیں اور حسبِ ضرورت ان میں سے جس وقت جو فریق جس کام کا اہل نظر آئے وہی اس کو انجام دے باقی فریق اس کی تائید کریں یا خاموش رہیں۔ بعد میں ہماری ساری کوشش ایک جدید مشترک اسلامی انجمن کی تشکیل وتاسیس کے لیے وقف ہوگئی جس کا نتیجہ آل انڈیا مسلم کانفرنس دہلی کی شکل میں برآمد ہوا۔ اس کانفرنس کے اصول تربیت میں بھی یہ بات جملہ فریقوں کی خاموش رضامندی کے ساتھ مدِنظر رہی کہ جہاں تک مسلمانوں کے حقوق مخصوص کی تائید اور نہرو رپورٹ سے اختلاف کا تعلق ہے ہم لوگوں کا گرم فریق شفیع اور آغا خان کے نرم پروگرام کا مؤید رہے گا۔ اس کے عوض نرم فریق نصب العین کے معاملہ میں ہمارے دعوئ آزادی کی اگر تائید نہ کرے تو تردید بھی نہیں کرے گا۔ اور مسلم کانفرنس کی جانب سے ڈومینین اسٹیٹس یا ناقص آزادی کا اظہار نہیں ہونے دیا جائے گا۔“

مسلم کانفرنس کی قرارداد

لیکن جب مسلم کانفرنس کی مجلس منتظم نے اپنے اجلاس منعقدہ لاہور مورخہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء میں ایک قرارداد کے ذریعہ ناقص آزادی کی حمایت کی تو مولانا کو یقیناً تکلیف ہونی چاہیے۔ یہ قرارداد چونکہ تاریخی حیثیت سے بے حد اہم ہے اور اسے مولانا محمد علی نے مرتب کیا تھا اور سر عبدالقادر نے اس کی تائید کی تھی لہٰذا اسے اس موقع پر مفصل نقل کیا جاتا ہے۔ ”آل انڈیا مسلم کانفرنس کی مجلس ہز ایکسی لینسی وائسرائے کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتی ہے جو ہز میجسٹی کی حکومت برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمائندوں کی گول میز کانفرنس کے انعقاد بمقام لندن سے متعلق ہے، کیوں کہ اس اعلان سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی قوم ہندوستان کے جذبۂ آزادی سے کافی طور پر متاثر ہو چکی ہے اور سرگرمی کے ساتھ خود مختار ہندوستان کے ایسے دستور اساسی کی تشکیل کی خواہاں ہے جسے متعلقہ حلقوں، جماعتوں اور طبقوں کے نمائندوں

نے مرتب کیا۔ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ رنج کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ برطانوی قوم ہندوستان کی آزادی نہیں چاہتی اور اس عقیدہ پر عمل کرتے ہوئے کہ کامل ذمے دار حکومت اگر ممکن ہو تو برطانیہ سے متعلق رہ کر اور اگر ضرورت ہو تو برطانیہ سے قطع تعلق کر کے حاصل کی جائے، خیال کرتا تھا کہ برطانوی تعلق کے بغیر اس کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ اب مجلس اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ مجوزہ گول کانفرنس کی دعوت کے یہ معنی ہیں کہ کامل ذمہ دار حکومت برطانوی تعلق کے ساتھ ممکن ہے اور مسلمانانِ ہند کے پیش نظر مقاصد پر پورا وثوق رکھتے ہوئے مجلس مسلمانوں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ گفت وشنید کا دروازہ بند نہ کریں اور مجوزہ گول میز کانفرنس کی دعوت قبول کرلیں۔ یہ مجلس ایسی فریبانہ چالوں سے متنبہہ کرنا ضروری تصور کرتی ہے جو فی الحال بالکل روشن ہیں اور جن سے آزادی کے پاک نام پر ناجائز نفع حاصل کرنا اور قومی مطالبہ کی صورت دے کر ایک مخصوص سیاسی جماعت کے لیے سیاسی حقوق کا اجارہ حاصل کرنا مقصود ہے۔ اس مجلس کو یقین ہے کہ برطانوی حکومت اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہے کہ مسلمانوں کے لیے دستور اساسی اس وقت تک اور اس کے بغیر قابلِ قبول نہیں جب کہ ان حقوق اور مفادات کا کامل تحفظ اس طور پر نہ کر دیا جائے جیسا کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ یکم فروری ۱۹۲۹ء زیر صدارت ہز ہائی نس سر آغا خاں بمقام دلی کی قرارداد میں جو متفقہ طور پر منظور ہوئی تھی۔ ظاہر کیا گیا ہے۔ نیز اس گول میز کانفرنس میں ان کی مؤثر نمائندگی ایسے اشخاص سے نہ ہوتی ہو جو ملت کے حقیقی نمائندے ہیں۔ شریعت اسلامیہ کے غیر بدل ہونے کا یقین رکھتے ہیں، اپنے ہم مذہبوں کا پورا اعتماد رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے نقطۂ خیال اور جوش ہیجانی کے ساتھ مؤثر طریقہ پر اظہار کرتے ہیں۔

مولانا کا اضطراب

مولانا کو اس قرارداد کی منظوری سے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے بے حد تکلیف پہنچی اور انھوں نے کہا کہ "اگرچہ ہماری جانب سے مسلم کانفرنس کی کوئی مخالفت نہیں ہوئی اور ہم نے اپنے نرم دوستوں کی تائید کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن

سر شفیع اور شفیع داؤدی اپنے عہد پر قائم نہ رہے اور افسوس ہے کہ اب مولانا محمد علی بھی ان کے ہم نوا بن گئے چنانچہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی مجلس منتظم میں بمقام لاہور انہی کی تحریک پر یہ بات طے پاگئی کہ مسلمان آزادیٔ ناقص زیرِ سایہ برطانیہ کو اپنا نصب العین سمجھتے اور گول میز کانفرنس میں بہ رضا و رغبت شریک ہونے کے لیے ہمہ تن آمادہ ہیں۔" اس کے بعد مولانا لکھتے ہیں کہ "مسلم کانفرنس کی اس بے راہ روی کے بعد ظاہر ہے کہ آئندہ اس کے ساتھ اشتراکِ عمل اصولاً ناممکن ہوگیا۔

مولانا محمد علی پر اعتراض

مولانا نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے اداریہ میں مسلم کانفرنس کے فیصلے کی مذمت کی اور مولانا محمد علی کے رویہ پر بھی اظہارِ افسوس کیا اور لکھا کہ "مولانا محمد علی بھی آزادیٔ ناقص پر تیار ہو گئے چنانچہ مولانا نے اس ضمن میں لکھا کہ انھوں نے "مستقل" کی گزشتہ اشاعت میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کی مجلسِ منتظمہ کی جو قرارداد من و عن شائع کی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ اہلِ نظر کو معلوم ہو جائے کہ اربابِ کانفرنس کا مقصد اصل میں گول میز کانفرنس میں شرکت ہے جس سے وہ کسی حال میں دست بردار نہیں ہو سکتے چاہے اس بات کے لیے ان میں سے بعض کو اپنے ضمیر کے خلاف دعویٔ آزادیٔ کامل سے ہی کیوں نہ دست بردار ہونا پڑے۔ یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ قرارداد مذکورہ کا مسودہ مولانا محمد علی کا بنایا ہوا ہے۔ جنھوں نے خلافت کانفرنس کلکتہ کے صدر کی حیثیت سے تحریکِ آزادیٔ کامل کی تائید میں ۵ گھنٹہ تقریر کی تھی اور نہرو رپورٹ کے ناقابل قبول ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی تھی کہ اس میں ہندوستان کا نصب العین آزادیٔ کامل کی بجائے آزادیٔ ناقص قرار دیا گیا تھا اور افسوس کا مقام ہے کہ وہی مولانا محمد علی آج گول میز کانفرنس کی شرکت کو جائز قرار دینے کی غرض سے فرماتے ہیں کہ مجوزہ گول میز کانفرنس کی دعوت کے یہ معنی ہیں کہ کامل ذمہ دار حکومت برطانوی تعلق کے ساتھ ممکن ہے۔" یہ سطور لکھنے کے بعد مولانا یہ دریافت فرماتے ہیں کہ "اس عبارت کا اس کے سوا اور بھی کچھ مطلب ہو سکتا ہے کہ را، آج تک مسلمانوں کا جو عقیدہ قائم ہو چکا تھا کہ برطانوی قوم ہندوستان

کی آزادی نہیں چاہتی وہ غلط ہے اور صحیح یہ ہے کہ انگریز خود ہندوستان کی آزادی کے خواہاں ہیں اور (۲) گول میز کانفرنس کے ذریعے سے جو دستور مرتب کرنا چاہتے ہیں اس کو ہم بھی آزادی کا دستور تسلیم کر لیتے ہیں۔

مولانا خود کیا چاہتے ہیں

کانگریس اور مسلم کانفرنس کے رویّہ سے متعلق مولانا کے نظریات بالکل واضح تھے اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو دلائل دیے تھے وہ بھی ایک واضح ذہن کی پیداوار تھے لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ مولانا جب خود ہی کامل آزادی کے حامی اور دعوے دار تھے تو جب کانگریس نے آزادیٔ کامل کو اپنایا اور خواہ اس فیصلے کے محرکات کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن جب اس نے اس نعرہ کو بلند کیا تو پھر ان کا کیا فرض تھا۔ اس کے جواب میں یہ عرض ہے کہ اولاً تو مولانا کو اس بات کا یقین ہی نہیں تھا کہ کانگریس واقعی آزادیٔ کامل کی حامی ہے۔ دوئم مولانا کی رائے یہ تھی کہ کسی قسم کی تحریک شروع کرنے سے پہلے مسلم حقوق کا فیصلہ ہو جانا چاہیے لیکن افسوس کہ مسٹر گاندھی نے ان کی یہ بات نہیں مانی۔ یہاں تک کہ جب مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے یہ تجویز پیش کی تو بھی انھوں نے تسلیم نہیں کیا چنانچہ جب مولانا شوکت علی نے ایک بیان کے ذریعہ مسلمانانِ ہند سے اپیل کی وہ ۲۶؍ جنوری کے مظاہرہ میں کوئی حصہ نہ لیں تو مولانا کو پھر اس موضوع پر اظہارِ خیال کرنا پڑا حالاں کہ وہ خود اس مسئلہ پر مسلمانوں کو یہی رائے دے چکے تھے۔ مولانا نے مولانا شوکت علی کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "اگرچہ وہ ذاتی حیثیت سے بغیر کسی شرط کے تحریکِ حریت کو کامیاب بنانے پر تیار ہیں لیکن مولانا شوکت علی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریسی اعلان آزادی کے متعلق مسلمانوں کے عام جذبات و احساسات کیا ہیں۔" یہ لکھنے کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ "حامیانِ نہرو رپورٹ اور مہا سبھائیوں کے غلط طرزِ عمل نے کانگریس کے وقار اور اعتماد کو ضربِ شدید پہنچا کر مسلمانوں کے دلوں میں جائز شبہات پیدا کر دیے جائیں اور اب اگر مسلمان من حیث القوم کانگریس کی تحریک میں شرکت سے پہلے کانگریسی لیڈروں سے

اپنے حقوق کے متعلق کامل اطمینان چاہتے ہیں تو کوئی انصاف پسند انھیں موردِ الزام قرار نہیں دے سکتا؟ مولانا کانگریس کی اس دلیل سے متفق تھے کہ حصول حریت سے سے پہلے کوئی جامع اور مکمل دستور نہیں بن سکتا لیکن مولانا کی رائے میں چند بین اصولوں کی صراحت ضرور ممکن ہے۔ مثلاً یہ کہ آزادی کے بعد ملک میں شخصی حکومت قائم ہوگی یا جمہوری الخ اگر جمہوری حکومت ہوگی تو وحدانی ہوگی یا وفاقی؟ اس اظہارِ خیال کے بعد مولانا بڑے یقین کے ساتھ فرماتے ہیں کہ "عام رفتارِ زمانہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شخصی حکومت کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔ آزاد ہندوستان کا نظام یقیناً جمہوری ہوگا۔ ہم صاف الفاظ میں بتا دینا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے ایسا جمہوری نظامِ حکومت جس میں تمام تر اختیارات مرکزی حکومت کو حاصل ہوں بالکل ناقابلِ قبول ہے۔ ہندوستان کی تمام جماعتیں اگر مطمئن ہو سکتی ہیں تو صرف ایسے فیڈرل نظامِ حکومت پر جس پر ہندوستان کی تمام موجودہ ریاستیں اور صوبجات ریاستوں کی حیثیت سے اپنے اندرونی معاملات میں بالکل آزاد اور عام مشترک مسائل میں باہم متحد رہ کر آزاد متحدہ ریاست ہائے ہند کی بنیاد قائم کریں؟

گاندھی جی کی وضاحت

مولانا کے مضبوط اور مستحکم اعتراضات کی بنا پر گاندھی جی کو کھل کر سامنے آنا پڑا اور انھوں نے ایک بیان میں کہا کہ وہ بے شک عدم تشدد کے حامی ہیں لیکن اگر سوال غلامی اور تشدد کا ہو تو وہ تشدد کو ترجیح دیں گے اور یہ کہ اگر آئندہ انگریزوں سے بات چیت کا موقع آیا تو کامل آزادی کو بنیاد بنا کر بات چیت ہوگی اور ناقص آزادی کا ذکر نہیں آئے گا۔ مسٹر گاندھی کے اس بیان سے مولانا کے خدشات ایک حد تک کم ہو گئے لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مولانا کا یہی خیال رہا کہ... "اربابِ کانگریس کے لیے بہتر یہی ہے کہ تصفیہ حقوق کے ذریعے مسلمانوں کے دل سے رہی سہی بدگمانی کو کم سے کم اپنی طرف سے دور کر دیں تاکہ ناقص آزادی کی ہڈیوں کی خاطر باہمی لڑائی کے لیے ہندو مسلم اعتدال پسندوں کے سوا کوئی دوسرا خیال اور حریت پسند فریق ہندوستان میں باقی نہ رہے۔

ویسرائے کا بیان

ادھر تو مولانا کانگریس کو یہ تلقین کر رہے تھے ادھر مولانا محمد علی، نواب اسمٰعیل خاں مولانا شفیع داؤدی، مولانا شوکت علی، سید مرتضٰی بہادر مولانا محمد عرفان نے ایک مشترک بیان کے ذریعے مسلمانوں کو ۲۶ جنوری کی تقریب میں شرکت نہ کرنے کی اپیل کی لیکن ویسرائے نے اپنی تقریر میں اس بات کا اعلان کر کے کہ آزادیٔ ناقص بھی مستقبل قریب میں نہیں مل سکتی، انگریزوں کے بارے میں مولانا کے نظریات کی پوری طرح تائید کر دی۔ یہ تقریر مرکزی اسمبلی میں ۲۵ جنوری ۱۹۳۰ء میں کی گئی۔

مولانا کا مشورہ

مولانا نے ویسرائے کی تقریر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے پیشین گوئی کی کہ ویسرائے کے انکار کے باوجود مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے زعما گول میز کانفرنس میں شرکت کریں گے۔ یہ پیشین گوئی بھی سابقہ پیشین گوئی کی طرح صحیح ثابت ہوئی۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت مدن موہن مالویہ نے جو ملکی گول میز کانفرنس طلب کی ہے اس میں ضرور شرکت کی جائے۔ مولانا نے اس ضمن میں تحریر فرمایا کہ "ایسی صورت میں معتدلین ہند کے ان جملہ ہندو مسلم نمائندوں سے ہماری دست بستہ گزارش ہے کہ سر تیج بہادر سپرو اور مالوی جی کی بلائی ہوئی ہندوستانی گول میز کانفرنس میں یکجا ہو کر فی الحال ڈومینس اسٹیٹس کی بجائے صرف مکمل صوبہ جاتی آزادی پر قناعت کر لیں اور پھر اس نظریہ کے ماتحت ہندوستان کا دستور اساسی فیڈرل یعنی ترکیبی قسم کے از سر نو مرتب کر کے لندنی گول میز کانفرنس میں پاس کرائیں جس میں برٹش انڈیا کے تمام صوبے بڑی ہندوستانی ریاستوں اور چھوٹی ہندوستانی ریاستوں کے گروپ اپنے اپنے اندرونی معاملات میں بالکل خود مختار رکھے جائیں اور اقلیتوں کو ان کے مذہبی اور شخصی قوانین و رسوم کے تحفظ کے علاوہ تناسبہ یا جداگانہ انتخاب کا حق بھی دیا جائے۔ اس تجویز کا یہ فائدہ ہوگا کہ انگریز جو ڈومینس اسٹیٹس کے فوری مطالبہ کو ماننے کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہے اس کی بات بھی رہ جائے گی اور طالبانِ حریت

کا بھی کم ازکم نصف مقصد حل ہو جائے گا۔ یعنی آیندہ کی فیڈرل ریپبلک کے اجزا سب مرتب و مکمل ہو جائیں گے " یہ خیال فرمایا جائے کہ مولانا تو خود آزادیٔ کامل پر قائم و دائم ہیں لیکن پھر یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی وحدت کسی نہ کسی صورت قائم رہے اور کم ازکم معتدلین میں تو اتحاد و اتفاق رہے۔ لیکن جب سر تیج بہادر سپرو نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستانی گول میز کانفرنس میں صرف وہی لوگ شریک ہوں گے جو درجہ نوآبادیات کے حامی ہوں تو مولانا نے سر تیج بہادر سپرو سے اپیل کی کہ وہ کانفرنس کا دائرہ محدود نہ کریں بلکہ اس میں ان لوگوں کو بھی شرکت کی اجازت دیں جو آزادی کامل پر یقین رکھتے ہوں۔ مولانا نے آزادیٔ کامل کے متوالوں، کانگریس کے حامیوں اور دوسرے حریت پسندوں سے یہ اپیل بھی کی کہ اگر وہ نمائندہ کی حیثیت سے اس کانفرنس میں شرکت سے محروم کر دیے جائیں تو کم ازکم ایک مبصر کی حیثیت سے وہ اس میں شرکت کریں۔ مولانا کی کوشش یہی تھی کہ جو لوگ گول میز کانفرنس میں شرکت کر رہے ہیں وہ کم ازکم لندن جانے سے پہلے ایک پروگرام پر متفق ہو جائیں۔

مسٹر گاندھی کی قلابازی

مولانا کی یہ کوششیں جاری تھیں کہ مولانا کے خدشات کے عین مطابق مسٹر گاندھی نے یہ اعلان کر کے کہ اگر لارڈ ارون اُن کے ۱۱ نکات منظور کر لیں تو کانگریس ان سے تعاون کرے گی اور ملک کو عدم تعاون کے لیے تیار نہیں کرے گی، ساری سیاست کا نقشہ ہی بدل دیا۔ مولانا نے مسٹر گاندھی کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس بیان نے بہت سے لوگوں کو جن میں وہ خود بھی شامل ہیں حیرت میں ڈال دیا ہے، اس لیے کہ صرف چند روز قبل یعنی ۱۱ر فروری ۱۹۳۰ء کو انھوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ آزادیٔ کامل کے حامی ہو گئے ہیں اور اس سے کم کسی طرح تیار نہ ہوں گے" مولانا نے آگے چل کر فرمایا کہ مسٹر گاندھی کے اس بیان میں نہ سوراجیہ کا ذکر ہے اور نہ ہی آزادی کا نام لیا گیا ہے۔ مولانا نے مسٹر گاندھی کی اس دو غلی پالیسی پر جو اداریہ اپنے اخبار مستقل میں سپرد قلم کیا وہ سیاسی طنز کا ایک اچھا

نمونہ ہے اس لیے اس کو پیش کیا جاتا ہے۔

"ان کے (مسٹر گاندھی) کے عجیب و غریب فعل کی سب سے آخری مثال وہ ہے جو ہندوستان کی آزادی کے معاملہ میں ان کے اقوال و افعال کی نیرنگی کا نمونہ دکھا کر لوگوں کو محو حیرت بنائے ہوئے ہے۔ لاہور کانگریس کے موقع پر مہاتما نے یہ اقرار تو کر لیا کہ اب میں آزادیٔ کامل کے مطالبہ سے نہیں ہٹوں گا مگر ابھی اس وعدہ کو پورا مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ دفعتاً اخبار ینگ انڈیا میں لارڈ ارون (جن کا نام بعد میں لارڈ ہیلی فیکس ہو گیا تھا) کے سامنے پھر ۱۱ شرطیں رکھ کر کہا گیا کہ ان کو مان لو تو ہم گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے تیار ہیں جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہم آزادیٔ کامل سے کم پر بھی بات چیت کے لیے تیار ہیں۔ اس سول نافرمانی کے بارے میں بھی یہی حال ہوا کہ پہلے تو مہاتما نے اقرار کیا کہ اسے شروع کرنے کے بعد کسی حال میں اسے بند نہ کروں گا مگر بعد میں پھر یہ بھی لکھ دیا کہ اگر چورا چوری والا واقعہ ہو گا تو اسے بند کرنے میں ذرا سا بھی تامل نہ ہو گا۔" مولانا نے پھر یہ تحریر فرمایا کہ "ہاں اور نہیں یا اقرار و انکار کے درمیان یہ راستہ جبر و اختیار یا بیم و رجا کے مسلک کی طرح باریک اور عوام الناس کی فہم سے بالاتر واقع ہوا ہے۔" مولانا نے صرف اسی اظہارِ خیال پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی لکھا کہ مسٹر گاندھی نے ۱۹۲۱ء کے درمیان لارڈ ریڈنگ سے اس وقت مجوزہ صلح کانفرنس میں شرکت سے قبل جن شرائط کی منظوری پر اصرار کیا تھا قریب قریب وہی شرطیں ایک بار پھر لندنی کانفرنس کی شرکت کے سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں حالانکہ لاہور کانگریس کے فیصلہ کے بعد ان کو ہرگز ہرگز اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ حکومتِ ہند کے ساتھ کسی مفاہمت کرنے کے متعلق کانگریس کی طرف سے کسی اقدام کا وعدہ کریں۔ ان کی حیثیت کانگریس کے ایک رکن سے زیادہ نہیں ہے اور اس جماعت نے انھیں اپنا وکیل اور متولی نہیں بنایا ہے۔ انھیں اس بات کا حق نہیں کہ وہ کانگریس کی طرف سے درجۂ نوآبادیات قبول کرنے کا وعدہ کریں۔"

سر تیج بہادر سپرو کی کانفرنس

اسی دوران سر تیج سپرو کی مجوزہ ہندوستانی گول میز

کانفرنس منعقد ہوئی جس میں فرقہ وارانہ سوال پر اور اس کے حل پر توجہ دی گئی۔ کانفرنس میں پنڈت مدن موہن مالویہ، ڈاکٹر مونجے، مسٹر جیکر، پنڈت کنزرو، قائداعظم، سر محمد شفیع، سر سلطان احمد۔ سر سیتلواد، مہاراجہ محمود آباد۔ مولانا محمد علی۔ سر سکندر حیات خاں۔ سر راما سوامی اینگر، سر ذوالفقار علی خاں، ڈاکٹر شفاعت احمد خاں، راجہ غضنفر علی خاں۔ قائد ملت لیاقت علی خاں، مسٹر عبدالمتین چودھری، مسز سروجنی نائیڈو اور ڈاکٹر اینی بسنٹ شریک تھیں لیکن اس کانفرنس میں بھی فرقہ وارانہ مسائل کا کوئی حل نہیں نکل سکا۔

گول میز کانفرنس کے دعوت نامے

اس عرصے میں وائسرائے کی جانب سے گول میز کانفرنس کے دعوت نامے جاری کر دیے گئے اور مسلمانوں میں حسب ذیل والیانِ ریاست اور زعما کو مدعو کیا گیا۔ نواب صاحب بھوپال۔ سردار صاحبزادہ سلطان احمد خاں، نواب محمد اکبر حیدری۔ دیوان سر مرزا اسمٰعیل، سر آغا خان، نواب سر عبدالقیوم۔ سر شاہ نواز غلام مرتضیٰ خان بھٹو مسٹر فضل الحق۔ مسٹر عبدالحلیم غزنوی۔ خان بہادر حافظ ہدایت حسین، قائداعظم محمد علی جناح۔ نواب صاحب چھتاری، مولانا محمد علی، سر محمد شفیع۔ بیگم شاہنواز، کپتان راجہ خیر محمد۔ سر سلطان احمد، مسٹر ظفر اللہ خاں۔ مولانا اس وقت زعمائے اسلام کی غلط فہمی اور غلط کاری سے بہت پریشان تھے۔ مولانا کا کہنا تھا کہ جب کہ ہندو، تمام پارٹیوں کی موجودہ کشمکش کے دوران اپنی پالیسی کے متعلق ایک متفقہ فیصلہ پر پہنچ چکے تھے اور سب کے سب اس کے پابند نظر آتے تھے لیکن مسلمانوں کی سیاسی پارٹیوں میں اتفاق تو درکنار ابھی تک ان کے رہنماؤں نے اچھی طرح یہ بھی نہیں سمجھا کہ ان کا نصب العین کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ عوام کو توجہ چھوڑیے کہ ان کا کام عام مسلمانوں میں پبلک اسپرٹ کے فقدان کی وجہ سے آج کل صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ اپنے مختلف رہنماؤں کی بہر حال تائید کریں خواہ اس تائید میں انھیں متضاد خیالات کا اظہار ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ جہاں تک خواصِ اسلام کا تعلق ہے مولانا کے خیال میں مولانا محمد علی، قائداعظم، مولوی کفایت اللہ،

مولانا آزاد سبحانی میں سے ہر ایک کسی نہ کسی غلط فہمی کا شکار نظر آتا ہے۔

مولانا خود کیوں سامنے نہ آئے

اسی زمانہ میں بمبئی کے روزنامہ انقلاب نے ایک اداریہ میں مولانا سے درخواست کی کہ وہ خود کیوں نہیں سامنے آتے۔ اخبار مذکور نے ہندوستان کے حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ لکھا کہ "مسلمانوں میں سچے کارفرماؤں کا قحط ہے۔ ایسے حالات میں ایڈیٹر مستقل ہی کیوں نہ اٹھے اور تمام راہنماؤں کو جمع کر کے ایک اسٹیج پر لے آئے۔ مولانا نے اس کے جواب میں لکھا کہ "آج ہم پھر انقلاب کی غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی غلط فہمی کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کانگریس کی تحریکِ سول نافرمانی کے متعلق مسلمانوں نے عدم شرکت اور اختلاف کا فرق نہیں سمجھا۔ ورنہ ان کو صاف معلوم ہو جاتا کہ ہم نے مسلمانوں کو سول نافرمانی خصوصاً بائیکاٹ کے صرف اختلاف سے دور رکھنا چاہا اور کانگریس میں مسلمانوں کی عدم شرکت کو ہندوؤں کی بے نیازی اور بے پروائی کی بنا پر ہمیشہ جائز جانا اور کبھی ان کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا۔ اختلاف کے ہم دو وجوہ سے مخالف ہیں۔ اوّل اس لیے کہ فرنگیوں کے خلاف سول نافرمانی فی نفسہٖ کوئی بُری شے نہیں ہے۔ مسلمانانِ ہند عارضی اسباب کی بنا پر اس سے علیحدہ تو بے شک رہ سکتے ہیں مگر مخالفت ان کے لیے مناسب نہیں۔ دوئم اس لیے کہ اگر انگریزوں نے ہمارے ساتھ دغا کی تو آئندہ ہم کو بھی اس حربے سے کام لینا ہوگا۔ رہی دوسری غلط فہمی کہ حسرت موہانی اٹھ کر کارفرمائی کیوں نہیں کرتے، اس کا سبب صاف ظاہر ہے کہ بہ حالاتِ موجودہ مسلمانوں کے لیے برطانوی حکومت گول میز کانفرنس سے تعاون ضروری ہے اور فقیر کسی طرح اس کا اہل نہیں ہو سکتا۔ یہ کام دوسرے ہی کرتے رہیں۔ 'ہر کسے را بہر کارے ساختند'۔"

گول میز کانفرنس کے شرکا کو مشورے

اس نظریہ کے تحت مولانا برابر گول میز کانفرنس کے شرکا کو اپنے مشوروں سے نوازتے رہے۔ چنانچہ اپنے اخبار مستقل میں ایک جگہ مسلم شرکائے کانفرنس کے

کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ "مسلم زعما کانفرنس کے سامنے تین اصول پیش کریں۔
اوّل یہ کہ گول میز کانفرنس میں ہندوستان کا دستور اساسی ترکیبی یا فیڈرل قسم کا تجویز کیا جائے۔
دوئم یہ کہ صوبوں کو بشمول سرحد کامل آزادی نصیب ہو۔
سوئم دستور میں مسلم اقلیت کا پورا پورا تحفظ بھی صوبائی خود مختاری کے اصول پر ہو۔
مولانا فرماتے ہیں کہ اگر کانفرنس یہ اصول نہ مانے تو مسلمان نمائندے اس کا بائیکاٹ کریں کیونکہ سب مسلمان کتابِ سیاست کا ایک نیا باب شروع کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ مولانا ہی کی کوششوں سے مسلم کانفرنس نے ایک قرارداد منظور کی جو بذریعہ تار گول میز کانفرنس کے مسلم شرکا کو روانہ کی گئی۔

کانگریس کی سیتہ گرہ

ایک طرف تو مولانا اس کوشش میں تھے کہ مسلمان زعما گول میز کانفرنس میں شرکت کے انگریزوں اور ہندوؤں کی سازشوں کا شکار نہ ہو جائیں۔ دوسری طرف وہ کانگریس کی سیتہ گرہ کی خبروں کو بھی نہایت نمایاں طریق سے اخبار مستقل میں شائع کرتے رہے اور جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے مسٹر گاندھی کی قیادت میں نمک سازی کا فیصلہ کیا تو مولانا نے اس قرارداد کو نہایت نمایاں طریقے سے شائع کیا اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مولانا انور شاہ کشمیری کا وہ مضمون بھی شائع کیا جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ آنحضرتؐ نمک پر محصول کے خلاف تھے۔ اگر کانگریس اور مسٹر گاندھی اس موقع پر مسلمانوں کو نظر انداز نہ کرتے تو شاید مولانا بھی اس تحریک سول نافرمانی میں دل کھول کر حصہ لیتے۔ مگر جیسا کہ اب تک ہوتا رہا۔ کانگریس نے ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ تنگ دلی کا مظاہرہ کیا اور مسٹر گاندھی کو آخر وقت تک یہی توقع رہی کہ وہ مسلمانوں سے بالا ہی بالا انگریزوں کو مجبور کر کے آزادی حاصل کر لیں گے اور انھیں ایسی آزادی میسر آئے گی جس میں مسلمان ان کے رحم و کرم پر ہوں گے۔

گول میز کانفرنس کا آغاز

کانگریس کی سیتہ گری جاری رہی اور لندن کی گول میز

کانفرنس ملتوی نہیں ہوئی بلکہ جب حسب پروگرام یہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو شروع ہوئی اور شہنشاہ جارج پنجم نے اس کا افتتاح کیا تو مولانا نے مستقل میں اس کی تفصیل شائع کی۔ اس کے بعد اس کا دوسرا اجلاس ۱۷ نومبر کو ہوا جس میں قریب قریب سارے ممبران نے ہندوستان کے لیے درجۂ نوآبادیات کے حصول اور مرکزی اسمبلی میں حکومت کو ارکان اسمبلی کے جواب دہ ہونے پر زور دیا۔ کانفرنس قریب قریب فیڈرل دستور کے حق میں تھی لہٰذا ۲۶ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو مجوزہ فیڈریشن کا آئین تیار کرے۔ اس کمیٹی میں مسلمانوں کی طرف سے نواب بھوپال، سر اکبر حیدری، سر مرزا اسمٰعیل، قائد اعظم محمد علی جناح، مولانا محمد علی، ڈاکٹر شفاعت احمد خاں، سر محمد شفیع اور سر سلطان احمد شریک تھے۔ اس کمیٹی کا جلسہ ۱۲ دسمبر کو منعقد ہوا جس میں مجوزہ دستور کے ۱۲ باب قائم کیے گئے اور ان کی تیاری کے لیے ۱۸ افراد پر مشتمل ایک اور سب کمیٹی قائم کی گئی۔ اس سب کمیٹی میں مسلمانوں کی جانب سے نواب بھوپال، سر اکبر حیدری، سر مرزا اسمٰعیل، قائد اعظم محمد علی جناح، سر محمد شفیع اور سر سلطان احمد شریک تھے لیکن جیسا کہ مولانا نے پیش گوئی کی تھی، اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور یہ کانفرنس وسط جنوری ۱۹۳۱ء میں کسی مقصد پر پہنچے بغیر ملتوی ہو گئی۔

شاردا ایکٹ کی خلاف ورزی

یہ سال اس لیے بھی مسلمانوں کی تاریخ میں بڑا اہم تھا کہ انھوں نے اس سال شاردا ایکٹ کے خلاف مہم چلائی اور حکومت نے اس ایکٹ کی خلاف ورزیوں کے باوجود کسی مسلمان کو گرفتار کرنے کی جسارت نہیں کی۔ شاردا ایکٹ کے خلاف تمام مسلمان حلقے متحد تھے اور علی برادران ان میں سب سے آگے تھے۔ اس سلسلہ میں ۲۳ مارچ ۱۹۳۰ء کو دلی میں ایک زبردست اجتماع مولانا محمد علی کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں مولانا شوکت علی، نواب اسمٰعیل خاں، مولانا شفیع داؤدی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا قطب الدین عبد الوالی شریک تھے۔ یہ اجتماع مؤتمر اسلامی کانپور کا تھا اور شریف منزل میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجتماع میں فیصلہ کیا گیا کہ مسلمان شاردا ایکٹ کی خلاف ورزی کریں گے۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو احترام شریعت کی خاطر سارے

ملک میں شاردا ایکٹ کی خلاف ورزیوں کا بندوبست کرے۔ اجتماع میں شریک تمام علما اور قائدین نے یہ بھی طے کیا کہ وہ سب اس قانون عملاً خلاف ورزی کریں گے نکاحوں میں گواہ بنیں گے اور اس قانون کو توڑیں گے۔ اجتماع کی رائے میں صغیر سنی کی شادی کے سلسلہ میں مسلمان اس قانون کی پابندی نہیں کریں گے۔ مولانا کی اس سلسلہ میں یہ رائے تھی کہ خلاف ورزیاں صرف شاردا ایکٹ تک ہی محدود نہ رکھی جائیں بلکہ وہ طرز عمل اختیار کیا جائے جس سے حکومت ہند کو ایسا سخت سبق پڑھایا جائے کہ وہ پھر کبھی اس کو فراموش نہ کرے، مگر دوسرے مسلمان قائدین اس کے حق میں نہ تھے۔ بہرحال مسلمانوں کی جانب سے اس ایکٹ کی خلاف ورزی کے سلسلہ میں ایک لاکھ رضاکاروں کی بھرتی کا اعلان کیا گیا اور مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ العلمائے ہند نے اعلان کیا کہ یہ تعداد ضرور پوری ہو جائے گی۔ اس اثنا میں کم سن بچوں کی شادی کا پروگرام بنایا گیا جس میں مولانا بھی شریک ہوئے۔ کانپور کے محلہ بانس منڈی میں ایک لڑکے محمد حسین عمر ۱۲ سال کی شادی ہوئی جس میں بہت سے لوگوں کے علاوہ مولانا نے بھی شرکت کی اور طے ہوا کہ اگر حکومت نے اس خلاف ورزی پر فریقین پر مقدمہ نہ چلایا تو یہ لوگ خود عدالت سے رجوع ہوں گے۔ دلی میں شاردا ایکٹ کی خلاف ورزی میں متعدد نکاح ہوئے جن میں مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا احمد سعید شریک ہوئے۔ ان تقریبات کی حالت یہ تھی کہ اس میں ہزاروں مسلمان شریک ہوتے تھے لیکن حکومت نے ان خلاف ورزیوں کو ہنسی خوشی برداشت کیا اور کسی ایک مسلمان کو بھی گرفتار نہیں کیا۔

علما کی تنظیم

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے مولانا اس زمانہ میں مسلمانوں کے عام سیاسی رجحانات اور مسلم قائدین کے نظریات سے بہت مایوس تھے اور اس مایوسی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اس بات کو کسی بھی صورت سے پسند کرنے کو تیار نہیں تھے کہ مسلمان آزادیٔ کامل کو چھوڑ کر نوآبادیاتی نظام کو قبول کرنے پر تیار ہو جائیں چنانچہ انھوں نے علما کی ایک تحریک کو منظم کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں آل انڈیا علما کانفرنس

کانپور میں منعقد کرنے میں کامیاب ہوئے جس میں قائم کردہ مجلس عاملہ کا اجلاس ۱۹ جنوری کو لکھنؤ میں مولانا قطب الدین عبدالوالی کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں مولانا مظہر الدین، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی نے شرکت کی۔ اس کے بعد اس ادارہ کا سالانہ اجلاس امروہہ ضلع مرادآباد میں ۳، ۴ اور ۵ کو مولانا قطب الدین عبدالوالی کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں مولانا محمد علی مولانا شوکت علی، نواب اسمٰعیل خاں، نواب جمشید علی خاں، مولانا عبدالماجد بدایونی مولانا مظہر الدین، مولانا شفیع داؤدی، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا صبغت اللہ فرنگی محلی، مولانا الطاف الرحمٰن قدوائی، مولانا کرم علی، سید ذاکر علی، حافظ ہدایت حسین اور ڈاکٹر شفاعت احمد خاں نے شرکت کی۔ مولانا شوکت علی نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسلمانوں کو بہادری سے حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے اور جو لوگ ان کو ان کے حقوق سے محروم کرنا چاہتے ہیں، ان سے جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس کے بعد مولانا قطب الدین عبدالوالی نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ جمیعتہ العلمائے ہند کی خرابیوں اور بدعنوانیوں کے باعث بہت سے مقتدر علما اس ادارے سے استعفیٰ دے چکے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ ایک طرف تو انگریز مسلمانوں کے مخالف ہیں جیسا کہ فلسطین میں ان کی یہود نواز پالیسی سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسری طرف ہمارے ہندو بھائیوں کی اکثریت۔ اور وہ اس پر تلے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے سیاسی حقوق سے محروم کر دیں۔ انھوں نے متنبہ کیا کہ مسلمانوں کو اس کش مکش میں بالکل غیر جانب دار رہنا چاہیے اور اگر انھوں نے کسی کو اپنی شمولیت سے قوت دی تو یہ عمل خود ان کے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔ اس کے بعد اجلاس میں ایک اہم قرارداد منظور ہوئی، جس میں کہا گیا کہ چونکہ موجودہ تحریک (کانگریس) مسلمانوں کے ساتھ ان کے سیاسی حقوق سے متعلق سمجھوتہ کیے بغیر شروع ہوئی ہے اور چونکہ کئی باقاعدہ سیاسی جماعتیں تحریک سول نافرمانی کے خلاف ہیں اس لیے یہ کانفرنس اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کو اس تحریک میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہیے۔ کانفرنس نے ان لوگوں کی مذمت کی جو مسلمانوں کو شریعت کے نام پر ایک خطرناک راستے پر لے جا رہی ہے (مراد جمیعتہ العلمائے ہند سے ہے) جمیعتہ العلمائے ہند نے بھی اس زمانہ میں امروہہ میں اپنا

اجلاس کیا جس میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ کانگریس کا ساتھ دیں۔

اسی کل ہند مرکزی ادارے کی شاخ یو۔پی کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں ۸ اور ۹ راگست ۱۹۳۱ء کو منعقد ہوا جس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ "۔۔۔ غرضیکہ جمعیۃ العلمائے دہلی آزادیٔ کامل کے نصب العین سے دست بردار ہو کر فنا ہو چکی مگر الحمد اللہ کہ علمائے کانپور، لکھنو، بدایوں کی جماعت اب بھی اپنے عہد پر قائم ہے۔ اور ان شاء اللہ قائم رہے گی۔ بعض معترضین پست حوصلہ کی جانب سے اس اعلیٰ نصب العین کی جانب کہا جاتا ہے کہ جب فی الحال وہاں تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو پھر اس کا ذکر بے کار ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ذکر تو بے کار نہیں بلکہ بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ نصب العین ہر وقت پیش نظر نہ رہے تو اس کے فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ڈومینین اسٹیٹس کی بہرحال مخالفت ہونی چاہیے، اس لیے کہ یہ شے ہمارے مقصود یعنی آزادیٔ کامل کی درمیانی منزل یا اس کا جزو نہیں بلکہ اس کے منافی اور مقابل واقع ہوئی ہے۔ اگر گاندھی جی ولایت پہنچ گئے، گول میز کانفرنس کامیاب ہو گئی اور ہندوستان کو درجہ نوآبادیات بلا تحفظات مل گیا تو آزادیٔ کامل کا تصور ختم یا ایک عرصہ دراز تک کے لیے خواب وخیال بن جائے گا (والتد اللہ کیا بالغ نظری ہے اب کس کو یہ بات یاد ہے کہ مکمل آزادی کی داعی دعویدار جمعیۃ العلمائے کانپور تھی یا جمعیۃ العلمائے ہند۔)

سائمن کمیشن کی رپورٹ

اس سال سائمن کمیشن کی رپورٹ بھی سامنے آئی۔ اس ضمن میں سائمن کمیشن گو بیک اور گاندھی کمیشن گو بیک کا تذکرہ ہو چکا تھا۔ مولانا سائمن کمیشن کے حامی نہیں تھے۔ مگر وہ اصولی طور پر اس کے بائیکاٹ کے خلاف تھے۔ اس لیے کہ انھیں صاف نظر آرہا تھا کہ ہندو انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو اپنی عددی اکثریت کا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اس کی مخالفت کی جائے۔ بہرحال جب کمیشن کی رپورٹ سامنے آئی تو کسی نہ کسی طرح فیڈرل نظام حکومت اور جداگانہ طرزِ انتخاب کا اس میں تذکرہ موجود تھا۔ یہ مولانا کی بڑی کامیابی تھی۔ مولانا اس بات

کو محسوس کرتے تھے کہ متذکرہ بالا دو نکات کے علاوہ قائدِ اعظم کے مشہور چودہ نکات میں سے ۱۲ نکات ہنوز بلا توجہ اور داد طلب پڑے تھے۔" مگر انھیں اس بات کی ضرور خوشی تھی کہ "ہمارے نزدیک سائمن کمیشن کی ایک اور صرف ایک بڑی خوبی یہ ہے جس کے مقابلہ میں اس کے تمام عیوب نظر انداز کیے جا سکتے ہیں وہ یہ کہ اس نے ڈومینین اسٹیٹس کے لغو مطالبہ اور فضول تخیل کا ایک طرح پر خاتمہ کر دیا۔ امید ہے کہ آئندہ حکومت اور زعمائے ہند میں کوئی بھی اس کا نام نہ لے گا۔" بہرحال مولانا شوکت کی دعوت پر ۸ر جولائی ۱۹۳۰ء کو شملہ میں مسلمان زعما نے سائمن رپورٹ پر غور کیا اور فیصلہ کیا کہ ان کے لیے سائمن کمیشن کی رپورٹ ناقابلِ قبول ہے کیونکہ اس میں وہ مطالبات پورے نہیں کیے گئے۔ جو آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے دلی میں منظور کیے تھے۔ اور اس لیے بھی کہ سائمن کمیشن کا رجحان رجعت قہقری کی طرف ہے۔ قرارداد میں اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ ہندوستان کی آئندہ حکومت کو فیڈرل اصول پر قائم کرنے، صوبجاتی کونسلوں کے انتخابات کو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعے سے کرانے اور صوبجات کو صوبجاتی آزادی عطا کرنے کے متعلق سائمن کمیشن کی سفارشات ٹھیک ہیں لیکن ہماری پر زور رائے ہے کہ مسلم قوم کے اہم ترین مطالبات جو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی اس قرارداد میں درج ہیں جو یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو بمقام دلی منظور ہوئی، کمیشن نے پورے نہیں کیے۔ مولانا نے اس قرارداد کی پرزور حمایت کی اور لکھا کہ جب تک مسلمانوں کو حکومت کی جانب سے اس بات کا یقین نہ دلایا جائے کہ (۱) گول میز کانفرنس میں حسب تحریک سائمن رپورٹ ہندوستان کا دستور اساسی ترکیبی یا فیڈرل قسم کا بنے گا (۲) صوبوں کو کامل آزادی حاصل ہو گی (۳) دستور میں اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے حقوق کا پورا پورا تحفظ بھی ہو گا، اس وقت تک کوئی مسلمان لندن کی جانب رخ بھی نہیں کرے گا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اور آزاد پارٹی

اس کے بعد لندن میں ایک اور گول میز کانفرنس ہوئی اور اس کے نتیجہ میں ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ بنا مگر مولانا نے اس میں کسی خاص

سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا البتہ کمیونل ایوارڈ کے اعلان کے بعد اور ۱۹۳۵ء کے آئین کی منظوری اور نفاذ سے قبل مولانا نے شیخ مشیر حسین قدوائی مرحوم، مولانا آزاد سبحانی سید ذاکر علی اور سید حسن ریاض پر مشتمل ایک آزاد پارٹی بنائی تھی۔ کامل آزادی کے حصول کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعاون کی یہ مخلصانہ سعی اور کوشش تھی لیکن حسب دستور سابق اس سلسلہ میں بھی ملک و ملت نے مولانا حسرت کی تمام انقلابی تجاویز کی طرح اس کی بھی قدر نہیں کی اور یہ پارٹی عام انتخابات میں حصہ نہ لے سکی۔

ہندو مسلم تعاون کی آخری کوشش

کانگریس سے علیحدگی اور مسلم لیگ میں شمولیت کے درمیانی وقفہ میں مولانا نے مسلسل اور متواتر کوشش اس امر کی کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اسی تعاون اور خلوص کی فضا کو پیدا کیا جائے جو مسٹر گاندھی کی سیاستِ ہند میں شمولیت سے قبل موجود تھی لیکن انھیں قدم قدم پر ناکامی ہوئی اور آخر کار انھیں مسلم لیگ کا سہارا لینا پڑا جس سے انھیں اپنی سیاسی زندگی کے بیشتر حصّہ میں اختلاف رہا لیکن جسے انھوں نے آخر کار مسلمانوں کے جذبات و احساسات کا واحد مظہر پایا۔ ان کی ساری زندگی اوّل دن سے لے کر مسلم لیگ میں شمولیت تک حصولِ آزادیٔ کامل کے لیے وقف تھی۔ اس جذبہ کے تحت وہ ۱۹۲۹ء تک کسی نہ کسی شکل میں کانگریس سے وابستہ رہے اور ۱۹۲۹ء کے اجلاس کانگریس منعقدہ لاہور میں وہ ایک ممبر کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

اسلامی اتحاد کے نقیب

لیکن جب انھیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ یہ جماعت مسٹر گاندھی کی زیرِ قیادت ایک ہندو جماعت بن گئی اور یہ کہ مسٹر گاندھی کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں تو انھوں نے مسلمانوں کے اتحاد کی طرف توجہ دی اور حصولِ آزادیٔ کامل کے فیصلہ کو بدلے بغیر انھوں نے مسلمانوں کو بالعموم اور مسلم زعما کو بالخصوص گاندھی

کی سحر طرازیوں اور مکاری سے واقف کرنا شروع کر دیا اور اس طرح احیائے مسلم لیگ کی خاطر اتحاد اسلامی کے نقیب اول ثابت ہوئے۔ مذکورہ بالا صفحات میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی کہ مولانا نے مسٹر گاندھی کے بارے میں جن صحیح اطلاعات کی عکاسی کی اس سے موجودہ نسل کو واقفیت ہو جائے۔

آزادئ کامل سے عشق

لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ وہ آزادئ کامل کے مسئلہ پر کسی فرد یا جماعت سے مصالحت کرنے پر تیار نہیں تھے۔ اس دور میں انھوں نے ہر اس جماعت سے تعاون کیا جو اس مقصدِ حیات سے ہم آہنگی رکھتی تھی، مسلم کانفرنس ہو یا خلافت کمیٹی، مسلم لیگ ہو یا جمعیۃ العلمائے کانپور۔ آزاد پارٹی ہو یا مسلم ایگزیکٹیو بورڈ۔ وہ ہر ادارے اور جماعت کو آزادئ کامل کا خواہاں بنانا چاہتے تھے۔ ان کے سوشلسٹ عقائد کمیونزم کی ہمنوائی اور اسلامی نظریات کی تبلیغ میں ہم آہنگی کا واحد رشتہ ان کا عشق آزادی تھا۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی تحریر فرماتے ہیں کہ "حسرت انگریزی تسلط کے جانی دشمن تھے۔ ان کی سیاست کا لب لباب بس یہ تھا کہ جس پارٹی میں ان کو انگریز دشمنی کا موقع ملتا وہ اس میں شریک ہو جاتے۔ اپنی اس رائے میں ان کی مستقل مزاجی ضد کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس دور میں بظاہر ان کے ذہن وفکر اور افعال وعمل میں جو تضاد نظر آتا ہے وہ ان کے اپنے خیال میں کسی تضاد کا باعث نہیں تھا۔ آزادی کے بارے میں ان کی رائے میں کبھی تضاد پیدا نہیں ہوا۔ یہ تضاد اس دور کی سیاسی شخصیتوں اور جماعتوں کے اپنے کردار اور رویہ میں تھا۔ وہ صرف اس وقت تک کسی جماعت یا شخصیت سے وابستہ رہے جب تک ان کے اپنے نظریہ آزادی کی توہین نہیں ہوئی۔ ان کا مقصد واضح تھا۔ جماعتیں اور افراد تو محض حصولِ مقصد کا ذریعہ تھیں، اصل مقصد نہیں تھیں۔ انھیں کسی سے ذاتی اختلاف یا مخاصمت نہیں تھی۔ پہلے وہ کانگریس کے اعتدال پسند گروہ کے ہمراہ تھے پھر ان کا گرم دل سے واسطہ ہو گیا۔ پھر مسلم لیگ سے وابستگی اختیار کی، گروہِ احرار میں شامل ہوئے۔ خلافت اور مسلم کانفرنس میں رہے۔ کانگریس اور دورِ مسلم لیگ سے کئی بار رشتے ناتے ہوئے

ہوئے۔ کمونسٹ جماعت قائم کی لیکن ہر جگہ مکمل آزادی کے حصول کے جذبہ کے ساتھ اور جب ہر سیاسی فرد اور جماعت کو اچھی طرح آزما کر یہ کہہ کر مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کی تو سب سے پہلے اس کے نصب العین کو تبدیل کرایا لیکن اس کے لیے ہمیں ۱۹۰۶ء بلکہ اس سے بھی آگے چلنا ہوگا۔

مسلم لیگ کے قیام کا پس منظر

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک مسلمانوں کی طاقت کو نہ گھٹایا جائے گا اس وقت تک ان کے ہندوستان میں قدم جمنے مشکل ہیں۔ انھیں اس جنگ میں ہندوؤں کی شمولیت سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ مسلمانوں نے اپنے ایک ہزار سالہ دورِ حکومت میں امن اور انصاف کا پرچم جس شان سے بلند رکھا اس کی بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہایت گہرے اور مخلصانہ مراسم موجود ہیں اور مسلمانوں کے بارے میں ہندوؤں کا رویہ ہمدردانہ ہے۔ آقا اور غلام کے درمیان کوئی منافرت نہیں ہے اور مسلمانوں نے برِ صغیر کو اپنا وطن قرار دے کر اس سرزمین کی ترقی خوشحالی اور استحکام کے لیے اس قدر اہتمام اور انتظام کیا ہے کہ جس کی بنا پر مقامی اور غیر مقامی کی تفریق ختم ہو گئی ہے۔ یہ بات ان نئے حکمرانوں کے لیے بڑی تکلیف دہ تھی۔ وہ تو لڑاؤ اور تقسیم کرو کی پالیسی کے تحت کاروبارِ حکومت چلانے کے عادی تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ہندو اور مسلم مل کر اور بہادر شاہ جیسے بے اقتدار حکمراں کے تحت متحد ہو کر آزادی کا پرچم بلند کر سکتے تھے۔ انگریزوں کو تو اس کا وہم و گمان تک نہ تھا کہ برِ صغیر کے عوام انھیں غیر ملکی سمجھتے ہوئے انھیں برِ صغیر سے ہٹانے کی متحدہ کوشش کریں گے لیکن جب ۱۸۵۷ء میں انھیں اس کا تجربہ ہوا تو ان کو اس متحدہ کوشش کے پسِ پشت احیائے اسلام کا خطرہ نظر آیا۔ یہ خطرہ کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ عیسائیوں کے لیے باعثِ پریشانی رہا کرتا تھا، اور ان کا نقطۂ آغاز وہ صلیبی جنگیں تھیں جن میں آخر کار غازی صلاح الدین ایوبی نے عیسائیوں کو شکست دے کر بیت المقدس پر عیسائی قبضہ کے خواب کو ہمیشہ کے لیے پریشان کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں نے ریشہ دوانیوں کے ذریعے سراج الدولہ اور

ٹیپو سلطان کی جدوجہد آزادی کو ناکام بنا دیا تھا لیکن انھیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ان کی سازشوں کے باوجود ہندو اور مسلمان متحد ہو کر مضبوط ہو کر صرف سو سال کے اندر انھیں اس طرح طشت از بام کر دیں گے کہ ساری دنیا ان کے جبر سے آگاہ ہو جائے گی۔ بہرحال جب یہ صورت حال ان کے علم میں آئی تو انھوں نے اس کا تدارک شروع کیا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کی کوشش

انھوں نے پہلی کوشش تو یہ کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تفریق پیدا کی جائے مگر ابتدا میں انھیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی لہٰذا انھوں نے مسلمانوں کو اقتصادی طور پر تباہ کرنا شروع کر دیا اور ہندوؤں کو ان کے مقابلہ میں ترجیحی سلوک سے نوازا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان جو ایک ہزار برس سے ہندوستان کے حکمران تھے۔ اقتصادی طور پر دن بدن کمزور ہونا شروع ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنی شروع کی اور ان علما کے خلاف جو شاہ ولی اللہ اور شاہ اسمٰعیل دہلوی کی تحریک سے وابستہ تھے اور جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ مطعون کرنے کے لیے ان کے وہابی ہونے کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا تاکہ یہ علما جو انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے، کمزور ہو جائیں اور عوام پر ان کا اثر نہ پڑے، جب انھیں اس سازش میں بھی کامیابی نہیں ہوئی تو انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ایک نیم سیاسی جماعت بنوانے کی درپردہ حمایت کی، ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو مسلمانوں کے مقابلے میں ایک بڑی طاقت بن گئے۔

سرسید کی بصیرت اور علی گڑھ کالج کا قیام

جب مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ نے جس کی قیادت سرسید کر رہے تھے۔ اس صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیا تو انھوں نے انگریزوں کی نفرت کو کم کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے، جن میں علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں انگریز پرنسپلوں کا تقرر

اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے رواج کا منصوبہ سرفہرست تھا۔ انگریزوں نے بھی یہ دیکھتے ہوئے کہ ہندوؤں کا بہت زیادہ طاقتور ہونا بھی ان کے حق میں مفید نہیں سر سید سے تعاون کیا لیکن ان کی کوشش یہی رہی کہ مسلمانوں میں آزادی اور حریت کے جذبات کو فروغ نہ ہونے پائے اور یہ کام انگریز پرنسپل صاحبان کے ذمہ تھا (ان تمام باتوں کی تفصیل تحریک پاکستان کے سلسلہ میں آگے آئے گی)

مسلمانوں میں بیداری کی مخالفت

یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ سے جب بھی مسلمانوں کی کسی سیاسی جماعت نے جنم لینا چاہا تو اس کی انگریز مدرسین کی جانب سے زبردست مخالفت ہوئی یہاں تک کہ جب ۱۹۰۰ء میں نواب محسن الملک نے اردو کے خلاف حکومت یوپی کی مہم پر احتجاج کیا تو ان پر عتاب شاہی نازل ہوا اور جب نواب وقار الملک نے ۱۹۰۱ء میں مسلمانوں کی سیاسی جماعت بنانے کا ارادہ کیا تو مسلسل ۶ سال تک ان پر مختلف آفتیں نازل ہوتی رہیں اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی تو حالت یہاں تک بدل گئی کہ آزادی اور حریت کی بات کرنا تو درکنار اگر کسی مسلم طالب علم سے کسی انگریز کی ٹکر ہو جاتی یا کسی مسلمان طالب علم کی جانب سے نادانستہ کسی سفید چمڑی والے کی توہین تو اسے بیک بینی دوگوش کالج سے نکال دیا جاتا اور ٹرسٹی صاحبان اس طرز عمل پر دل ہی دل میں ناراض تو ہو سکتے تھے لیکن علی الاعلان مخالفت کرنے کی ان میں ذرا بھی ہمت نہیں پیدا ہوتی تھی۔ مولانا حسرت موہانی کے ساتھ ان کے زمانۂ طالب علمی میں جو سختیاں ہوئیں اور تعلیم سے فارغ ہو کر ان سے ملنے پر جو پابندیاں لگائی گئیں ان کا تذکرہ اپنے مقام پر ہو چکا ہے۔

انگریزوں کی پالیسی میں تبدیلی

لیکن ہندو نوازی اور مسلم دشمنی کا دور زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہ سکا اور انگریز حاکموں کو بہت جلد اپنی اس پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس ضرورت کا نقطۂ آغاز تقسیم بنگال سے ہے جس کا اعلان ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں ہوا جب

ہندوؤں کی جانب سے اپنے اغراض کے تحت تقسیمِ بنگال کی مخالفت ہوئی تو انگریز نے محسوس کیا کہ ہندوؤں کی سیاسی طاقت کو متوازن بنانے کے لیے مسلمانوں کی بھی ایک سیاسی جماعت ہونی چاہیے۔ بنگال اس زمانہ میں برصغیر کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ صوبہ تھا۔ آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے اسے ایک انتظامی وحدت سمجھ کر نظم ونسق کو بہتر طور پر چلانا کار دارد والی بات تھی۔ اس لیے اسے انتظامی سہولت اور مصلحت کے تحت تقسیم کیا گیا تھا لیکن کلکتہ کے مارواڑی جنھوں نے سارے صوبہ کی معیشت کو اپنے آہنی پنجہ کے ذریعے جکڑ رکھا تھا، اپنی قوت کو دو حصوں میں تقسیم ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جب لارڈ کرزن کو جو بعد میں برطانیہ کے وزیرِ خارجہ بنے اور لارڈ ہونے کی بنا پر اپنی قابلیت اور ذاتی صلاحیتوں کے باوجود مسٹر بالڈون کے مقابلہ میں وزارتِ عظمیٰ کی دوڑ ہار گئے، یہ احساس ہوا کہ اگر مسلمانوں میں سیاسی استحکام اور مرکزیت کی بدستور مخالفت جاری رکھی گئی اور وہ سیاسی طور پر متحد نہ ہوئے تو تقسیمِ بنگال کی تجویز منسوخ ہو جائے گی تو سابقہ پالیسی پر نظرِ ثانی کی گئی اور وہ بذاتِ خود ڈھاکہ گئے اور انھوں نے اس تاریخی شہر میں ایک جلسۂ عام کو مخاطب کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ تقسیمِ بنگال کی حمایت کرنی چاہیے لیکن انگریزوں کی اس پالیسی میں تبدیلی کے وہ نتائج نہ نکل سکے جس کے وہ متمنی تھے۔ البتہ اس کا یہ اثر ضرور ہوا کہ مسلمانوں کے ایک ذہین طبقہ میں ایک سیاسی جماعت بنانے کا جذبہ اور مستحکم ہو گیا اور مسلمانوں میں عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ تقسیمِ بنگال کی تجویز مسلمانوں کے حق میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۱ء کے دربار میں تقسیمِ بنگال کی تجویز کو جب انگریزوں نے اپنی عام پالیسی کے تحت اور ذاتی مصلحتوں کی بنا پر واپس لیا تو مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوئی۔ انگریزوں کو شاید اس بات کا اندازہ تھا کہ دو چار ماہ کی سیاسی جد وجہد ایک ایسی مستحکم سیاسی جماعت کا روپ نہیں دھار سکتی جو برس ہا برس کی سیاسی جد وجہد کے بعد معرضِ وجود میں آتی ہے اور ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک کی غلط کاریوں کا چند دن میں مداوا نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی وہ مسلمانوں کی ایک علیحدہ تنظیم کی مخالفت کا سلسلہ دراز نہیں کرنا چاہتے تھے۔

نواب محسن الملک کی جدوجہد

بہرحال اس تبدیلیٔ ماحول کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں اپنی علیحدہ سیاسی جماعت بنانے کا جو جذبہ پرورش پا رہا تھا اس میں استحکام پیدا ہونا شروع اور نواب محسن الملک نے اس ضمن میں اپنی کوششوں کو تیز تر کر دیا۔ اسی دوران میں برصغیر میں سیاسی اصلاحات کے نفاذ کا وقت قریب آنے لگا جنھیں بعد میں منٹو مارلے ریفارمس کا نام دیا گیا۔ ان اصلاحات میں مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ منوانے کے لیے عملی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ اگرچہ کہ اب تک مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی جماعت نے جنم نہیں لیا تھا لیکن اس کے مسلمہ مسلم قائد اور سرسید کے جانشین نواب محسن الملک زندہ تھے لہٰذا مسلمانوں کے ذہین طبقہ نے ان سے رجوع کیا اور علی گڑھ ہی کے ایک رئیس نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں نے کالج کے سیکرٹری نواب محسن الملک کو یادداشت کا ایک مسودہ لکھ کر بھیجا اور ان سے کہا کہ مسلمانوں کو بھی اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا چاہیے، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، خود انگریز بھی یہی چاہتے تھے چنانچہ اس خیال کو تقویت پہنچانے کے لیے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے پرنسپل مسٹر آرچبالڈ نے جو گرما کی تعطیل کے سلسلہ میں شملہ میں موجود تھے۔ ۱۰ اگست ۱۹۰۶ء کو ایک خط نواب محسن الملک کو لکھا جس کے مندرجات بڑے دلچسپ ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "کرنل ڈنلپ اسمتھ (پرائیویٹ سیکرٹری لارڈ منٹو وائسرائے ہند) اب مجھے لکھتے ہیں کہ حضور وائسرائے مسلمانوں کا وفد منظور کرنے کو تیار ہیں (انھیں شاید اس بارے میں علی گڑھ سے مطلع کیا گیا ہو) اور مجھے ہدایت کرتے ہیں کہ اس کے لیے باقاعدہ ایک درخواست بھیجی جائے۔"

اس کے بعد مسٹر آرچبالڈ نے یا تو از خود یا کسی کے اشارے پر آگے چل کر اسی خط میں کئی اور مشورے بھی پیش کیے جو درج ذیل ہیں: "اس کے لیے حسبِ ذیل امور توجہ طلب ہیں۔ اوّل درخواست بھیجنے کا مسئلہ ہے۔ میرے نزدیک یہ کافی ہوگا کہ مسلمانوں کے کچھ نمایندے اگرچہ ان کا انتخاب نہ ہوا ہو، اس درخواست پر دستخط کر دیں اور دوسرا مسئلہ ممبران وفد کا ہے۔ یہ لوگ جملہ صوبجات کے نمایندے ہوں۔ تیسرا مسئلہ ایڈریس کے مضمون کا ہے۔ اس کی نسبت یہ ہے کہ ایڈریس میں وفاداری کا

کا اظہار کیا جائے۔ اس امر کا شکریہ ادا کیا جائے کہ طے شدہ پالیسی کے مطابق حکومت خود اختیاری کی جانب قدم بڑھایا جانے والا ہے جس کی رو سے ہندوستانیوں کے لیے عہدے ملنے کے دروازے کھول دیے جائیں گے مگر اس اندیشہ کا اظہار کیا جائے کہ طریقۂ انتخاب جاری کرنے سے مسلم اقلیت کو نقصان پہنچے گا اور یہ امید ظاہر کی جائے کہ نامزدگی کا طریقہ اختیار کرنے میں یا مذہبی عقائد کی بنا پر نیابت دینے میں مسلمانوں کی رائے کو مناسب اہمیت دی جائے۔ ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی عقل مندی اس میں ہوگی کہ وہ نامزدگی کے طریقہ کی تائید کریں کیوں کہ ابھی انتخاب کا وقت نہیں آیا۔ علاوہ بریں ان کے لیے نہایت مشکل ہوگا کہ طریقۂ انتخاب جاری ہونے کے نتیجے میں انھیں مناسب حصہ مل سکے، لیکن اس تمام کارروائی میں پردہ کے پیچھے رہنا چاہتا ہوں اور یہ تحریک آپ کی طرف سے ہونی چاہیے مگر آپ واقف ہیں کہ مسلمانوں کے فوائد کا میں کس قدر دل سے خواہاں ہوں اور اس لیے میں نہایت خوشی سے ہر قسم کی امداد دوں گا۔ میں آپ کے لیے ایڈریس تیار کرنے یا اس پر تنقید کرنے کا کام کر سکتا ہوں اور اگر اس کا مسودہ تیار کر دیا جائے تو میں اس مسودہ کو دیکھ سکتا ہوں کیوں کہ میں عمدہ الفاظ میں استدعا کرنے کے فن سے واقف ہوں مگر نواب صاحب یاد رکھیے کہ اگر تھوڑے وقت میں کوئی بااثر اور زبردست تحریک پیدا کرنی ہے تو ہمیں فی الواقع بہت جلدی کرنی چاہیے۔

وائسرائے سے مسلمانوں کے وفد کی ملاقات

مذکورہ بالا وضاحتی خط کی وصولی کے بعد نواب محسن الملک کی ہمت بندھی اور تھوڑے سے وقت میں تین چار ہزار دستخطوں سے ایک درخواست وائسرائے کو بھجوائی گئی کہ وہ مسلمانوں کے ایک نمائندہ وفد کو شرف باریابی بخشیں۔ سوا ماہ کی جدوجہد کے بعد وفد ترتیب دے دیا گیا اور سر آغا خان کو اس کی سربراہی کی دعوت دی گئی۔

یہ وفد یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو وائسرائے سے ملا۔ انڈین ڈیلی ٹیلی گراف لکھنو کے ۲ر اکتوبر ۱۹۰۶ء کے شمارہ کے مطابق ٹھیک ۱۱ بجے وائسرائے برآمد ہوئے۔ نمائندوں

نے جو نیم دائرے میں وسیرائے کی کرسی کی جانب بال روم میں منہ کیے بیٹھے تھے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ پھر آغا خاں نے اراکین وفد سے ملاقات کرائی۔ اس کے بعد مشیر الدولہ ممتاز الملک خان بہادر خلیفہ سید محمد حسین مجسٹریٹ کونسل پٹیالہ نے سپاس نامہ پیش کرنے کی اجازت مانگی۔ اجازت ملنے پر سر آغا خاں اور ان کے تمام ساتھی کھڑے ہو گئے۔ آغا خاں آگے بڑھے اور سپاسنامہ پڑھنا شروع کیا۔ سپاس نامہ پیش کرنے والے تمام اراکین یورپین ڈریس میں تھے اور ترکی ٹوپی پہنے تھے مگر پنجاب سے شریک ہونے والے اراکین نے اپنا دیسی لباس برقرار رکھا تھا۔

ملاقات کا آنکھوں دیکھا حال

لیڈی منٹو نے اس ملاقات کا آنکھوں دیکھا حال اپنے روزنامہ میں لکھا ہے جو خاصا دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ " آج کا دن بہت ہی معرکہ خیز ہے۔ بقول کسی شخص کے ہندوستان کی تاریخ میں نیا باب ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہندوستان میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور ہر طبقہ اور ہر ملت کے لوگ غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ مسلمان آبادی جس کا شمار ۶ کروڑ بیس لاکھ ہے اور بہت ہی وفادار رہی ہے اس بات پر ناراض ہے کہ مسلمانوں کو ان کے حق سے کم نمائندگی ملی ہے اور اس کا خیال ہے کہ ہندوؤں کو ترجیح دے کر مسلمانوں کی بہت سی باتوں میں توہین کی گئی ہے۔ تحریک چلانے والوں نے اس احساس کو کوشش کر کے ترقی دی ہے اور اس زبردست فرقہ کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے پورا زور لگا رہے ہیں۔ نئی نسل ڈانواں ڈول ہو رہی تھی اور کانگریس کے انقلاب پسندوں کے ساتھ مل جانے پر آمادہ (مولانا حسرت کی طرف اشارہ ہے) ہر طرف سے یہ آوازیں آ رہی تھیں کہ حکومت کے وفادار مسلمانوں کی حمایت نہ کی جائے اور یہ کہ ہم اپنے مطالبات بے چینی پھیلا کر خود منوالیں گے۔ مسلمانوں نے کچھ اور کرنے سے قبل یہ فیصلہ کیا کہ وسیرائے کے سامنے ایک عرضداشت پیش کریں گے جس میں اپنی شکایات پیش کی جائیں۔ یہ ملاقات آج کے دن طے پائی تھی اور ہندوستان کے مختلف حصوں سے تقریباً ۷۰ نمائندے وسیرائے سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ رسم

تاج گھر میں عمل میں آئی۔ لڑکیاں اور میں بغل کے دروازے سے ساری کارروائی سننے کے لیے گئیں اور منٹو اپنے عملے کی ہمراہی میں کمرے کے دروازے سے اندر آئے اور ڈائس پر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ آغا خاں مسلمان خوجہ فرقہ کے سرکردہ ہیں۔ وہ علی کی اولاد ہیں اور اپنے فرقہ کے حکمراں ہیں لیکن بادشاہِ بے اقلیم۔ ہز ہائینس ایڈریس پڑھنے کے لیے منتخب ہوئے جو کہ بہت طویل لیکن نہایت اچھا تھا اور اس میں مسلمانوں کی شکایات اور ان کی خواہشات کا ذکر تھا۔ اس کے بعد منٹو نے اپنا ایڈریس پڑھا جو انھوں نے بہت غور و فکر کے بعد تیار کیا تھا۔" لیڈی منٹو آگے چل کر لکھتی ہیں کہ "آج شام مجھے ایک دوسرے سرکاری افسر کا حسبِ ذیل خط ملا۔ وہ یہ ہے کہ یور ایکسی لینسی کو ایک سطر میں یہ بتانا ضروری خیال کرتا ہوں کہ آج کے دن ایک بہت بڑا کارنامہ انجام کو پہنچا۔ آج سیاسی تدبیر کا ایک ایسا کارنامہ وقوع میں آیا جو ہندوستان اور ہندوستان کی تاریخ پر برسوں تک اثر انداز ہوگا۔ وہ کارنامہ یہ ہے کہ آج ۶ کروڑ دس لاکھ آدمیوں کو باغیوں کی صف میں جا ملنے سے روک دیا گیا۔ وفد کی اہمیت کا یوں بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی پبلسٹی کے لیے سرکاری ذرائع کو کام میں لایا گیا۔ وفد یکم اکتوبر کو وائسرائے سے ملا لیکن اسی روز لندن ٹائمز میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں مسلمانوں کی عقل مندی کی تعریف کی گئی اور کہا گیا کہ وہ یورپ کے نمونہ کی نیابتی مجالس کے کبھی فریفتہ نہیں تھے۔ پھر ۱۲ اکتوبر کو لندن ٹائمز میں بنگال کے شورش پسندوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے اعتدال کی تعریف کی گئی اسی تاریخ کو ویسٹرن پریس برسٹل میں کئی کالمی مضمون میں وفد کے اراکین اور مسلمانوں کی بے حد تعریف کی گئی حالاں کہ ہندوستان میں وفد کی ملاقات کا حال ۳ اکتوبر کو شائع ہوا۔

سپاس نامہ

سر آغا خان نے جو سپاس نامہ پیش کیا اس کا متن درج ذیل ہے۔

"حضور والا! اس اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو ہمیں عطا کی گئی ہے، ہم لوگ جن میں شرفا، جاگیردار، تعلقہ دار، وکلا، زمیندار اور تاجر شامل ہیں اور جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں آباد ہیں، ہز مجسٹی ملک المعظم کی مسلم رعایا کے نمائندے ہیں بہت

ادب کے ساتھ یہ سپاس نامہ لے کر حاضر ہوئے ہیں تاکہ آپ اس پر ہمدردانہ غور فرمائیں۔ ہمیں پوری طرح احساس ہے اور ہم اس کی قدر کرتے ہیں کہ برطانوی راج کی بدولت براعظم ہندوستان کے بسنے والے کروڑوں لوگوں کو جن کا مختلف نسلوں سے تعلق ہے اور جن کے مختلف مذاہب ہیں بے شمار فوائد حاصل ہیں اور ہم بروجوہ امن و سلامتی، انفرادی اور مذہبی آزادی کی نعمتوں کے لیے بے حد ممنون ہیں مزید یہ کہ مدبرانہ اور روشن خیالی کی بدولت ہمارے پاس آئندہ ان توقعات کی وجوہ موجود ہیں کہ ان فوائد میں ترقی ہوگی اور ہندوستان کو قوموں کی برادری میں بڑھتی ہوئی اہمیت کا مقام حاصل ہوگا۔ ہندوستان میں برطانوی پالیسی کا ابتدا سے اہم نکتہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ملک کے لوگوں کے افکار اور خواہشات کی جانب ان امور کے معاملہ میں توجہ دی جاتی رہے جس کا ان کے مفادات سے تعلق ہے اور پھر ہمیشہ نسل اور مذہب کے اختلافات کا بالخصوص خیال رکھا گیا ہے۔ یہ ہندوستان کی ترقی کی اہم خصوصیت ہے۔ ابتدا میں ملک کے اہم فرقوں کے ان بااثر افراد سے خفیہ مشاورت کی جاتی تھی، اس طریقہ کو ترقی دے کر تسلیم شدہ سیاسی اور تجارتی انجمنوں کو حق دیا گیا کہ وہ پبلک اہمیت کے امور کے بارے میں اپنے خیالات اور نکتہ چینی سے حکام کو آگاہ کریں۔ پھر آخر کار لوگوں کو نامزدگی اور انتخاب کے ذریعہ میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں اور ان سب کے علاوہ ملک کی مجالس قانون ساز میں نیابت کا حق دیا گیا۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ موخرالذکر معاملہ ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا ہے جسے حضور والا نے اس باب میں کام کو آگے بڑھانے کے لیے مقرر کیا ہے۔ اس ترقی یافتہ نیابت اور دیگر چند ایسے امور کی وجہ سے جن کا ہمارے فرقہ کے مفاد سے بڑا تعلق ہے، ہم اس وقت حضور والا کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں ۱۹۰۱ کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں کی ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ سے زیادہ آبادی ہے۔ گویا وہ ہندوستان میں ملک المعظم کی کل رعایا کا ۱/۵ سے ۱/۴ تک حصہ ہیں اور اگر غیر مہذب فرقوں اور چھوٹے مذہبی فرقوں کی تعداد منہا کر دی جائے اور ان کلاسوں کی تعداد آبادی کی کل میزان سے خارج کر دی تو ملک کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب اور بڑھ جائے گا۔ چنانچہ ہماری یہ خواہش ہے کہ کسی بھی نیابتی سسٹم و طریق کار میں خواہ وہ توسیعی ہو یا محدود، ایک

فرقہ جو بذاتِ خود تعداد میں روس کے علاوہ کسی بھی اوّل درجہ کی یورپین طاقت کی پوری آبادی سے زیادہ ہو اسے ریاست میں مناسب طور پر بحیثیت ایک اہم جز کے تسلیم کیا جانا چاہیے۔ جنابِ والا! ہم آپ کی اجازت سے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ نیابت کا معاملہ ہو یا ایسے امور ہوں جن کا اس فرقہ کی حیثیت اور اثر سے تعلق ہو، مسلمانوں کے ساتھ ان کی تعداد کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ ان کی سیاسی اہمیت اور مملکت کے دفاع میں ان کی عظیم خدمات کے اعتبار سے سلوک ہونا چاہیے اور ہم امید کرتے ہیں کہ جناب والا مسلمانوں کی اس پوزیشن کو نظر میں رکھیں گے۔ جو آپ سے سو سال پہلے انھیں حاصل تھی اور جس کی روایات ان کے ذہنوں سے ابھی تک محو نہیں ہوئی ہیں ہندوستان کے مسلمان اپنے حکمرانوں کی انصاف پسندی اور عدل گستری پر مکمل بھروسہ کرتے آئے ہیں۔ یہ دونوں خصوصیتیں ہمارے حکمرانوں کے کردار کا اہم جز ہیں اور اس بھروسہ کی وجہ سے انھوں نے اپنے مطالبات کے سلسلہ میں وہ طریق کار اختیار نہیں کیا، جو پریشانی کا باعث ہو۔ یہی نہیں ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی شاندار روایات کو برقرار رکھیں۔ حالیہ واقعات سے ہمارے جذبات مشتعل ہوتے ہیں بالخصوص مسلمانوں کی نئی نسل اس سے متاثر ہوتی ہے جو بعض حالات میں معتدل مشورے اور سنجیدہ رہنمائی کے قابو سے باہر ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہمیں توقع ہے کہ ہماری وہ گزارشات جو ہم آں حضور کی خدمت میں بڑی احتیاط کے ساتھ عذر پیش کے بغیر پیش کر رہے ہیں اور جنھیں ہندوستان کے تمام حصّوں کے ہمارے ہم مذہبوں کی بڑی تعداد میں حمایت حاصل ہے انھیں شرفِ توجہ سے نوازا جائے گا۔ حضور والا ہمیں اس بات کے اظہار کے لیے معاف فرمایا جائے کہ یورپی ٹائپ کے نیابتی ادارے ہندوستانیوں کے لیے بالکل نئے ہیں اور ہمارے فرقہ کے بہترین مدبروں کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ ان نیابتی اداروں کو ہندوستان میں مکمل طور پر سماجی، مذہبی اور سیاسی حالات کے مطابق اختیار کرنے کے لیے از حد توجہ و احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر احتیاط نہ برتی گئی تو دیگر برائیوں کے علاوہ ہمارے قومی مفادات ایک غیر ہمدرد اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ چونکہ اب ہمارے حکمران اپنی جبلت اور روایات کے مطابق ان اداروں کو ملک کی حکومت میں اہم درجہ

دینا چاہتے ہیں اس لیے ہم مسلمان اس سے اپنے تئیں الگ تھلگ نہیں رکھ سکتے جوان کی محولہ بالا پالیسی کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے اگرچہ اس امر کے احسان مندی کے ساتھ ہم اعتراف پر مجبور ہیں کہ اب تک مسلمانوں کو جو نمائندگی نصیب ہوئی اور لوکل گورنمنٹ کے سربراہوں کی بدولت نصیب ہوئی جہاں سے مجالس قانون ساز کے لیے مسلمان نامزد ہوتے رہے مگر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جو نمائندگی ہمیں دی جاتی رہی وہ ہماری ضرورت سے بہت کم رہی اور ہمیشہ ہی اس نمائندگی کو ان لوگوں کی رضامندی حاصل نہیں ہوتی رہی جن کی نیابت کے لیے لوگوں کو نامزد کیا گیا تھا۔ شاید یہ صورتِ حال اس وقت اس وجہ سے ناگریز تھی کہ اوّل تو نامزدگیوں کی تعداد وزیراعظم کی کونسل اور لوکل گورنمنٹ کے لیے جو مقرر ہے وہ بہت کم ہے، دوسرے ایسا کوئی آسان طریقہ موجود نہیں جس کے ذریعہ لوگوں کی پسند معلوم کی جائے۔ انتخابات کے نتائج کا جہاں تک تعلق ہے اس امر کا بہت کم امکان ہے کہ کسی مسلمان امیدوار کا نام حکومت کی منظوری کے لیے موجودہ مقرر کردہ انتخابی اداروں کی طرف سے پیش کیا جائے تاوقتیکہ شخص مذکورہ اکثریت کے اہم امور کے متعلق خیالات سے اسے ہمدردی نہ ہو۔ ساتھ ہی اکثریت میں ہم اپنے غیر مسلم بھائیوں سے انصاف کے پیش نظر یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ اپنے فرقہ کے لیے اپنی عددی اکثریت سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے، پھر ایسے لوگوں کو منتخب نہ کریں گے جو مستقبل میں دوبارہ منتخب ہونے کے لیے غیر ہندو ہونے کے سبب ہندوؤں پر بھروسہ کرتے ہوں۔ یہ درست ہے کہ ملک کے ہندو بھائیوں کے ساتھ ہمارے بہت سے مفادات مشترک ہیں اور ہمارے لیے یہ بات بڑی اطمینان بخش ہوگی کہ ان مفادات کی حفاظت ہماری مجلسِ قانون ساز قومیت کا لحاظ کیے بغیر ان مفادات کی طرف دار رہیں۔ بہر حال یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مسلمان ایک نمایاں فرقہ ہیں جس کے اپنے مفادات ہیں جن میں دیگر فرقے شامل نہیں ہیں اور ان مفادات کو اس لیے اب تک نقصان پہنچتا رہا کہ ان مفادات کے لیے مناسب طور پر اب تک کوشش نہیں کی گئی۔ حد یہ ہے کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں بھی ان کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا گیا کہ جیسے وہ ناقابلِ اعتنا سیاسی جزو ہیں جنھیں ناانصافی کے اندیشہ کے بغیر بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یہ صورتِ حال کسی حد تک پنجاب میں

اور بڑی حد تک سندھ میں اور مشرقی بنگال میں موجود رہی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم نمائندں کے انتخابات کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں۔ ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کسی فرقہ کی سیاسی اہمیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس فرقہ کے لوگوں کو سرکاری ملازمت میں کیا مقام حاصل ہے۔ مسلمانوں کو اگر مناسب نمائندگی نہیں ملتی جیسا کہ بدقسمتی سے موجودہ صورت حال سے ظاہر ہوتا ہے۔ تب ان کا وہ اثر اور آبرو خطرہ میں رہے گی جو ان کا جائز حق ہے۔ اس لیے ہم حکومت سے جارحانہ طور پر درخواست کرتے ہیں کہ وہ براہ مہربانی تمام ہندوستانی صوبوں میں مسلمانوں کے لیے ملازمتوں کا مناسب حصہ محفوظ رکھے۔ اگرچہ اس قسم کے چند احکام لوکل حکومتوں نے وقتاً فوقتاً جاری کیے ہیں مگر ہر جگہ ان احکامات پر بدقسمتی سے اس لیے سختی کے ساتھ پابندی نہیں کی گئی کہ مقررہ معیار کے مطابق تعلیم یافتہ مسلمان آگے نہیں آئے۔ یہ الزام اگرچہ واقعی ایک وقت درست تھا مگر ہمیں عرض کرنے دیجیے کہ یہ بات اب صحیح نہیں اور ہم حضور والا کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی ضرورت ہو اور حکومت ملازم رکھنا چاہے تو تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تعداد ضرورت کے مطابق موجود ہے۔ اب چوں کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے تو بدقسمتی سے یہ رجحان اب پایا جاتا ہے کہ انھیں اس لیے ملازمتوں میں نہیں لیا جاتا کہ دوسرے لوگ جو ان سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں ان کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس طرح مسابقت کا عنصر اپنی بدترین شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور اس ضمن میں حضور والا ہمیں ایک طبقہ کی سرکاری اسامیوں پر اجارہ داری کی سیاسی اہمیت کی طرف توجہ دلانے کی اجازت دیں۔ اس سلسلہ میں ہم یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مسلم تعلیمی راہنماؤں کے سامنے ابتدا ہی سے یہ مقصد رہا ہے کہ وہ کردار کی پختگی پر توجہ دیں اور ہمیں یہ عرض کرنے کی اجازت دیں کہ سرکاری ملازم کے لیے تنہا ذہنی ہوشیاری ضروری نہیں بلکہ کردار کی پختگی بھی بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

ہم یہ عرض کرنے کی جرات کرتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام حصوں کے مسلمان عموماً اس امر کے شاکی ہیں کہ چیف کورٹوں اور ہائی کورٹوں میں مسلمان ججوں کی عموماً تقرری نہیں کی جاتی جس سے اس کی عمومی افادیت پر اثر ہوا ہے صرف

تین مسلمان وکیلوں کو یہ اعلیٰ ملازمت نصیب ہوئی ہے۔ اور ان تینوں نے مکمل طور پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ اس ترقی کے مستحق تھے۔ فی الحال ان ہائی کورٹوں میں ایک بھی مسلمان جج نہیں ہے جب کہ کلکتہ ہائی کورٹ میں تین ہندو جج اور پنجاب چیف کورٹ میں دو ہندو جج موجود ہیں حالاں کہ ان علاقوں میں مسلمانوں کی زیادہ آبادی ہی نہیں بلکہ اکثریت ہیں اور ہمارے خیال میں یہ مطالبہ بے جا نہیں کہ ہر چیف کورٹ اور ہائی کورٹ میں ایک مسلمان جج مقرر کیا جائے۔ ان ملازمتوں کے لیے تعلیم یافتہ مسلمان اگر ایک صوبہ میں نہیں تو دوسرے میں ہمیشہ ضرور مل سکتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم یہ اور عرض کر دیں کہ ان عدالتوں میں مسلم قانون سے واقف جج کی موجودگی سے انصاف کے حصول کو خاصی تقویت پہنچے گی۔ چونکہ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کا کام یہ ہے کہ وہ مقامی نوعیت کے اہم امور جیسے تعلیمی ضرورتوں، طبی سہولتوں اور آسائشوں اور حد یہ کہ مذہبی معاملات تک کے لیے دیکھ بھال کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ حضور والا کی توجہ مزید بڑے اور اہم امور سے قبل ان کی طرف منعطف کرائیں تو ہمیں اس کے لیے معاف فرمایا جائے۔ یہ ادارے حکومت خود اختیاری کے زینے کی سیڑھیاں ہیں اور انہی کے ذریعہ لوگوں کو اچھی طرح نیابت کا اصول سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ پھر ان بورڈوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے کوئی رہنما اصول مقرر نہیں ہیں اور طریقہ کار ایک جگہ سے دوسری جگہ مختلف ہے۔ مثال کے طور پر علی گڑھ میونسپلٹی میں ۶ وارڈ ہیں اور ہر وارڈ سے ایک ہندو اور ایک مسلمان کمشنر مقرر ہوتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ پنجاب اور دیگر مقامات پر جہاں بہت سی جگہوں پر اس اصول کو پیش نظر رکھا جاتا ہے وہاں بہت سی جگہوں پر مسلمان ٹیکس افسران کو مناسب نیابت حاصل نہیں ہے۔

اس لیے ہم بڑے ادب سے تجویز پیش کرتے ہیں کہ لوکل اتھارٹی کے لیے یہ لازمی ہو کہ وہ میونسپلٹیوں اور لوکل بورڈوں میں ہندو اور مسلمان نمائندوں کے تناسب کا تعین کریں اور اس تناسب کے تعین کیے جانے میں فرقوں کی عددی حیثیت، سماجی پوزیشن، مقامی اثر اور ہر فرقہ کی خصوصی ضروریات کا لحاظ رکھا جائے جب ان فرقوں کا تناسب ٹھیک ٹھیک مقرر ہو جائے تو پھر ہم تجویز کرتے ہیں کہ ہر فرقہ کو علیحدہ علیحدہ اپنے نمائندے ان اداروں میں بھیجنے کی اسی طرح اجازت دی جائے جس طرح آج کل پنجاب کے کئی

شہروں کو دی گئی ہے۔ ہم یہ بھی تجویز پیش کرتے ہیں کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے سینیٹوں اور سینڈیکیٹوں کے معاملہ میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے یعنی سرکاری اعلان کے ذریعے اس تناسب کا اعلان کیا جائے جس کے لیے مسلمان ان اداروں میں تناسب کے مستحق ہیں اب ہم ملک کی مجالس قانون ساز میں اپنی نمائندگی کے سوال کی طرف آتے ہیں۔ پورے ادب کے ساتھ ہم تجویز کرتے ہیں کہ جس طرح اس سپاس نامہ کے پیراگراف نمبر ۵ میں ہم نے میونسپلیٹوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں نمائندگی کے لیے تناسب کا ذمہ دارانہ اعلان تجویز کیا ہے اسی طرح مسلمان زمین دار، وکلا، تاجروں، میونسپلیٹوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے مسلمان ممبروں اور یونیورسٹیوں کے مسلمان گریجویٹوں پر مشتمل نیابتی ادارے اس طریقِ کار کے مطابق قائم کیے جائیں جو حضور والا کی حکومت کرے اور جو مقررہ تعداد میں نمائندوں کو منتخب کرے۔ امپیریل لیجسلیٹو اسمبلیوں کے بارے میں جس میں مسلمانوں کی منصفانہ نیابت مسلمانوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ہمیں یہ عرض کرنے دیجیے کہ ان تمام کے کیڈر میں مسلمانوں کا تناسب ان کے فرقے کی آبادی کے لحاظ سے مقرر نہیں ہونا چاہیے اور بہرصورت مسلمان نمائندوں کی تعداد بے اثر اقلیت کی سی نہیں ہونا چاہیے۔ (۲) جہاں تک ممکن ہو تقرری نامزدگی کی بجائے انتخاب کے ذریعے کی جائے۔ اور (۳) مسلم اراکین کے انتخاب کے لیے مسلمان زمینداروں وکیلوں، تاجروں اور دیگر اہم مفادات کے نمائندوں اور صوبائی کونسل کے مسلمان ممبروں اور یونیورسٹی کے مسلم فیلوز پر مشتمل ایک انتخابی ادارہ اس تعداد اور طریقۂ کار کے مطابق قائم کیا جائے جو حضور والا کی حکومت اس ضمن میں طے کرے۔ آج کل یہ خیال تقویت پا رہا ہے کہ وائسرائے کی انتظامیہ کونسل میں ایک یا دو ہندوستانی اراکین مقرر کیے جائیں گے۔ اگر ایسی تقرریاں عمل میں آئیں تو ہم یہ عاجزانہ گزارش کریں گے کہ مسلمانوں کے حق میں صرف نظر نہ کیا جائے۔ ہمیں یہ عرض کرنے میں تامل نہیں کہ ایک سے زیادہ مسلمان اس اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونے کی صلاحیت کے ساتھ ملک میں موجود ہیں۔ اب ہم ایک ایسی عرضداشت حضور والا کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں جس کا ہماری قومی بہبود سے گہرا تعلق ہے۔ ہمیں اس بات پر پختہ یقین ہے کہ ہمارے فرقہ کی تمنائیں اور مستقبل کی ترقی ایک مسلم یونیورسٹی کے قیام پر منحصر ہے جو ہماری مذہبی اور علمی زندگی کا محور

ہو گی اس لیے ہم حضور والا سے بڑے ادب سے مستدعی ہیں کہ حضور والا ایسے معاملہ میں ہماری امداد کے لیے ضروری اقدام کریں کہ جس میں ہمارے فرقہ کا مفاد ہے۔ آخر میں ہم حضور والا کو یقین دلاتے ہیں کہ اس موقعہ پر ہندوستانی معاملات کی اس طرح ترقی میں جو اس سپاس نامہ میں بیان کی گئی ہے اگر ملک المعظم کی مسلم رعایا کی اعانت کی گئی تو حضور والا اس طرح نہ صرف ان میں تخت کے ساتھ وفاداری کو تقویت پہنچائیں گے بلکہ ان کی سیاسی ترقی اور قومی خوشحالی کی بنا ڈالیں گے جس کے لیے حضور والا کا نام ان کی آنے والی نسلیں شکر گزاری کے جذبہ کے ساتھ یاد رکھیں گی اور ہمیں یقین ہے کہ حضور والا ہماری ان معروضات پر از راہِ خسروانہ غور فرمائیں گے۔ ہم ہیں آپ کے حضور اپنے آپ کو پیش کرنے والے اور حضور والا کے بے حد تابع دار اور عاجز ملازمان۔

(۱) آغا سر سلطان محمد شاہ آغا خان جی۔ سی آئی۔ ای (بمبئی) شہزادہ بختیار شاہ او آئی۔ ای سربراہ خانوادہ میسور (کلکتہ) (۳) آنریبل ملک عمر حیات خاں ٹوانہ، سی آئی ای شاہ پور (پنجاب) (۴) آنریبل مولوی شرف الدین بارایٹ لا (لاہور) (۵) آنریبل مولوی شرف الدین بارایٹ لا (پٹنہ) (۶) خان بہادر سید نواب علی چودھری (میمن سنگھ، مشرقی بنگال) (۷) نواب بہادر سید امیر حسن خان سی آئی ای (کلکتہ) (۸) نواب نصیر حسین خان خیال (کلکتہ) (۹) خان بہادر مرزا شجاعت علی بیگ برشین کونسل جنرل مرشد آباد بنگال (۱۰) سید علی امام بارایٹ لا (پٹنہ) (۱۱) خان بہادر راجہ محی الدین خاں وظیفہ خوار خوانوادہ کرناٹک (۱۲) مولوی رفیع الدین احمد بارایٹ لا (بمبئی) (۱۳) ابراہیم بھائی، آدم جی بھائی جنرل مرچنٹ بمبئی (۱۴) مسٹر عبد الرحیم بارایٹ لا (کلکتہ) (۱۵) سید اللہ داد شاہ اسپیشل مجسٹریٹ وائس پریذیڈنٹ زمین دار ایسوسی ایشن خیر پور میرس (۱۶) مولانا ایچ ایم مالک سربراہ صدری بازبوہریان (ناگپور) (۱۷) مشیر الدولہ ممتاز الملک خان بہادر سید محمد حسین ممبر آف اسٹیٹ کونسل (پٹیالہ) (۱۸) خان بہادر کرنل عبد المجید فارن منسٹر پٹیالہ (۱۹) خان بہادر خواجہ یوسف شاہ آنریری مجسٹریٹ امرتسر (۲۰) میاں محمد شفیع بارایٹ لا لاہور (۲۱) شیخ غلام صادق امرتسر (۲۲) حکیم محمد اجمل خاں دلی۔ (۲۳) منشی احتشام علی زمین دار رئیس کاکوری (یوپی) (۲۴) سید نبی اللہ بارایٹ لا

الہ آباد (۲۵) مولوی سید کرامت حسین بار ایٹ لا الہ آباد (۲۶) منشی عبدالسلام خاں ریٹائرڈ سب جج رام پور (۲۸) خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں سیکرٹری زمین دار ایسوسی ایشن یوپی (۲۹) حاجی محمد اسمٰعیل خاں زمین دار علی گڑھ (۳۰) صاحبزادہ آفتاب احمد بار ایٹ لا علی گڑھ (۳۱) مولوی مشتاق حسین رئیس امروہہ یوپی (۳۲) مولوی حبیب الرحمن خاں رئیس بھیکم پور علی گڑھ (۳۳) نواب سید سردار علی خاں خلف جناب دبیر الملک بہادر سی آئی ای حیدر آباد دکن (۳۴) مولوی سید مہدی علی خاں (محسن الملک) آنریری سیکرٹری ایم اے او کالج علی گڑھ (اٹاوہ)

لارڈ منٹو کا جواب

اس سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے لارڈ منٹو نے کہا کہ یور ہائی نس اور جنٹل مین آپ کے سپاس نامہ میں جو متعدد نکات اٹھائے گئے ہیں ان پر تبصرہ سے قبل مجھے اجازت دیجیے کہ میں شملہ آنے پر آپ کو خوش آمدید کہوں۔ آج کے دن یہاں پر آپ سب حضرات کی موجودگی بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے جو دستاویز پیش کی ہے اس پر متعدد امرا، ریاستوں کے وزرا، سرکردہ وکلا، ملک التجار اور ملک المعظم کی رعیت کے دوسرے اہم افراد کے دستخط ثبت ہیں۔ میں آپ کے وفد کی نمائندہ حیثیت کا خیر مقدم کرتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات ہندوستان کے روشن خیال مسلمان فرقہ کے نظریات اور ان کی تمناؤں کے واقعی ترجمان ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ حضرات نے جو کچھ کہا ہے وہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی صورت حال کا اچھی طرح تجزیہ کرنے کے بعد کہا ہے اور اس میں چھوٹی چھوٹی رنجشوں، کدورتوں یا علاقائی مناقشات کو کوئی دخل نہیں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ہندوستان میں اسلام کے نام لیواؤں کے حق بجانب مقاصد اور ہماری سلطنت کی سیاسی تاریخ میں ان کے حصہ لینے کے عزم صحیح کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا ہے۔ اس ملک میں مختلف قوموں اور مختلف عقیدوں کے لوگ آباد ہیں اور آپ نے سب طبقوں کے لیے برطانوی راج کی نعمتوں کا جن الفاظ میں اعتراف کیا ہے اس پر مجھے آپ کے وائسرائے کی حیثیت سے واقعی فخر ہے۔ آپ لوگ خود بھی ایک فاتح اور حکمران قوم

کے جانشینوں میں سے ہیں اور آج آپ نے خود اپنی زبان سے اعتراف کیا ہے کہ برطانوی راج میں آپ سب کو ذاتی آزادی، عبادت کی آزادی، امن عامہ اور بہتر مستقبل کے سامان حاصل ہیں۔ آپ کی زبان سے یہ سب سن کر مجھے واقعی دلی مسرت ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم ماضی پر نظر ڈالیں تو واضح ہو جائے گا کہ برطانیہ نے پبلک سروس کے معاملہ میں مسلمان آبادی کی اعانت کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ برطانیہ نے مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں آنے کا اہل بنانے کے لیے پوری کوشش کی ہے۔ ۱۷۸۲ء میں وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ مدرسہ کی بنیاد رکھی تاکہ حکومت کی ملازمتوں میں ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمان طلبہ کو بھی مناسب اہلیت اور استعداد حاصل کرنے کے قابل بنایا جائے۔ ۱۸۱۱ء میں میرے ایک پیش رو لارڈ منٹو نے اس مدرسہ میں مناسب توسیع و ترقی کی تجاویز پیش کیں اور کہا کہ ہندوستان بھر میں مسلمانوں کے لیے اور کالج قائم کیے جائیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد محمڈن ایسوسی ایشن کی مساعی کے نتیجہ میں حکومت نے ۱۸۸۵ء کی وہ قرار داد منظور کی جس میں مسلمان فرقہ کی تعلیمی حالت اور سرکاری ملازمتوں میں ان کے حصے کا تفصیلی تذکرہ موجود تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد کے باعث علی گڑھ میں کالج قائم ہوا۔ یہ کالج ایک عظیم اور بلند پایہ ادارہ ہے جو وسیع النظر اور مجمع صفات سر سید احمد خاں نے اپنے ہم وطنوں کے لیے وقف کیا۔ ۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن نے علی گڑھ کالج کا سنگ بنیاد رکھا اور اس موقع پر وائسرائے کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا ہوتے سر سید احمد خاں نے یہ یادگار الفاظ کہے تھے کہ "آپ نے ذاتی طور میری جو عزت افزائی کی ہے اس سے مجھے ایک عظیم حقیقت کا احساس ہو گیا ہے اور میرے اندر محض ایک ذاتی تشکر سے بھی کہیں اعلیٰ اور بلند جذبہ پیدا ہو گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آپ جو کہ اس وقت برطانوی راج کی نمائندگی کرتے ہیں ہماری ان کاوشوں کو ہمدردی کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اور یہ ایقان ہمارے لیے بہت ہی قیمتی اور باعث اطمینان و مسرت ہے۔ میں جس عمر کو پہنچ چکا ہوں، وہاں پر میرے لیے اسے بڑھ کر اور کیا بات باعث اطمینان ہو سکتی ہے کہ میں جس منصوبہ پر سالہا سال سے کام کر رہا تھا اور جو اب میری زندگی کا واحد نصب العین ہے اس نے ایک تو میرے ہم وطنوں کو میدانِ عمل میں لاکھڑا کیا اور دوسری طرف میں اس

کام میں اپنے ساتھی برطانوی افراد کی ہمدردیاں اور حکمرانوں کی اعانت بھی حاصل ہوگی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے لیے تو یہ سب سے بڑی خوشی کی بات ہے کہ میری زندگی کے چند سال باقی ہیں جب وہ بھی ختم ہو جائیں گے اور جب میں آپ کے درمیان موجود نہیں ہوں گا تو اس وقت بھی یہ کالج پروان چڑھتا رہے گا اور میرے ہم وطنوں کو برابر یہ تعلیم دینے میں کامیابی حاصل کرتا رہے گا کہ وہ بھی اپنے ملک سے وہی عقیدت رکھیں۔ برطانوی راج سے وفاداری کے اس احساس کو زندہ رکھیں اور اس کی نعمتوں کو برابر قدر کی نگاہوں سے دیکھیں۔ اپنے ساتھی برطانوی شہریوں کے ساتھ وہی پُرخلوص دوستی قائم رکھیں جو میری زندگی کے اہم ترین اور بنیادی اصول ہائے کار رہے ہیں۔ علی گڑھ کو طرۂ امتیاز حاصل ہو چکا ہے۔ اس کے طلبا اپنی مذہبی تعلیم کے جذبہ سے سرشار ہو کر اور جذبات حب الوطنی کا سبق سیکھ کر پوری طاقت کے ساتھ عملی زندگی کے میدان میں پھیل چکے ہیں اور جب کہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے معاملہ میں صورت حال خاصی نازک ہو چکی ہے۔ مسلمانوں کی قابلِ فخر تاریخ، ان کی وفاداری، ان کی سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی اور ان کے مضبوط دلائل و براہین جن کا آپ نے اتنے جوش و خروش سے حوالہ دیا ہے وہ سب روشنی کا مینارہ ہیں اور آپ کی رہنمائی کے لیے موجود ہیں۔ لیکن حضرات! آپ نے اس سے آگے مجھے یہ بھی بتایا کہ گو آپ کو اپنے حکمرانوں کی خلوص نیتی اور انصاف پسندی پر کوئی شبہ نہیں تاہم آپ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ حالیہ واقعات نے مسلمانوں کے نوجوان طبقہ میں ایسے پرجوش اور پر ہیجان جذبات پیدا کر دیے ہیں جو آگے چل کر ممکن ہے میانہ روی اور اعتدال پسندی کی تلقین کرنے والوں کے قابو میں نہ رہیں۔ میں اس مرحلہ پر مشرقی بنگال اور آسام کے امور پر کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تاہم مجھے امید ہے کہ میں کسی کی ناراضگی مول لیے بغیر اس نئے صوبے میں مسلمانوں کا شکریہ ادا کر سکتا ہوں کیوں کہ انھوں ان حالات میں جو ان کے لیے بالکل نئے تھے جس اعتدال پسندی اور ضبط و تحمل کا مظاہرہ کیا ہے اس کے پیش نظر وہ واقعی میری طرف سے شکریے کے مستحق ہیں حالاں کہ اس صورت حال کے بارے میں خاصی غلط فہمیاں پائی جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی بنگالیوں کے جذبات ہیں جو پر خلوص بائیں ہیں، مجھے ان سے بھی گہری ہمدردی ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ پر زور طور پر آپ کو یہ یقین دلانا چاہتا

ہوں کہ اس صوبے کے بارے میں جس کا مستقبل اب یقینی دکھائی دیتا ہے۔ وائسرائے اور گورنمنٹ آف انڈیا نے جو راہ متعین کی ہے اس کا فلسفہ یہ ہے کہ اس صوبہ کی موجودہ اور مستقبل کی آبادی کے لیے جو بہترین سمجھا گیا ہے وہی کیا گیا ہے۔ اس میں ذات پات عقیدے یا قوم کے امتیاز کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے لہٰذا مشرقی بنگال اور آسام کے مسلمان اب بھی پہلے کی طرح اس بات پر پورا بھروسہ کر سکتے ہیں کہ برطانیہ ان سے انصاف کرے گا۔ جو معقولیت سے پیش آئے گا اس کی وفاداری کی قدر کرے گا اور ان کے مفادات کا برابر محافظ بنا رہے گا۔ حضرات آپ نے یہ سپاس نامہ اس وقت پیش کیا ہے جب کہ فضا مجوزہ سیاسی تبدیلیوں سے لبریز ہے۔ ہم سب کا خیال ہے کہ اس صورت حال کے وجود سے انکار کرنا محض حماقت ہوگا ہندوستان میں نئی امیدیں پیدا ہو رہی ہیں۔ نئی تمنائیں کروٹیں لے رہی ہیں اور ان تبدیلیوں کو ہر شخص بہ آسانی محسوس کر سکتا ہے۔ ہم انھیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر ہم انھیں نظر انداز کرنے کی خواہش کریں بھی تو یہ غلط ہوگا، مگر سوال یہ ہے کہ اس بے چینی کے اسباب کیا ہیں۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں پر غلط حکمرانی کا الزام تو اس سلسلہ میں عاید نہیں کیا جا سکتا جو شخص یہ الزام لگاتا ہے کہ ہمارے نظام حکومت کے نقائص اس بے چینی کے ذمہ دار ہیں تو میں ان کی پرزور طور پر تردید کروں گا۔ اور اسے ایک بے چینی اور بے اطمینان قوم کی بغاوت کا نام تو دیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کا اصل سبب وہ تعلیمی ترقی ہے جس میں ابھی اس ملک کی بہت کم آبادی نے حصہ لیا ہے۔ اور اس کے بیج سب سے پہلے برطانوی راج ہی نے بوئے تھے اور اب اس کا پھل یہ ہے کہ حکومت برطانیہ اس کی نشو و نما اور اسے صحیح سمت میں موڑنے کا ہر جتن کر رہی ہے۔ اس وقت ہم فصل کاٹ رہے ہیں۔ اس میں بہت سے کڑوے دانے بھی نکل سکتے ہیں۔ ہم نے یہاں مغرب سے جو بیج لا کر بویا تھا۔ ممکن ہے اس سے پیدا ہونے والا اناج ہندوستان کے لوگوں کی ضروریات کے لیے پوری طرح مناسب نہ ہو لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تعلیمی فصلوں میں برابر اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور اس اناج کی قوت غذائی کس حد تک صحت بخشے گی۔ اس کا دارومدار اس بات پر ہوگا کہ اس کی پیداوار کا استعمال اور اس کی تقسیم کس حد تک صحیح

ہے۔ حضرات آپ نے جو کہا ہے کہ "یوروپین ٹائپ کے نمائندے ادارے ہندوستان کے لوگوں کے لیے بالکل ایک نئی بات ہیں تو اس پر آپ کو مجھ سے معذرت چاہنے کی ضرورت نہیں اور اس پر بھی معذرت خواہی کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہاں ان اداروں کے رواج و نفاذ کے لیے پُرخلوص غور و فکر اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ اقوام مشرق میں آبائی جبلتیں، رجحانات اور روایات چونکہ بہت طاقت ور ہوتی ہیں لہٰذا ان کے لیے میں مغرب کا سیاسی نظام بالکل جوں کا توں مسلط کرنے کی حمایت ہرگز نہیں کر سکتا۔ مغرب کی وسعت نظر، مغربی تہذیب کی تعلیمات اور برطانوی انفرادی آزادی ہندوستان کے لوگوں کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن آپ کے ساتھ میں بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام میں سیاسی طریق کار کو زبردستی کرانے کا ناقابل عمل عنصر شامل نہیں ہونا چاہیے اور حضرات اب میں مسلمانوں کے سیاسی مستقبل اور مسلمانوں کی پوزیشن کے اس پہلو کی طرف آتا ہوں کہ جس کا آپ نے سپاس نامہ میں ذکر کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ یہ بات تو ضرور تسلیم کریں گے سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے جائز حق اور حصہ کے سوال پر میں آپ کے پیش کردہ نکات پر اس وقت کوئی تفصیلی بحث نہیں کر سکتا۔ ہاں البتہ میں عمومی طور پر اس معاملہ میں اپنے خیالات کا اظہار ضرور کروں گا۔ آپ نے جو نکات اٹھائے ہیں ان پر غالباً آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ کمیٹی غور کر رہی ہے جو نمائندگی کا مقصد طے کرنے کے سلسلے میں قائم کی گئی ہے۔ وہاں البتہ میں اس بات کا خیال رکھوں گا کہ آپ کے سپاس نامہ کو کمیٹی میں پیش کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے امید ہے کہ میں کمیٹی کی متوقع رپورٹ کی راہ میں رکاوٹ ڈالے بغیر آپ کے نکات کے اصل منشا اور مقصد کے بارے میں عام نوعیت کے جوابات ضرور دے سکتا ہوں۔

حضرات میں جو کچھ سمجھ سکا ہوں اس کے مطابق آپ کے سپاس نامہ کا لب لباب یہ دعویٰ ہے کہ میونسپلٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں یا قانون ساز کونسلوں کے لیے جو بھی طریق نمائندگی طے کیا جائے اور انتخابی حلقے کو وسعت دینے کے لیے جو بھی تجاویز بروئے کار لائی جائیں، ان سب میں مسلمانوں کو ایک فرقے کی حیثیت سے نمائندگی ملنی چاہیے۔ آپ نے اس امر کی جانب نشاندہی کی ہے کہ بہت سے مقامات اور اداروں میں انتخابی اداروں کی ہیئت ترکیبی کے باعث یہ توقع نہیں

کی جا سکتی کہ کسی مسلمان امیدوار کو لازمی طور پر منتخب کیا جائے، اور اگر کہیں اتفاق سے ایسا ہو بھی گیا تو پھر اس امیدوار کو اکثریت کے سامنے اپنے نظریات کو قربان کرنا پڑے گا کیوں کہ یہ اکثریت اس فرقہ کے خلاف ہے جس کی وہ نمائندگی کرنا چاہتا ہے جس کی وہ نمائندگی کرنا چاہتا ہے۔ لٰہذا بالکل جائز طور پر آپ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنی عددی قوت، اپنی سیاسی اہمیت اور سلطنت کے لیے انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کے پیشِ نظر آپ بہتر سلوک کے مستحق ہیں اور یہ کہ اس بات کا خیال رکھا جائے۔ حضرات مجھے آپ کے اس نظریہ سے پورا اتفاق ہے۔ از راہِ کرم میری کسی بات کا غلط مطلب نہ سمجھیں۔ میں یہ ظاہر کرنے اور سمجھانے کی کوشش نہیں کر سکتا کہ فرقہ وارانہ نمائندگی کا حق کون سے طریقے اختیار کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کی طرح میری بھی یہی طے شدہ رائے ہے کہ ہندوستان میں ہر وہ انتخابی طریقہ شر انگیز حد تک ناکام رہے گا جس میں ہر شخص کو رائے دینے کا انفرادی حق اس طرح حاصل ہو کہ اس میں اس برصغیر کی آبادی کے مختلف فرقوں کے اعتقادات اور روایات کا خیال نہ رکھا ہو۔ ہندوستان کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصہ کو نمائندہ اداروں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ حضرات مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ سلف گورنمنٹ کی سیڑھی کے سرے نچلے قدمچے میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں رکھے جائیں گے اور ہم لوگوں کو بتدریج سیاسی تعلیم دینے کے لیے اسی سطح سے ابتدا کر سکتے ہیں۔ دریں اثنا اس وقت میں آپ سے صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان فرقہ کو اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ بحیثیتِ فرقہ ان کے سیاسی حقوق اور مفادات کا نظم و نسق اور ہر اس تنظیم میں پورا خیال رکھا جائے گا جس سے میں متعلق ہوں گا۔ برطانوی راج اب تک مذہبی اعتقادات اور قومی روایات کے معاملہ میں اس برصغیر کی آبادی کے ہر طبقہ کی جس طرح حفاظت کرتا رہا ہے، میں فخریہ کہتا ہوں کہ اس طرح آئندہ بھی ملک اعظم کی حکومت پورا پورا خیال رکھے گی اور تحفظ کرتی رہے گی۔ یور ہائی نس اینڈ جنٹل مین میں خلوص دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ کے اس فقید المثال وفد نے مجھے مسلمانوں کے اتنے سربرآوردہ نمائندوں سے ملاقات کا موقع

فراہم کیا۔ امور عامہ میں آپ حضرات نے جس دلچسپی اور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا ہے میں اس کی بھی قدر کرتا ہوں، اس لیے کہ اس جذبہ کے تحت آپ دور دراز سے یہاں پہنچے ہیں۔ ہاں مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ شملہ میں آپ کا قیام ضرورتاً اس قدر مختصر رہا۔

وفد کی کامیابی کا سہرا

وفد کی کامیابی جس کا خود وائسرائے نے اپنی تقریر میں ذکر کیا کا سہرا نواب محسن الملک کے سر ہے جنھوں نے اس حیرت انگیز تدبر اور انتظامی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ڈیڑھ ماہ کی قلیل مدت میں سفر کی تیاری اور ہندوستان کے کونہ کونہ سے مسلم عمائدین کا جمع کرنا اور سپاس نامہ کی تیاری نسبتاً ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر نواب محسن الملک کو جس قدر داد دی جائے کم ہے۔ خود قائد وفد سر آغا خاں نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں نواب محسن الملک کو جن شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ بھی نواب صاحب کے اخلاص اور تدبر کا بین ثبوت ہے۔ تحریک آزادی کی تاریخ کے مورخین نے بھی اپنی کتاب کی جلد سوئم کے پارٹ اوّل میں لکھا ہے کہ جس وقت لارڈ مارلے نے ۱۹۰۶ء کے موسم گرما میں بجٹ پر بحث کے دوران ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کا ذکر کیا تو نواب محسن الملک نے جو اس دوران بمبئی میں تعطیلات گزار رہے تھے اس اعلان کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہی مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے پرنسپل مسٹر آرچبالڈ کو جو گرمائی تعطیل گزارنے کے لیے شملہ گئے ہوئے تھے خط لکھا اور دریافت کیا کہ وائسرائے مسلمانوں کے ایک وفد سے ملاقات کر سکتے ہیں؟ مسٹر آرچبالڈ نے ایک جوابی خط میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے نہ صرف وائسرائے کی رضامندی سے نواب صاحب کو آگاہ کیا بلکہ سپاسنامہ کی تیاری سے متعلق انھیں بعض مشوروں سے بھی نوازا۔ نواب صاحب نے اس پر فوراً وفد کی ترتیب شروع کر دی بلکہ عماد الملک سید حسین بلگرامی کو حیدر آباد سے بلوا کر سپاس نامہ کا مسودہ ان سے تیار کرایا اور ایک نمائندہ جلسہ میں جس کی صدارت سر عبدالرحیم نے فرمائی، اس کو منظور کرایا۔ نواب محسن الملک ہی نے تجویز کیا کہ سر آغا خاں وفد کی قیادت کریں۔ سر آغا خاں چین کے سفر پر روانہ ہو چکے تھے مگر

نواب محسن الملک کے کہنے پر انھوں نے اپنا دورہ منسوخ کر دیا اور وفد کی قیادت کے لیے عین وقت پر شملہ پہنچ گئے۔ بہرحال ارکان وفد نے شملہ سے واپسی کے بعد فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی ایک نمائندہ ایسوسی ایشن قائم ہونی چاہیے لیکن مسلمانانِ ہند کو مجتمع کرنے کی یہ پہلی کوشش نہیں تھی۔

مسٹر سہروردی کا تجزیہ

مسٹر حسین شہید سہروردی نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ برطانیہ نے مسلم حکمرانوں سے اقتدار چھین کر جس طرح مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا شروع کیا اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں اتحاد فکر و عمل کی راہ ہموار ہونا شروع ہو جائے۔ مسٹر سہروردی فرماتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد برطانیہ نے جو پالیسی اختیار کی اس کی بنیاد یہ تھی کہ مسلمانوں کا زندگی کے مختلف شعبوں میں اثر و نفوذ ختم کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں ہندوؤں کی ہر شعبۂ زندگی میں ہمت افزائی کی جائے۔ ہندوستان میں اس وقت سرکاری زبان فارسی تھی چنانچہ سب سے پہلے اسے ختم کر کے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ مسلمانوں نے شدید نفرت کے احساس کے باعث اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں نے اعلیٰ انتظامی عہدوں پر قابض ہونا شروع کر دیا۔ سہروردی صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں کہ بنگال میں بالخصوص مسلمان صرف اعلیٰ عدالتی اور انتظامی عہدوں پر فائز نہیں تھے بلکہ بڑی بڑی زمینداریوں پر بھی قابض تھے"۔ چنانچہ ملازمتوں سے نکالنے کے بعد انھیں زمینوں سے بھی نکال دیا گیا۔ زرعی املاک کی چھان بین کا کام شروع کر دیا گیا اور اس طرح ان کی زمینوں کو ہندوؤں کے حوالے کر دیا گیا۔ بندوبست اراضی کے اس نظام کے تحت ہندو دولت مند ہو گئے۔ چنانچہ یہ بات فطری تھی کہ اس کا ردِ عمل ہو، چنانچہ مسلمانوں کی تنظیم کا کام بھی بنگال سے شروع ہوا۔

سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن

چنانچہ سب سے پہلے سر امیر علی نے سنٹرل

محمڈن ایسوسی ایشن ۱۸۷۷ء میں قائم کی جس کا ایک جلسہ ۱۹۰۳ء میں تقسیم بنگال کی تجویز پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا۔ جس میں باریسال کے زمین دار امیر مظاہر حسین ایڈووکیٹ کے سراج الاسلام چودھری جو بنگال لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بھی تھے اور مسلم کرانیکل کے ایڈیٹر جناب عبد الحکیم نے تقریریں کیں جو بنگالی قائد تقسیم بنگال کے حق میں تھے۔ ان میں نواب سر سلیم اللہ خاں آف ڈھاکہ کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ادھر بنگال کے حالات روز بروز خراب ہو رہے تھے، دوسری طرف یوپی میں مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے اردو پر ضربیں لگائی جا رہی تھیں۔

حکومتِ یوپی کی طرف سے اردو پر حملہ

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے جب حکومت یوپی نے ۱۸ر اپریل ۱۹۰۰ء میں یہ فیصلہ کیا کہ ہندی زبان کو بعض سرکاری مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو مسلمانوں میں ایک ہلچل مچ گئی اور نواب محسن الملک نے ۱۳ر مئی ۱۹۰۰ء کو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ایک جلسہ علی گڑھ میں طلب کیا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ حکومت یوپی سے اس معاملہ میں رجوع کیا جائے مگر یوپی کے گورنر اس بات پر بہت ناراض ہوئے اور اس فیصلہ کو اپنی ذاتی توہین سمجھا، لیکن اس کے باوجود مجلسِ اردو قائم ہوئی اور ۱۸ر اگست ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ میں ایک عظیم الشان اجتماع ہوا جس میں نواب محسن الملک نے ایک زور دار تقریر کی اور اعلان کیا کہ مسلمان اپنی زبان اور ثقافت کے بارے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ انھوں نے اس الزام کا ذکر کیا کہ حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن کیا جا رہا ہے اور کہا کہ جب ساری قوم کے جذبات ایک ہوں تو ایجی ٹیشن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سر انتھونی میکڈانل بہت خفا ہوئے اور خود بنفس نفیس علی گڑھ آئے۔ کالج کے ٹرسٹیوں کا جلسہ طلب کیا اور کہا کہ وہ اس ایجی ٹیشن کے سخت خلاف ہیں اور چونکہ اس تحریک میں علی گڑھ کے طلبا استعمال کیے جا رہے ہیں لہٰذا وہ کالج کی گرانٹ بند کر دیں گے۔ کالج کو گورنر صاحب کی خفگی سے بچانے کے لیے نواب محسن الملک نے ۲۶ر اگست ۱۹۰۰ء کو کالج کے سیکرٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا لیکن اس پر سارے ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ

نواب صاحب اپنا استعفیٰ واپس لیں چنانچہ نواب صاحب کو عوام کا مطالبہ ماننا پڑا۔ اور ۱۹۰۲ء میں دوبارہ عوامی مطالبہ پر انھیں کالج کا سکریٹری منتخب کیا گیا اور یہ اعلان کیا گیا کہ وہ انفرادی حیثیت میں ملک کی سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں۔ بہرحال نواب محسن الملک قیادت میں چلنے والی تحریک اس قدر کامیاب ہوئی کہ حکومت یو۔پی کو بڑی حد تک اردو کی سابقہ حیثیت کو بحال کرنا پڑا اور نواب صاحب کی جرأت و ہمت سے حکومت کو تحریک کی اہمیت کا احساس کرنا پڑا۔

مسلم اتحاد کی کوشش

اس تحریک کی کامیابی کی بنا پر مسلمانوں کی ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے دوسری کوشش کا آغاز ہوا اور اس جدوجہد کا آغاز بھی لکھنؤ سے ہوا جہاں ۲۱ اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں تمام ملک کے سرکردہ مسلمان نواب وقار الملک کی قیادت میں جمع ہوئے۔ نواب وقار الملک نے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو اپنے حقوق کی حفاظت میں جدوجہد کرنی ہوگی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب برابر گھٹ رہا ہے اور مجالس قانون ساز میں ان کی تعداد میں برابر کمی واقع ہوتی جارہی ہے۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کی ایک مرکزی سیاسی جماعت قائم ہونی چاہیے جو ان کے سیاسی اور سوشل مفادات کی نگہداشت کرسکے۔ جلسہ میں اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ انڈین نیشنل کانگریس مسلمانوں کی ضروریات کا ساتھ دینے میں ناکام رہی ہے اس لیے مسلمانوں کی ایک علیحدہ سیاسی تنظیم ضروری ہے۔ جلسہ نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ تمام اضلاع میں جلسے کیے جائیں اور صوبائی اور مرکزی سطح پر جماعت کی تنظیم کی جائے نواب وقار الملک نے بعض علاقوں کا دورہ بھی کیا لیکن انھیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی اس لیے کہ انگریز مسلمانوں کی الگ تنظیم کے مخالف تھے اور مسلمان اپنے حاکموں کی کھلم کھلا مخالفت کی ہمت نہیں رکھتے تھے لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے جب بنگال کی تنظیم کے سلسلہ میں ہندوؤں اور کانگریس نے حکومت وقت کی زبردست مخالفت کی جلسوں اور جلوسوں کا اہتمام کیا اور ملک بھر میں ہنگامے بپا کیے تو حکومت وقت کی طاقت کو

للکارا تو پھر انگریزوں نے یہ محسوس کیا کہ برصغیر میں سیاسی استحکام اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کانگریس کی طاقت کو متوازن بنانے کے لیے مسلمانوں کو بھی الگ سیاسی جماعت بنانے کا موقعہ فراہم کیا جائے چنانچہ جب نواب محسن الملک کی کوشش سے مسلمانوں کے وفد کو ویسرائے سے ملاقات کرنے کی تجویز پیش کی گئی تو اس کی پوری طرح حوصلہ افزائی کی گئی اور جب ارکانِ وفد نے ویسرائے سے ملنے کے بعد مسلمانوں کی سیاسی جماعت کے قیام کے لیے تیسری کوشش کی تو اس میں انھیں بظاہر حکمرانوں کی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

مسلم لیگ کا قیام

اس زمانہ میں نواب سر سلیم اللہ نے آل انڈیا مسلم کانفی ڈریسی کے بارے میں اپنی یادداشت شائع کی اور جب ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ختم ہوا تو ۳۰ / دسمبر ۱۹۰۶ء کو مسلم قائدین کا ایک اجتماع نواب وقار الملک کی زیرِ صدارت ڈھاکہ میں منعقد ہوا جس میں تقریر کرتے ہوئے نواب صاحب نے فرمایا کہ آج ہم جس مقصد کے تحت جمع ہوئے ہیں۔ وہ کوئی نیا نہیں ہے۔ جب سے انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا اس بات کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے کہ مسلمانوں کی بھی اپنی ایک جماعت ہو۔ سر سید احمد خاں جن کی بالغ نظری اور فہم و فراست کی یہ قوم ہمیشہ شرمندہ احسان رہے گی۔ کانگریس کی بڑھتی ہوئی قوت کا اس درجہ احساس رکھتے تھے کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کو اس جماعت سے الگ ہونے پر زور دیتے رہے تھے۔ یہ مشورہ اتنا قیمتی اور صائب ہے کہ اگرچہ آج وہ ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن اس کی اہمیت اور افادیت آج بھی مسلمانوں کے حق میں اسی قدر مضبوط اور مستحکم ہے جتنی پہلے تھی۔ اور یہ احساس روز بروز طاقت ور ہوتا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے بھرپور کوشش کرنی ہوگی۔ بنگال کی تقسیم کے سلسلہ میں کانگریس کے بڑھتے ہوئے اندرونی اور بیرونی اثرات کے پیشِ نظر اور حکومت کے اس منشا کو سمجھتے ہوئے کہ مجالس قانون ساز کے دائرہ عمل اور تعداد ارکان میں اضافہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے ایک وفد نے ویسرائے سے ملاقات کی اور ان کے سامنے

اپنے خیالات کو پیش کیا۔
وفد کی معروضات اور ویسرائے کی تقریر اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔ مسلم عمائدین نے جو وفد میں شامل تھے۔ ویسرائے سے ملاقات کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ملک کے کونہ کونہ سے مسلم نمائندے دسمبر کے اواخر میں ڈھاکہ میں جمع ہوں اور اپنے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے مستقل طور پر بندوبست کریں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد بہ لحاظ آبادی ایک چوتھائی ہے اور ظاہر ہے کہ اگر ہندوستان میں برطانوی حکومت کا قیام ختم ہوا تو جو قوم تعداد میں تین چوتھائی ہے ملک پر حکومت کرے گی لہٰذا ہمیں سب کو مل کر یہ سوچنا چاہیے کہ اگر یہ صورت حال رونما ہوئی تو ہمارا کیا ہوگا۔ اس حالت میں ہماری جان، ہمارا مال، ہماری عزت اور ہمارا مذہب خطرے میں پڑ جائے گا۔ آج جب برطانیہ کی قوت اور سرپرستی ہمیں حاصل ہے۔ ملک کے مختلف صوبوں میں ہمارے ہمسایوں کے ہاتھوں ہمیں متعدد دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ آپ غور کریں اس وقت کیا ہوگا جب ہم ایسے لوگوں کے غلام کی حیثیت سے زندگی گزارنے پر مجبور بنا دیے جائیں گے جو اورنگ زیب کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ بہرحال یہ ہمارا فرض ہے اور جہاں تک ہمارے اثرات کام کرتے ہیں ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بھائیوں کو غلط راہ پر چلنے سے باز رکھنے کی کوشش کریں، ان کے ساتھ ایک اچھے ہمسایہ کی طرح برتاؤ کریں۔ سوشل حدود میں ان کے ساتھ ہمدردی کا سلوک روا رکھیں اور اپنے مفادات اور حقوق کی نگہداشت کرتے ہوئے ان کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو انتقامی کارروائی سے احتراز کریں۔ ہمیں ان سے جو اختلاف ہے یا جو اختلاف ہو سکتا ہے اور جس کی ہمیں مستقبل میں توقع ہے اس کا تعلق تین اہم مسئلوں سے ہے۔ اول مسئلہ کا تعلق کانگریس کے اس مطالبے سے ہے کہ انگریزوں کا وجود ہندوستان میں خطرناک ہے۔ دوسرے مسئلہ کا تعلق ان سوالات سے ہے جو ہمارے جائز حقوق کے منافی ہیں اور تیسرے کا تعلق حکومت کے ساتھ ان کے جارحانہ رویے سے ہے۔ جو مسلمان پسند نہیں کرتے۔ نواب وقار الملک کی تقریر کے بعد نواب سلیم اللہ کی تحریک اور حکیم اجمل خاں، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی کی تائید سے فیصلہ کیا گیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے مسلمانوں کی ایک سیاسی

جماعت قائم کی جائے جس کا پہلا مقصد تو یہ ہو کہ وہ مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے ساتھ وفاداری کے جذبات کو فروغ دے اور اگر حکومت کے اقدامات کے بارے میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے تو وہ اس کو رفع کرے۔ دوئم مسلمانوں کے سیاسی مفادات اور حقوق کا تحفظ کرے اور ان کے جذبات اور ضروریات کو مؤدبانہ طریقہ سے حکومت کے سامنے پیش کرے اور سوئم مسلمانوں کے مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر ان میں دوسرے فرقوں کے بارے میں منافقت کے جذبات پیدا ہونے سے روکے۔ اسی اجلاس میں نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کو مشترکہ طور پر لیگ کا سیکرٹری مقرر کیا گیا اور ۶۰ ارکان پر مشتمل ایک پروویژنل کمیٹی قائم کی گئی جس کو لیگ کے آئین کی تیاری سونپی گئی۔ بعد میں آئین کا مسودہ اراکین میں تقسیم کیا گیا۔ جن لوگوں نے مسلم لیگ کے قیام میں حصہ لیا اور اجلاس میں بھرپور شمولیت کی ان میں قابل ذکر نواب سر سلیم اللہ آف ڈھاکہ، نواب سید نواب علی چودھری آف بوگرہ، مسٹر جسٹس شہاب الدین آف لاہور۔ مولانا ظفر علی خاں، حکیم اجمل خان اور مولانا محمد علی نے خاص طور پر اجلاس کی کارروائی میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ قرارداد کی ترتیب اور مسلم لیگ کے قواعد و ضوابط کی تیاری میں وہ پیش پیش تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اس سارے مواد کو کتابی شکل میں بھی شائع فرمایا۔

مسلم لیگ کا باضابطہ اجلاس

اس سے ایک سال بعد مسلم لیگ کا پہلا باضابطہ سالانہ اجلاس ۲۹ اور ۳۰ دسمبر ۱۹۰۷ء کو کراچی میں سر آدم جی پیر بھائی کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں آئین کی منظوری دی گئی۔ اس کے بعد یہ اجلاس ملتوی ہو گیا اور ملتوی اجلاس ۱۸ مارچ ۱۹۰۸ء کو نواب سر مزمل اللہ خاں آف بھیکم پور کے مکان واقع علی گڑھ میں مسٹر جسٹس شہاب الدین آف لاہور کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ چونکہ اس اثنا میں نواب محسن الملک کا اکتوبر ۱۹۰۷ء میں انتقال ہو گیا تھا اور نواب وقار الملک ان کی جگہ کالج کے سیکرٹری منتخب ہو جانے کے باعث لیگ کے سیکرٹری کے عہدہ سے سبکدوش ہو گئے تھے لہذا ان کی جگہ میجر ڈاکٹر سید حسن بلگرامی کو لیگ کا سیکرٹری اور سر آغا خان کو صدر مقرر کیا گیا۔

اس اجلاس میں مسلم لیگ کی صوبائی شاخوں کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور چونکہ پنجاب میں مسلم لیگ کی شاخ موجود تھی اس لیے اس کا باقاعدہ الحاق منظور کیا گیا۔ لیگ کی مرکزی مجلس عاملہ بھی قائم کی گئی اور اس میں تمام صوبوں کو نمائندگی دی گئی۔ اس اجلاس میں عدلیہ اور انتظامیہ کو ایک دوسرے الگ کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور مرکزی حکومت جو اصلاحات تجویز کر رہی ہے اس پر غور کرنے کے لیے ایک اور کمیٹی کا تقرر عمل میں لایا گیا اور ساتھ ہی ساتھ لندن میں امیر علی کی قائم کردہ کمیٹی کو وہاں مسلم لیگ کی شاخ لندن کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ اجلاس میں ایک اور قرارداد کے ذریعے حکومت کی توجہ شملہ وفد کے مطالبات کی طرف بھی مبذول کرائی گئی۔ اس کے بعد مسلم لیگ کی مقرر کردہ کمیٹی نے حکومت کی مجوزہ اصلاحات کے بارے میں مسلمانوں کے موقف سے آگاہ کیا اور اس پر جداگانہ انتخاب کی اہمیت واضح کی لیکن ہندوؤں نے جداگانہ انتخاب کی زبردست مخالفت کی اور اس موضوع پر متعدد بار حکومتِ ہند اور حکومت برطانیہ کے مابین مراسلت ہوئی لیکن لارڈ منٹو نے جو وعدے کیے تھے وہ حکومت برطانیہ کو بڑی حد تک پابند کیے ہوئے تھے۔

مسلم لیگ کا دوسرا سالانہ اجلاس

اس اثنا میں مسلم لیگ کا دوسرا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۰۸ء میں بمقام امرتسر سید علی امام کی زیرِ صدارت ہوا۔ اگرچہ صدر اجلاس نے مسٹر گوکھلے سے متاثر ہو کر مخلوط انتخاب کے مسئلہ کو منوانا چاہا مگر مسلم لیگ نے نواب وقار الملک کی راہنمائی میں جداگانہ انتخاب کی حمایت کی اور نواب وقار الملک نے اس موضوع پر مضامین لکھے اور یہ ثابت کیا کہ مخلوط انتخاب کا طریقہ مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں رہے گا۔

کانگرس بدستور جداگانہ انتخاب کی مخالفت کرتی رہی لیکن مسلمانوں کا مطالبہ چونکہ جائز تھا، لہٰذا اس مطالبہ کو ایک حد تک خود کانگرس کے صدر مسٹر ایس پی سنہا نے جائز قرار دیا۔ اور جب حکومتِ ہند نے یکم اکتوبر ۱۹۰۸ء کو ایک مراسلہ وزیر ہند کو روانہ کیا تو اس میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کے اصول کی سفارش کی گئی چنانچہ ۱۹۰۹ء میں جب منٹو مارلے اصلاحات کا نفاذ ہوا تو حکومت برطانیہ نے لارڈ منٹو کے وعدہ کا پاس کرتے ہوئے مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا۔

لوکل اداروں میں جداگانہ نیابت پر زور

اب مسلم لیگ نے اس بات کی کوشش کی مجالس قانون سازی کی حد تک تو جداگانہ کی منظوری مل گئی لیکن میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں بھی اسی اصول کو منوانا چاہیے چنانچہ کافی تگ ودو کے بعد مسلم لیگ ان اداروں کے لیے بھی یہی اصول منوانے میں کامیاب ہوگئی۔

تیسرا اجلاس

اب صرف سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نیابت کا مسئلہ رہ گیا تھا۔ لہٰذا جب مسلم لیگ کا تیسرا سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تو حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو معقول اور جائز نیابت دے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مسلم لیگ کے قائدین نے ہندو مسلم اتحاد کی خاطر ہندوؤں سے اپنے تعلقات کو استوار کرنا چاہا اور جب حکیم اجمل خاں نے جو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی کے صدر استقبالیہ تھے یہ تجویز کیا کہ مسلمانوں کو ہندوستان کے دوسرے فرقوں خاص کر ہندوؤں کے ساتھ اپنے تعلقات کو استوار کرنا چاہیے تو ان کی تجویز کو تائید عامہ حاصل ہوئی۔ مسلم لیگ کا یہ تیسرا اجلاس جنوری ۱۹۱۰ء کو ہوا تھا۔ اس لیے کہ دسمبر ۱۹۰۹ء والا اجلاس بعض وجوہ کی بنا پر نہ ہو سکا تھا۔

چوتھا سالانہ اجلاس

اس کے بعد مسلم لیگ کا چوتھا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۱۰ء میں بمقام ناگپور سید نبی اللہ کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں صدر اجلاس نے پھر ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔

تقسیم بنگال کی منسوخی پر مایوسی

لیکن جب ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو تقسیم بنگال کا فیصلہ منسوخ ہوا تو مسلمانوں میں بڑی مایوسی پھیل گئی چنانچہ جب دسمبر ۱۹۱۱ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں نواب

سرسلیم اللہ کی زیرِ صدارت منعقد ہوا تو اس میں مسلمانوں کی مایوسی اور بے چینی کا اظہار کیا گیا۔ اور حکومت برطانیہ کی وعدہ خلافی کی شکایت کی گئی۔ نواب وقار الملک نے حکومت کے فیصلہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ ان وعدوں کے پیشِ نظر جو تقسیم بنگال سے متعلق حکومت برطانیہ اور حکومتِ ہند کے وفد اور ارکان وقتاً فوقتاً کرتے رہے حکومت کے تازہ اعلان سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اب اس کے قول و فعل پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ نواب صاحب نے کہا کہ گزشتہ چھ سال میں بنگال کے مسلمانوں نے تقسیم بنگال کے مسئلہ پر کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا بلکہ حکومت کے وعدوں پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے نئے صوبہ کی تعمیر و ترقی میں مصروف و منہمک رہے اور انھوں نے اس مقصد میں خاصی کامیابی حاصل کی لیکن اب تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا گیا اور ہندوؤں کی مسلسل اور متواتر کوشش نے تقسیم کے فیصلہ کو کالعدم کرایا۔

لارڈ منٹو کا اظہارِ افسوس

خود لارڈ منٹو کو اس وعدہ خلافی سے بڑا افسوس ہوا۔ انھوں نے ۱۲ فروری ۱۹۱۲ء کو دارالامراء میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ تقسیم بنگال اب ایک حقیقت بن چکی ہے اور پھر اس کے بعد بار بار اس دعوے کو دہرایا اور کہا کہ تقسیم بنگال کی تجویز پر بدستور عمل ہوتا رہے گا۔ ہم نے مشرقی بنگال کی آبادی کو یقین دلایا کہ ہم ان کی وفاداری کو بنظرِ تحسین دیکھتے ہیں اور ہم ان کے مفادات کی نگرانی کریں گے۔ میرے خیال میں شاید ہی کوئی سول ملازم جس نے ہندوستان میں کام کیا ہو، اس نے تقسیم بنگال کے قائم رہنے کا وعدہ نہ کیا ہو لیکن اس کے باوجود بنگال کی تقسیم رد کر دی گئی۔

ہندو مسلم اتحاد کی کوشش

اس فیصلہ سے مسلمانوں میں مایوسی تو ضرور پھیلی مگر اس خیال کو بھی استحکام نصیب ہوا کہ مسلمانوں کو صرف حکمرانوں ہی پر تکیہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہندوؤں سے بھی تعلقات کو استوار کرنا چاہیے۔

اس ضمن میں اسی سال سر ایم وائنڈ الرن برن نے بھی ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کی اور جب انھوں نے دسمبر ۱۹۱۱ء میں الٰہ آباد کانگریس میں صدارتی تقریر فرمائی تو انھوں نے کہا کہ میں اس ضمن میں سر آغا خاں سے بات کر چکا ہوں اور سر آغا خان، سر فیروز شاہ مہتہ اور مسٹر امیر علی کی مدد سے وہ عنقریب ہندو اور مسلم زعما کا ایک مشترکہ اجتماع طلب کر رہے ہیں چنانچہ یہ اجتماع یکم جنوری ۱۹۱۲ء میں الٰہ آباد میں منعقد ہوا جس میں مسٹر سریندر ناتھ بنیرجی، مہاراجہ بہادر دربھنگہ، پنڈت مدن موہن مالویہ، پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر گوپال کرشن گھوگھلے ہندوؤں کی جانب سے اور نواب وقار الملک، سر آغا خاں، مسٹر ابراہیم، رحمت اللہ، محمد عزیز مرزا اور سید محمود نے مسلمانوں کی جانب سے شرکت کی مگر اس مقصد میں کوئی زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔

مسلم لیگ کے نصب العین میں تبدیلی

ایک طرف تو یہ کوششیں ہو رہی تھیں، دوسری طرف بین الاقوامی حالات، جنگِ طرابلس و بلقان اور مسجد کانپور کے واقعات نے مسلمانوں میں اضطراب کی ایک لہر دوڑا دی اور مسلمان شعرا اور ادبا کا ایک طبقہ مسلمانوں کو جرات کی اہمیت کا ایک نیا راستہ دکھا رہا تھا جس کی وجہ سے مسلم لیگ پر پرانے قائدین کی گرفت کمزور ہو گئی اور مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد میں تبدیلی کی ضرورت ملک گیر اہمیت اختیار کر گئی۔ سر آغا خان مسلم لیگ کی قیادت سے استعفیٰ دے چکے تھے۔ لہٰذا جب جنوری ۱۹۱۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس منعقد ہوا تو اس نے مسلم لیگ کے لیے ایک نئے آئین کی منظوری دی جس میں سلف گورنمنٹ کا قیام مسلم لیگ کا نصب العین قرار پایا۔ یہ دستور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں ۲۲ مارچ ۱۹۱۳ء کو منظور کیا گیا اور مولانا حسرت موہانی پہلی بار مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔

بیگم حسرت کا بیان

مولانا نے کیوں مسلم لیگ میں شمولیت سے اب تک احتراز کیا، اس کا ذکر صاحبِ حالاتِ حسرت نے اس طرح کیا ہے۔ "بقول بیگم حسرت زمانہ طالب علمی ہی سے

مولانا حسرت کو سیاسی تحریک کے ساتھ دلچسپی اور ہمدردی تھی۔ چنانچہ بی اے کی ڈگری لینے کے بعد دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۰۴ء میں بمبئی کانگریس وہ بحیثیت ڈیلیگٹ شریک ہوئے اور سورت کانگریس تک برابر شریک ہوتے رہے لیکن سورت کانگریس کے آغاز کے ساتھ ہی کانگریس سے نفرت کرنے لگے، جس طرح آغا خاں لیگ سے اپنے سیاسی عقائد کی بناپر مجتنب رہتے تھے۔ لیکن لکھنو کے اجلاس مسلم لیگ کے بعد ا جو مارچ ۱۹۱۳ء کو منعقد ہوا تھا حسرت لیگ میں بھی شریک ہونے لگے کیونکہ لکھنو کے اجلاس میں مسلم لیگ کے نصب العین میں جمہوریت کے سیاسی عقائد کے مطابق اصلاح کی گئی اور آئندہ اصلاح کی توقع ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس وقت سے آپ لیگ کے تمام جلسوں میں برابر شریک ہوتے رہے اور حق وصداقت کی ترجمانی میں کبھی آپ نے غفلت وکوتاہی نہیں کی، حالاں کہ ایسے بہت سے مواقع آئے جن میں بڑے بڑے مدعیان حریت کے قدم صراط مستقیم سے ڈگمگا گئے۔

مسلم لیگ کا اجلاس منعقدہ آگرہ

چنانچہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقدہ آگرہ میں ا جو دسمبر ۱۹۱۳ء میں منعقدہ ہوا تھا جب آغا خاں نے مسجد مچھلی بازار کانپور کی واگزاری سے متعلق لارڈ ہارڈنگ کے شکریہ کا ریزولیشن پیش کیا تو مستبدین کے علاوہ اکثر احرار نے اس کی تائید کی لیکن مولانا حسرت اور مولوی عبدالودود بریلوی نے نہایت زوردارانہ طریقہ سے اس سے اختلاف کیا اور آخر وقت تک اس رائے پر قائم رہے کہ موجودہ صورت حال جمہور مسلمانوں کی اس قابل نہیں کہ اس پر شکر واطمینان کا ریزولیشن پاس کیا جائے۔

مسلم لیگ کا اجلاس منعقدہ بمبئی

اسی طرح بمبئی کے اجلاس مسلم لیگ کو درہم وبرہم کر دینے کی جو کوشش کی گئی چونکہ یہ کوشش آپ کے انقلابی ریزولیشن کے ساتھ ہی شروع کر دی گئی تھی اس لیے اکثر حلقوں میں اس فساد وفتنہ کا الزام مولانا حسرت ہی پر عائد کر دیا گیا حالانکہ خود قائداعظم کے بقول اصل واقعہ کچھ اور تھا۔

نوجوان مسلمان کیوں لیگ کے مخالف تھے

مولانا کیا اس وقت مسلمانوں کا سارا ذہین طبقہ مسلم لیگ کا مخالف تھا۔ مسلم لیگ کا قیام جن حالات کے تحت ہوا تھا، اس سے مسلمانوں نوجوانوں میں شکوک و شبہات کا پیدا ہونا لازمی تھا اور پھر یہ کہ مولانا تو زمانۂ طالب علمی ہی میں سرسید کی پالیسی سے اختلاف رکھتے تھے۔ اس لیے ان سے مسلم لیگ کی حمایت کی توقع ہی غلط تھی کیوں کہ مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد کی اول شق ہی حکومتِ برطانیہ کی وفاداری سے متعلق تھی۔

مولانا کا اظہارِ خیال

مولانا نے اس ضمن میں ایک تفصیلی مضمون اردوئے معلّی کی اشاعت مورخہ ۷ر جون ۱۹۰۷ء میں "مسلمانانِ ہند کے پولٹیکل مستقبل" کے عنوان سے شائع کیا۔ جس سے اس موضوع پر ان کے خیالات کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "اگرچہ بظاہر حالات دیگر اقوام ہند کے مستقبل و حال سے بالکل غیر مشابہ نظر آتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے اور ہمارے خیال میں بہت ممکن ہے کہ آج سے بیس برس بعد ملکی معاملات میں مسلمانوں کی وہی پالیسی ہو جائے جو اس وقت کانگریس کے فریق نرم کی ہے اور ۳۰، ۴۰ برس بعد مسلمان بھی وہی روش اختیار کریں جو اس وقت کانگریس کے گرم فریق نے اختیار کی ہے (بعد کے واقعات نے اس تجزیہ کو کتنا صحیح ثابت کیا) مگر اس میں شک نہیں کہ نظر بحالات موجودہ بعض لوگوں کو ہمارا یہ قیاس غلط معلوم ہوگا اور ہم بھی کہتے ہیں کہ غلط معلوم ہونا چاہیے کیوں کہ مشرقی بنگال میں ہندو اور مسلمانوں کی موجودہ کشمکش اور پنجاب میں ہندو لیڈروں کی گرفتاری پر مسلمانوں کا اطمینان یا کم از کم بے تعلقی یا سب سے بڑھ کر مسلمانوں کی جدید سیاسی انجمن مسلم لیگ کے مقاصد کا نیشنل کانگریس کے مقاصد سے یکم قلم متصادم ہونا یہ سب ایسی حوصلہ فرسا اور مایوسی افزا باتیں ہیں جن کے موجود ہوتے ہوتے ظاہراً ہندو مسلمانوں کا متحد ہونا بہت بعید نظر آتا ہے۔" مولانا کے ذہن میں دراصل

کومیلا کا ہندو مسلم فساد تھا جو ۴ مارچ ۱۹۰۷ کو ہوا تھا اور جس میں ہندوؤں نے نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ کے سیکرٹری پر حملہ کیا تھا اور ایک مسلمان مار کر شہید کر دیا تھا مولانا ان مایوس کن حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ "اس موقعہ پر شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ آل انڈیا مسلم لیگ مخالف کانگریس نہیں چنانچہ نواب وقارالملک بہادر نے اپنی ایک اسپیچ میں بمقام علی گڑھ میں فرمایا بھی تھا کہ "حاشا وکلا! ہم مسلمان کانگریس کے دشمن نہیں ہیں ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ اپنی قوم کو اس نقصان سے محفوظ رکھیں جس کا انھیں اندیشہ ہے۔ کانگریس کی کوششوں سے مثلاً نمک کا ٹیکس جو ہلکا ہو گیا ہے، اس سے تمام اہلِ ہند کو فائدہ پہنچا ہے۔ علاوہ اس کے ان کی کوششوں سے ہندوستان کے خزانے پر سے مصارف کا بار ہلکا گیا، لہٰذا ایسی کوششوں میں کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کی مخالفت کریں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کے احسان مند اور شکر گزار نہ ہوں"۔ لیکن کانگریس کے ان معمولی مسائل میں مزاحمت نہ کرنے سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتا کہ مسلم لیگ' کانگریس کی مخالف نہیں ہے۔ لاریب کانگریس کے مقاصد کو محصول نمک یا ملکی اخراجات کی تخفیف وغیرہ کے چند مسائل تک محدود سمجھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا یہ کہنا کہ ہندوستان پر حکومتِ برطانیہ کا منشا ریل کی پٹریاں بنوانا ہے۔ حالاں کہ ظاہر ہے کہ انگریز سڑکیں ضرور بنواتے ہیں لیکن ان کی حکومت کا مقصد سڑکیں بنوانا ہرگز نہیں ہے۔ اسی طرح اگرچہ کانگریس کی کوششوں سے محصولِ نمک میں تخفیف ضرور ہوئی لیکن اس محصول کم کرنے کو کانگریس کا مقصدِ اصلی نہیں جس پر نرم اور گرم دونوں کو اتفاق ہے۔ حکومتِ خود اختیاری سلف گورنمنٹ یا سوراج ہے اور جو شخص یا جو انجمن یا جو قوم اس مقصد کے خلاف ہے ہم اس کو کانگریس کا مخالف سمجھتے ہیں اگرچہ فروعی حالات میں وہ کانگریس کا ہم خیال ہی کیوں نہ ہو اور اس لحاظ سے مسلم لیگ نیشنل کانگریس کی قطعی مخالف ہے کیونکہ نواب وقارالملک بہادر کی جس اسپیچ کا حوالہ ہم دے چکے ہیں اس کا تقریباً تین چوتھائی حصہ اسی مضمون پر مشتمل ہے کہ مسلمانوں میں من حیث القوم تحریکِ حریت و حکومتِ خود اختیاری کی مخالفت کرنا سب سے بڑا پولیٹیکل فرض ہے۔ چنانچہ نواب صاحب نے ختم تقریر پر مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کو جو نصیحت فرمائی

تھی اس کا حرف حرف قابلِ ملاحظہ ہے: "تم فٹ بال کھیلنے میں مصروف ہو یا کرکٹ کے میدان میں کود پھاند کر رہے ہو یا رائڈنگ اسکول میں گھوڑوں پر چکر لگا رہے ہو یا ٹینس کھیلنے میں سرگرمی دکھا رہے ہو، غرضکہ اس قسم کی ہر حالت میں تم اپنے تئیں انگریزی فوج کا سولجر خیال کرو، تم تصور کرو کہ انگریزی پرچم تمھارے سروں پر لہرا رہا ہے۔ تم یقین کرو کہ تمھاری یہ دوڑ دھوپ اس لیے ہے کہ تم ایک دن تاجِ برطانیہ پر اپنی جانیں نثار کرو۔" اور ریڈ صاحب تو اس سے بھی بڑھ کر فرماتے ہیں کہ اگر ضرورت ہو تو انگریزوں کی طرف سے خلیفۃ المسلمین سے بھی جنگ کرنے میں دریغ نہ کرو، غرضیکہ مسلمانوں کی موجودہ پالیسی کا رجحان بظاہر مقصدِ حریت کی جانب نہیں معلوم ہوتا تاہم ان کی گزشتہ اور موجودہ پولٹیکل حالت کا موازنہ کرنے سے صاف نظر آتا ہے کہ قطعی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے اس لیے کہ مسلم لیگ کا جو مقصد آخری (آئیڈیل) نواب وقار الملک نے قرار دیا ہے اس کا ہمیشہ کے لیے قائم رہنا کچھ ضروری نہیں (جیسا کہ ۷ برس بعد ۱۹۱۳ء میں ظاہر ہوا) بلکہ برخلاف اس کے گمان غالب یہی ہے کہ پولٹیکل میدان میں اتر آنے کے بعد جس وقت ان کے جذبۂ حریت میں تحریک پیدا ہوگئی اس وقت مسلمان بھی انگریزوں کی اطاعت وخدمت کے افتخار پر قائم نہ رہ سکیں گے (کس طرح صحیح تجزیہ ہے) مقامِ غور ہے کہ آج سے چند سال قبل ہی تک مسلمانوں کی مسلمہ پالیسی یہ تھی کہ ہم کو پالیٹیکس میں مطلق حصّہ نہ لے کر حکمران قوم کے کامل انصاف پر کامل اعتماد رکھنا چاہیے لیکن آج اس قسم کے خیالات کو تعلیم یافتہ مسلمان اپنے نام کے ساتھ منسوب کرنا بھی گوارا نہیں کریں گے۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے، یہی کہ جس طرح زمانہ نے پہلی حالت کو دوسری حالت میں تبدیل کر دیا اسی طرح دوسری حالت کو تیسری اور اس سے بھی بہتر حالت میں ضرور تبدیل کر دے گا۔ چنانچہ نیشنل کانگریس ہی کی مثال اس دعویٰ کی تائید کرتی ہے اس لیے آغاز کانگریس کے زمانہ میں حفاظت حقوق کے متعلق اور پارسیوں کے خیالات بعینہٖ اسی انداز کے تھے جیسے کہ آج مسلمان لیڈروں کے ہیں۔ مثلاً دادا بھائی نوروجی کو بھی انگریزوں کے انصاف اور روش پر ایسا ہی بھروسہ تھا جیسا اب، اس وقت مسلمانوں کو ہے اور بنگالی پالیٹیشن بھی طلب

حقوق و شکوہ جور کے لیے صرف ریزرولیشن پاس کرنا اور ان ریزرولیشنوں میں بھی اعتدال و ادب کا سختی کے ساتھ ملحوظ رکھنا ایسا ہی ضروری جانتے تھے جیسا کہ آج کل مسلمان جان رہے ہیں۔ پس جب مسلمانوں کی حالت اس وقت ایسی ہے جیسی کہ کانگریس کی بیس سال قبل تھی تو بیس سال بعد ان کے خیالات کا ویسا ہی ہو جانا جیسا کہ اس وقت فریق نرم کے خیالات میں بالکل قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے اب رہی یہ بات کہ آئندہ ہمارے زیادہ آزاد خیال ہو جانے کی کیا دلیل ہے اور مسلمانوں کی موجودہ پالیسی کیوں کمزور ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں، مثلاً (۱) تعلیم کی کمی (۲) دولت کی کمی (۳) آغاز حریت کی قدرتی جھجک (۴) ملازمت سرکاری کا بہ آسانی مل جانا (۵) دیگر اقوام ہند کے ساتھ رقابت کا جوش وغیرہ لیکن بزمانۂ آئندہ ان تمام اسباب کمزوری کا دور ہو جانا بھی یقینی ہے۔ اس طور پر کہ موجودہ رفتارِ تعلیم سے بیس سال کے عرصے میں مسلمانوں کا دیگر اقوام ہند کے برابر ہو جانا بہت ممکن ہے جس سے ان کو حصولِ دولت میں بھی کافی مدد ملے گی علاوہ کچھ تو گورنمنٹ کی عنایت سے اور جس کو مسلمانوں کے ادعائے وفاداری کا انعام سمجھنا چاہیے اور کچھ اس وجہ سے کہ فریق گرم کے مونہہ از خود خدمتِ حکومت سے بیزار ہو گئے ہیں۔ آئندہ مسلمانوں کے لیے میدانِ ملازمت اور وسیع ہو جائے گا اور ایک حد تک ان کی بے بضاعتی کی تلافی ہو جائے گی اور جس وقت ان کے پاس کافی سرمایہ جمع ہو جائے گا، اس وقت یقیناً وہ طلبِ حقوق میں زیادہ بیباک ہو جائیں گے اور ابتدائی جھجک بھی جاتی رہے گی کیونکہ حریت کی خواہش ایک ایسی خواہش ہے جس کی ابتدا ضرور ہوتی ہے لیکن انتہا نہیں ہو سکتی یعنی ایک بار دل میں پیدا ہو کر پھر وہ برابر بڑھتی ہی رہتی ہے گھٹنے کا نام نہیں لیتی۔ پالٹیکس سے مسلمانوں کی بے تعلقی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی کمی تعداد کے باعث سے ابھی تک ان پر عرصۂ ملازمتِ گورنمنٹ تنگ نہیں ہوا ہے اور ان کو بلا جد وجہد سامانِ فراغت میسر ہو جاتا ہے لیکن یہ حالت ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی، اور ایک حدِ معین کے بعد ان کو بھی صنعت و حرفت و تجارت کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔ اور اس وقت حکومتِ غیر کے جبر بے انصافی کی ان کو بھی ایسی ہی شکایات ہوگی جیسی کہ اس وقت دوسری آزاد قوموں کو ہے اور جب اس طرح پر ان کی آنکھیں

کھل جائیں گی تو ہندو مسلمانوں کی باہمی رقابت اور بے اعتمادی بھی بہت کچھ کم ہو جائے گی اور پولیٹکل حیثیت سے تمام باشندگان ہند ایک قوم بن کر یقیناً اس حق کے دعوے دار ہوں گے کہ ہندوستان صرف ہندوستانیوں کے لیے ہے اور اس دعویٰ میں ہندی مسلمان بھی یقیناً شریک ہوں گے کیونکہ سلف گورنمنٹ حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک ہندو اور مسلمان متحد نہ ہوں اور جب کبھی انشاءاللہ تعالیٰ اس کا وقت آئے گا، اس وقت ان دونوں کے باہمی تعلقات ہرگز موجودہ تعلقاتِ شک و بے اعتباری کے مانند نہیں ہوں گے بلکہ حصول آزادی کی کشمکش ان کو خودبخود مراعات باہمی کی جانب مائل اور سلف گورنمنٹ کے قابل بنا دے گی اور جب یہ حالت ہو گی تو علی الرغم نواب وقارالملک بہادر مسلمانوں کو ہندو کی کثرتِ تعداد کی جانب سے اپنے حقوق کی پامالی کا اندیشہ بھی باقی نہ رہے گا۔"

اضطراری فوائد کا شکریہ ضروری نہیں

چونکہ مسلم لیگ کے ارکان کی جانب سے انگریز حکمرانوں کی تعریف و توصیف میں زمین و آسماں کے قلابے ملائے جا رہے تھے اور انگریزوں نے ہندوستان کی نام نہاد ترقی کا ڈھنڈورا پیٹ کر مسلمانوں کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں لینے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ اس لیے مولانا کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ انگریز حکمرانوں کی اس پالیسی کو طشت از بام کر دیں جو وہ نام نہاد ترقی کا نام لے کر ملک پر نافذ کر رہے ہیں، چنانچہ مئی ۱۹۰۷ء کو اردوئے معلیٰ میں انھوں نے "اضطراری فوائد کا شکریہ ضروری نہیں" کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم کیا جو درج ہے: "ہم اس آرٹیکل میں یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اگر برٹش حکومت ہند سے کچھ فوائد مرتب ہوئے ہیں تو ان کی حیثیت محض اتفاقی یا اضطراری فوائد کی ہے جن کی بابت کسی پارٹی یا گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں (اشارہ نواب وقارالملک کی تقریر کی طرف ہے) ہمارے سامنے یہ سوال نہیں کہ انگریزی تعلق سے ہندوستان کو کیا کیا فائدے پہنچے ہیں بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ اہلِ ہند کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کا برتاؤ نیک نیتی پر بھی مبنی تھا یا نہیں۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ زید، عمر سے کسی خاص مقام

پر ملنے کا وعدہ کرتا ہے لیکن بفرضِ محال وہ اپنا وعدہ پورا نہ کرتا تو اسے وہ تھیلی جس کا اس سے وہ کیا گیا تھا، اب اس خوش قسمتی کے لیے اسے عمر کا شکر گزار ہونا ضروری ہے

دوسری مثال لیجیے کہ زید عمر کو ایک پر تکلف دعوت دیتا ہے لیکن اس کا ارادہ یہ ہے کہ عمر کو زہر دے دے۔ عمر دعوت قبول کر لیتا ہے لیکن غلطی سے زہر والی رکابی اس کے سامنے نہیں آتی۔ وہ واقعی خوب سیر ہو کر کھانا کھاتا ہے۔ آخر میں اپنے بدنیت دوست کا شکریہ ادا کرتا ہے لیکن عمر کو زید کے ارادۂ فاسد کا حال معلوم ہوتا تو کیا اس صورت میں بھی عمر کا ممنون ہونا لازمی تھا۔ پہلی مثال میں اگر رستے میں بجائے تھیلی پانے کے وہ ناگہانی طور پر ٹھوکر کھا کر گر پڑتا اور اس کا بازو ٹوٹ جاتا تو اس حادثے کا الزام بھی وہ عمر پر نہ رکھتا۔ غرض کہ اتفاقیہ امور میں شکر گزاری یا الزام کا کوئی موقعہ نہیں ہوتا۔ تعلیم اور ریلوے وغیرہ سب اتفاقیہ فوائد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اہلِ ہند اس تعلیم کے لیے ممنون ہیں جو برٹش حکومت نے ان کو دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرکار کو یہ گمان نہ تھا کہ اس طرزِ تعلیم سے لوگ ہندوستان میں اس کے اقتدار کے دشمن ہو جائیں گے۔ اگر اس طرزِ تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے تو یہ ایک محض اتفاقی امر ہے جو انگریزوں کی خواہش کے خلاف نکلا کیوں کہ وہ ہندوستان کو ہمیشہ ماتحتی کی حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ برٹش سلطنت جو اہلِ ہند کو انگریزی طریقے کی تعلیم دیتی ہے، اس کی ظاہری وجہ یہ ہے کہ معدودے چند انگریز ہندوستان کے سے وسیع ملک پر بلا اعانت ان ہندوستانیوں کے، حکومت نہیں کر سکتے جن کی تعلیم اپنے اجنبی آقاؤں کے خیالات کے مطابق ہوتی ہو مگر اس قسم کی تعلیم سے بھی طبیعتوں میں اغیار کی محکومی سے برگشتگی ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ اس لیے جو نفع اس تعلیم سے پہنچا وہ محض اتفاقی ہے۔ اس کی وہی مثال ہے کہ خالد بکر پر طمنچہ سے فائر کرنا چاہتا ہے۔ اتفاق سے طمنچہ خالد کے ہاتھ سے گر پڑتا ہے اور بکر اسے اٹھا کر خالد پر ہی داغ دیتا ہے تو بکر، خالد کی اس عنایت کا ممنون نہیں ہو گا کہ اس نے بکر کو طمنچہ دے کر اس کی جان بچائی ریل اور تار بھی اسی قبیل کی نعمتوں میں سے ہے جو ہندوستان کو انگریزی دور میں نصیب ہوئی ہیں۔ جس شخص نے تاریخ ہند کا مطالعہ کیا ہے اس کو معلوم ہے کہ ریلوے

کے اجرا میں لارڈ ڈلہوزی کے دو مقصد تھے۔ اوّل یہ کہ فوج کی آمد و رفت بہ آسانی ممکن ہو۔ دوسرے یہ کہ انگریزی تجارت کو فروغ ہو۔ مسٹر ولیم ہنٹر نے امپیریل گزیٹیر آف انڈیا میں لکھا ہے کہ لارڈ مذکور کی تجویز یہ تھی کہ عمدہ عمدہ سڑکیں تیار کر دی جائیں جن سے تمام بڑے بڑے شہروں اور چھاؤنیوں کا سلسلہ مل جائے۔ اب اگر ریل اور تار سے ہندوستانیوں کو بھی کچھ فائدہ پہنچ جاتا ہے تو وہ محض اتفاقی اور اضطراری ہے۔ خاص کر اگر اس لحاظ سے ہندوستانی ریل سے محروم رکھے جائیں تو ریلوے لائنوں کی آمدنی ان کے اخراجات کے لیے ہرگز کافی نہ ہو۔ انگلستان میں ۲۸ ہزار میل ریل ہے ان میں سے ایک میل بھی سرکاری نہیں۔ اس لیے اہلِ انگلستان سے ریل کے حساب میں کچھ ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں ہر شخص ریلوے کے قیام کا ذمہ دار ہے خواہ اس نے کبھی ریل کی صورت بھی نہ دیکھی ہو اور پھر ریل سرکاری ملکیت ہے۔ ایک اینگلو انڈین افسر ڈپٹی سرجن جنرل پاسکے کا یہ قول صحیح ہے کہ انگلستان کی تمام فتوحات و الحاقات کی بنا ذات و خود غرضی پر ہے۔ اس حالت کو مسٹر دادا بھائی نوروجی سے زیادہ صفائی کے ساتھ کسی نے بیان نہیں کیا۔ آپ نے دسمبر ۱۹۰۳ء بمقام ولورتھ اپنی اسپیچ میں بیان کیا کہ انگریزوں نے لوگوں کو ایک دوسرے کو لوٹنے سے اس لیے باز رکھا کہ وہ خود سب کچھ لوٹ لیں اور پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان کے جان و مال کے لیے امن پیدا کر دیا اور ان کو ہمارا ممنون ہونا چاہیے۔ بے شک انھوں نے اس قسم کا امن پیدا کر دیا لیکن اس لیے کہ وہ بے دغدغہ سارا مال لے جائیں۔ جان کی امان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مشرق کے قدیم حکمران ہزاروں، لاکھوں آدمیوں کو قتل اور رعایا کو پریشان کیا کرتے تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے تھے تو اس وقت انگریزی حکومت بھی بڑی فطرت اور بے خطا اصول کے ساتھ لاکھوں آدمیوں کو قحط اور طاعون کے ذریعے سے فنا کیے دیتی ہے اور کروڑوں کو فاقہ سے مار دیتی ہے۔ اینگلو انڈین اور انگریز ان ہوشیار سرجنوں کی مثال ہیں جو نہایت ہی تیز نشتروں سے دل تک میں شگاف دے جاتے ہیں اور سارا خون اس طرح نکال لیتے ہیں کہ بظاہر خراش کا نشان بھی نظر نہیں آتا۔ ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت ہند کے اغراض میں خلوص نیت ابتدا

ہی سے نہیں ہے بلکہ ان اغراض کی بنا طمع زر اور ہوس اقتدار پر قائم ہوئی ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اہل ہند کو اگر کوئی نفع برٹش گورنمنٹ سے اتفاقی طور پر مل جائے تو وہ اس کے ممنون بھی ہوں۔

سرسیّد کی پالیسی سے انحراف

مسلم لیگ اور اس کی قیادت پر مولانا ہی کو نہیں بلکہ اس دور کے تمام پڑھے لکھے مسلمانوں کو سخت اعتراض تھا، اس لیے کہ مسلمانوں میں بھی حریت کے جذبات پروان چڑھ رہے تھے اور مسلمانوں کے نوجوان طبقہ کا خیال یہ تھا کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے سرسید کی پالیسی پر عمل کرنا اور انگریزوں کے ساتھ مکمل اور مسلسل اظہارِ وفاداری کرنا قوم کے حق میں مفید نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ انھیں لیگ کے اغراض ومقاصد اور سرآغا خاں اور نواب وقار الملک کی قیادت بھی گراں گزر رہی تھی۔ مسلمان قوم کو اس وقت نوجوان خون کی ضرورت تھی اور یہ خون اسے حسرت، محمد علی، شوکت علی، ظفر علی اور شبلی کی صورت میں مل چکا تھا جن کے جذباتِ حریت سے ساری قوم متاثر نظر آتی تھی۔ مولانا شبلی نے ۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ کے بارے میں جو نظم لکھی اس نے ہندوستان میں بڑی شہرت حاصل کر لی ہے۔ اس لیے یہ نظم درج ذیل ہے۔

لیگ کی عظمت و جرأت سے تو انکار نہیں
ملک میں غلغلہ ہے، شور ہے کہرام بھی ہے
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ
نظرِ لطفِ رئیسانِ خوش انجام بھی ہے
کون ہے جو نہیں اس حلقۂ قومی کا اسیر
اس میں زاہد بھی ہے رندِ سیہ اشام بھی ہے
فیض اس کا ہے بہ اندازۂ طالب یعنی
بادۂ صاف بھی ہے، دردِ تہِ جام بھی ہے

کعبۂ قوم جو کہتے ہیں، بجا کہتے ہیں
مرجعِ خاص ہے یہ قبلہ گرِ عام بھی ہے
پختہ کاروں کے لیے آلۂ تسخیر ہے یہ
نوجوانوں کو صلائے طبعِ خام بھی ہے
رہنمایانِ نوآموز کا ہے مکتبِ درس
زینۂ فخر و نمائش گری عام بھی ہے
جن مہمات میں درکار ہے ایثارِ نفوس
ان میں طرزِ عمل بوسہ و پیغام بھی ہے
مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں
محسنِ قوم بھی ہے خادمِ حکام بھی ہے
ربط ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی
جس طرح حرف میں اک قاعدہ ادغام بھی ہے

اس کے آفس میں بھی ہر طرح کا ساماں ہے درست
ورق سادہ بھی ہے کلکِ خوش اندام بھی ہے
ہیں قرینہ سے سجائی ہوئی میزیں ہر سو
جا بجا دفترِ پارینۂ احکام بھی ہے
چند بی اے ہیں سند یافتۂ علم و عمل
کچھ اسسٹنٹ ہیں، کچھ حلقۂ خدام بھی ہے
ہو جو تعطیل میں تفریحِ سیاست مقصود
سفرِ درجۂ اوّل کے لیے دام بھی ہے
یہ تو سب کچھ ہے مگر ایک گزارش یہ ہے
گرچہ سوئے ادب بھی ہے لوا برام بھی ہے
مجھے آہستہ، مرے کان میں ارشاد رہو
سال بھر حضرتِ والا کا کوئی کام بھی ہے!

لیکن جب مسلمانوں کے نوجوان طبقہ سے متاثر ہو کر مسلم لیگ نے بھی حکومتِ خود اختیاری کو اپنا نصب العین قرار دیا تو مولانا شبلی نے لفظ سلف گورنمنٹ پر اس طرح اظہارِ خیال کیا۔

یہ چہرے پہ ہے جو سلف گورنمنٹ کے نقاب
بر دیدِ ور اسیرِ طلسمِ مجاز ہے
سمجھے نہ لوگ یہ کہ یہی لفظِ پُر فریب
اس ملک میں طلسمِ غلامی کا راز ہے

مسلم لیگ کے اجلاس آگرہ کی اہمیت

۱۹۱۳ء کا اجلاس مسلم لیگ منعقدہ آگرہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کو از سرِ نو تازگی بخشی گئی اور اجلاس کے صدر مسٹر ابراہیم رحمت اللہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور کہا کہ یہ اتحاد ملک کی سیاسی ترقی کے لیے ناگزیر ہے، البتہ انھوں نے جداگانہ نیابت کی تعریف کی اور کہا کہ جداگانہ طریق انتخاب مسلمانوں کے علیحدہ وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے اور اس ضمن میں ہندوؤں اور بالخصوص انڈین نیشنل کانگریس کے تنقیدی رویہ کی مذمت کی۔ انھوں نے اس بات پر اظہارِ اطمینان کیا کہ مسلمان جہاں تک ملک کے مجموعی مفاد کا تعلق ہے ہندوؤں سے مخلصانہ تعاون برت رہے ہیں، مسٹر ابراہیم رحمت اللہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ ۱۹۱۱ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اچھے نہیں تھے لیکن اب دو سال کے اندر اندر ان تعلقات کو نہ صرف استوار کر لیا گیا بلکہ مسلمان ان تمام نکات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے پر تیار ہیں جو ہندو بھائیوں کی طرف سے پیش کیے جائیں۔ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں ایک کمیٹی کے قیام کی تجویز پیش کی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیتی رہے اور انھیں بہتر اور موثر بنانے کے لیے اپنی مساعی کو برابر جاری رکھے۔ مسٹر ابراہیم رحمت اللہ کے خطبۂ صدارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی جانب سے ہندوؤں کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی کوشش پہلی جنگ

عظیم ہی سے کامیاب و کامراں ہو چکی تھی۔ جنگ عظیم کے دوران ماسوائے گروہ احرار کے جن میں مولانا کا نام بھی شامل ہے اور جو کسی نہ کسی بہانے سے گرفتار کر لیے گئے، مسلمانوں اور ہندوؤں نے جنگ کے سلسلہ میں حکومت سے تعاون کیا اور مسٹر گاندھی نے کہا کہ اگر ہم نے فرانس کے میدان میں اتحادیوں کا ساتھ دیا تو یہ خود ہمارے اپنے مفاد کے حق میں ہو گا۔

جنگ میں تعاون اور ہندو مسلم اتحاد کی از سر نو کوشش

اس جذبہ کے تحت کہ انگریزوں کی فتح ہندوستان کو حکومت خود اختیاری دینے کے مترادف ہو گی، برصغیر میں انگریزوں کی کھلم کھلا مدد کی گئی اور خود انگریزوں نے یہ کہہ کر کہ ان کی جرمنی کے ساتھ جنگ، جمہوریت، مساوات، انصاف اور حق خود ارادیت کے لیے ہے، برصغیر میں ایک نئی امید اور ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا اور تمام لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ اگر ہندو اور مسلمان آپس میں یک جان اور قالب ہو جائیں تو ہندوستان کو حکومت خود اختیاری ملنے میں اور آسانی پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تمام اکابرین نے یہ فیصلہ کیا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس آیندہ ایک ہی مقام پر اور قریب قریب کی تاریخوں میں منعقد کیے جائیں تاکہ دونوں قوموں کے لیڈر آپس کے مشورہ سے اپنے ملک کی سیاسی زندگی کو اتفاق و اتحاد کے جذبہ کے ساتھ مربوط رکھنے کی کوشش کرتے رہیں اور دونوں جماعتوں کے قائدین ایک دوسرے کے اجلاسوں میں شرکت کر سکیں۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں دونوں جماعتوں کے اجلاس بمبئی میں منعقد ہوئے اور یہ سلسلہ ۱۹۲۱ء تک جاری رہا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ بمبئی اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں کہ دونوں جماعتوں کے قائدین اور رضاکاروں نے ایک دوسرے کے اجلاس کو کامیاب بنانے میں مشترکہ طور پر کوشش کی۔ لیگ کے پنڈال کے باہر جو کتبہ لگا ہوا تھا، اس میں لکھا تھا کہ اتحاد قوت کا سرچشمہ ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مسلم لیگ کا خطبۂ صدارت جو مسٹر مظہر الحق نے پڑھا وہ کانگریس کے خطبۂ صدارت سے جو مسٹر ایس پی سنہا نے پڑھا زیادہ واضح اور حریت پرور تھا۔ مسٹر مظہر الحق نے اپنے خطبہ میں مسلمانوں

پر زور دیا کہ وہ ہندوؤں سے خوف کھانا چھوڑ دیں اور ان سے تعاون کریں، اس لیے کہ ہندو مسلم اتحاد ہی سے ملک کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ مسلم لیگ کے اس اجلاس میں کانگریس کے صدر مسٹر سنہا اور ہوم لیگ کی قائد مسز اینی بسنٹ بھی شریک تھیں۔ اس کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوئے۔ اس زمانہ میں چونکہ ہندوستان میں اصلاحات کا چرچا تھا اس لیے ہندوستانیوں کا نقطۂ نگاہ واضح کرنے کے لیے مرکزی اسمبلی کے ۱۹ ہندو مسلم ارکان نے مشترکہ طور پر اصلاحات کی تجاویز حکومت اور وائسرائے کے سامنے پیش کیں تاکہ انگریزوں کو یہ کہنے کا موقع نہ مل سکے کہ ہندوستانی عوام اصلاحات کے مسئلہ پر آپس میں دست و گریباں ہیں۔ پھر کلکتہ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے خاص اجلاس میں ایک اصلاحات کمیٹی مقرر کی گئی جس کی رپورٹ پر مسلم لیگ اور کانگریس کے سالانہ جلسوں میں غور کیا گیا اور اس سلسلہ میں جو قراردادیں منظور کی گئیں ان کو لکھنؤ پیکٹ کا نام دیا گیا۔ کانگریس کے اجلاس لکھنؤ کے صدر مسٹر اے سی مزمدار تھے اور قائداعظم نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی تھی۔ کانگریس کے سالانہ کونشن میں تقریر کرتے ہوئے صدر کانگریس مسٹر مزمدار نے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اختلاف اب قصۂ پارینہ بن گیا ہے۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا کہ ہندوستان کو جلد از جلد حکومتِ خود اختیاری دی جائے۔ لکھنؤ پیکٹ کی ایک بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے حق کو تسلیم کیا تھا۔ ۲۰ اگست کے اعلانِ اصلاحات کی بنیاد یہی اصول تھا۔

میثاقِ لکھنؤ

لکھنؤ پیکٹ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ہندو مسلم تصفیہ کی ایک کامیاب کوشش تھی۔ اس پیکٹ پر ہندوؤں کی جانب سے کانگریس نے اور مسلمانوں کی جانب سے مسلم لیگ نے دستخط کیے۔ معاہدہ کے تحت صوبہ پنجاب میں مسلمانوں کی نیابت ۵۰ فیصد صوبجات متحدہ میں ۳۰ فیصد بنگال میں ۵۱ فیصد بہار اور اڑیسہ

میں ۲۵ فیصد، صوبۂ متوسط ۱۵ فیصد، مدراس میں ۱۵ فیصد اور بمبئی میں ۳۳ فیصد طے ہوئی۔ اصول یہ تھا کہ پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلمان اکثریت میں تھے، غیر مسلموں کو ان کی تعداد سے زیادہ نیابت ملے اور اس کے بدلے میں ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کو ان کی حقیقی تعداد سے زیادہ نیابت دی جائے۔ اس معاہدہ کے تحت یہ بھی طے پایا کہ مرکز میں مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی ہو۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق جو لکھنؤ پیکٹ کی بنیاد تھے بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی علی الترتیب ۵۲.۶ اور ۵۴.۸ تھی، اس معاہدہ کے تحت انھیں علی الترتیب ۴۰.۶ اور ۴۰.۸ فیصد نمائندگی سے ہاتھ دھونے پڑے تھے، اس کے برخلاف بہار اور اڑیسہ میں مسلمانوں کو ۱۰.۵ کے مقابلہ میں ۲۵ فیصد، بمبئی میں ۲۰.۴ کے مقابلہ میں ۳۳.۳ فیصد نیابت اور نمائندگی کا حق ملا اور مرکزی مقننہ میں ۱/۵ ہونے باوجود ۱/۳ نمائندگی کا حق ملا۔ اس پیکٹ سے اور کوئی فائدہ ہو نہ ہو لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اقلیتی اور اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں میں اتحادِ فکر و عمل کی راہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی اور جب مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں قرار دادِ پاکستان پیش کی گئی تو اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے دل کھول کر قرار دادِ پاکستان کی تائید کی۔ لکھنؤ پیکٹ کے مؤثر ہونے کا اندازہ ۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے لگایا جاسکتا ہے جس میں ان کے اہم نکات کو مؤثر نمائندگی دی گئی۔ لکھنؤ پیکٹ نے کانگریس اور مسلم لیگ کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا اور بعد میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مسٹر فضل الحق کی زیرِ صدارت منعقد ہوا تو یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کی گہری حلیف بن چکی تھیں۔

سید سلیمان ندوی کا بیان

سید سلیمان ندوی نے حسرت کی سیاسی زندگی میں اس دور کے واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر روشنی ڈالی اور لکھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے مثالی اتحاد نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا شیر و شکر بنا دیا تھا اور انگریزوں کی یہ سازش کہ ہندو اور مسلمان آپس میں دست و گریباں رہیں دم توڑتی نظر

نظر آرہی تھی۔ سید صاحب نے اپنے اس مضمون میں مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی کے بعض اہم پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی جس کا تعلق مولانا کی ذات سے ہے۔ اس لیے اس کا یہاں پر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ سید صاحب ۱۹۱۵ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "بمبئی وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے مسلم لیگ اور کانگریس کا ملاپ ہوا۔ یہ ۱۹۱۵ء تھا اور یہی سب سے پہلے وہ اسٹیج تھا جہاں مرحوم محمد علی جینا مسلم لیگ کے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے پہلے ظاہر ہوئے۔ سید صاحب آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ شاید لوگوں کے لیے یہ اچنبھے کی بات ہوگی کہ قائد اعظم مرحوم کے نام کا آخری جزو اس وقت تک 'جینا' تھا جس کے معنی گجراتی میں 'دبلے' کے ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں جب وہ لکھنو مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے آئے تو سید جالب مرحوم ایڈیٹر ہمدم کی ذہانت نے اسے جناح بنا دیا۔ جس کے بعد وہ ایسا مشہور ہوا کہ اس نے اصل کی جگہ حاصل کر لی خود میر ابھی اس زمانہ کا ایک شعر ہے جس میں جناح کی جگہ جینا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

ہے مریضِ قوم کے جینے کی بھی کچھ کچھ امید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا

بہر حال سید صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "مظہر الحق مرحوم اس کے صدرِ اجلاس تھے۔ کانگریس کا اجلاس بھی یہیں تھا جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سبب سے اس اجلاس میں ہندو سیاسی لیڈر بھی دوستانہ شریک تھے۔ ابھی صدارتی خطبہ ہی ہوا تھا کہ اسٹیج پر حسرت موہانی نمایاں ہوئے اور انھوں نے کسی چیز کی بڑی شدت سے مخالفت کی۔ بس ایک ہنگامہ جلسہ میں پیدا ہو گیا۔ چند پٹھان جوش و خروش سے آگے بڑھے اور اسٹیج پر قابض ہو گئے۔ آخر جلسہ ملتوی کرنا پڑا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ انگریز حکام کی تحریک سے گورنر کو خوش کرنے کے لیے بمبئی کے بعض سر برآوردہ لوگوں نے کرایہ کے پٹھانوں کی مدد سے جلسہ کو درہم برہم کر دیا۔ غلط فہمی سے لوگ حسرت مرحوم کی نسبت سوئے ظن کرنے لگے۔ حالاں کہ ان کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ اس معمولی بات کو لوگوں نے ہنگامہ کا موقعہ بنا لیا۔" مولانا ندوی کے بقول "اب مسلم لیگ اور کانگریس

یک جان اور دو قالب تھیں۔ ایک ہی جگہ دونوں کے جلسے ہوتے اور ایک کے لیڈر دوسرے کے اجلاس میں خاص طور پر شریک ہوتے تھے۔ اب خلافت کی تحریک شروع ہوئی۔ مسلم لیگ کے رہنما جن میں اس وقت لکھنؤ کے اندر مہاراجہ محمود آباد اور چودھری خلیق الزمان اور دوسری طرف مولانا عبدالباری فرنگی محلی خدامِ کعبہ کے صدر کی حیثیت سے جس کے سیکرٹری شوکت علی مرحوم تھے سربراہی کے لیے اٹھے۔ راجہ صاحب تو پیچھے رہ گئے اور سرکاری مناصب میں الجھ گئے۔ چودھری صاحب اور مولانا عبدالباری باہم شریکِ کار تھے اور آخر دونوں صاحبوں کی شرکت سے خلافت کا پہلا جلسہ مسلم لیگ کے زیرسایہ شروع ہوا، اس کی تفصیل اپنے مقام پر بیان ہو چکی ہے لیکن اس کے بعد خلافت کی تحریک جیسے جیسے زور پکڑتی گئی مسلم لیگ اس کے لیے جگہ خالی کرتی گئی۔

مسلم لیگ کا اجلاس امرتسر

۱۹۱۹ء میں کانگریس مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی تینوں کے سالانہ اجلاس امرتسر میں ہوئے اور مولانا نے تینوں میں شرکت کی۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک تجویز منظور کی گئی جس کے ذریعہ حکومت برطانیہ کے اس رویہ کی مذمت کی گئی جو اس نے خلافت اور جزیرۃ العرب کے بارے میں مسلمانانِ ہند کے جذبات کے ساتھ روا رکھا۔ اس تجویز میں کہا گیا تھا کہ حکومتِ ہند کے اس رویہ کی وجہ سے مسلمانانِ ہند حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن کے تمام ذرائع اختیار کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ مولانا نے اس تجویز میں یہ ترمیم پیش کی کہ ذرائع کے دائرہ میں ہندوستانی افواج کے بائیکاٹ کو بھی شامل کیا جائے گا کیوں کہ ان افواج کے بارے میں شبہ ہے کہ انھیں شہنشاہی اور غیر اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ یہ ترمیم کافی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ بعد میں علی برادران نے اس قرارداد کے تحت افواج کو حکومت برطانیہ کے ساتھ وفاداری سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔

مسلم لیگ کے اجلاس علما کی شرکت

۱۹۲۰ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مسٹر فضل الحق کی زیرِ صدارت ہوا جس میں پہلی بار علما کی ایک بڑی تعداد مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی زیرِ قیادت شریک ہوئی اور اس طرح انھوں نے سیاست میں باضابطہ طور شمولیت اختیار کی۔ گاندھی جی بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔ مولانا نے اس اجلاس میں گاندھی جی کے کھدر چرخے کی پالیسی کی مخالفت کی کیوں کہ وہ سودیشی کے حامی تھے۔ اس موقع پر ان کے اور مسٹر گاندھی کے درمیان جو کشمکش ہوئی اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

احمد آباد مسلم لیگ

اب ۱۹۲۱ء شروع ہوا اور اس سال کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کا سالانہ اجلاس احمد آباد میں ہوا۔ احمد آباد کانگریس میں مولانا نے یہ قرارداد پیش کی کہ کانگریس کے نصب العین میں جس جگہ سوراج کا لفظ آیا ہے اس سے مراد کامل آزادی لیا جائے۔ مگر یہ قرارداد مسٹر گاندھی کی کوششوں سے منظور نہیں ہو سکی، اس کا تفصیلی ذکر کانگریس کے تذکرہ میں آچکا ہے، لیکن مولانا مسلم لیگ کے اجلاس احمد آباد کے صدر تھے اس لیے انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں دل کھول کر کامل آزادی کا ذکر کیا۔ اور مسٹر گاندھی کے اصلی مشن کو تہ تک پہنچ جانے کہ بعد کو وہ ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہیں، یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں امریکی طرز کی ریاست ہائے متحدہ ہندوستان قائم کی جائے جس میں زیادہ اختیار صوبوں کو ہوں تاکہ ہندو اکثریت کے زعم میں مسلمانوں کو اپنا غلام رکھنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ مسٹر گاندھی کامل آزادی کے ضمن میں اور مولانا کی ناکامی پر بہت خوش تھے اور اس سلسلہ میں ثبوت کے طور پر ینگ انڈیا میں مسٹر گاندھی کا اعتراف پڑھیے۔ فرماتے ہیں کہ مولانا حسرت موہانی نے کانگریس کے پلیٹ فارم پر آزادی کی بڑی جدوجہد کی اور پھر مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے قرارداد آزادی پیش کی مگر خوش قسمتی سے ہر دو مقامات پر انھیں ناکامی ہوئی۔

خطبۂ صدارت

مولانا نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ سب سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں کے بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد پر نظر ثانی کی جائے۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ سوراج کے تصور کو جان بوجھ کر مبہم اور ادھورا چھوڑا گیا ہے۔ کانگریس کا مقصد اور کریڈٹ یہ ہے کہ اگر خلافت اور پنجاب کی بابت غلطیوں کی تلافی ہمارے مطالبات کی بنیاد پر ہو جائے تو پھر برطانوی سلطنت میں سوراج ہمارے لیے کافی ہو گا، ورنہ پھر کامل آزادی کے لیے جدوجہد کی جائے گی لیکن مسلمانوں کے زاویہ نگاہ سے ان کا بنیادی مقصد آزادیٔ کامل ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ آزادی کے بعد کیا نقشہ ہو گا۔ اس لیے اس چیز کا فیصلہ بھی ضروری ہے۔ میرے خیال میں موجودہ ہندو مسلم اتحاد کے باوجود ہندوستان کے ان دونوں اہم فرقوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں میں سنگین اختلاف موجود ہیں اور مسلمانوں کو اندیشہ ہے کہ حکومتِ خود اختیاری کے حصول کے بعد ہندو اپنی عددی اکثریت مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کریں گے۔ ہندوؤں کے دل میں شبہ ہو سکتا ہے کہ موقع ملنے پر یا تو ہم اپنے ہم مذہبوں کو باہر سے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے بلائیں گے یا کم از کم ان کو مدد بہم پہنچائیں گے اور مسلمانوں کو یہ شبہ ہے کہ حکومتِ خود اختیاری حاصل ہو جانے پر ہندو زیادہ سیاسی اختیارات حاصل کریں گے۔

مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد پر بھی تنقید کی اور فرمایا کہ اگر برطانوی حکومت آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لیے جبر و تشدد سے کام لے تو مسلمانوں کو بھی قرآن پاک کے اس فیصلہ پر عمل کرنا چاہیے اور اس کا مناسب جواب دینا چاہیے۔" مولانا اپنے اس خطبۂ صدارت میں آگے چل کر فرماتے ہیں کہ اگرچہ مسلمان مجموعی طور پر ہندوستان میں اقلیت میں ہیں پھر بھی قدرت نے انھیں اس عددی اقلیت کا نعم البدل عطا فرمایا ہے۔ یعنی مسلمان تمام صوبوں میں اقلیت میں نہیں ہیں۔ چند صوبوں میں جیسے کشمیر، پنجاب، سندھ، بنگال اور آسام میں مسلمان عددی اعتبار سے ہندوؤں سے زیادہ ہیں، چنانچہ ریاست متحدہ ہندوستان میں مدراس، بمبئی اور یوپی کی اکثریت کو اس بات کی اجازت نہیں

دی جائے گی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ایک مقررہ حد سے آگے بڑھیں۔ مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہ بھی اعلان کیا کہ یکم جنوری ۱۹۲۲ء کو انڈین ریپبلک (یونائیٹڈ اسٹیٹس آف انڈیا) کا اعلان کر دیا جائے اور اگر انگریز نہ مانیں تو ان کے ساتھ گوریلا جنگ شروع کر دی جائے۔ مولانا نے اس کے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی کیا کہ ایک حکومت کو تبدیل کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک تو تلوار کا استعمال ہے جس کو دنیا نے اختیار کیا ہے اور دوسرا طریقہ متوازی، از خود اور خود مختار حکومت کے قیام کا اعلان ہے اور وہ خود بذاتِ خود اس دوسرے طریقے کے حق میں ہیں۔ مولانا نے اس خطبہ میں یہ تجویز بھی پیش کی کہ مسلم لیگ کے دروازے عام لوگوں کے لیے کھول دیے جائیں اور فیس رکنیت کم کی جائے۔ مولانا نے اس خطبہ میں آگے چل کر کہا کہ اگر حکومت برطانیہ خلافت اور پنجاب کے مسائل طے نہ کرے تو مسلم لیگ کا مقصد آزادیٔ کامل سے بھی زائد ہونا چاہیے۔" مولانا احمد آباد مسلم لیگ کی صدارت فرما کر کانپور واپس ہی ہوئے تھے اور اپنی اکلوتی صاحبزادی نعیمہ بیگم کی شادی کے انتظامات میں مصروف تھے کہ شادی سے چند یوم قبل مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت اور عدم تعاون کی تحریک میں دلچسپی کی بنا پر انھیں تیسری اور آخری بار گرفتار کیا گیا اور ان کا خطبۂ لیگ بحق سرکار ضبط ہوا۔ اس گرفتاری کے سلسلہ میں بیگم حسرت موہانی نے جو عظیم کردار ادا کیا اس کا تفصیلی تذکرہ مولانا کی ازدواجی زندگی کے باب میں ہو چکا ہے لیکن مولانا ... کے خطبۂ صدارت کی ضبطی سے مسلم لیگ کو یہ شرف ضرور حاصل ہوا کہ اس کا نام بھی شہیدوں میں شامل کیا گیا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے مسلم لیگ کی تاریخ میں یہ شاید پہلا اور آخری موقع تھا کہ اس کا صدر اس قدر انقلاب انگیز خیالات کا اظہار کرے کہ وہ خود بھی گرفتار کیا جائے اور اس کے ارشادات بھی ضبط کیے جائیں اور کانگریس کو تو اس قسم کا شرف کبھی حاصل ہی نہیں ہوا۔

تیسری گرفتاری

مولانا کو کانپور سے گرفتار کر کے احمد آباد لے جایا گیا، اس لیے کہ یہ خطبہ احمد آباد میں ہی پیش کیا گیا تھا اور وہاں ان پر دفعہ ۱۲۴ الف اور دفعہ ۱۲۱ کے تحت

مقدمہ چلایا گیا۔ یہ بغاوت کا مقدمہ تھا اور جج نے جیوری کی رائے سے اختلاف کرنے کے بعد انھیں دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت دو سال قیدِ سخت کی سزا سنادی۔ دفعہ ۱۲۱ کے تحت چونکہ مقدمہ کی سماعت صرف ہائی کورٹ کر سکتی تھی اس لیے انھیں بھی ہائی کورٹ میں پیش کیا گیا۔ جہاں مولانا نے آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ثابت کیا کہ مسلمان بعض حالات میں جہاد پر مجبور ہیں۔ بمبئی ہائی کورٹ کی روداد حسرت موہانی ۱۹۲۴ء بمبئی ایل آر ۸۸۶ میں مولانا کے یہ الفاظ قابلِ ذکر ہیں کہ کانگریس کے پر امن اور جائز طریقے سے سوراج حاصل کرنا مسلمانوں کے فطری اور مذہبی اصولوں کے خلاف ہے اور ایک وقت آئے گا جب مسلمان پُرامن نہیں رہیں گے۔ ہائی کورٹ نے مکمل سماعت کے بعد مولانا کو بغاوت کے جرم سے بری کر دیا لیکن چونکہ دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت دی جانے والی سزا بحال تھی اس لیے وہ بدستور قید میں رہے اور چونکہ احمد آباد کی آب و ہوا ان کو راس نہیں آئی اور صحت خراب رہنے لگی تو انھیں احمد آباد سے پونا کے یر وادا جیل میں منتقل کیا گیا جہاں وہ وسط ۱۹۲۳ء سے مارچ ۱۹۲۴ء تک رہے۔ اس اثنا میں ان پر قواعدِ جیل کی خلاف ورزی کے سلسلہ میں ایک اور مقدمہ چلا جس سے ان کی میعادِ قید میں اور اضافہ ہو گیا لیکن اپیل پر یہ سزا ختم ہو گئی۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران بعض دلچسپ باتیں ہوئیں جن کا آنکھوں دیکھا حال جناب ضیاالدین برنی بیان فرماتے ہیں کہ "ایک مقدمے سے جو حکومتِ بمبئی کی طرف سے ایک تقریر کے سلسلہ میں ان پر قائم ہوا تھا، میرا بھی تعلق تھا، اس لیے کہ ان کی تقریر کے انگریزی ترجمہ کا کام میرے سپرد تھا اور مقدمہ کے سارے کاغذات بھی میری تحویل میں تھے۔ حکومت نے حکم دیا تھا کہ مولانا جہاں کہیں بھی ہوں گرفتار کر لیے جائیں۔ مجھے معلوم تھا کہ مولانا کی صاحب زادی کی شادی ہونے والی ہے لیکن مجھے ڈر تھا کہ مولانا یا ان کی بیگم صاحبہ کو اطلاع دے دی گئی تو یہ بات کہیں ظاہر نہ ہو جائے، چنانچہ میں نے اطلاع نہیں دی اور مولانا گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ میں مترجم کی حیثیت سے مجھے ہی جانا چاہیے تھا ایک بات ہوئی جس کی وجہ سے میری جگہ ہمارے دفتر کے افسرِ اعلیٰ جملہ دفتری روایات کے برخلاف بنفسِ نفیس گواہی دینے کے لیے احمد آباد پہنچ گئے حالاں کہ ان کا ترجمہ سے صرف اتنا تعلق تھا کہ انھوں نے بے پڑھے اس پر اپنے دستخط ثبت کیے تھے

اور چونکہ عدم تعاون کا زمانہ تھا اور ملزمین عدالتوں کی کارروائیوں میں مطلق حصہ نہیں لیتے تھے اس لیے انھوں نے سمجھا ہوگا کہ مفت میں فسٹ کلاس کا کرایہ اور ڈیلی الاؤنس ملے گا اور نام بھی ہو جائے گا، چنانچہ مترجم کی حیثیت سے جب وہ پیش ہوئے تو مولانا نے جنھیں معلوم تھا کہ ترجمہ کس نے کیا، ان سے پوچھا کہ کیا یہ ترجمہ آپ نے کیا ہے۔ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر مولانا نے سی آئی ڈی کی تحریر کردہ تقریر طلب کی۔ وہ پنسل کی لکھی ہوئی تھی اور بار بار کے ہاتھ لگنے سے کئی جگہ سے مٹ سی گئی تھی۔ مولانا نے وہی خراب حصہ گواہ کو پڑھنے کے لیے دیا۔ گواہ نے بات بناتے ہوئے کہا کہ ترجمہ اگرچہ میرے اسسٹنٹ نے کیا ہے لیکن میں نے اس کا لفظاً لفظاً مطالعہ کیا ہے۔ یہ حصہ مٹا ہوا سا ہے اس لیے مجھے وقت ملنا چاہیے کہ میں اس کا مطالعہ کر سکوں چنانچہ عدالت کچھ دیر کے لیے برخواست ہو گئی۔ جب عدالت دوبارہ بیٹھی تو گواہ نے کہا کہ میں اب اس حصہ کو پڑھ سکتا ہوں، اس پر مولانا نے فرمایا کہ میں صرف یہ دکھانا چاہتا تھا کہ یہ گواہ اردو سے کتنا نابلد ہے۔ بہرحال عدالت میں مفروضہ مترجم کی بہت کرکری ہوئی اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی طرف سے اس مقدمے کی جو روداد اخبارات کو بھیجی گئی اس نے بھی اس واقعہ کو مزید شہرت دے دی۔ شعیب قریشی صاحب نے جو مقدمہ کی کارروائی دیکھنے کے لیے عدالت میں موجود تھے، گواہ سے طنزاً کہا کہ شیخ صاحب میرا اخبار ینگ انڈیا انگریزی میں نکلتا ہے، اس لیے آپ کو اس کے مضامین کا ترجمہ کرنے کی زحمت تو نہ اٹھانی پڑتی ہوگی۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس کے رہ گئے۔ احمد آباد کے مقدمہ کے کچھ دن بعد مولانا پر ایک اور مقدمہ چلا تھا۔ جو قواعد جیل کے کسی قاعدہ کی خلاف ورزی کے سلسلہ میں تھا۔ چونکہ مولانا ملک کے سیاسی مسلک کے پیرو تھے اور اس کا علم مرہٹہ سپاہیوں کو تھا، بالخصوص ان کو جو جیل میں وارڈر کی حیثیت سے متعین تھے، اس لیے وہ مولانا کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کے لیے ہر قسم کی سہولت مہیا کرتے تھے، وہ مولانا کے لیے اخبار لا کر دیتے تھے۔ یہ چیز جیل کے قواعد کے خلاف تھی۔ چنانچہ جب ان پر مقدمہ چلایا گیا تو وارڈر نے جرم کو اپنے اوپر اوڑھ لیا اور مولانا پر آنچ نہ آنے دی۔ مولانا کی ازدواجی زندگی میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے۔ بیگم صاحبہ نے اس وارڈر کو

کو بچانے کے لیے ہائی کورٹ میں اپیل کی جہاں سے گو وہ بری ہوا اور اس کا مولانا کو بھی فائدہ پہنچا۔ مولانا کو احمد آباد جیل میں صعوبتوں اور پریشانیوں کے باوجود تائیدِ ایزدی حاصل رہی اور ان پر انوارِ الٰہیہ کی بارش ہوتی رہی۔ اس بات کا اعتراف انھوں نے خود درج ذیل اشعار میں کیا ہے۔

جیل سابر متی میں آج کیا ہی — نسیمِ رحمت، فضلِ الٰہی
جمالِ التفاتِ شاہِ جیلاں — ہوا پیدا بہ شانِ کج کلاہی
بہ یک دم دے دیا دینا تھا جو کچھ — دکھا دی شانِ حسنِ کم نگاہی
شہِ عبدالصمد کا واسطہ تھا — ذکیوں کر سرِّ حق کھُلتا کماہی
دلِ حسرت ہوا معمورِ انوار — شہِ رزّاق دیتے ہیں گواہی

مسلم لیگ کی نشاطِ ثانیہ

مولانا نے مسلم لیگ کی نشاطِ ثانیہ میں بڑی سرگرمی سے حصّہ لیا اور جس چیز کا اعلان انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے کیا تھا اسے مسلم لیگ کے نصب العین کا جزو بنا کر چھوڑا یعنی جو تجویز ریاست ہائے متحدہ ہندوستان کی انھوں نے ۱۹۲۱ء میں پیش کی تھی وہی تجویز ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے آئین کا جزو بنا دی۔ مولانا جمال میاں تحریر فرماتے کہ مولانا ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کی تنظیمِ جدید سے وابستہ ہو گئے۔ یوپی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے رکن بنے۔ اس وقت مسلم لیگ کو مسلمان عوام میں مقبول بنانے میں مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان اور مولانا حسرت موہانی کا بڑا حصّہ ہے۔ دیہات کے اکثر مسلمان قائدِ اعظم کے نام سے واقف نہیں تھے۔ کانگریس کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا تھا کہ مسلم لیگ صرف نوابوں اور آرام طلبوں کی جماعت ہے۔ مسلم لیگ کی طرف سے مولانا کا نام ان اعتراضات کا مسکت جواب تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ راقمِ تحریر نے قائدِ اعظم کا تعارف اس طور پر کرایا کہ وہ مولانا حسرت موہانی، شوکت علی اور مولانا ظفر علی خان جیسے مجاہدینِ حریت اور زعمائے اسلام کے تسلیم شدہ لیڈر ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے اس حصّہ کے نفاذ نے بھی جس کا تعلق صوبوں سے تھا، بڑی حد تک بے چینی پیدا کی

تھی اور ان میں یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ اگر مسلمانانِ ہند ایک مرکز پر جمع نہ ہوئے تو ہندو اکثریت انھیں تباہ کر دے گی۔ ان میں خاص طور پر کانگریس کے رویہ سے بڑی مایوسی پیدا ہوتی تھی جو یوپی کی کابینہ میں دو مسلمان ممبر بنانے پر کسی طرح راضی نہیں تھی اور ضد کا یہ عالم تھا کہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد ان کی سفارش کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھا گیا۔ مسلمانوں کو یوں تو عام طور پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے اختلاف تھا اور وہ اس ایکٹ کے مرکزی حصہ کو کسی طرح قبول کرنے پر تیار نہیں تھے لیکن انھوں نے اس کے اس حصہ کو جس کا تعلق صوبوں سے تھا شدید اعتراضات کے باوجود افہام و تفہیم کے جذبہ کے تحت قبول کر لیا تھا اور جب ایکٹ کے تحت صوبائی انتخابات ہوئے تو ابتدا میں کانگریس، مسلم لیگ اور جمیعۃ العلمائے ہند نے مشترکہ طور پر الیکشن میں حصہ لیا لیکن جب انتخابات میں کانگریس نے ہندو اکثریتی صوبوں میں بھاری اکثریت حاصل کر لی اور مسلم لیگ کو یوپی کے علاوہ دوسرے صوبوں میں، خاص کر مسلم اکثریتی صوبوں میں کامیابی نہ ہوئی تو کانگریس اپنے اصلی روپ میں آگئی۔ جناب فدا احمد صاحب عباسی نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے نفاذ کے بعد جب عام انتخابات ہوئے تو مولانا نے مسلم لیگی امیدواروں کو کامیاب بنانے کے لیے صرف اپنے ہی صوبہ میں نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں دورہ کیا۔ یہ انتخابات وہ پہلے انتخابات تھے جن میں مسلم لیگ نے من حیث الجماعت حصہ لیا تھا۔ اس لیے مسلم لیگ کا پیغام عوام تک پہنچانے کے لیے اور ان کو لیگ کا ہمنوا بنانے کے سلسلہ میں مولانا حسرت اور دوسرے لیڈروں کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ انتخابات کی صورت حال یہ تھی کہ یوپی میں مسلمانوں کی ۶۴ نشستیں تھیں جن میں مسلم لیگ ۲۶۔ آزاد مسلمان ۲۸۔ نیشنل ایگریکلچر پارٹی ۹ اور کانگریس مسلمان ۱۔ بنگال میں کل ۲۵۰ نشستوں میں سے کانگریس کو ۵۴۔ غیر کانگریسی ہندوؤں کو ۴۲۔ آزاد مسلمانوں کو ۴۳۔ مسلم لیگ کو ۴۰۔ دیگر مسلمانوں کو ۳۸، اینگلو انڈین کو ۳۱ اور غیر جانبدار مسلمانوں کو ۲ نشستیں ملی تھیں۔ پنجاب میں کانگریس کو ۱۸۔ مسلم لیگ کو ۲، دیگر مسلمانوں کو ۴۔ غیر کانگریسی ہندوؤں اور سکھوں کو ۳۶۔ یونینسٹوں کو ۸۸ اور غیر جانب دار ارکان کو ۷ نشستیں ملی تھیں۔ آسام میں پارٹی پوزیشن یہ تھی۔ کانگریس ۳۵۔ آزاد مسلمان ۹، مسلم لیگ ۹۔

وادیٔ آسام کے مسلمان ۵ ۔ وادی سرما کے مسلمان ۵ ۔ کرشک پرجا پارٹی ۱۔ آزاد ہندو ۱۰ ۔ مزدور ۴ ۔ متحدہ عوامی پارٹی ۲ ۔ ہندوستانی کاشت کار ۲ عیسائی ۱ ۔ آزاد خاتون اور یورپین ۹ ۔ سندھ میں ساٹھ نشستیں تھیں ۔ ان میں سندھ متحدہ پارٹی (مسلم) کو ۱۸ ۔ سندھ ہندو مہا سبھا ۱۱ ۔ آزاد مسلمان کو ۹ ۔ کانگریس کو ۸ ۔ سندھ مسلم پارٹی کو ۴ ۔ سندھ آزاد پارٹی کو (کانگریس نواز) کو ۳ ۔ آزاد ہندوؤں کو ۲ ۔ آزاد مزدوروں کو ۱ اور غیر جانبدار افراد کو ۴ ۔ مدراس میں کانگریس نے ۷۴ فی صد بمبئی میں ۴۸ فی صد ۔ بہار میں ۶۳ فی صد ۔ صوبہ متوسط میں ۶۳ اور صوبہ سرحد میں ۳۸ فیصد نشستیں حاصل کیں ۔ انتخابات کے بعد یوپی ، بہار ، اڑیسہ ۔ سی پی مدراس اور سرحد میں کانگریسی وزارتیں بنیں ۔ پنجاب میں یونینسٹ برسرِ اقتدار آئے ۔ بنگال میں مسلم لیگ اور کرشک پرجا پارٹیاں مل گئیں اور وزارت بنائی ۔ جھگڑا اس وقت شروع ہوا جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے جب کانگریس نے طاقت کے نشہ میں چور ہو کر اپنی ہندو ذہنیت کو بے نقاب کر دیا اور نہ صرف مسلم لیگ کے دستِ تعاون کو جھٹک دیا بلکہ کسی ہندو اکثریتی صوبہ میں کسی کانگریسی مسلمان کو وزیرِ اعلیٰ نہیں بنایا حالاں کہ اس قسم کے کانگریسی مسلمان موجود تھے ۔ خود یوپی میں مسٹر رفیع احمد قدوائی سینارٹی اور اثرات میں پنڈت گووند بلبھ پنتھ پر ہر طرح سبقت رکھتے تھے مگر قرعہ پنتھ کے حق میں آیا ۔ یہی نہیں بلکہ مسلم اقلیت کا جینا دوبھر کر دیا گیا ۔ ایسے ماحول میں مسلمانوں کا مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہونا اور خاص طور پر ایسے حالات میں کہ مسلمانوں کے مشہور حریت پرست قائدین اس میں شامل ہو گئے ہوں ، مسلم لیگ کو مسلمانوں کی محبوب ترین جماعت بنانے کے لیے کافی تھا ۔ ایسے ماحول میں جب مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تو اس میں مولانا حسرت موہانی ، مولانا ظفر علی خان اور مولانا شوکت علی کے ساتھ ساتھ وزیرِ اعلیٰ بنگال مولوی فضل الحق اور وزیرِ اعلیٰ پنجاب سر سکندر حیات خان بھی شریک تھے لیکن ان میں سب سے نمایاں کردار مولانا حسرت موہانی کا تھا ، جن کی کوششوں سے اس اجلاس میں مسلم لیگ کا نصب العین کامل آزادی اور ایسا وفاقی طرزِ حکومت معین ہوا جس میں تمام صوبے اندرونی طور پر آزاد ہوں ۔ مولانا نے

مسلم لیگ سیشن میں اپنی قرارداد کو پیش کرتے ہوئے واضح طور پر اعلان کیا کہ وہ وفاق ہند کے صوبوں کی داخلی خود مختاری کے اس لیے خواہاں ہیں کہ مرکزی حکومت مسلمانوں کے اکثریت والے صوبوں کے ساتھ ناانصافی نہ کر سکے اور اگر وہ ناانصافی کی کوشش کرے تو یہ صوبے وفاق سے الگ ہو سکیں اور اگر ہندو اکثریت والے صوبے درجہ مستعمرات پر قناعت کرنے کے لیے آمادہ و تیار ہوں تو مسلم اکثریت والے صوبوں کو آزادی ہو کہ وہ اپنی آزاد حکومت خود بنالیں اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والے ہندو اکثریتی صوبوں سے اپنا تعلق منقطع کر لیں۔ اور اگر وا ازارت ہو تو اپنی کامیابی و کامرانی اور استحکام کے لیے جمہوریہ روس سے تعلقات استوار کر لیں۔ مولانا نے اپنی تقریر میں آگے چل کر فرمایا کہ مسٹر گاندھی کی مخالفت کی وجہ سے میں ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کانگریس میں آزادی کی قرارداد کو منظور کرانے میں ناکام رہا مگر مجھے یقین ہے کہ میں آزادیٔ کامل کی جو قرارداد مسلم لیگ کے اس تاریخی اجلاس میں پیش کر رہا ہوں اسے یہ اجلاس متفقہ طور پر منظور کرے گا اور خدا کے فضل و کرم سے مولانا کی یہ قرارداد اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں کی گونج میں منظور کر لی گئی۔ لکھنو کے مشہور اخبار روزنامہ تنویر کے نیوز ایڈیٹر جناب فدا احمد عباسی نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے تاریخ ساز سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنو کو کامیاب بنانے میں مولانا حسرت موہانی نے سرگرم حصہ لیا کیوں کہ اس زمانہ میں لکھنو کی فضا انتہائی خراب تھی اور مسلمان آپس میں لڑ رہے تھے جن سے مسلمانوں کے دشمن پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ مولانا ہی کی کوششوں سے مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کامیاب ہوا۔ مجلس استقبالیہ کی پروپیگنڈہ کمیٹی جلسے تک نہیں کر سکتی تھی اور بعض محلوں میں تو جلسہ کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حالت یہ تھی کہ کہیں جلسوں پر پتھراؤ کیا جاتا تھا، کہیں دریاں چھین لی جاتی تھیں۔ کہیں گیس کے ہنڈے توڑ ڈالے جاتے تھے۔ غرضیکہ ہر جگہ لیگ والوں کی درگت بنائی جاتی تھی۔ اس صورتِ حال کی بنا پر مجلس استقبالیہ کے عہدہ داروں نے مولانا حسرت کو کانپور سے لکھنو بلوایا اور انھوں نے اتحاد بین المسلمین کی ضرورت اور اہمیت پر اتنی مؤثر تقریریں

کیس کرفضا کا تکدر دور ہو گیا اور لکھنؤ کے مرکزی مقام امیر الدولہ پارک میں مسلم لیگ جلسہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس جلسہ میں مولانا حسرت نے بھی تقریر کی۔ قصہ مختصر ان تیاریوں کے بعد مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ راقم الحروف تو یہاں تک کہہ سکتا ہے کہ مولانا کے ہمراہ کانپور سے سینکڑوں مسلمان نوجوان لکھنؤ گئے جس کی وجہ سے لکھنؤ میں قائد اعظم کے جلوس کے موقع پر کالی جھنڈیوں کے مظاہرے کی ہمت نہ پڑ سکی اور ایک آدھ جگہ جب سیاہ جھنڈیوں کے مظاہر کی ہمت بھی کی گئی تو مسلم لیگ کے رضاکاروں نے اسے بروقت ناکام بنا دیا۔

مولانا کی قرارداد

مسلم لیگ کے شائع شدہ ریکارڈ کے مطابق جس میں اکتوبر ۱۹۳۷ء سے لے کر دسمبر ۱۹۳۸ء تک کی تمام قراردادوں کو کتابی شکل میں مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خاں ایم اے اکسن ایم ایل اے یوپی بیرسٹرایٹ لاء نے شائع کیا تھا۔ اس میں ان قراردادوں کے ساتھ جو آل انڈیا مسلم لیگ کے ۲۵ ویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۵، ۱۶، ۱۷ اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو زیر صدارت قائد اعظم محمد علی جناح منظور ہوئی تھیں۔ مولانا کی پیش کردہ ۸ ویں قرارداد کے الفاظ حسب ذیل ہیں: "طے پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا نصب العین مکمل آزادی ہو گا اور اس کا مطمع نظر آزاد جمہوری ریاستوں پر مشتمل ایک ایسے فیڈریشن کا قیام ہو گا جس کے آئین میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کی نگرانی اور نگہداشت کی مکمل اور مؤثر ضمانت دی گئی ہو۔" اس قرارداد کے نیچے مجوز کی حیثیت سے مولانا حسرت موہانی یوپی اور موئد کی حیثیت سے مولانا ظفر علی خان پنجاب کا نام درج ہے۔ کتابچہ میں آگے چل کر تحریر ہے کہ شمس الحسن صاحب (بنگال) مولانا مظہر الدین (دلی) مسٹر عبدالرؤف صاحب (سرحد) مولانا سید مرتضیٰ بہادر صاحب ایم ایل اے (مدراس) سید عبدالرؤف صاحب (سی پی) آنریبل حسین امام صاحب (بہار) مسٹر غیاث الدین صاحب ایم ایل اے (پنجاب) مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی صاحب (بنگال) مسٹر آئی آئی چندریگر (بمبئی) منشی اطہر علی صاحب ایم ایل اے (یوپی) اور چوہدری خلیق الزمان صاحب (یوپی) نے قرارداد کی حمایت کی۔

فیڈرل نظامِ حکومت کی مخالفت

مسلمان ہندوؤں کے طرزِ عمل سے اس قدر مایوس ہو گئے تھے کہ انھوں نے گورنمنٹ آف انڈیا مجریہ ۱۹۳۵ء کے اس حصّہ کے نفاذ کی بھی مخالفت کی جس کا تعلق فیڈریشن سے تھا۔ چنانچہ اسی اجلاس مسلم لیگ میں مولانا کی کوششوں سے ایک اور قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا کہ مسلمان ہندوستان میں فیڈرل نظامِ حکومت کے نفاذ کو کبھی منظور نہیں کریں گے اس سلسلہ میں جو قرارداد منظور کی گئی اس میں مولانا کا نام قرارداد کے موید کی حیثیت سے مذکورہ بالا کتابچہ میں درج ہے۔ قرارداد کا متن یہ ہے:۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ کے تحت آل انڈیا فیڈریشن کی اسکیم کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کے نفاذ کی مذمت کرتا ہے اور حکومتِ برطانیہ پر زور دیتا ہے کہ وہ اس کے نفاذ سے باز رہے۔ اس لیے کہ اس کا نفاذ اہلِ ہند کے مفادات کے عموماً اور مسلمانوں کے مفاد کے خصوصاً خلاف ہے۔ اس قرارداد کو آنریبل حسین امام (بہار) نے پیش کیا۔ مولانا حسرت موہانی یو۔پی نے اس کی تائید کی اور مسٹر آئی آئی چندریگر نے تائید مزید فرمائی۔

فلسطین کانفرنس

مولانا ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کے سہ رکنی وفد کے ممبر کی حیثیت سے فلسطین کانفرنس میں شرکت کے لیے قاہرہ تشریف لے گئے۔ مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی اور چوہدری خلیق الزماں بھی اس وفد کے رکن تھے۔ وفد کی روانگی کا فیصلہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اس اجلاس میں ہوا جو ۳۰، ۳۱ جولائی ۱۹۳۸ء کو دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ بھی ہوا کہ سارے ملک میں ۲۶ اگست کو یوم فلسطین منایا جائے کونسل نے اس ضمن میں جو قرارداد منظور کی اس میں تمام مسلمانوں سے پُرزور اپیل کی گئی کہ حکومتِ برطانیہ کی غیر منصفانہ جابرانہ اور غیر انسانی پالیسی کے خلاف جلسے کریں اور مذمت کی قرارداد پاس کریں۔ اور ہمارے عرب بھائیوں نے اپنے ملک کی آزادی

کے لیے جو باعزت اور منصفانہ جدوجہد شروع کی ہے۔ اس کی کامیابی کے لیے بارگاہِ رب العزت میں دعا کریں۔ قرارداد میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ برطانوی اشیاء کے بائیکاٹ کے لیے قواعد اور ضوابط تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو تمام معاملات پر غور کرنے کے بعد کونسل کے سامنے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کرے جس سے حکومت برطانیہ پر اپنی ناجائز پاس تبدیلی کرنے کے لیے زور ڈالا جائے۔ کونسل نے اس کمیٹی کی رکنیت کے لیے جن قائدین کا انتخاب کیا اس میں مولانا کا نام سرفہرست تھا۔ کمیٹی کے دوسرے ارکان کے نام یہ ہیں۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی خاں، مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی، مولانا قطب الدین عبدالوالی، مولانا مظہر الدین اور مسٹر عزیز احمد خان۔ مولانا نے فلسطین کانفرنس قاہرہ میں جو تقریر کی اس میں سب سے پہلے انھوں نے حکومت برطانیہ کے طریقۂ کار اور مسلمانوں کے بارے میں اس کی منظم مخالفانہ روی کی پوری طرح وضاحت کی اور عربوں کو بتایا کہ انگریزی وعدوں پر بھروسہ کرنے کا مطلب اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے اور اپنے آپ کو خواہ مخواہ خوش فہمی کا شکار بنانا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر آپ فلسطین کو واقعی آزاد دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے عربوں کو جدوجہد اور وہ بھی مسلسل جدوجہد کے لیے تیار ہونا پڑے گا۔ سید حسن مثنیٰ ندوی نے اس کانفرنس کی کارروائی پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرمایا کہ ۱۹۳۸ء میں جب ورلڈ مسلم کانفرنس قاہرہ میں مسئلہ فلسطین پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوئی اور برِّ عظیم سے بھی مختلف جماعتوں کے نمائندے شریکِ اجلاس ہوئے تو مولانا حسرت بھی گئے۔ وہاں ساری دنیا کے مسلم ممالک اور مسلم جماعتوں کے سربراہ سر جوڑے بیٹھے تھے۔ مولانا نے بحث و تمحیص میں شرکت تو کی مگر اپنی عادت اور بصیرت کے مطابق صاف صاف کہہ دیا کہ "انگریز ہرگز فلسطین کو نہیں چھوڑے گا، اس لیے گفت و شنید کا طریقہ کار بالکل سودمند نہیں ہوگا۔ مناسب یہی ہے کہ اسے الٹی میٹم دے دیا جائے کہ تین مہینے کے اندر اندر اگر اس نے فلسطین کو خالی نہ کیا تو سارا عالمِ اسلام اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا۔" مولانا کی اس بات میں وکیلوں کی سی بات کرنے والوں کے لیے بہ ظاہر کوئی جان نہیں تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ راست اقدام پر جتنا زور بعد

میں صرف کیا گیا اس کا اصلی وقت وہی تھا جب حسرت نے آواز بلند کی تھی۔ آخر کار اس کانفرنس کا حشر وہی ہوا جس کی پیشین گوئی مولانا نے کی تھی۔ مولانا کی یہ صاف صاف بات اس وقت ان کے دوسرے ساتھیوں کو اچھی نہیں لگی تھی اور قاہرہ سے واپسی پر یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مولانا نے فلسطین کانفرنس میں کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کی اور مسلم لیگ کے موقف کے خلاف آواز بلند کی مگر جیسا کہ سید حسن مثنیٰ ندوی نے اوپر لکھا تھا کہ سچی بات وہی تھی جو مولانا نے کہی تھی مگر اس وقت چونکہ عربوں نے اسے در خور اعتنا نہیں سمجھا، اس لیے وہ اب تک اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ فلسطین کانفرنس اور اس میں اپنے کردار پر مولانا نے ایک عام جلسہ میں فلسطین کانفرنس اور اس میں اپنے کردار پر روشنی ڈالی اور اپنے موقف کو دہرایا۔ یہ جلسہ انجمنِ تحفظِ فلسطین کے زیرِ اہتمام تلی بازار کانپور میں منعقد ہوا تھا۔ مولانا عبدالقیوم کانپوری نے جو اس زمانہ میں مجلسِ احرارِ اسلام کے صدر تھے لکھا کہ اگرچہ اس زمانہ میں مسلم لیگ اور مجلس احرار میں اختلاف تھا۔ لیکن ہم نے اپنی نئی تنظیم کے تحت جب مولانا کو جلسہ میں شرکت کی دعوت دی تو انھوں نے اسے قبول فرمالیا۔ جب بعد میں مسلم لیگی کارکنوں کو معلوم ہوا کہ احراریوں نے اس جماعت کو محض اس لیے قائم کیا ہے کہ مولانا کو اپنے جلسے میں مدعو کریں تو انھوں نے اس جلسہ میں مولانا کی شرکت کی مخالفت کی مگر مولانا وعدہ خلاف نہ تھے اور انھوں نے تمام مخالفتوں کے باوجود جلسہ میں شرکت کی اور تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ فلسطین کے سلسلہ میں مسلمانوں کا باہمی اختلاف ان کی فہم و فراست سے بالاتر ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ انگریزوں نے عرب دنیا کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ رکھا ہے اور وہ انگریزوں کی مسلسل سازشوں کی بنا پر آپس میں متحد نہیں ہو سکتے اور جب تک عرب دنیا پر انگریزوں کا اثر رہے گا، عرب کبھی متحد نہیں ہوں گے اور جب تک دنیائے عرب میں اتحاد نہیں ہوگا فلسطین ہرگز آزاد نہیں ہوگا۔ (مولانا نے یہ بات ۱۹۳۸ء میں کہی مگر ۱۹۸۸ء میں بھی یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے) اس کے بعد مولانا نے ہم احراریوں کی خبر لی اور ہماری سیاسی جدوجہد کو غلط بتایا اور مجھ کو مسلم لیگ میں شرکت کی دعوت دی۔ یہ عجیب بات تھی کہ مولانا ہم کو ڈانٹ رہے تھے، جھاڑ رہے تھے اور ہماری تحریک کو غلط بتا رہے

تھے مگر کسی احراری کارکن کی پیشانی پر بل نہیں تھا۔ جلسہ کے بعد مولانا نے تمام کارکنوں کو اپنی شفقت سے نوازا اور ہمیں ایک روپیہ مٹھائی کھانے کیلئے عنایت فرمایا

یوپی کا دورہ

۱۹۳۸ء کا سال مسلم لیگ کی حیات نو کے لیے بے حد اہم ہے۔ اس لیے کہ ایک طرف تو مسلم لیگی کارکن شہر شہر اور قریہ قریہ جاکر مسلمانوں کو مسلم لیگ کا پیغام پہنچا رہے تھے اور دوسری طرف کانگریس کے ماس کانٹیکٹ پروگرام کے تحت کانگریسی مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے دورہ میں مصروف تھے۔ خود پنڈت جواہر لال نہرو صدر کانگریس کی حیثیت سے عوامی روابط کی اس مہم کی براہِ راست نگرانی فرما رہے تھے۔ ایسے عالم میں یوپی مسلم لیگ نے طے کیا کہ علما کا ایک وفد سارے صوبہ کا دورہ کرے اور مسلمانوں کو اتحاد اور مسلم لیگ میں شمولیت کی تلقین کرے۔ مولانا اس وفد کے رکن رکین تھے۔ ان کے ساتھیوں کی حیثیت سے مولانا کرم علی ملیح آبادی اور مولانا عبدالحامد بدایونی کا نام تجویز کیا گیا تھا۔ مولانا نے کئی ہفتے یوپی کا دورہ کیا اور گاؤں گاؤں اور گھر گھر مسلم لیگ کا پیغام پہنچایا۔ اس طوفانی دورہ کا یہ اثر نکلا کہ مسلم لیگ یوپی میں ایک نہایت فعال اور منظم جماعت بن گئی اور ہندو کانگریس نے مسلمانوں کو ورغلانے کی جو مہم شروع کی تھی وہ بری طرح فیل ہوئی۔

پیر پور رپورٹ

یہ نہایت ہی پرآشوب دور تھا۔ کانگریس نے تمام ہندو اکثریتی صوبوں میں وزارتیں قائم کر لی تھیں اور حکومت کو بلیک میل کر کے یہ طے کرا لیا تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء میں صوبائی معاملات میں جو اختیارات خصوصی گورنروں کو حاصل ہیں، ان کو استعمال میں نہیں لایا جائے گا۔ یہ یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد کانگریس وزراء کو بڑا حوصلہ ہو گیا تھا اور ملک کے بیشتر حصہ میں فرقہ وارانہ فسادات کا بہانہ بنا کر مسلمانوں پر مظالم کا ایک منظم اور وسیع سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا عام مسلمانوں میں زبردست خوف و ہراس تھا اور چوں کہ نشر و اشاعت کے بیشتر ذرائع

بھی بیشتر ہندوؤں کے قبضہ تھے اس لیے مسلمانوں پر مظالم کی تفصیلات بھی منظرِ عام پر نہیں آ رہی تھیں۔ لہٰذا مسلم لیگ نے تمام واقعات کی چھان بین کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جس کے کنوینر اودھ کے ایک معزز تعلقہ دار راجہ صاحب پیرپور مقرر کیے گئے۔ کمیٹی نے کانگریسی اکثریتی صوبوں کا تفصیلی دورہ کرنے کے بعد ایک رپورٹ تیار کی، جس کو عام طور پر پیرپور رپورٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر یہاں اس ساری رپورٹ کو درج کیا جائے تو داستان بہت طوالانی ہو جائے گی تاہم مختصراً چند موٹی موٹی دھاندلیوں اور کھلے مظالم کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ آج کے دور کے لوگوں کو بھی اس کا اندازہ ہو جائے کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں پر ہندوؤں نے کیا کیا ظلم ڈھائے ہیں۔

(۱) بہار اسمبلی میں ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء کو کانگریس حکومت کی طرف سے یہ اعتراف کیا گیا کہ صوبہ کی ۴۲ میونسپل کمیٹیوں میں مخلوط انتخابات کے ذریعے ۲۹۹ نشستوں میں سے مسلمانوں کو صرف ۴۷ نشستیں ملیں اور ہندوؤں کو ۲۵۲ نشستیں حاصل ہوئیں حالانکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کو کم از کم ۹۳ نشستیں ملنی چاہیے تھیں۔ پھر خود حکومت نے نامزدگی کے ذریعہ ۶۱ ہندوؤں اور ۱۴ مسلمانوں کو نامزد کیا حالاں کہ مسلمانوں کا حق ۲۵ بنتا تھا۔ (۲) سی پی کے ضلع بلڈانہ کے ضلع بورڈ کے ۲۳ حلقوں میں کسی ایک پر بھی مسلمانوں کا انتخاب نہیں کیا گیا۔ (۳) سی پی سے آل انڈیا کانگریس کے جماعتی انتخابات میں ایک بھی مسلمان کا انتخاب عمل میں نہیں لایا گیا۔ (۴) سی پی کی ایک درجن میونسپلٹیوں میں مخلوط انتخابات کے ذریعے ایک بھی مسلمان منتخب نہیں ہوا۔ (۵) اسی صوبہ میں کانگریس حکومت نے ایک سرکلر کے ذریعہ حکم دیا کہ ۲ اکتوبر کو گاندھی جی کی پیدائش کے موقع پر بچے اور استاد مل کر ان کی پوجا کریں اور یہ حکم مسلم مدرسین کو بھی دیا گیا۔ (۶) اس صوبہ کی حکومت نے حکم دیا کہ جب تقریبات میں بندے ماترم گایا جائے تو تمام شرکائے محفل کھڑے ہو جائیں۔ (۷) ساگر کی میونسپل کمیٹی کے صدر نے مسلمان طلبہ کو تنبیہ کی کہ اگر وہ بندے ماترم کے گانے کے موقع پر احتراماً نہ کھڑے ہوئے تو انھیں اسکول سے نکال دیا جائے گا۔ (۸) اسی صوبہ میں ایک اسکول میں انجمن ترقیٔ اردو کے ایک نمائندے نے مسلمان بچیوں کو سرسوتی کی پوجا کرتے ہوئے اور اسلام کی جگہ جے رام جی کہتے سنا۔ (۹) بہار، یوپی اور مدراس میں گائے کی قربانی حکماً بند کی گئی۔

(۱۰) ہندوستانی کے نام پر اُردو کی جگہ سنسکرت آمیز ہندی رائج کی گئی۔ (۱۱) ہٹلے نعرہ ودیا مندر اسکیم نافذ کی گئی گویا ان تمام خدشوں کو صحیح ثابت کیا گیا جو مولانا اور دوسرے مسلم زعمانے ہندوؤں کی عددی اکثریت کے تجربات سے متعلق کیے تھے ... پیرپور رپورٹ کی اشاعت کے بعد مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں میں خوف وہراس کم کرنے کے لیے مستقل دوروں کی ضرورت ہے۔ بنگال کے وزیراعلیٰ مولوی فضل الحق نے بھی اعلان کیا کہ اگر اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ اس طرح ظلم وستم ہوتا رہا تو اس کے اثرات مسلم اکثریتی صوبوں پر پڑیں گے۔ خدا مغفرت کرے مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خان کی جنھوں نے مولانا حسرت موہانی کی طرح ملک گیر دورے کیے اور مسلمانوں کو منظم اور تیار کرنے میں دن رات ایک کر دیا۔

لندن روانگی

مولانا کو ۱۹۳۹ء کے شروع میں یہ خیال ہوا کہ انگریزوں اور وزیرِ ہند کو ہندوستان کی اصلی صورتِ حال سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔ پس یہ خیال کرنا تھا کہ مولانا نے لندن روانہ ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں اور ایک سہ رکنی وفد ترتیب دیا جو لندن جا کر برِصغیر کے حالات سے برطانیہ کے اربابِ حکومت، پریس اور عوام کو آگاہ کرے۔ مولانا جمال میاں فرنگی محلی اور کانپور کے ایک مشہور صحافی مسٹر محمد مظفر اس وفد کے دوسرے رکن تھے۔ مولانا ارکانِ وفد کو لے کر کانپور سے کراچی اور کراچی سے بصرہ ہوتے ہوئے بغداد پہنچے اور وہاں سے بذریعہ ریل موصل اور موصل سے بذریعہ بس دمشق پہنچے۔ دمشق پہنچے ہی تھے کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوگئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بحرِ روم میں جہازوں کی آمدورفت منسوخ ہوگئی۔ مولانا جمال میاں اور جناب محمد مظفر نے مولانا کو رائے دی کہ اب برطانیہ جانے کا ارادہ منسوخ کیا جائے اور ہندوستان چلا جائے۔ مگر مولانا نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ اس لیے یہ دونوں شریکِ سفر تو دمشق سے واپس وطن روانہ ہوگئے مگر مولانا بعد از خرابیٔ بسیار دمشق سے بیروت پہنچنے میں کامیاب ہوگئے اور جہاز کے انتظار میں کافی دیر بیروت میں مقیم رہے یہاں تک کہ انھیں ایک بحری جہاز میں مارسیلز تک جانے کی جگہ مل گئی اور وہ وہاں

سے بذریعہ ٹرین کیلے اور کیلے سے بذریعہ اسٹیمر ڈوور اور وہاں سے آخر کار لندن پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور راستے کی بڑی سے بڑی مشکل اور سفر کی بڑی سے بڑی صعوبت ان کے لیے سدِراہ نہ بن سکی۔ بیروت سے انھوں نے ایک خط مولانا جمال میاں کو تحریر کیا جس میں انھوں نے فرمایا کہ وہ یہ عزم صمیم کر چکے ہیں کہ وہ ہر قیمت پر انگلستان جائیں گے اور اہلِ انگلستان خاص کر حکومت برطانیہ کے ارکان کے سامنے مسئلہ فلسطین اور ہندوستان کی مسلمانوں کی حالتِ زار کے بارے میں اپنے خیالات ضرور پیش کریں گے اور اگر جہاز نہ ملا تو سمندر میں تیر کر جائیں گے، مگر جائیں گے ضرور۔

لندن میں مولانا کی سرگرمیاں

مولانا نے لندن میں کئی ماہ قیام کیا اور اس قیام کے دوران وہ نہ صرف وزیرِ ہند سے ملے بلکہ انھوں نے اہم مسائل پر ان سے بہت دیر تک گفت وشنید کی مولانا نے ان کے علاوہ دوسرے اکابر برطانیہ سے بھی تبادلہ خیالات کیا اور برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان کے سامنے تین گھنٹہ تک ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر تقریر کی اور مسلمانانِ ہند کے نظریات کی مسلسل تبلیغ واشاعت کے لیے اپنی سرپرستی میں ایک انڈین مسلم سینٹر بھی قائم کیا تاکہ مسلمانوں اور مسلم لیگ کی برطانوی رائے عامہ کے سامنے مؤثر نمائندگی ہوتی رہے۔

حج کا مسئلہ

اس اثنا میں حکومت ہند نے حجاج کے عرب جانے پر پابندی لگانے کا اعلان کر دیا جس سے مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ مولانا کی زیر صدارت ۱۴ / اکتوبر ۱۹۳۹ء کو لندن میں انڈین مسلم سینٹر کے زیر اہتمام ایک جلسۂ عام ہوا جس میں حج کے بارے میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا۔ مولانا نے جلسہ کے فوراً بعد وزیرِ ہند سے رجوع کیا اور انھیں بتایا کہ حج کے لیے جہاز موجود ہیں جنھیں اس مقصد کے لیے پابند کیا جا سکتا ہے اور اس ضمن میں ایک جہازراں کمپنی کے نام سے بھی انھیں آگاہ کیا جو اس مقصد کے لیے جہاز فراہم کر سکتی ہے۔ مولانا نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لندن سے

سے راجہ صاحب محمود آباد اور مولانا قطب الدین عبدالوالی فرنگی محلی کو تار روانہ کیے جس کا مضمون یہ ہے "میں مسلم سینٹر کا وفد لے کر لارڈ زٹلینڈ سے ملنے والا ہوں تاکہ حج پر پابندیاں ختم کرنے کے لیے زور دوں۔ پلٹوریر (جہاز راں کمپنی) بحری جہازوں کو ۱۲ سو حجاج فی جہاز کے اوسط سے چارٹر کرنے پر تیار ہے۔ یہ جہاز جدہ یا کویت تک جا سکتے ہیں۔ جناح کو اطلاع دو۔ تار کے ذریعہ تعاون اور اسی سلسلہ میں دوسری ہدایات روانہ کی جائیں۔ حسرت موہانی۔ ۱۱۲ ناروِن اسٹریٹ لندن۔ مولانا کی اس جد وجہد کا یہ نتیجہ نکلا کہ لارڈ زٹلینڈ کو حکومتِ ہند کی غلطی کا احساس ہوگیا اور انھوں نے مولانا کے نام ایک خط میں جس پر ۱۹ / اکتوبر کی تاریخ درج ہے بتایا کہ حکومتِ ہند اور وزیرِ ہند کی کوششوں سے اس بات کا انتظام ہوگیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان سفرِ حج پر جا سکیں اور اس سلسلہ میں ایک سرکاری اعلان لندن اور دلی میں بیک وقت جاری ہونے والا ہے جس کی ایک نقل اسی خط کے ساتھ منسلک ہے۔ اس اعلانیہ میں بتایا گیا کہ حکومتِ ہند نے سفرِ حج کی منسوخی کا جو اعلان کیا تھا وہ عارضی تھا اور اب حکومتِ ہند کی کوششوں سے حجاج کی ایک محدود تعداد ہندوستان سے حج پر جدہ جا سکے گی۔ حج کے معاملہ میں مولانا کی دلچسپی کے پیشِ نظر آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے اپنے اجلاس منعقدہ اینگلو عربک کالج ہال مورخہ ۹ / نومبر ۱۹۴۰ء جب ایک کمیٹی مقرر کی جو وائسرائے ہند کی ایگزکٹو کونسل کے بیرونی ممبر سے مل کر حجاج کے سفرِ حج کے لیے ضروری سہولتوں کے فراہمی کے سوال پر ان سے بات چیت کرے۔ تاکہ مسلمانوں میں اس ضمن میں جو بے چینی پھیلی ہوئی ہے اسے ختم کیا جائے اور اس کے بعد اپنی بات چیت سے صدر مسلم لیگ کو آگاہ کرے تو کونسل نے اس کمیٹی میں مولانا ظفر علی خاں، مسٹر عبدالحمید قادری، حاجی نواب جمشید علی خاں کے ساتھ مولانا حسرت موہانی کو بھی شامل کیا۔

قراردادِ پاکستان :۔ قراردادِ پاکستان مسلم لیگ ہی کی زندگی میں نہیں بلکہ مسلمانانِ برِصغیر کی زندگی میں بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اس لیے کہ اسی سال مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں ۲۳ / مارچ کو قراردادِ پاکستان منظور کی گئی اور اس طرح اس خواب کی تعبیر ممکن ہوگئی جو مجدد الف ثانی، ٹیپو سلطان، شاہ ولی اللہ، سر سید احمد خاں، حسرت موہانی، جمال الدین افغانی، علامہ اقبال اور برِصغیر کے متعدد

سربرآوردہ اکابرین صدیوں سے دیکھ رہے تھے برِصغیر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن اور مملکت کے قیام کے لیے جدوجہد کا باقاعدہ آغاز مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس لاہور منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء سے کیا گیا۔

پسِ منظر

لیکن مسلمانوں کے علیحدہ وجود، ان کے قومی وقار اور ان کے لیے علیحدہ مملکت کی سیاسی ضرورت کا احساس انیسویں صدی کے اواخر میں نمایاں طور پر ابھرنا شروع ہوا۔ جس کے متعدد اسباب تھے۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ برصغیر ہندوپاک میں آباد بیسیوں قوموں اور قومیتوں کے درمیان سیاسی بالادستی کی جنگ جو اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد شروع ہو گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جدوجہد آزادی کے بعد انگریزوں کی بالادستی قائم ہونے پر ختم ہو گئی تھی لیکن تہذیب و ثقافت اور فکر و نظر کے میدان میں یہ کشاکش بدستور جاری تھی۔ ہندومت کے نظریۂ حیات کا ہزار سال بعد بھی اسلام کے نظریۂ حیات سے ٹکراؤ جاری تھا اور اس کشمکش میں ہندومت اپنی سابقہ روایات اور تجربات کے برخلاف اسلام پر غالب نہیں آسکا تھا اور مسلمان ہندوستان میں ایک ہزار سال قیام پذیر رہنے کے باوجود دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی طرح ہندومت میں خلط ملط نہیں ہو سکے تھے اور ان کا الگ اور علیحدہ وجود اور سیاسی، ثقافتی، سماجی اور معاشی زندگی میں اُن کا منفرد اور نمایاں امتیاز انقلاب زمانہ کے باوجود بدستور موجود اور متعین تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ سیاسی اقتدار سے محرومی کے بعد مسلمانوں کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے طویل دورِ حکومت میں اکابرینِ سلطنت کے منافقت اور ریاکاری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر تو سیاسی استحکام حاصل کر لیا تھا لیکن اس مصلحت کوشی کا یہ نتیجہ بھی نکلا تھا کہ خود مسلمان اپنے مذہب اور اس کی تعلیمات سے دور ہوتے چلے گئے اور ان میں تبلیغ کے وہ جراثیم جن کی بدولت وہ مفتوحہ علاقوں میں حامیانِ دین کی تعداد کو اکثریت میں تبدیل کر سکتے تھے، اس غلط پالیسی کی بنا پر ختم ہو گئے اور اکبر نے جس بھیانک اور ناعاقبت اندیش پالیسی کا آغاز کیا تھا اس کا نتیجہ اقتدار سے محرومی کے بعد یہ نکلا کہ صدیوں کے آقا منشوں

میں اقلیت کا روپ دھار کر اپنی سیاسی برتری گنوا بیٹھے۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ سیاسی اقتدار نکل جانے کے بعد مسلمانوں کے انحطاط کا وہ دور جو اکبر کے زمانہ سے شروع ہوا تھا اپنی انتہا کو پہنچ گیا اور مسلمانوں میں اپنی مذہبیت، اپنی روایات اور اپنی اہمیت کو اجاگر اور بحال کرنے کا جذبہ پھر پروان چڑھنے لگا۔

مجدّد الف ثانی

اس میں کوئی شک نہیں کہ اکبر کے دینِ الٰہی کی حیثیت کو بے نقاب کرنے کے لیے قدرت نے مسلمانوں میں حضرت مجدد الف ثانی کی شخصیت کو پیدا کیا۔ جنھوں نے مسلمانوں کو اس نئے فتنہ سے باخبر کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے تاریخ کے دھارے کو موڑنے کی کوشش کی اور صحابہ کرام کی زندگیوں کا نمونہ پیش کر کے مسلمانوں میں غیرتِ دینی کے جذبات پیدا کرنا چاہے لیکن چوں کہ مسلمان بدستور سیاسی اقتدار کے مالک تھے۔ اس لیے ان کے کانوں پر جوں نہیں رینگی۔

شاہ ولی اللہ

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد جب سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ بکھرنے لگا اور مرہٹوں کے فتنہ نے سر اٹھایا تو اس دور کے مبلغِ اعظم اور مفکرِ عظیم حضرت شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی اور انھیں لکھا کہ "مسلمانوں کی حالت قابلِ رحم ہے۔ حکومت کا تمام نظم و نسق ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے کیونکہ اس وقت یہاں وہی ایسے لوگ ہیں جو محنتی ہیں اور قابل ہیں، وہ دولت اور خوشحالی سے بہرہ ور ہیں۔ مسلمان غریب اور بے بس ہیں۔ اس وقت آپ ہی ایک ایسے حکمران ہیں جو طاقتور، دور اندیش اور قابل ہونے کے باعث دشمنوں کو شکست دے سکتے ہیں۔ آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہندوستان پر حملہ کر کے مرہٹوں کی بالادستی ختم کریں اور کمزور و بے بس مسلمانوں کو غیر مسلموں کے شکنجہ سے نجات دلائیں۔ احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ مرہٹوں کی قوت کو نیست و نابود کیا مگر افسوس کہ خود اس کے اپنے علاقہ میں بدامنی کا آغاز ہوا اور

ہندوستان میں اس وقت کوئی اور ایسا مفکر و مدبر موجود نہیں تھا جو احمد شاہ ابدالی کی بالادستی کو برقرار رکھتا۔ سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان نے اپنے اپنے علاقوں میں اقتدار کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کی کوشش کی مگر علاقائی سازشوں اور منافقت اور مصلحت کوشی کے طویل دور کی پیدا کردہ خرابیوں میں آنکھیں کھولنے والے درباریوں نے ان دونوں شخصیتوں کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

سید احمد شہید

سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید نے مسلمانوں میں جرأت پیدا کرنی چاہی مگر خود مسلمانوں نے ان کی تحریک کو ناکام بنایا۔ اس لیے کہ ان دونوں حضرات نے اپنی تحریک کے لیے ایک ایسے علاقے کو منتخب کیا جہاں انھوں نے ماحول کو سازگار کرنے کے لیے کوئی کام نہیں کیا اور جہاں ان کی اپنی حیثیت بھی نووارد کی تھی۔ ان تمام کوششوں کے باوجود سیاسی اقتدار کا وہ ایوان پیوند زمیں ہو کر رہا۔ جس کی بنیاد کفر و اسلام کی مفاہمت پر رکھی گئی۔

جنگِ آزادی

۱۸۵۷ء کی جدوجہد اکابرین اسلام کی آخری کوشش تھی۔ حضرت حاجی امداد اللہ حضرت حافظ ضامن صاحب شہید، حضرت شاہ حسن عسکری شہید، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احیائے اسلام کے لیے میدان جنگ میں کود پڑے۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اور حضرت شاہ حسن عسکری نے جان کی بازی لگادی مگر وہ بھی منافقت، ریاکاری اور مصلحت اندوزی کے قلعوں کو نہیں ڈھا سکے۔ تمام اسلامی مفکرین نے اس طویل عرصہ میں یہی کوشش کی کہ وہ اسلام اور کفر کے فرق کو نمایاں کریں۔ شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں سے کہا کہ اگر وہ ہندوستان میں باعزت اور کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو انھیں کفر اور اسلام کے مابین مفاہمت سے گریز کرنا ہوگا اور بحیثیت مسلمان اپنے وجود کو علیحدہ رکھنا ہوگا۔ شاہ عبدالعزیز نے فتویٰ دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور اس لیے

انھیں اسلام کی بقا کے لیے سرگرم عمل ہونا پڑے گا۔ لیکن مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات اس وقت آئی جب وہ سیاسی اقتدار سے محروم ہو چکے تھے اور زمانے نے ان کے انحطاط اور زوال کا فسانہ مکمل کر دیا تھا۔ انگریزوں نے چونکہ اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا چنانچہ فطری طور پر نئے حکمرانوں کی دشمنی، جور و ستم اور جبر و تشدد کا وہی نشانہ بنائے گئے۔ قتل اور خون ریزی اور غارت گری غرضیکہ کون سی ایسی طاقت جو ان پر مسلط نہیں کی گئی! وہ بے گناہ پھانسی پر چڑھائے گئے۔ ان کی جائدادیں ضبط کی گئیں، املاک لوٹی گئیں۔ کارخانے تباہ کیے گئے۔ حدیہ کہ کاریگروں پر یہ ظلم کیا گیا کہ ان کے انگوٹھے کاٹ دیے گئے۔ تاکہ ڈھاکہ کی ململ بنی بالکل بند ہو جائے۔ ان کی معاشرت، حدیہ کہ ان کے لباس تک کا مذاق اڑایا گیا۔ ٹیپو کا وزیر اسد خاں خانساماں کہلاتا تھا۔ یہی لباس انگریزوں کے خانساماں کے لیے تجویز ہوا۔ پگڑی جو مسلمان امرا اور علما کا طرۂ امتیاز تھا، وہ چپڑاسیوں اور اردلیوں کے لیے مقرر و متعین کی گئی۔ غرضیکہ مسلمانوں میں احساسِ کمتری، محرومی اور غلامی کو پختہ کرنے کے لیے انگریز حکمرانوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور کوئی نفسیاتی حربہ ایسا نہیں تھا کہ جو مسلمانوں کے احساسِ ذلت کو اجاگر کرنے کے لیے انھوں نے استعمال نہ کیا ہو۔ انھوں نے محض اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، انگریزوں نے ہندوؤں کی معیشت، معاشرت اور مالی حالت کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ ان کے لیے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کیں۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کے لیے مخصوص کیے اور مسلمانوں کی املاک جائز بے جا طریق سے لے کر انھیں ہندوؤں کے سپرد کیا گیا تاکہ وہ مسلمانوں کی جگہ لے لیں اور انھیں بالکل بے دست و پا بنا کر ہندوستان میں ہمیشہ کے لیے ایک کمزور اور بے جان فرقہ بنا دیں۔

تحریکِ دیوبند

ایسے حوصلہ شکن اور دل شکستہ ماحول میں مسلمانوں کی دلجوئی کے لیے دو طاقتیں ابھریں۔ ایک طاقت شاہ ولی اللہ کی تحریک کے سرگرم کارکن مولانا محمد قاسم نانوتوی

اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی تھی جنھوں نے دیوبند تحریک کا آغاز کیا۔

علی گڑھ تحریک

اور دوسری طاقت سر سید احمد خان اور ان کے احباب کی تھی جنھوں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے قیام کے ذریعے مسلمانوں میں جدید علوم کے حصول کا جذبہ پیدا کیا لیکن ان دونوں نمائندوں کی بنیادی کوشش یہی تھی کہ مسلمانوں کو بحیثیتِ مسلمان اپنا علیحدہ وجود قائم رکھنا ہے۔ ان حلقوں نے دارالعلوم دیوبند اور مسلم یونیورسٹی کے ذریعے مسلمانوں کو باصلاحیت اور قابل لیڈر اور کارکن مہیا کیے جن میں مولانا محمود حسن، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسرت موہانی مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خاں شامل ہیں۔

سیّد جمال الدین افغانی

اسی زمانہ میں عالم اسلام کے مایۂ ناز مفکر اور اتحادِ عالم اسلام کے داعی سید جمال الدین افغانی ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر مسلم ممالک یورپی اقوام کی ریشہ دوانیوں اور مداخلت کے دائروں سے نکل جائیں تو مسلم معاشرے کی اصلاح ہو جائے اور ملتِ اسلامیہ یورپی اقوام کی نقالی اور ان پر انحصار کیے بغیر اپنا وقار قائم کر لیں اور ملت کی سطوت و شوکت واپس لے آئیں۔ انھوں نے ہندوستان، افغانستان، ایران، ترکی اور مصر میں قومی تحریکوں کو اپنے افکار سے توانائی بخشی۔ وہ چاہتے تھے کہ مرکزی ایشیا کی اشتمالی جمہوریتیں افغانستان اور برِصغیر کے مسلم اکثریتی شمال مغربی علاقوں پر مشتمل ایک مسلم جمہوریہ قائم ہو جائے، یہ گویا پاکستان کے تصور کا آغاز تھا۔ علامہ افغانی کئی مرتبہ ہندوستان آئے۔ ایک دفعہ تو تین سال تک حیدر آباد اور کلکتہ میں رہے یہاں ان کی ملاقات بہت سے لوگوں سے ہوئی اور یہاں کے مسلمانوں نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ ان کے خیالات کی پذیرائی کی۔

سرسید کے خیالات میں تبدیلی

سرسید جنھوں نے انگریزوں کے مقاصد کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا کہ نئے حکمرانوں کا مقصد کیا ہے۔ جب یوپی کے انگریز گورنر کی شہ پر یوپی کے ہندوؤں نے اردو کے مقابلے میں ہندی کی حمایت شروع کی تو سرسید نے حکمرانوں کی مسلم دشمن پالیسی کی طرف اشارہ کیا۔ مولانا حالی نے سرسید کی سوانح عمری حیاتِ جاوید میں لکھا ہے کہ ان دنوں سرسید کہا کرتے تھے کہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے کبھی نہیں رہ سکتے۔ اور ملک کی ترقی کے لیے مشترکہ طور پر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ نفرت اور دشمنی بڑھ رہی ہے جو زندہ رہے گا وہ اس کے نتائج دیکھ لے گا۔ ۲۰ سال کے اندر اندر سرسید احمد خان کا یہ یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ وہ ہندوستان کو ملک نہیں برِ اعظم قرار دینے لگے اور انھوں نے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اس برِ اعظم میں دو قومیں آباد ہیں اور دونوں کا مساوی حیثیت سے ایک ہی بڑے خطے میں رہنا ناممکن ہے۔ انھوں نے ایک تقریر میں کہا کہ فرض کر لیجیے کہ آج سارے انگریز ہندوستان سے نکل جاتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ اس کے بعد ہندوستان میں کس کا راج ہو گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ایک ہی تخت پر بیٹھیں اور اقتدار میں برابر کی شریک ہوں؟ ... یقیناً یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم دوسری قوم پر مسلط ہو جائے لیکن یہ امید ناممکن اور ناقابلِ تصور ہے کہ دونوں قومیں مساوی حیثیت سے رہیں۔ سرسید احمد خان نے جو کام شروع کیا تھا اسے مولانا حالی، مولانا عبدالحلیم شرر، سید امیر علی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، نواب سلیم اللہ، مولانا شبلی نعمانی، آغا خان، محمد علی اور حسرت موہانی نے آگے چلایا۔

مسدسِ حالی

اسی زمانے میں مولانا حالی نے مسدسِ حالی لکھی جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا نقشہ بڑے موثر انداز میں بیان کیا گیا تھا اور مسلمانوں کے عیوب اور نقائص کی نشاندہی

کرتے ہوئے انھیں جد و جہد پر ابھارا گیا تھا۔ ان کا یہ مرثیہ اپنی اثر انگیزی میں سعدی کے اس مرثیے سے کم نہ تھا جو انھوں نے سقوطِ بغداد پر لکھا تھا۔ خود سر سید نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ اگر حشر کے دن اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ سید تم نے دنیا میں کون سا قابلِ ذکر کارنامہ انجام دیا ہے تو وہ کہیں گے کہ انھوں نے حالی سے مسدس کہلوائی ہے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو منظم کرنے کے لیے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کا پہلا اجلاس ۱۸۸۶ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے سر سید نے فرمایا کہ "اس وقت ہمارا حال یہ ہے کہ گو ہم ایک قوم کہلاتے ہیں مگر ایک جگہ کے رہنے والے دوسری جگہ کے رہنے والوں سے ایسے ناواقف ہیں جیسے کوئی اجنبی قوم ایک دوسرے کے حال سے ناواقف ہو۔ ہم نہیں جانتے کہ پنجاب کے لوگوں کا قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت کیا خیال ہے اور انھوں نے کیا کیا ہے اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔ پنجاب تو ایک دوسرا صوبہ ہے۔ ہم اپنے ہی صوبہ یو۔پی۔ کے ایک ضلع کے رہنے والے دوسرے ضلع کے رہنے والوں کے حال سے محض ناواقف ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں اور ایک کے حال سے دوسرے کو آگاہی ہو۔ ہم آپس میں مل کر اپنے خیالات جو قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ہوں دوسروں پر ظاہر کر سکیں۔ ایک دوسرے کے خیالات کا تبادلہ ہو۔ ہم باوجود ایک مسلمان قوم ہونے کے بمنزلہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں۔ ان میں قومی یگانگت بلکہ ہم کو کہنا چاہیے کہ قومیت پیدا ہو۔ ان ہی خیالات سے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہر سال مسلمانوں کی تعلیم اور ترقی پر غور کرنے کے لیے مختلف مقامات و مختلف صوبجات کے لوگ ایک جگہ جمع ہوا کریں اور ایک صوبہ اور ضلع کے لوگوں کے ذریعہ سے دوسرے صوبہ اور ضلع کے حالات معلوم ہوتے رہیں اور جو تدابیر ان کی بھلائی اور ترقی کی نسبت سوچی جائیں

ان پر بحث و مباحثہ ہو کر جو تدبیر عمدہ قرار پائے وہ اختیار کی جائے۔" یہ ادارہ اگرچہ ایک سیاسی ادارہ نہیں تھا اس لیے کہ اس وقت تک سر سید یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان سیاست میں ملوث ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ اس ادارہ نے مسلمانوں میں علاقائی، صوبائی، طبقاتی حد بندیوں کو نظر انداز کر کے ان میں ملک گیر قوم کا احساس پیدا کیا اور پورے ملک میں اس کے سالانہ اجلاس منعقد کر کے مسلمانوں میں اجتماعی شعور بیدار کیا۔ اس کے اجلاس یوپی، مدراس، بہار، اجمیر، یہاں تک کہ رام پور اور خیر پور میں بھی منعقد ہوئے اور ان جلسوں کی صدارت ہر علاقے اور ہر طبقے کے مشاہیر نے کی۔ یوپی اور دلی سے مولوی سمیع اللہ خان، نواب اسحاق خان، منشی امتیاز احمد کاکوروی، نواب محسن الملک، مولوی حشمت اللہ بریلوی، سر علی محمد خان راجہ آف محمود آباد، صاحب زادہ آفتاب احمد خان، سر شاہ سلیمان، سر راس مسعود، سر سید رضا علی، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد اور نواب زادہ لیاقت علی خان، پنجاب سے سر محمد حیات خان، جسٹس محمد شاہ دین، نواب فتح علی خاں قزلباش، بشیر الدولہ خلیفہ محمد حسین، سر رحیم بخش، سر محمد شفیع، سر فضل حسین، سر عبد القادر، کرنل مقبول حسین بنگال سے جسٹس سید امیر علی، جسٹس شریف الدین، نواب زادہ سر سلیم اللہ، عبد الرحیم، مولوی اے کے فضل الحق، سر عزیز الحق، بمبئی سے سر آغا خان، جسٹس بدر الدین طیب جی، علامہ عبد اللہ یوسف علی، محمد ابراہیم رحمت اللہ، سر ابراہیم ہارون جعفر، مدراس سے نواب سید عبد الحکیم، سرحد سے صاحبزادہ سر عبد القیوم اور حیدر آباد دکن سے نواب عماد الملک، سر اکبر حیدری، نواب کمال یار جنگ اور نواب ظہیر یار جنگ جیسے اکابر نے اس کے جلسوں کی صدارت کی۔ ان تمام اکابرین کے پیش نظر ملک گیر متحدہ مسلم قومیت کا تصور تھا اور اس کی انھوں نے تبلیغ و اشاعت کی۔ چنانچہ بنگال کے جلسوں میں پنجاب و سندھ سے متعلق تجاویز منظور ہوتی تھیں اور پنجاب کے جلسوں میں یوپی اور مدراس کے معاملات زیر بحث آتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے پلیٹ فارم سے کشمیر، الور، میوات، جے پور، جودھ پور اور ٹونک کے تعلیمی مسائل پر بھی قرار دادیں اور تجاویز پاس کی گئیں اور اس کی کوششوں سے مختلف شہروں میں بکثرت اسلامیہ ہائی اسکول قائم ہوئے جن میں اسلامیہ کالج پشاور، سندھ، مدرستہ الاسلام کراچی، محمڈن

عربک اسکول پٹنہ ۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ قائم ہوئے اور اس کی برکتوں کے نتیجہ
میں علی گڑھ یونیورسٹی ، ڈھاکہ یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی معرضِ وجود میں آئی اور تحریک
ندوۃ العلماء ، انجمن حمایت الاسلام لاہور اور مدرسہ احمدیہ آرہ (بہار) جیسے مذہبی دائرہ
پر بھی اس کی چھاپ نظر آتی ہے ۔ خود انجمن ترقی اردو بھی اسی محمڈن ایجوکیشن کانفرنس
کے ایک شعبہ کی حیثیت سے قائم ہوئی اور ۱۹۰۶ء میں اس ادارے کے اجلاس منعقدہ ڈھاکہ کے موقع پر ۱۹۰۳ء میں مسلم لیگ کا قیام
عمل میں آیا لیکن اس انجمن کا سب سے نمایاں کارنامہ اردو زبان کی ترویج و توسیع ہے ۔ سر سید احمد خان نواب
محسن الملک اور نواب صدر یار جنگ کی نگرانی اور سرپرستی میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس
نے زبردست کوشش کی اور آج جو قومی حیثیت اس زبان کو حاصل ہے وہ انہی کوششوں
کے طفیل ہے ۔ جسٹس امیر علی نے اسی کانفرنس کے پلیٹ فارم سے کلکتہ میں ۱۸۹۹ء
میں فرمایا کہ اردو زبان بنگال بمبئی کے اسکولوں میں بطور اختیاری زبان کے رہنی
چاہیے ۔ اسی طرح آگرہ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۳ء میں جسٹس شاہ دین نے فرمایا
کہ " اردو جسے عام طور پر ہندوستانی کہتے ہیں مسلمانانِ ہند کی بلکہ ہندوستان کے
بیشتر حصے کی زبان ہے اور اس کو ہندوستان میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو فرانسیسی
زبان کو یورپ میں حاصل ہے " ۔ سر محمد شفیع نے علی گڑھ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۰۷ء میں
فرمایا کہ " اردو درحقیقت ہندوستان کی عام زبان ہے ۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے
باہمی اتحاد سے پیدا ہوئی تھی ۔ ہر وہ کوشش جو اردو زبان کے خلاف ہوگی ناانصافی پر
مبنی ہوگی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اتحاد کے لیے بربادکن ہوگی ۔ کلکتہ کے
کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۷ء میں سر اکبر حیدری نے فرمایا کہ " اردو کی اشاعت اور
مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں ایک خاص مناسبت ہے ۔ جن جن مقامات پر اردو رائج
اور شائع ہے اسی قدر وہاں کے مسلمان زیادہ سرگرم اور مستعد ہیں ۔ اسی طرح جس
نسبت سے اردو مختلف مقامات میں داخل ہو جاتی ہے اسی نسبت سے وہاں کے
مسلمانوں کا جمود ٹوٹتا جاتا ہے اور ان میں وسعتِ نظر اور احساسِ قومی پیدا ہو جاتا
ہے ۔ امرتسر کے اجلاس منعقدہ ۱۹۰۸ء جو نواب خواجہ سر سلیم اللہ کی زیرِ صدارت
منعقد ہوا تھا ۔ سر عبدالقادر کی تحریک پر یہ قرارداد منظور کی گئی کہ اس کانفرنس کی
رائے میں صوبہ پنجاب میں تعلیمی اغراض کے لیے بالعموم اور ابتدائی تعلیم کے لیے

بالخصوص نہایت مناسب اور موزوں زبان ہے اور بحیثیت درسی زبان جو مرتبہ اسے مدارس میں حاصل ہے، اسے قائم رکھنا ترقی کے لیے ضروری ہے۔" اسی اجلاس میں سر محمد شفیع نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ کانفرنس ڈاکٹر سی پی پیٹر جی سی آئی ڈی کی اس تجویز سے جو انھوں نے حال میں پنجاب یونیورسٹی کے جلسہ کانووکیشن میں پیش کی ہے کہ زبان پنجابی کا کورس صوبہ میں بجائے اردو کے رواج دیا جائے اختلاف کرتی ہے اور اس تجویز کو قلت لغات پنجابی واختلاف محاورہ ناممکن العمل اور اس صوبہ کے حق میں سخت مضر خیال کرتی ہے۔ کلکتہ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۷ء میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ جن طلباء کی مادری زبان اردو نہیں ہے ان کے لیے بطور زبان ثانی صوبہ بنگال اور بمبئی میں اردو رائج کی جائے۔ کانفرنس کے اجلاس کراچی ۱۹۰۷ء راولپنڈی ۱۹۱۴ء خیرپور میرس ۱۹۱۹ اور لاہور ۱۹۲۲ء کی بدولت سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد میں اردو کا کام زور و شور سے شروع ہوا اور بکثرت اُردو مدارس اور اخبارات جاری ہوئے۔

عبدالحلیم شرر

مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی صحافتی اور ادبی میدان میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت پر انگریزی افکار اور عیسائیت کی یلغار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور جب ۱۸۹۰ء میں ہندوستان میں پہلی بار ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع ہوا تو انھوں نے اپنے ہفت روزہ "مہذب" لکھنؤ میں ہندو مسلم فسادات پر ایک اداریہ لکھا جس کی یہ سطور محل نظر ہیں: "ہمارے خیال میں اگر ایسا وقت آگیا ہے کہ کسی کی مذہبی رسوم بغیر دوسرے کی توہین کیے نہیں پوری ہوتیں اور نہ اتنا صبر و تحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کو طرح دے دے تو ہندوستان کے اضلاع کو آپس میں تقسیم کر لیں اور اپنی اپنی آبادی علیحدہ کر لیں کیوں کہ ہندوؤں کا اتفاق در بردہ اس کو چاہتا ہے کہ اب وہ مسلمانوں کو اپنے پڑوس میں نہیں رہنے دیں گے نہ انھیں یہ منظور ہے کہ اپنے سنکھ کی آواز مسلمانوں کے کان میں پہنچائیں اور نہ مسلمانوں کی اذان خود سننا چاہتے ہیں اور یقیناً مسلمانوں کو بھی یہی منظور ہو گا کیونکہ وہ بھی بظاہر اب تنگ معلوم ہوتے ہیں۔

سیّد امیر علی

نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک نے تعلیمی اور سیاسی میدانوں میں سرسید کا مشن جاری رکھا۔ مولانا شبلی نے تعلیم ادب اور تاریخ کے شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور آغا خان کی کوششوں سے سربرآوردہ مسلمانوں کا ایک وفد ۱۹۰۶ء میں وائسرائے سے ملا اور اسی سال مسلم لیگ قائم ہوئی (تفصیلی تذکرہ اپنے مقام پر موجود ہے) سرسید احمد خاں، سر امیر علی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور آغا خان کی کوششوں کا محور اور مرکز آئینی اصلاحات اور جمہوری حکومت کے نقشہ میں مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود کو منوانا تھا۔ برصغیر میں مسلمانوں کا علیحدہ قومی تشخص کا تسلیم کرا لینا ان کا زبردست کارنامہ ہے۔ اور سر امیر علی تو وہ شخص ہیں کہ جب انھیں ۱۹۱۲ء میں کانگریس کی صدارت پیش کی گئی تو انھوں نے یہ کہہ کر اسے رد کر دیا کہ ان کے نزدیک کانگریس میں ان کی شمولیت سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔

مولانا محمّد علی

تقسیم بنگال کے سلسلہ میں ہندو کانگریس نے جو رویہ اختیار کیا اس سے مولانا محمد علی کی بھی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے بھی اپنے اخبار کامریڈ کی چار سالہ زندگی میں جو اداریتی مقالے سپرد قلم کیے ان میں انھوں نے بار بار کہا کہ اس نعرے میں ہمارا کوئی اعتقاد نہیں کہ ہندوستان متحد ہے"۔۔ اور ان کے یہ جملے بھی قابل توجہ ہیں کہ ہندوستان کے مسائل کی نوعیت اتنی قومی نہیں جتنی بین الاقوامی ہے۔ بین الاقوامی قانون میں کسی ملک کی طاقت پیش نظر نہیں ہوتی۔ اس قانون کا بنیادی اصول یہ ہوتا ہے کہ سب قومیں برابر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مسلمانوں کی حیثیت یورپ کی چھوٹی طاقتوں کے برابر ہے اور مسلمان ان طاقتوں کی طرح تمام فرقہ وارانہ تنازعات میں کامل برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں (۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء) مولانا محمد علی ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمان کے درمیان کنیڈا کے انداز کا اتحاد ناممکن نہیں سمجھتے تھے۔ اس بارے

ہیں ان کے یہ جملے قابلِ اعادہ ہیں۔ لکھتے ہیں۔ رومان اور شاعری کی تخلیق کی ہوئی محبت کی شادی نہیں ہوگی۔ اس شادی کا محرک جذبہ محض فریقین کی سہولت پر مبنی ہوگا۔ یہ نکاح اگر عزت سے کیا جائے اور احترام کے ساتھ قائم رکھا جائے تو اسے برا نہیں سمجھنا چاہیے (۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء) ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی کے نزدیک متحدہ ہندوستان کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ ہندوستان میں ان کے نزدیک ایک نہیں دو قومیں آباد تھیں جن کی حیثیت ایک دوسرے کے برابر نہیں تھی۔ وہ ان دونوں کا ملاپ قدرتی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے نکاح کی صورت دینا چاہتے تھے جو ظاہر ہے ٹوٹ بھی سکتا تھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ نکاح پڑھا جانے سے پہلے اس کے توڑنے کی ضرورت بھی پیش کر دی گئی ہے۔ کامریڈ میں ولایت علی بمبوق کا لکھا ہوا مکالمہ جو عام خیال میں ہوا، اس سلسلہ میں پیش خدمت ہے۔

سوال۔ آپ ہندو مسلم مسئلہ کیسے حل کریں گے؟"

جواب۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ کر دینا چاہیے۔ شمالی ہند مسلمانوں کے حصے میں آئے گا اور ہندوستان ہندوؤں کے حوالے کر دیا جائے۔ (۱۰ مئی ۱۹۱۳ء)

نادر علی

پہلی عالمی جنگ کے بعد بقول چودھری خلیق الزماں لکھنؤ کے ایک وکیل نادر علی نے بھی ایک پمفلٹ لکھا جس میں برصغیر کے مسائل کا حل بتایا کہ اسے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن حالات ایسے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نکاح ہو گیا لیکن جب تحریکِ خلافت اور عدم تعاون ناکام ہوئیں تو یہ نکاح ٹوٹ گیا اور ایسا ٹوٹا کہ فریقین ایک دوسرے کا منہ دیکھنے کے روادار نہ ہوئے۔

ریشمی رومال کی تحریک

ان تمام باتوں کو تحریر کرنے کا مطلب یہ ہے ساری مسلم قوم شروع ہی سے علیحدہ وطن کی حامی تھی۔ بلاشبہ جب تک مسلم قوم پر سرسید کے اثرات باقی تھے

علیحدہ وطن کا حلقہ مسلمانوں میں ایک جاندار حلقہ تھا لیکن جب ان میں گروہ احرار کو فروغ ہوا جو ہندوؤں سے زیادہ انگریزوں کا دشمن تھا اور جو یہ کہتا تھا کہ ہندوستان سے پہلے انگریزوں کو نکالا جائے پھر ہندوؤں کے ساتھ رہنے کے مسئلے پر غور کیا جائے تو ہندو مسلم اتحاد کے لیے سرگرم کوششیں شروع ہوئیں اور جب پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو مسلمانوں کے ایک گروہ نے جو علمائے دیوبند کا حامی تھا یہ محسوس کیا کہ جنگ میں ترکی اور جرمنی کا ساتھ دیا جائے اور ایسے حالات پیدا کیے جائیں جو برصغیر سے انگریزوں کے انخلا کا باعث بنیں۔ اس جنگِ عظیم میں انگریزوں نے سلطنتِ عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کی جو سازشیں کیں اس کا ہندوستانی مسلمانوں پر بڑا اثر ہوا اور وہ خود اپنے ملک میں ان سازشوں سے پوری طرح باخبر تھے جو انگریزوں نے ان سے اقتدار چھیننے کے سلسلے میں کی تھیں۔ اب وہ ایسی ہی سازشوں کو خلافتِ عثمانیہ کے خلاف جاری و ساری دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلمانوں نے علی الاعلان اپنے ترک بھائیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا اور دیوبندی گروہ کے سرخیل مولانا محمود حسن نے ریشمی رومال کی تحریک شروع کی۔ ان کے ایک شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنے استاد کی ہدایت پر افغانستان جا کر آزاد ہند حکومت قائم کی اور خود اس کے وزیر داخلہ بنے۔ اس گروہ علما نے افغانستان اور اور سرحد کے قبائلی علاقہ میں مسلمانوں کی جدوجہد کو منظم کیا۔ اس کے بعد مولانا محمود حسن کی اسکیم کے مطابق ایک ریشمی رومال پر . . . . جنگ کے ایام میں خفیہ تحریر کے ذریعے ترکوں کو عراق اور افغانستان کے راستہ ہندوستانیوں کی امداد اور ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی۔ خود مولانا محمود حسن ہجرت کر کے عرب گئے اور مدینہ میں حکومتِ ترکیہ کے نمائندوں سے ملے اور انھیں ہندوستان پر حملہ کے لیے آمادہ کرنا چاہا۔ مسلمانوں کا دوسرا گروہ جو ترکوں کا حامی تو تھا لیکن وہ مولانا محمود حسن کی طرح جنگ کا دائرہ ہندوستان تک پھیلانے کے خلاف تھا۔ ہندوستان کے بیشتر سرکردہ عمائدین اس گروہ میں تھے۔ لیکن ایک تیسرا گروہ بھی مسلمانوں میں موجود تھا جو ایسے کام میں بھی انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرتا تھا لیکن اس گروہ کو عام مسلمانوں کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ ہندو مسلم نکاح کے مختقر

دور کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۹۱۶ء کا میثاق لکھنو ہے جس میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشش کی گئی اور مسلم لیگ اس میں فریق تھی۔ (تفصیل اپنے موقعے پر بیان کر دی گئی ہے۔)

عبدالستار خیری

لیکن اس کے باوجود مسلم مفکرین ہندو ذہنیت سے برابر خائف رہے چنانچہ ۱۹۱۷ء میں پروفیسر عبدالستار خیری نے سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے اجلاس اسٹاک ہوم میں اس تجویز کو پیش کیا کہ ہندوستان ایک قوم کا وطن نہیں ہے بلکہ یہ مختلف قوموں کا وطن ہے۔ اس لیے ہندوستان میں انتقال اختیارات کے ضمن میں یہ خیال رکھا جائے کہ ہندوستان واحد اکائی ہے نہ تھا اور نہ ہو گا اور اس کے صوبوں کو حق خود اختیاری دیا جائے تاکہ مسلمان اپنے اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک فیڈریشن بنا سکیں۔

مولانا کے نظریات

پروفیسر خیری کے علاوہ مولانا حسرت موہانی کی دور بیں نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کی فضا عارضی ہے اور یہ اتحاد دیر پا ثابت نہیں ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۲۱ء کے مسلم لیگ سیشن میں اپنا خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے مسلم قوم کے علیحدہ وجود اور اس کے ارتقا اور تحفظ کے بارے میں اپنے خیالات کو واضح طور پر پیش کیا۔ مولانا نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا کہ مسلمانوں کے نزدیک آزادی کامل ہی کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ "آزادی" کامل کے بعد کیا ہو گا۔ اس لیے ہمیں پہلے اس پر غور کرنا ہے کہ حصول آزادی کے بعد ملک کا جو نقشہ مرتب ہو گا، اس میں مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہو گی۔ انھوں نے اس خطبۂ صدارت میں تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرز پر ہندوستانی جمہوریہ قائم ہونی چاہیے، اس لیے کہ دو قومی ہندو مسلم اتحاد کے باوجود ہندوستان کے دونوں فرقوں نے یعنی ہندو اور مسلمانوں میں شدید اختلاف ہیں اور مسلمانوں کو اندیشہ ہے کہ حکومت خود اختیاری

کے حصول کے بعد ہندو اپنی عددی اکثریت کو مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کریں گے اور مولانا کے یہ اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔ اس لیے کہ ہندوؤں نے اپنے رویّہ سے مسلمانوں کو اس قسم کے خدشات میں مبتلا کر دیا تھا۔ بندے ماترم کے خالق مسٹر بنکم چیٹرجی نے اپنے ناول انداماتھ میں بنگال کے اندر مسلم طاقت کے زوال اور ہندو قومیت کی بیداری کا ذکر کرتے ہوئے ہندوؤں کو اس بات پر ابھارا کہ وہ غاصب لیکن زوال پذیر مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہوں۔ اس ناول میں واضح طور پر بتایا گیا تھا کہ ہندوؤں کا مقابلہ انگریزوں سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے۔ اس کتاب کا ایک کردار جیوانند، بچوں کے ایک گروہ سے . . . . مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ہم نے مسلم حکومت کے آشیانہ کو تہ و بالا کر دیا اور ان بدمعاشوں کے شہر ڈھاکہ کو دریا برد کرنے کا کئی بار ارادہ کیا ہے۔ اب ایسا کرنے کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ بچّے مسلمانوں کے گاؤں کو آگ لگاتے۔ ان کی جائداد کو لوٹتے اور انھیں قتل کرنے پر پل پڑتے ہیں۔ اس زمانہ میں ایک اور ہندو راہنما نے مسلمانوں کے بارے میں ہندوؤں کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "ہمارے دلوں میں مسلمانوں کے لیے نفرت کے گہرے جذبات پیدا ہو چکے ہیں جن کے باعث باہمی تعلقات کی خوشگواری ختم ہو گئی۔ کشور گنج کے ہم تمام لڑکے ایک نامعلوم جذبہ کے تحت دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ یعنی مسلمان اور ہندو۔ ہمیں اس تقسیم کے محرکات کا بالکل علم نہ تھا۔ معلوم نہیں کہ مسلمان لڑکے میرے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پسند کرتے تھے یا نہیں لیکن ہم ہندو لڑکے ان سے علیحدہ رہنا چاہتے۔ مولانا محمد علی نے بھی ۱۹۲۴ء میں ہندو مسلم اتحاد کے نتائج دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اگر ہندو مسلم مسئلہ کو حل نہ کیا گیا تو ہندوستان دو حصوں میں بٹ جائے گا۔ انھوں نے اپنے اس خیال کا اظہار اس سال علی گڑھ کے ایک اجتماع میں کیا۔

لالہ ہر دیال

اسی سال ایک ہندو راہنما لالہ ہردیال نے اپنی کتاب "میرے وچار" میں لکھا

کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے۔ مسلمان اس میں ایک رعایا کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں اور بس۔ انھیں نظم و نسق میں کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ سوراج حاصل کرنے کے لیے ہمیں نہ مسلمانوں کی مدد کی ضرورت ہے اور نہ ہماری خواہش ہے کہ مشترکہ حکومت قائم ہو۔ غیر ہندو حلقوں سے کوئی توقع نہ باندھو۔ اگر تم نے مسلمانوں کی مدد سے سوراج حاصل کیا تو ہمیشہ ان کے محتاج رہو گے، اس لیے انھیں اکیلا ہی رہنے دو۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ ہندو نسل ہندوستان اور پنجاب کا مستقبل ان چار ستونوں پر قائم رہ سکتا ہے۔ اوّل ہندو سنگھٹن، دوم ہندو راج، سوم مسلمانوں کی شدھی، چہارم افغانستان اور قبائلی علاقہ کی فتح اور وہاں کے مسلمانوں کی شدھی۔

سردار گل خان

اسی طرح ۱۹۲۳ء میں ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک بزرگ سیاست داں مولوی خان صاحب سردار گل خان صدر اسلامی انجمن نے تجویز پیش کی کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلم مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جن میں اقتدار اور حکومت کے لیے اتحاد اور اشتراک ممکن نہیں اور ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں ناکام ہونی لازمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ راس کماری سے آگرہ تک کا علاقہ ۲۲ کروڑ ہندوؤں اور آگرہ سے پشاور تک کا علاقہ ۸ کروڑ مسلمانوں کو دے دیا جائے۔ مسلمان اپنے منطقے میں اور ہندو اپنے حلقے میں سمٹ آئیں۔ اس کا مقصد ایک قوم کا دوسرے کو تباہ کرنا نہیں ہے بلکہ تبادلہ آبادی ہے۔ اگرچہ یہ بات بظاہر ناممکن العمل ہے تاہم ممکن العمل ہو تو ہم اسے پسند کریں گے۔

مرتضیٰ احمد خان میکش

دسمبر ۱۹۲۸ء میں مشہور ادیب اور صحافی مولانا مرتضیٰ میکش نے روزنامہ انقلاب مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۲۸ء میں تجویز پیش کی کہ مسلمان علاقوں پر مشتمل ایک علیحدہ وطن بنایا جائے۔ انھوں نے لکھا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ شمالی ہند میں جو پنجاب، سرحد، بلوچستان

اور سندھ پر مشتمل ہے۔ ایسی قومی حکومت کے قیام کو نصب العین قرار دیا جائے، کیوں کہ وقت کا تقاضا اور مسلمانوں کی خواہش اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے۔ اسی میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے۔ مسلمان نہایت آسانی سے اسے اپنا وطن سمجھ سکتے ہیں اور جب ان کو معلوم ہوگا کہ اس وطن کے آزاد کرانے میں ان کی ہر قسم کی فلاح و بہبود مضمر ہے اور ان کی آئندہ کی نسلوں کی ترقی اور کفالت اس پر منحصر ہے تو ان کی ساری کوششیں اس مقصد پر صرف ہونے لگیں گی۔ اس سال ۱۹۲۸ء میں نہرو کمیٹی کے سامنے بھی یہ تجویز پیش کی گئی لیکن کمیٹی نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ رقبے کے لحاظ سے یہ ریاست غیر متوازن ہو جائے گی۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ الٰہ آباد میں جو انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا، اس کا حوالہ دیا ہے۔

علامہ اقبال کی طرف سے شرائطِ صدارت

علامہ اقبال کو جب مسلم لیگ کے اس اجلاس کی صدارت کا دعوت نامہ ملا تو مولانا حسرت موہانی کے اخبار مستقل کی اشاعت مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۳۰ء کے بقول علامہ اقبال نے قائداعظم کو تحریر کیا کہ صدارت لیگ کی قبولیت تین مسائل کے تصفیہ پر مبنی ہے۔
(۱) میں ہندوستان کی متحدہ قومیت کو تسلیم نہیں کرتا اور اس اصول کو ملت مرحوم کی حیات فی الہند کے لیے سم قاتل سمجھتا ہوں (۲) میں اس بات کا قائل ہوں کہ پنجاب کے صوبہ سرحد اور سندھ کو ملا کر شمالی ہند میں ایک آزاد اسلامی ریاست قائم کی جائے۔
(۳) میں بعض صوبجات میں مسلمان اقلیتوں کو مراعات دلا کر پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریتوں کو برباد کرنے کے سخت خلاف ہوں۔

خطبۂ مسلم لیگ

بہر حال علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت میں نہرو کمیٹی کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ۔
میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو مدغم کر کے ایک واحد ریاست بنا دیا جائے خواہ یہ قلمرو برطانیہ کے اندر ہو یا باہر ہو۔ میرے نزدیک کم از کم شمال مغربی ہند

کے مسلمان کی قسمت ایک متحدہ شمال مغربی ہندی مسلم ریاست کی تشکیل سے وابستہ ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے اجلاس ۱۹۲۸ء میں پیش کی گئی تھی لیکن اس نے اس بنا پر اسے رد کر دیا کہ اگر اس پر عمل درآمد ہوا تو ایک غیر متوازن سی ریاست بن جائے گی۔ جہاں تک رقبہ کا تعلق ہے یہ درست ہے لیکن آبادی کے لحاظ سے یہ ریاست ہندوستان کے موجودہ صوبوں سے بھی چھوٹی ہے اگر انبالہ ڈویژن کو اور بعض غیر مسلم اکثریت کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دیا جائے تو اس کا رقبہ گھٹ جائے گا اور مسلمان اس معاملہ میں بہتر پوزیشن میں ہوں گے کہ اپنے رقبہ میں اقلیتوں کی زیادہ مؤثر انداز میں حفاظت کر سکیں۔

مولانا محمد علی کا خط

جنوری ۱۹۳۱ء میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی نے اپنے انتقال سے چند روز قبل لندن میں ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کے تصفیہ کے لیے وزیر اعظم انگلستان کو اپنے تاریخی خط میں لکھا تھا کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کو جنیوا کی مجلس اقوام کے تصور کے مطابق ایک اقلیت کہنا غلط ہے بالخصوص جب کہ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ۴۰ کروڑ سے زائد ہو اور وہ ساری دنیا کے لوگوں کو مسلمان بنانے میں مصروف ہوں، جن کا اپنا نظریۂ حیات ہو اور جن میں اخوت اور مساوات کا جذبہ کارفرما ہو۔ مسلمانوں کو اقلیت سمجھنا سب سے بڑی حماقت ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہوں وہاں انھیں کامل اختیار دیا جائے اور ان صوبوں میں بھی حقوق ہندوؤں کو دیے جائیں جو مسلمانوں کو ہندو اکثریتی صوبوں میں حاصل ہوں۔ مولانا محمد علی نے اپنے خط میں یہ بھی تحریر فرمایا کہ اگر نئے دستور میں مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے نہ قائم ہوئے تو ہندوستان میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مسلمانوں کو اپنے چار یا پانچ اکثریتی صوبوں میں وہی اختیارات ملنے چاہئیں جو ہندوؤں کو باقی صوبوں میں ملیں گے مولانا محمد علی نے گول میز کانفرنس میں اپنی اس عظیم تقریر کے دوران پورے ہندوستان میں وفاقی طرز حکومت کا قیام کا مطالبہ کیا جس میں انھوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر ہندوستان کو کامل آزادی نہ دی گئی تو ان کے لیے آپ لوگوں کو میری قبر یہیں کھودنی پڑے گی۔

مولانا محمد علی کی یہ معرکتہ الآرا تقریر لندن میں ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو ہوئی تھی ۔ مولانا نے اپنی اس تقریر میں اعلان کیا تھا کہ میں وہ طاقت مانگتا ہوں کہ جب لارڈ ہیڈنگ کوئی جرم کریں تو میں بھی انھیں اسی طرح جیل بھیج سکوں جس طرح انھوں نے مجھے اور میرے بھائی کو جیل بھیجا تھا ۔ مولانا نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا کہ ہم کانفرنس سے اس وقت جائیں گے جب فیڈرل نظام حکومت قائم ہو جائے گا ۔

رحمت علی

لیکن مولانا محمد علی کو شاید یہ اندازہ نہیں تھا کہ اسی لندن میں ایک ہندوستانی طالب علم جس کا نام رحمت علی ہے اور جو کیمرج یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا ہے فیڈرل نظام حکومت کو بھی مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں گردانتا ۔ اس طالب علم نے ۲۸ جنوری ۱۹۳۳ء کو لفظ پاکستان کی تخلیق کرنے کے چند ماہ بعد ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا اور پھر اسی شخصیت نے تن تنہا اس کو تمام حلقوں میں تقسیم کیا اور اس کی نقول گول میز کانفرنس کے شرکا میں بھی تقسیم کیں لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے مسلمانوں کو اس وقت تک اس بات کی قطعی امید نہ تھی کہ ہندوؤں کے کے ساتھ مستقل اور دیرپا مصالحت ہو سکتی ہے اور اگرچہ سر سیّد سے لے کر اس وقت تک کے تمام مسلمان زعما اور مفکرین تقسیمِ ہند کو ہندو مسلم تنازعہ کا واحد حل تصور کرنے لگے تھے لیکن پھر بھی عام مسلمانوں کے دل اتنے بڑے عمل جراحی پر آمادہ معلوم نہیں ہوتے تھے ۔ چنانچہ جب یہ پمفلٹ تقسیم ہوا تو گول میز کانفرنس کے ایک برطانوی مندوب سر رینالڈ کریڈ اک نے کانفرنس میں سوال کیا کہ کیا کوئی اور مندوب مجھے یہ بتائے گا کہ آیا پاکستان کے نام سے کوئی ایسی تجویز پیش ہوئی ہے جس میں مسلم اکثریتی صوبوں کے ایک وفاق کا خیال ظاہر کیا گیا ہو ۔ علامہ عبداللہ یوسف علی سی بی ای ۔ سر محمد ظفر اللہ خان اور ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے اس کے جواب میں کہا کہ ایسی کوئی تجویز نہ زیرِ غور ہے اور نہ پیش کی گئی ہے جس کا ذکر سر کریڈ اک نے کیا ہے ۔ یہ صرف ایک طالب علم کی بڑ ہے اور اس سے زیادہ اس کی کوئی وقعت نہیں سر ظفر اللہ نے جو بعد میں پاکستان کی پہلی کابینہ میں وزیر خارجہ بنے تو یہاں تک فرمایا

کہ جہاں تک کانفرنس کے شرکا کا تعلق ہے یہ اسکیم بچکانہ اور ناممکن العمل ہے اور اس کا مقصد بعض صوبوں کے فیڈریشن کے قیام ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے فرمایا کہ شاید یہ کہنا کافی ہو کہ کسی نمائندہ شخصیت یا ادارے نے اب تک اس اسکیم پر غور ہی نہیں کیا ہے۔ یہ سوال و جواب ہندوستانی آئینی اصلاحات جوائنٹ کمیٹی کے سامنے بیانات کی روداد کی جلد دوم کے صفحہ ۱۴۹۶ پر درج ہیں۔ میاں کفایت علی نے لکھا کہ "۱۹۴۰ء میں مرحوم و مغفور چوہدری رحمت علی نے مجھے بتایا تھا کہ ان کا ایک مضمون تقسیم ہند پر ۱۹۱۸ء میں اسلامیہ کالج کے میگزین کریسنٹ میں چھپا تھا۔ اس طرح غالباً ۱۹۵۲ء میں میاں شمیم حسن نے راقم الحروف کو بتایا کہ ان کے والد مرفضل حسین نے مسلم علاقوں میں ایک وحدت میں شامل کرنے کی تجویز آل انڈیا مسلم لیگ ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ علی گڑھ میں پیش کی تھی (یہ کانفرنس سرسید نے قائم کی تھی) اور میاں کفایت حسین نے اس کانفرنس کے جس اجلاس کا حوالہ دیا تھا وہ ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ میں ہی منعقد ہوا تھا اور یہ کانفرنس کا ۳۵واں اجلاس تھا۔

ڈاکٹر عبداللطیف

جناب رحمت علی کے بعد تحریک پاکستان کے سلسلہ میں سب سے اہم کردار جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللطیف حیدرآبادی کا ہے جنھوں نے اپنی تاریخی کتاب "ہندوستان کا تہذیبی مستقبل" میں جو مارچ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ ہندو مسلم اختلاف کے اصل اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے مسلمان کے لیے ایک علیحدہ وطن کے قیام کا مشورہ دیا اور تہذیبی لسانی بنیاد پر ہندوستان میں آزاد حکومتوں کے قیام کا مکمل خاکہ پیش کیا۔ اس کتاب نے شائع ہوتے ہی مسلم لیگ کے قائدین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور ۲۹ جنوری ۱۹۳۹ء کو لاہور کے ایک جلسہ میں پاکستان کے قیام کے سلسلہ میں جن اسکیموں پر غور کیا گیا۔ ان میں پروفیسر لطیف کی اسکیم کو خاص اہمیت دی گئی اور خود صاحب تجویز سے تمام معاملات پر تفصیلات حاصل کرنے کے بعد اسے ہندو مسلم حل کے سلسلہ میں ایک بہتر تجویز کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا اور اس کی ایک نقل آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے تمام ارکان کو بھیج دی گئی۔

سندھ مسلم لیگ کانفرنس کی قرارداد

مگر قبل اس کے کہ ہم اس تجویز اور اس سے متعلق دوسری تجویزوں پر مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے غور و خوض کا ذکر کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سندھ مسلم لیگ کانفرنس کراچی مورخہ ۷، ۸ اور ۹ / اکتوبر کا تذکرہ کرتے چلیں جس کو بجا طور پر قرارداد لاہور کا پیش لفظ کہا جا سکتا ہے۔ یوں خیال فرمائیے کہ مسلمانانِ ہند اور ان کے متعدد راہنما ابھی ہندو مسلم تنازعہ کے حل کے سلسلہ میں تقسیم ہند کی تجویز کا جائزہ ہی لے رہے تھے اور بیانات کی حد تک یہ کہا جا رہا تھا کہ اس مسئلہ کا حل بٹوارہ کے سوا اور کچھ نہیں کہ سندھ مسلم لیگ نے ایک نہایت مدلل اور مفصل تجویز کے ذریعے فیصلہ کر دیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور اس لیے آل انڈیا مسلم لیگ کو ہندوستان کا ایک ایسا آئینی خاکہ مرتب کرنا چاہیے جس میں مسلمانوں کو بھی ہندوؤں کے ساتھ مکمل آزادی نصیب ہو۔ چونکہ یہ قرارداد مملکتِ پاکستان کی خشتِ اول ہے اس لیے اسے یہاں مکمل طور پر بیان کیا جاتا ہے" چونکہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اس بنا پر آل انڈیا مسلم لیگ سے فرقہ وارانہ پر گفتگو سے انکار کر دیا ہے کہ مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت نہیں ہے اس لیے اس کی اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر ان پر ہمیشہ حکومت کرنا چاہتی ہے۔ کانگریس کے اس رویہ سے ہندوستانی اقلیتوں کے اس مسئلہ کے پُرامن اور سنجیدہ حل کے تمام امکانات خاک میں مل گئے ہیں جس کے لیے مسلم لیگ گزشتہ پندرہ سال کے عرصہ سے بھی زیادہ سے کوشش بے سود کر رہی ہے چونکہ کانگریس اپنے مضبوط پولیس اور بہتر پوزیشن کے باعث مسلمانوں سے براہ راست رابطہ کی مہم شروع کر کے مسلمانوں میں تفرقہ اور خلفشار پیدا کر کے دنیا کو گمراہ کن طریقے سے باور کرانا چاہتی ہے کہ وہ سارے ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے اور چونکہ اس نے بعض صوبوں میں دانستہ طور پر مسلمانوں کو شامل کیے بغیر وزارتیں بنا کر یا ان وزارتوں میں ایسے مسلمانوں کو شامل کر کے جن کو اپنی قوم کا اعتماد حاصل نہیں ہے اور اپنے صوبہ کے مسلم ارکانِ اسمبلی ان سے متفق نہیں ہیں ان صوبوں میں خالص ہندو راج قائم کر دیا ہے جو گورنمنٹ انڈیا ایکٹ کے مقاصد

اور روح کے منافی ہے اور اس ضمن میں جاری شدہ ضابطۂ حیات کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے اور چونکہ اس مقصد کے تحت قائم شدہ وزارتوں کا بنیادی طریقہ کار یہ ہے کہ اپنے صوبوں کی مسلم اقلیت کو بزورِ قوت محکوم بنایا جائے۔ معاشرہ میں مسلم ثقافت کے صحت مند اور ترقی پذیر رجحانات کو زائل کیا جائے۔ مسلمانوں کی مذہبی رسومات کو ختم کیا جائے۔ انھیں اپنی مذہبی اور معاشرتی ذمہ داریوں کی بجا آوری سے روکا جائے۔ اور انھیں ایک علیحدہ سیاسی فرقہ کی حیثیت سے نہ زندہ رہنے دیا جائے۔ چونکہ کانگریس نے جمہوری روایات کی مسلسل پامالی اور خلاف ورزی کے ذریعہ سرحد، بنگال پنجاب اور سندھ کی مسلم اکثریت کو بے بس اور غیر مؤثر بنانے کے لیے اس بات کی مسلسل کوشش کی ہے کہ ان صوبوں میں مسلم ارکانِ اسمبلی کو ورغلا کر، وزارتوں کا لالچ دے کر مخلوط وزارتیں بنا کر اور ایسی حکومتوں کی تشکیل اور استحکام میں مدد دے کر جنھیں اپنے صوبہ کی اکثریت کا اعتماد حاصل نہ ہو۔ چونکہ کانگریس نے اپنی ہائی کمان کے ذریعہ ایک خاص قسم کی فسطائی ڈکٹیٹر شپ قائم کر لی ہے جس کو تمام کانگریس وزارتوں پر مکمل کنٹرول حاصل ہے اور اس فسطائیت کی وجہ سے صوبوں میں صحت مند پارلیمانی روایات کے قیام اور ارتقا اور پارلیمانی آداب کی نشو و نما اور تعین میں زبردست رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں اور اس طرح اس نے مسلمانوں کی نئی تشکیل شدہ وزارتوں میں ان کا جائز حق نہیں دیا اور نہ ان مراعات کا لحاظ کیا جو آئین کے تحت انھیں حاصل ہیں۔ چونکہ کانگریس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ (۱) مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود ودیا مندر اسکیم نافذ کی جائے گی (۲) بندے ماترم کو مسلمانوں پر قومی ترانہ کی حیثیت سے تھوپا جائے گا حالاں کہ مسلمانوں کے احساسات یہ ہیں کہ یہ گانا مسلمان دشمنی کی بنا پر تخلیق کیا گیا ہے اور اس میں مسلمانوں کو دشمن تصور کیا گیا ہے (۳) ہندی کو دیوناگری رسم الخط میں ہندوستان کی قومی زبان بنایا جائے حالاں کہ تمام اقلیتوں نے اس کی مخالفت کی ہے۔ اس فیصلہ کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اس زبان کے ذریعے اقلیتوں پر ہندو مذہبی معتقدات، فلسفہ اور ثقافت مسلط کی جائے۔ اور ہندوستان پر برہمن کلچر کی بالادستی قائم کی جائے (۴) لوکل اداروں میں زبردستی مخلوط انتخابات کا طریقہ رائج کیا جائے تاکہ مسلمانوں کو ان اداروں میں صحیح اور مؤثر نمائندگی نہ مل سکے۔ (۵) جہاں تک ممکن ہو اردو سکولوں کو بند کیا جائے اور اردو کی تعلیم کی حوصلہ شکنی

کی جائے تاکہ یہ زبان رفتہ رفتہ نیست و نابود ہو جائے۔ (۶) آزادیٔ صحافت اور آزادیٔ تقریر
کو امنِ عامہ کے نام پر ختم کیا جائے اور کہا جائے کہ ان کے ذریعہ لوگوں کے جذبات کو
برانگیختہ کیا جا رہا ہے۔ (۷) مسلمانوں کے مذہبی رسم و رواج میں بزورِ شمشیر مداخلت کی جائے
اور جابرانہ قوانین کے ذریعہ ان کو دبایا جائے چونکہ ہندوستان کا اکثریتی فرقہ ہزارہا سال
سے ذات پات کی قیود کا شکار ہے اور یہ چیز متحدہ قومیت، مساوات، جمہوریت اور ان
تمام اعلیٰ اقدار کے منافی ہے جن کا دورِ جدید کی نعمتوں میں شمار ہے اور چونکہ کاسٹ سسٹم
نے ملک کی آبادی کے ایک بڑے حلقے کو جو کروڑوں پر مشتمل ہے سوشل اور اقتصادی
ناہمواری کا شکار بنا دیا ہے اور یہ طبقہ اچھوت بن گیا ہے اور چونکہ ایک متحدہ و متفق
ہندوستانی قومیت کا قیام اور ارتقا جس کا مقصد وحدت اور مساوات ہو ذات
پات کی قیود اور اکثریتی فرقہ کی مسلم کش ذہنیت نے ناممکن بنا دیا ہے اور یہ وحدتِ فکر و
عمل اس لیے بھی ناممکن ہے کہ اکثریت اور اقلیت کے درمیان مذہب، زبان، رسم الخط
ثقافت، سماجی قدریں اور مطمحِ حیات میں گہرا اور بنیادی فرق پایا جاتا ہے اور بعض
علاقوں میں تو نسل کا بھی اختلاف ہے اس لیے یہ کانفرنس وسیع براعظم کے مستقل اور
پائیدار امن کے قیام، ثقافتی ترقی، معاشی خوشحالی اور سماجی انصاف کی خاطر اور ہندوؤں
اور مسلمانوں دونوں قوموں کے حقِ خود داریت کے اصول کے پیشِ نظر آل انڈیا مسلم لیگ
سے سفارش کرتی ہے کہ وہ ہندوستان کے لیے ایک ایسا دستوری خاکہ اور اسکیم
مرتب کرے اور ہندوستان کے دستوری مسائل کا متذکرہ بالا خیالات کے پیشِ نظر
از سرِ نو ایسا جائزہ لے جس کے تحت مسلمان ہندوستان میں اپنے آئینی استحقاق اور
معاشرہ میں اپنے حقوق کو بہ آسانی حاصل کر سکیں یہ کانفرنس آل انڈیا مسلم لیگ سے
سے مزید سفارش کرتی ہے کہ وہ ایک ایسا آئینی فارمولا اور نظام تیار کرے جس کے
تحت مسلمانوں کو مکمل آزادی حاصل ہو۔ یہ کانفرنس مزید طے کرتی ہے کہ گورنمنٹ آف
انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء ہندوستان کے لیے قابلِ قبول نہیں اور وہ اس کے نفاذ
کے خلاف ہے۔ یہ کانفرنس حکومتِ برطانیہ پر زور دیتی ہے کہ وہ اس کے نفاذ سے
باز رہے کیوں کہ یہ اسکیم اہلِ ہند کے مفادات کے عموماً اور مسلمانانِ ہند کے مفادات کے
خصوصاً خلاف ہے۔ یہ کانفرنس مزید اعلان کرتی ہے کہ جو آئین متذکرہ بالا اصولوں کے

خلاف بنایا جائے گا اور جسے آل انڈیا مسلم لیگ کی حمایت حاصل نہ ہوگی۔ وہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہوگا یہ قرارداد شیخ عبدالمجید سندھی نے پیش کی تھی اور اس کی تائید خان بہادر نواب مشتاق احمد گورمانی (پنجاب) حاجی عبداللہ ہارون (سندھ) سید عبدالرؤف شاہ (سی پی) اور مولانا عبدالحامد بدایونی (یوپی) نے کی۔

مسلم لیگ کی ذیلی کمیٹی

اور ۲۶ مارچ ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا ایک خاص جلسہ اس تجویز پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا تو سر عبداللہ ہارون کی سکرٹری شپ میں ایک ذیلی کمیٹی قائم کی گئی جو اس سلسلہ میں پیش ہونے والی تمام اسکیموں پر غور کرے۔ ان اسکیموں میں سر سکندر حیات خاں، علی گڑھ کے پروفیسر سید ظفر الحسن، ڈاکٹر افضال حسین قادری، پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن، مولا عبدالواحد، مولانا آزاد سبحانی، چودھری فضل حق سر عبداللہ ہارون اور سید رضوان اللہ کی اسکیمیں خاص طور پر شامل تھیں۔

قرارداد لاہور کے الفاظ

بعد ازاں مسلم لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کے کئی اجلاس ہوئے اور مختلف اسکیموں پر تبادلہ خیال ہوتا رہا اور سب سے آخر میں ۲۳ مارچ کو مولانا ابوالقاسم فضل الحق کی تحریک اور چودھری خلیق الزماں کی تائید اور مولانا ظفر خان ایم۔ ایل۔ اے، سینٹرل سردار اورنگ زیب خان ایم ایل اے (سرحد) حاجی سر عبداللہ ہارون (ایم۔ ایل اے) سینٹرل۔ خان بہادر نواب اسمٰعیل خاں صاحب ایم ایل سی (بہار) قاضی محمد عیسٰی صاحب صدر بلوچستان صوبائی مسلم لیگ مسٹر عبدالحمید صاحب ایم۔ ایل اے (مدراس) مسٹر آئی۔ آئی چندری گر ایم۔ ایل اے (بمبئی) سید عبدالرؤف شاہ (ایم۔ ایل اے) (سی پی) سید ذاکر علی صاحب (یوپی)، بیگم صاحبہ مولانا محمد علی اور مولانا عبدالحامد۔ صاحب قادری (یو۔پی) کی حمایت سے قرارداد لاہور متفقہ طور پر منظور کی گئی جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

کل ہند مسلم لیگ کا یہ اجلاس دستوری معاملات کی نسبت کونسل اور مجلس عاملہ کی کارروائی کی جو ان کی تجویز مورخہ ۲ اگست، ۱۸ ستمبر اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ اکتوبر

۱۹۴۰ء سے ظاہر ہے توثیق کرتے ہوئے پورے شدت کے ساتھ اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ وفاق جس کی دستور ہند بابت ۱۹۳۵ء میں تشریح کی گئی ہے اس ملک کے حالات اعتبار سے قطعاً ناموزوں اور ناقابل عمل ہے اور مسلم ہندوستان کے لیے کسی طرح قابل قبول نہیں (۲) ملک معظم کی حکومت کی جانب سے ویسرائے بہادر کے اعلان مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کی نسبت یہ اجلاس اپنے نقطۂ نگاہ کا اظہار کرتا ہے کہ حکومت ہند کے دستور بابت ۱۹۳۵ء کا جہاں تک تعلق ہے اس اعلان کے ذریعہ یقین دلایا گیا ہے کہ مختلف جماعتوں، فرقوں اور مفادات سے مشورے کے بعد دستور پر نظر ثانی کی جائے گی۔ مسلم ہندوستان اس وقت تک مطمئن نہ ہو سکے گا جب تک پورے دستوری خاکہ پر از سر نو غور نہ کیا جائے اور تاوقتیکہ اس کی بابت مسلمانوں کی رضامندی اور توثیق حاصل نہ ہو جائے کوئی تیار کردہ خاکہ قابل قبول نہیں ہو سکتا (۳) قرار پایا کہ کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس کی یہ غور کردہ رائے ہے کہ جب تک کوئی دستور مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں کے تحت مرتب نہ کیا گیا ہو اسے مسلمانانِ ہند کی منظوری حاصل نہیں ہو گی۔

جغرافیائی حیثیت سے متصل اراضی وحدتوں کے مابین حدود قائم کر کے ان کو جداگانہ علاقوں میں منقسم کیا جائے لیکن جیسا کہ ضروری معلوم ہوتا ہے ان رقبہ جات میں جہاں بہ لحاظِ تعداد مسلمان اکثریت میں ہیں، مثلاً شمالی مغربی اور ہندوستان کے مشرقی علاقوں کو آزاد ریاستوں کی حیثیت سے ایک دوسرے سے اس طرح متحد کرنا چاہیے کہ ان میں سے ہر وحدت خود مختار رہے۔ ان آزاد اور خود مختار وحدتوں کے دستور میں اقلیتوں اور ان کے مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق کی حفاظت کے لیے ان ہی کی اکثریت سے معین اور موثر تحفظات فراہم کرنے چاہئیں۔ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں دستور میں ان کے لیے معین اور موثر تحفظات شامل کیے جائیں تاکہ ان کے مذہبی، ثقافتی، انتظامی سیاسی اور دیگر حقوق و مفادات کی خود ان کی مشورت کے ذریعے حفاظت ہو سکے۔

یہ اجلاس مجلسِ عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ مذکورہ صدر بنیادی اصول کے بموجب ایسی دستوری اسکیم مرتب کرے جس میں ان مجوزہ ریاستوں کو سارے مسائل مثلاً دفاع، خارجی معاملات، رسل و رسائل، چنگی اور دوسرے ضروری امور کا اختیار دیا گیا ہو۔ اسی

قرارداد میں ایک مملکت پاکستان کے تصور کو پیش نہیں کیا گیا تھا بلکہ مملکت کی جگہ مملکتوں کا لفظ تھا اور ساری قرارداد میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے پاکستان کا لفظ نہیں تھا لیکن جب ہندو پریس نے اس قرارداد کو پاکستان کی قرارداد سے تعبیر کیا اور اسے متواتر یہی نام دیا گیا تو پھر قائدِ اعظم نے بھی اسے تسلیم کر لیا اور اسے قراردادِ پاکستان کہہ کر ایک مملکت کے تصور کی جانب سفر شروع کر دیا لیکن ابھی مملکتوں کے مملکت بننے میں دیر تھی۔ مسلم لیگ نے پہلی بار سرکاری طور پر قراردادِ لاہور کو قراردادِ پاکستان کے نام سے تعبیر کرنا ۲۲ فروری ۱۹۴۱ء کے بعد کیا۔ اس روز دہلی میں مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں جس کی صدارت قائدِ اعظم نے فرمائی یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر سال ۲۳ مارچ کو یومِ پاکستان منایا جائے اور اس روز تمام مسلمانوں کو قراردادِ لاہور یا قراردادِ پاکستان کے مطلب اور مفہوم سے روشناس کیا جائے اور جب وزیرِ ہند لارڈ ایمرے نے اپنے بیان میں اس بات کا اشارہ کیا کہ برطانوی حکومت اب بھی ہندوستان کو ایک وحدت تصور کرتی ہے تو مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ نے اپنے اجلاس منعقدہ دلی ۲۲ فروری ۱۹۴۱ء کو پھر قراردادِ لاہور کو دہرایا اور اعلان کیا کہ مسلمان اس سے کم پر تیار نہ ہوں گے۔

مسلم لیگ کے نصب العین میں تبدیلی

اور جب پندرہ اور سولہ اگست ۱۹۴۱ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مدراس میں منعقد ہوا تو اس کی قرارداد نمبر ۲ کے ذریعہ مسلم لیگ کے آئین کی شق نمبر ۲ میں ترمیم کر کے قراردادِ لاہور کے الفاظ کو یعنی پاکستان کو مسلم لیگ کا نصب العین بنایا گیا۔ لیکن یہاں بھی مملکت کی جگہ مملکتوں کا لفظ تھا۔ اس تاریخی ترمیم کو نواب زادہ لیاقت علی خاں ایم ایل اے سینٹرل نے پیش کیا اور حاجی عبد الستار۔۔۔ اسحاق سیٹھ ایم ایل اے سینٹرل نے اس کی تائید کی۔ مسٹر بی داؤد شاہ (مدراس)، قاضی محمد عیسیٰ (بلوچستان) نواب سر محمد یوسف ایم ایل اے (یوپی) مولانا ظفر علی خاں ایم ایل اے سینٹرل، بیگم محمد علی صاحبہ (دہلی) مولانا احمد سیٹھ صاحب (مدراس) سر عبد اللہ ہارون ایم ایل اے سینٹرل مسٹر محمد عثمان (بنگال) اور مولانا عبد الوہاب صاحب بخاری (مدراس) نے اس کی حمایت کی۔

مولانا کا تصورِ پاکستان

مگر قبل اس کے کہ ہم مجلس قانون ساز ہند کے مسلم ارکان کے کنونشن کی اہم قرار داد کا ذکر کریں جس میں پہلی بار مملکت پاکستان کا نام لیا گیا ہے اور مملکتوں کے لفظ کو ترک کیا گیا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حسرت موہانی کی ان کوششوں کا ذکر ہو جائے جو انھوں نے حصول پاکستان کے سلسلہ میں سرانجام دیں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا تھا مولانا ابتدا میں مسلم لیگ کے خلاف تھے لیکن جب لیگ نے حکومت خود اختیاری کو اپنایا تو مولانا اس میں شامل ہو گئے اور انھوں نے اس ادارہ کو اس حد تک اپنایا کہ ۱۹۲۱ء میں جب وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے تو ایسا آتشیں خطبۂ صدارت پیش کیا کہ وہ بحق سرکار ضبط ہوا اور اس طرح اس نے مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک ایسی پوزیشن حاصل کی جو اس ادارہ کے صدارتی خطبات میں نہ پہلے کسی کے حاصل تھی اور نہ آئندہ حاصل ہو گی۔ مولانا دراصل انگریزوں کے خلاف تھے اور مسلم لیگ اور کانگریس میں ان کی شمولیت کا یہی پیمانہ ہے کہ ان میں سے کون سی جماعت کس حد تک انگریزوں کے مخالفت ہے لیکن مولانا چونکہ ایک مرد مومن بھی تھے اس لیے وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان آزادی کامل کے چکر میں اس طرح پڑیں کہ اپنی آزادی بھی گنوا بیٹھیں اس لیے جب مسٹر گاندھی نے کانگریس کو اپنے مذہبی اثرات سے آلودہ کر لیا تو وہ اس ادارہ سے مایوس ہو گئے پھر آزادیٔ کامل کے بارے میں بھی کانگریس نے مسٹر گاندھی کی قیادت میں وہ سوانگ رچایا کہ مولانا یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ اس ادارہ کو آزادی سے زیادہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی عددی اکثریت کی بنا پر اپنا غلام بنانے سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس خطرہ کا جا بجا اظہار مولانا کے خطبۂ مسلم لیگ میں ملتا ہے جس میں انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ آزادی کامل کے ساتھ ہی ہندو مسلم مسئلہ کا حل بھی طے ہو جانا چاہیے تاکہ آزادی کامل سے مسلمانوں کو غلامی کا شکار نہ ہونا پڑے لیکن اس خطبۂ صدارت کی پاداش میں انھیں جیل کی ہوا کھانی پڑی اور جب وہ ۲۴ء میں پونا کے یرودا جیل سے رہا ہو کر کانپور واپس پہنچے تو بقول حافظ محمد اسلام مولانا نے ۱۹۲۱ء میں زیر سایہ تاج برطانیہ محدود آزادی کے نظریہ کی پھر مخالفت کی اور کامل آزادی کے

واسطے مسلمانوں کے تعاون کے لیے یہ شرط لگائی کہ اونچی ذات کے ہندو اس بات پر رضامند ہو جائیں کہ ایک قومی وفاقی حکومت ہند کے تحت مسلمانوں کی ریاستیں اور ہندوؤں کی ریاستیں ہوں گی۔ انھوں نے اصرار کیا کہ ہندو آزاد مملکت کے تصوّر کی اساس کو یہ سمجھ لیں کہ یہ دو فرقوں یعنی ہندو اور مسلمان کی بنیاد پر ہوگی۔ مسلم اکثریتی صوبوں کو مسلم ریاستوں میں اور ہندو اکثریتی صوبوں کو ہندو ریاستوں میں بدل دیا جائے گا۔ ان ریاستوں پر مشتمل ہندوستانی کا وفاق ہوگا ہوگا جو ایک سپریم نیشنل حکومت کے تحت ہوگا۔ جس میں ہندو اور مسلم شریک ہوں گے۔ ان اسکیمز کی تفصیل حسرت موہانی؟ از عبدالشکور کے صفحہ ۲۶، ۲۷ اور ۲۸ سے نقل کی جاتی ہے جو اردوئے معلّٰی بابت جنوری فروری، مارچ ۱۹۴۲ء سے اخذ کی گئی ہے مولانا کی اسکیم میں برصغیر کی تقسیم ۶ مملکتوں میں کی گئی ہے جو وفاقی اتحاد ریاست ہائے ہند کے اجزائے ترکیبی ہوں گی۔ مولانا نے اس اسکیم میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں اس کے متبادل انگریزی الفاظ بھی درج کر دیے گئے (۱) اتحادیہ UNION (۲) ترکیبہ CONFEDERAL (۳) وفاقیہ FEDEREL (۴) جمہوریہ SOVEREIGN یہ ۶ جمہوریہ حسب ذیل ہوں گی۔

(۱) وفاقیہ ہند مشرقی جسے بعد میں مشرقی پاکستان کا نام دیا گیا۔ یہ جمہوریہ آسام اور بنگال پر مشتمل ہوگی۔

(۲) وفاقیہ ہند جنوب مشرقی جس کا نام بعد میں بھی یہی رہا۔ جمہوریہ اڑیسہ جمہوریہ آندھرا جمہوریہ مدراس اور جمہوریہ کیرلی پر مشتمل ہوگی۔

(۳) وفاقیہ ہند مرکزی جس کا بعد میں نام مرکزی ہندوستان تجویز کیا گیا۔ جمہوریہ بہار، جمہوریہ یوپی اور جمہوریہ مہاراشٹر پر مشتمل ہوگی۔

(۴) وفاقیہ ہند جنوبی مغربی جس کا بعد میں نام جنوب مغربی ہندوستان تجویز کیا گیا۔ جمہوریہ گجرات، جمہوریہ بمبئی، جمہوریہ بلوچستان اور جمہوریہ سرحد پر مشتمل ہوگی اور۔۔

(۵) وفاقیہ ہند مغربی جس کا نام بعد میں مغربی پاکستان تجویز ہوا جمہوریہ پنجاب اور سندھ پر مشتمل ہوگی۔

(۶) جمہوریہ حیدرآباد

ان تمام جمہوریہ ریاستوں کو بقول مولانا اتحادیہ وفاقیات میں شامل کیا جائے

گا جس کی ایک کابینہ ترکیبیہ ہند بشرائطِ ذیل ہوگی اور اس کا مستقر دہلی میں ہوگا۔

(۱) ترکیبیہ ہند کو حق ہو گا کہ جن حکومتوں یا آزاد جمہوریوں مثل برطانیہ، روس یا چین سے معاہدۂ دوستی یا غیر جانب داری کرے نیز صلح و جنگ کا بھی اعلان کر سکے۔

(۲) ترکیبیہ ہند میں بغرض اشتراکِ عمل ہر وفاقیہ ہندوستان برابر تعداد میں اپنے نمائندے بذریعۂ انتخاب بھیجے گا۔

(۳) ہر جمہوریہ وفاقیہ کو اپنے اپنے گورنر یا گورنر جنرل انتخاب کرنے نیز الوان ہائے قانون کے انتخاب کا حق ہو گا۔

(۴) ہر جمہوریہ وفاقیہ کے انتخاب میں حق رائے کل آزاد بالغوں کو حاصل رہے گا اور پارٹیاں صرف سیاسی بن سکیں گی اور یہ شرط لازمی طور پر درج دستور ہوگی کہ اگر ایک رائے بھی صریحاً فرقہ یا مذہب کی بنا پر حاصل کی جائے گی تو بشرطِ ثبوت وہ انتخاب کالعدم ہو جائے گا۔

(۵) سیاسی پارٹیوں کی تشکیل کے لیے مال دار CAPITALTST اور نادار NATIOUAIST پارٹی کی طرح کام دار پارٹی SOCIALIST بھی جائز سمجھی جائے گی اور خلافِ قانون قرار نہیں دی جا سکے گی۔

(۶) ترکیبیہ کے صدر کا انتخاب براہِ راست کل باشندگان ترکیبیہ کی رائے سے ہو گا اور اس کا دائرۂ عمل مسائل مخصوصہ تک محدود رہے گا۔ وفاقی ریاستیں خود مختار ہوں گی اور مالی معاملات میں ترکیبیہ کے ماتحت نہ ہوں گی۔

(۷) اسی طرح وفاقیہ کے صدر کا انتخاب بھی براہِ راست کل بالغان وفاقیہ کی رائے سے ہو گا اور اس کا دائرۂ عمل بھی مسائل مخصوصہ تک محدود رہے گا۔ باقی مسائل میں جمہوریتیں آزاد ہوں گی، وفاقیہ کے ماتحت نہیں ہوں گی۔

(۸) اگر حکومت برطانیہ اس مجوزہ دستور کو منظور اور اس کے ضروری قیام کو تسلیم کرے تو موجودہ صوبجاتِ ہند کے یورپین گورنر، مجوزہ جمہوریتوں کے گورنر اور ہندوستان کے موجودہ گورنر جنرل کابینہ ترکیبیہ ہند کے عارضی پریذیڈنٹ مان لیے جائیں گے اور دورانِ جنگ میں ہندوستان کی کل فوج اور مسائل ان کے اور موجودہ کمانڈر انچیف کے ماتحت کام میں لائے جا سکیں گے البتہ جنگ کے خاتمہ پر اہل ہند

باضابطہ طور پر اپنے گورنر اور کل ہند کا پریزیڈنٹ منتخب کرلیں گے۔

(۹) ہندوستان کی موجودہ دیسی ریاستوں میں سے جو اور جب ایک وفاقیہ آزاد کا درجہ حاصل کرلیں۔ مثلاً حیدرآباد، برار، وہ بھی آئندہ اس ترکیب نظام میں شامل ہو سکتی ہیں۔

(۱۰) باقی دیسی ریاستیں بھی بہ شرطِ حصول آزادی و جمہوریت اپنی اپنی جگہ پر حسب حیثیت واہمیت وفاقیہ نظام حکومت یا جمہوریہ نظام حکومت میں شامل ہو سکتی ہیں۔ مولانا کی اس اسکیم کا لب لباب یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی علیحدہ علیحدہ ریاستیں قائم ہوں اور وہ ایک نیم یا ذیلی فیڈریشن میں منسلک ہو جائیں۔ مولانا کا خیال تھا کہ اگر اس انداز پر حکومت کی تشکیل کی منصوبہ بندی کی جائے تو ہندو مسلم دونوں کے سیاسی حقوق محفوظ ہو جائیں گے، اور فرقہ وارانہ مسئلہ خود بخود ختم ہو کر آزادی کی راہ صاف اور ہموار کرائے گا۔

مولانا نے پہلی مرتبہ ۱۹۲۴ء میں یہ اسکیم پیش کر کے ہندو رہنماؤں کو اس طرف متوجہ کیا اور ان سے گفت و شنید کی۔

لالہ لاجپت رائے

مولانا کی اس اسکیم سے دو قومی نظریہ کو استحکام حاصل ہوا اور جب انھوں نے لالا لاجپت رائے سے بات چیت کی تو وہ اس سے خاصے متاثر ہوئے بلکہ انھوں نے تو ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کی باتیں بھی شروع کردیں اور بقول جناب رضوان احمد چودھری رحمت علی نے ان فوائد کے لیے مولانا حسرت کو پُرخلوص اور زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ روزنامہ طوفان کی اشاعت مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۵۸ء میں حسرت موہانی کے عنوان سے جو اداریہ سپردِ قلم کیا گیا اس میں تحریر ہے کہ وہ ان عظیم محبانِ وطن سے تھے جو برصغیر میں پیدا ہوئے اور وہ ان مفکرین میں سرفہرست ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے علیحدہ وطن کا تصور پیش کیا جو بعد میں مسلمانانِ ہند کا متفقہ اور متحدہ مطالبہ قرار پایا۔ لالہ لاجپت رائے نے کھلم کھلا اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ جداگانہ انتخاب کا حق مانگنے والے مسلمان، ہندوستانی قومیت اور متحدہ ہندوستان کے نظریہ کو صدق دل سے قبول نہیں

کرتے۔ لالہ صاحب کا خیال تھا کہ جب مولانا حسرت موہانی جیسا مسلم راہنما ایک ہی سانس میں انگریزوں کو ملک سے نکال دینے اور مذہبی بنیاد پر مسلمانوں کے حق نمائندگی کی بات کرتا ہے تو انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلا مطالبہ تو پورا ہوگا نہیں البتہ اس سے دوسرے مطالبہ کی راہ ہموار ہو جائے گی اور مسلمان اپنی علیحدہ حیثیت مضبوط کرلیں گے۔ لالہ لاجپت رائے نے اسی سال یعنی ۱۹۲۴ء میں بنگال کے ایک وسیع النظر اور مسلمانوں کے ہمدرد لیڈر مسٹر سی آر داس کو ایک خط اس ضمن میں تحریر کیا جسے قائدِاعظم نے ۱۹۴۰ء کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوؤں کی ذہنیت ملاحظہ فرمایئے کہ جو بات لالہ لاجپت رائے نے کہی تھی۔ وہی بات میں کہوں تو میں فرقہ پرست، ہندوؤں کا دشمن اور انگریز کا پٹھو کہلاؤں مگر لالہ لاجپت رائے قوم پرست اور محب وطن سیاست داں ٹھہرائے جائیں۔ آخر ایک ہی بات کہنے والے دو افراد کے متعلق معیار میں زمین وآسمان کا فرق کیوں ہے اس لیے کہ وہ ہندو تھے اور میں مسلمان ہوں۔ لالہ لاجپت رائے نے اس خط میں لکھا تھا کہ مسلمان قرآن اور حدیث کی تعلیمات کے پابند ہیں۔ کوئی مسلم لیڈر خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو انھیں ان تعلیمات سے انحراف پر آمادہ نہیں کرسکتا۔ اسلامی تعلیمات ان کی زندگی پر محیط ہیں اس لیے ہندوستان میں وہ ایک قوم کا جزو نہیں بن سکتے ہندو مسلم مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ مولانا حسرت موہانی کی اسکیم کے مطابق ہندوؤں اور مسلمانوں کی الگ الگ مملکتیں قائم کی جائیں۔ انھوں نے صوبہ پنجاب کے ہندو اور مسلم اکثریتی ضلعوں کی بنیاد پر تقسیم کا منصوبہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں بنگال کے صوبہ کی بھی اسی طرح تقسیم چاہتا ہوں لیکن اگر وہاں کے ہندو مسٹر داس کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے اس پیکٹ پر بھی عمل کریں جو مسٹر داس اور مسلم لیڈروں میں ہوا ہے تو یہ ان کی اپنی مرضی ہے۔ لالہ صاحب نے کہا کہ میری اسکیم کے تحت مسلمانوں کی چار ریاستیں ہوں گی (۱) پٹھان صوبہ یا شمال مغربی صوبہ (۲) مغربی پنجاب (۳) سندھ اور (۴) مشرقی بنگال۔ ان کے علاوہ اگر ہندوستان میں ایسے علاقے ہوں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور ان کا صوبہ بن سکے تو انھیں بھی بنا دینا چاہیے۔ اس خط میں لالہ لاجپت رائے نے مسٹر سی آر داس کو لکھا کہ ایک اور چیز جو چند روز سے مجھے ستا رہی

ہے اور جس کے متعلق میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ احتیاط سے غور کریں، وہ ہندو مسلم اتحاد کا سوال ہے۔ میں نے گزشتہ ۶ ماہ کا بڑا حصہ تاریخ اسلام اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ممکن ہے نہ قابل عمل۔ ترک موالات میں مسلم قائدین کے خلوص کو تسلیم کرتے ہوئے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ ان کا مذہب ایسی چیزوں کا مانع ہے۔ میں نے کلکتہ میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر کچلو سے جو گفتگو کی تھی وہ یاد ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اجمل خاں سے بہتر کوئی مسلمان نہیں لیکن کیا مسلمان قرآن پاک کی خلاف ورزی کر سکتا ہے۔ اس کے خلاف اگر میں کوئی امید کر سکتا ہوں تو وہ صرف یہ ہے کہ میں نے اسلامی قانون سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اور میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز اطمینان بخش نہیں ہو سکتی کہ مجھے اپنی غلطی کا یقین دلایا جائے لیکن اگر میرا خیال صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اگرچہ ہم حکومت برطانیہ کے خلاف متحد ہو سکتے ہیں مگر ہندوستان میں جمہوری حکومت کے لیے متحد نہیں ہو سکتے۔ سوال یہ ہے کہ پھر علاج کیا ہے۔ میں ہندوستان کے — — — — — ۔ ۔ سات کروڑ مسلمانوں سے خائف نہیں ہوں۔ لیکن جب یہ افغانستان، وسطی ایشیا، عرب، عراق اور ترکی کی مسلح فوجوں سے مل جائیں تو پھر ان کی مزاحمت ناممکن ہو جائے گی۔" اس خط کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک یعنی ۱۹۲۴ء تک سوائے مولانا حسرت موہانی اور لالہ لاجپت رائے کسی کو مشرقی بنگال کی مسلم اکثریت کا خیال نہیں آیا۔ مولانا نے ۲ ستمبر ۱۹۳۰ء کو اپنے ایک اداریتی مقالے میں جو انھوں نے "مستقل" کانپور میں شائع کیا ہے پھر لالہ لاجپت رائے کا ذکر کیا اور لکھا کہ "مرحوم لالہ لاجپت رائے ہندو مسلم مقاصد کے بنیادی اختلاف سے گھبرا کر کبھی کبھی راقم الحروف سے کہا کرتے تھے کہ اب تو ان پیچیدہ مسائل کے حل کی صرف ایک ممکن صورت نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنے اپنے مطالبات کو انگریزوں کے سامنے رکھ دیں اور پھر جو فیصلہ وہ کر دیں اسے دونوں اپنا نوشتہ قسمت سمجھ کر منظور کر لیں۔" مولانا نے مئی ۱۹۲۱ء میں نیم وفاق کی جو اسکیم مرتب کی تھی وہ ہندو کانگریس اور مسٹر گاندھی کے رویے سے مایوس ہونے کے بعد پیش کی تھی لیکن ۱۹۲۴ء کے بعد جب گاندھی جی کی پالیسی اور زیادہ واضح ہوئی تو مولانا کو اپنی اسکیم کے بارے میں

اور زیادہ یقین واثق ہوگیا۔

گاندھی کے متضاد رویہ پر مولانا کا تبصرہ

مولانا کو اس بات کی شدید تکلیف تھی کہ مسٹر گاندھی کے الفاظ کے ہمیشہ دو مفہوم ہوتے ہیں اور وہ بیک وقت دونوں کو حق پر سمجھتے ہیں۔ اس طرح خلافت میں ان کی دلچسپی کو دیکھ مولانا نے کہا کہ یہ شخص (مسٹر گاندھی) عین دریا میں لے جاکر ہماری کشتی ڈبو دے گا اور ایسا ہی ہوا۔ پھر انھوں نے ۷ نومبر ۱۹۲۹ء کے مستقل میں تحریر فرمایا کہ "لاہور کانگریس کے صدر منتخب ہندوستان کے مشہور حریت نواز اور نوجوان لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی آخر کار کچھ تو اپنی فطری و آبائی اعتدال پسندی کی بنا پر اور کچھ مہاتما گاندھی کی عیارانہ ہندو نصیحت سے مسحور ہو کر لارڈ ارون کے تحفہ غلامی کو ہدیہ حریت قرار دے کر بہ دل و جان منظور کر لیا اور ہمارے اس قول کی عملی طور پر تصدیق کر دی کہ اس وقت طول و عرض ہند میں بعض کمیونسٹ نوجوانوں کو چھوڑ کر ایک ہندو بھی ایسا موجود نہیں ہے جو واقعی دل سے ہندوستان کے لیے آزادی کامل کا خواہاں ہو حریت کے سب سے بڑے مدعی جواہر سوراج لال نہرو کا خاتمہ اس طور پر ہوا اب مہاتما گاندھی کی روئداد سنیے۔ یہ بزرگوار ہی نہیں کہ غلامی کو سوراج تسلیم کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں بلکہ اس غلامی کو بھی صرف اس صورت میں قبول کرنا چاہتے ہیں جب کہ اس کی صورت نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق ہو۔

مولانا کی جانب سے آئینی اسکیم کا اعادہ

اس طرح جب گول میز کانفرنس میں ہندو اور برطانوی اکابرین نے ہندوستان میں واحدانی طرز حکومت کو رائج کرنے کا ارادہ کیا تو مولانا نے پھر اپنے اخبار مستقل میں اس خطرہ کی نشاندہی کی اور اپنی ۱۹۲۴ء والی اسکیم کے بنیادی اصولوں کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کرائی۔ انھوں نے اس اخبار کی اشاعت ۹ دسمبر ۱۹۳۰ء میں لکھا کہ مستقل کے گزشتہ دو نمبروں میں ہم نے جس خطرہ کا اظہار کیا تھا کہ ہندو لیڈر اور برطانوی

حکومت صرف بظاہر فیڈرل دستور کی تائید کرتے ہیں ورنہ دراصل انھیں وحدانی حکومت کے سوا اور کسی کی حکومت منظور نہیں۔ اس کی تائید تار کی آخری خبروں سے بالکل صاف طریق پر ہو رہی ہے، جن میں مسٹر شاستری کا یہ بیان خصوصیت کے ساتھ غور طلب ہے کہ اگر دستور لامرکزی قسم کا تجویز کیا جائے گا تو میں نے فیڈرل حکومت کی جو تائید کی ہے اس پر کسی طرح نہ قائم رہوں گا۔ اقسام حکومت کے متعلق مسلمانوں کی پریشان خیالی کو دور کرنے کے لیے ہم نے دو سال قبل جو ایک مقالہ مستقل میں لکھا تھا، آج اسے دوبارہ درج کیے دیتے ہیں۔

حکومت
- شخصیہ
  - مطلقہ
  - محدودہ
- جمہوریہ
  - وحدانیہ
  - ترکیبیہ
    - مرکزیہ
    - لامرکزیہ

حکومت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک شخصی دوسری جمہوری۔ پھر شخصی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک حکومت شخصیہ مطلقہ جس میں بادشاہ مطلق العنان ہوتا ہے، دوسری شخصیہ محدودہ جیسی حکومت موجودہ حکومتِ انگلستان، جس میں بادشاہ وزرا کی رائے کا پابند ہوتا ہے۔ حکومت شخصی کی طرح حکومت جمہوری کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وحدانیہ اور دوسری ترکیبیہ۔ پھر حکومت ترکیبیہ جمہوریہ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک مرکزی دوسری لامرکزیہ۔ مرکزیہ میں کامل اختیارات حکومت مرکزی کو حاصل ہوتے ہیں البتہ مرکزی حکومت جن اختیارات کو مناسب سمجھتی ہے وہ اپنی ماتحت آزاد ریاستوں کو تفویض کر دیتی ہے۔ اس کی مثال حکومت کینیڈا ہے اور لامرکزیہ میں اختیارات کامل منفردہ آزاد ریاستوں کے پاس ہوتے ہیں البتہ وہ ریاستیں جن جن اختیارات کو چاہتی ہیں اپنی طرف سے مرکزی حکومت کو سپرد کر دیتی ہیں۔ ہمارے نزدیک مسلمانوں کو جو شے مطلوب ہے وہ بھی آخری قسم کی حکومت ترکیبیہ لامرکزیہ ہے۔ اس کے برخلاف ہندو اور حکومت برطانیہ دونوں یا تو وحدانیہ کے طلب گار ہیں یا حکومت ترکیبیہ مرکزیہ کے، جس میں اور حکومتِ وحدانیہ میں بہت کم فرق ہے۔

مولانا نے جب ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ میں شمولیت کی اور جب آل انڈیا مسلم لیگ

کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں شرکت فرمائی اور اس کے بعد نصب العین میں تبدیلی کرنے کے لیے ترمیمی قرارداد پیش کی تو اس میں کامل آزادی کے مطالبہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی درج فرمایا کہ ہندوستان میں آزاد جمہوری مملکتوں کی ایک فیڈریشن اس طرح قائم کی جائے جس میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ آئین کا جزو بنایا جائے۔ اس اجلاس میں وہ ایک اور قرارداد کے موید تھے جس میں اس بات کا اعلان کیا گیا تھا کہ مسلمان اور مسلم لیگ ہندوستان میں ایک ایسے فیڈرل نظام حکومت کی مخالفت کریں جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء میں موجود ہے۔

مولانا نے اپنی اسکیم پھر پیش کی

مولانا نے اپنی ۱۹۲۴ء والی اسکیم کو بعد میں معمولی ردوبدل کے بعد اردوئے معلی کی اشاعت جنوری، فروری اور مارچ ۱۹۴۲ء میں پیش کیا جو اوپر درج ہے اور اس سلسلہ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے ارکان کو ہم نوا بنانے کی کوشش کی اور اس میں انھیں کامیابی بھی ہوئی جیسا کہ ان کی اپنی ذاتی ڈائری کے حسب ذیل اندراجات سے اندازہ ہوتا ہے۔

۲۶ر مارچ ۱۹۴۲ء آج میں نے دفعتاً فیصلہ کیا کہ دہلی جا کر جناح صاحب کو پاکستان اور برطانیہ کے ساتھ تعاون کی پالیسی ترک کرنے پر مجبور کر دوں گا۔

۲۷ر مارچ ۱۹۴۲ء آج صبح کی گاڑی دہلی لیٹ پہنچی۔ ۹ بجے دفتر مسلم لیگ میں حسن ریاض کے یہاں قیام۔ اسی وقت لیاقت علی خاں کے بنگلہ پر جا کر قریب قریب کل ممبران مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی سے ملاقات کی۔ نواب زادہ نے جناح صاحب سے پوچھ کر مجھ کو ۴٫۳۰ بجے شام کا وقت دیا۔ اس وقت مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر جمع ہوں گے۔ تم اپنے خیالات ان کے سامنے رکھ سکتے ہو۔ اسی وقت میں پہنچا اور دو باتیں مختصر طور پر پیش کر دیں۔ اول یہ کہ ورکنگ کمیٹی یا قائداعظم کو بھی اس کا اختیار نہیں کہ ڈومینین اسٹیٹس کی بنیاد پر کرپس سے کوئی بات چیت کریں۔ دوم یہ کہ ڈومینین شکست کی حالت میں گاندھی پارٹی یا کانگریس پارٹی سے مل کر آزاد کا فیڈریشن

کی بنیاد پر مصالحت ہو سکتی ہے۔ کم و بیش ایک مہینہ بعد انھوں نے واردھا کا سفر اختیار کیا اور گاندھی جی، راجگوپال، اچاریہ اور ولبھ بھائی پٹیل سے ملاقاتیں کیں۔ ان ملاقاتوں کا حال خود ان سے سن لیجیے۔ وہ ۲۸ اپریل ۱۹۴۲ء کو اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ "راجہ جی بہت ہی ذہین واقع ہوئے ہیں اور ان کی نگاہ بہت دور رس ہے۔ فوراً میری اسکیم سمجھ گئے اور اس سے اتفاق کیا۔ رات کو گاندھی جی کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا۔ خدا کی شان کہ جو شخص ڈومینین اسٹیٹس کا شیدائی اور کامل آزادی کا دشمن تھا وہ اب میرا ہمنوا ہو گیا۔

قاضی سعید الدین کی اسکیم

مولانا کی اسکیم سے ملتی جلتی ایک اور اسکیم ۱۲ نومبر ۱۹۴۲ء کے اُردوئے معلّٰی کے شمارہ میں ڈاکٹر قاضی سعید الدین صدر شعبہ جغرافیہ پنجاب یونیورسٹی نے پیش کی جسے انھوں نے کامن ویلتھ آف انڈیا کے نام سے موسوم کیا۔ ڈاکٹر قاضی کی تجویز یہ تھی کہ برصغیر کو ۵ حصّوں میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ہندو اکثریت کا غلبہ ختم ہو کر رہ جائے۔ آپ کی اسکیم کے مطابق ان پانچ ریاستوں میں سے تین میں مسلمانوں کا غلبہ ہوتا ہندوستان کے شمالی اور مشرقی علاقوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں مسلمانوں کی ریاستیں قائم ہو جائیں اور جنوب میں نظام حیدر آباد کی ریاست قائم رہتی چونکہ اس پروگرام کے تحت نقل و حمل پر پابندی لگانا مقصود نہیں تھا۔ اس لیے آہستہ آہستہ اقلیتی علاقوں کے مسلمان مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں میں منتقل ہو جاتے اور ہندو اقلیتوں کے عوام ہندو اکثریتی صوبوں میں چلے جاتے۔ قاضی سعید الدین کا کہنا تھا کہ قائدِ اعظم نے بھی اس منصوبہ کی تعریف کی تھی مگر ہندو سیاست اور انگریزوں کی شاطرانہ چالوں نے ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ تقسیم کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا۔

ایک متحدہ پاکستان

اور مسلم لیگ نے آخر مسلمانوں کی وحدت اور مملکت کو تجویز کر کے مختلف مملکتوں کی اسکیم کو ہمیشہ کے لیے رد کر دیا۔ مسلم لیگ کی اس قرارداد کو ۱۹۴۶ء کی قرارداد کہتے

ہیں اور اسے مجالس قانون ساز ہند کے تمام مسلم لیگی ممبران کے ایک کنونشن میں جو قائدِ اعظم کے زیر صدارت ۷، ۸ اور ۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں منعقد ہو منظور کیا گیا۔ قرارداد جناب حسین شہید سہروردی وزیر اعلیٰ بنگال نے پیش کی تھی اور اس کا پورا متن درج ذیل ہے۔

ہر گاہ کہ ہندوستان کے وسیع براعظم میں دس کروڑ مسلمان بستے ہیں جن کا تعلق ایک ایسے مذہب سے ہے جو ان کی زندگی کے ہر شعبے (تعلیم، معاشرت، اقتصادیات، سیاست) کو منضبط کرتا ہے اور جو محض روحانی عقیدوں، رسوم اور تقریبات تک محدود نہیں بلکہ اس ہندو دھرم اور ہندو فلسفے سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی بدولت ہندو قوم ہزار سال سے طبقاتی تقسیم اور درجہ بندہ کا شکار چلی آتی ہے اور جس کے نتیجے میں چھ کروڑ انسان اچھوت بنا دیے گئے ہیں اور جس نے طرح طرح کی غیر فطری قیود قائم کرکے انسان کو انسان سے جدا کر دیا ہے جس کی بدولت بے شمار انسانوں پر ایک طبقے کی معاشرتی اور اقتصادی برتری مسلط ہے اور جس نے مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوستان کی دوسری اقلیتوں کے لیے بھی یہ خطرہ پیدا کر دیا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ سماجی اور اقتصادی غلام ہو کر رہ جائیں گے۔ ہندوؤں کے چھوت چھات کا نظام نیشنلزم، مساوات، جمہوریت اور اسلام کے تمام ارفع تصورات کی براہِ راست نفی کرتا ہے۔

ہر گاہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تاریخی پس منظر، ان کی روایات، ان کی ثقافتی تاریخ اور ان کا معاشرتی اور اقتصادی نظام ہر اعتبار سے جدا جدا ہے اور اس کے باعث ایک واحد ہندوستانی قوم کا تصور ہی غیر ممکن ہے جو ایک جیسے عقائد اور نظریات کا حامل ہو۔ اور صدیاں گزرنے کے بعد بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے راستے جدا جدا رہیں گے اور ہر گاہ کہ ہندوستان میں برطانیہ کی طرف سے مغربی جمہوریت کے اصولوں پر مبنی سیاسی ادارے قائم کرنے کے بعد مختلف ریاستوں میں اکثریت کا راج قائم ہو گیا اور اکثریت کا اس طرح باقی تمام اقلیتوں پر خواہ وہ بہ حیثیت مجموعی اکثریت میں تھیں کل اختیار ہو گیا اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت اکثریت والے صوبجات میں کانگریسی حکومتوں کے قیام نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان اقلیتوں

پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے اور انھیں طرح طرح سے دبایا گیا اور وہ تمام تحفظات اور گورنروں کے اختیارات بے معنی ہو کر رہ گئے جو اقلیتوں کے بچاؤ کے لیے تھے اور مسلمانوں کو تھک ہار کر اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا کہ اگر ہندوستان میں متحدہ وفاقی نظام قائم ہو گیا تو مسلمانوں کے حقوق اور مفادات کا مسلمان صوبوں میں بھی وہی حشر ہو گا جو ہندو اکثریت اور کانگریسی راج والے صوبوں میں ہوا تھا اور مرکز میں واقعی ہندو اکثریت ان کے حقوق کو بھی محفوظ و مامون نہ رہنے دے گی۔ اور ہر گاہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس امر کا یقین ہو چکا ہے کہ ان کو ہندو اکثریت کی غلامی سے بچنے اور اپنی نشوونما کے مواقع اپنی فطرت کے مطابق حاصل رہنے کا واحد ذریعہ ان کے لیے ایک آزاد اور خود مختار اور جداگانہ ریاست (مملکت) کا قیام ہے جو شمال مشرقی ہندوستان میں بنگال اور آسام پر اور مغربی ہندوستان میں پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہو گا۔ لہٰذا ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے مسلم لیگی ارکان کا یہ کنونشن ہر پہلو پر غور و خوض کے بعد اعلان کرتا ہے کہ ہندوستان کی مسلم قوم کسی ایسے آئین کو قبول نہیں کرے گی جو ایک متحدہ ہندوستان کے تصور سے مرتب کیا گیا ہو اور نہ ہی ایسا آئین۔۔ تیار کرنے والوں کے ادارے ہی میں شرکت کرے گی جس کی رو سے ہندوستان کے لوگوں کو اختیار منتقل کرتے ہوئے حسب ذیل منصفانہ اور قیام امن کے متقاضی اصولوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔

(۱) شمالی مشرقی ہندوستان میں بنگال اور آسام کو ملا کر اور شمالی مغربی ہندوستان میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ان علاقوں پر مشتمل ایک آزاد اور خود مختار مملکت کا قیام عمل میں لایا جائے اور بھاری مسلم اکثریت اور پاکستان کے قیام کو بلا تاخیر پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا غیر مبہم یقین دلایا جائے۔

(۲) پاکستان اور ہندوستان کے لوگوں پر مشتمل دو الگ الگ ادارے قائم کیے جائیں جو ان دونوں ملکوں کے آئین مرتب کریں۔

(۳) پاکستان اور ہندوستان کی اقلیتوں کو آل انڈیا مسلم لیگ کی ۲۳ مارچ کی قرارداد لاہور کے مطابق تحفظات دیے جائیں۔

(۴) مرکز میں عبوری حکومت کے قیام میں مسلمانوں کی شرکت کی واحد شرط یہ ہے کہ مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان تسلیم کیا جائے۔

کنونشن پوری شدومد سے یہ اعلان کرتا ہے کہ اگر ملک پر کوئی ایسا اعلان ٹھونسنے کی کوشش کی گئی جو متحدہ ہندوستان کے تصور پر مبنی ہو یا مسلمانوں کا مطالبہ پورا کیے بغیر کوئی عبوری حکومت قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلمانوں کے لیے ایسی ہر کوشش کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانیاں پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔

قراردادِ دہلی کی توثیق

اس قرارداد کو پھر باضابطہ طور پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ امپیریل ہوٹل دہلی مورخہ ۵ جون ۱۹۴۶ء میں توثیق کی گئی اور اس سلسلہ میں جو قرارداد منظور کی گئی اس میں بھی مملکتوں کی بجائے مملکت کا لفظ استعمال کیا گیا اور اعلان کیا گیا کہ مسلم لیگ کا مقصد اب برصغیر میں ایک آزاد اور خود مختار پاکستان کا قیام ہے۔

کیبنیٹ مشن کی اسکیم

اس کے بعد کیبنیٹ مشن نے ۱۶ مئی کو وہ اسکیم پیش کی جس کو وزارتی پلان کہا جاتا ہے اور جس میں مملکتِ ہند کو اے بی اور سی گروپ میں تقسیم کیا گیا تو اگرچہ مولانا آزاد نے اس اسکیم کو اپنی کوششوں اور ذہنی کاوشوں کا ثمرہ قرار دیا لیکن درحقیقت یہ مولانا کی پرانی اسکیم کا چربہ تھا جو انھوں نے ابتداً ۱۹۲۴ء میں پیش کی تھی اور بعد میں جسے انھوں نے ۱۹۴۲ء میں باضابطہ اسکیم کی صورت میں اردو کے معلّے کے ذریعے پیش کیا تھا اور جس کو مقبول بنانے کے لیے اس زمانہ میں انھوں نے سارے ملک کا دورہ کیا تھا۔ "تصور پاکستان کے ارتقا" کے مصنف حافظ محمد اسلام نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے: "مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۲۴ء میں جو بات کہی تھی اس میں معمولی ردوبدل کے بعد انگلستان کے وزارتی مشن نے اے، بی سی پلان کے نام سے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو پیش کیا۔ یہ منصوبہ ایسا تھا کہ اس میں ہندوستان کی وحدت کسی نہ کسی حد تک موجود تھی اور کانگریس کا معقول اور

منصف مزاج طبقہ اس منصوبے کو ماننے کے لیے تیار بھی تھا لیکن کٹر فرقہ پرست طبقہ نے ہندوستان کے اتحاد کی اس آخری کوشش کو بھی ناکام بنا دیا اور خود مسٹر گاندھی نے اس کی مخالفت کی۔ ان کی مخالفت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ گروپ سی میں بنگال کے ساتھ آسام کی قسمت کو وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے حالاں کہ وہ یہ بھی خیال کر سکتے تھے کہ مسلم لیگ اے بی سی منصوبہ کو ایک مرکز کے تحت مان لینے پر آمادہ ہے اور اس طرح بقول ان کے گئو ماتا دو ٹکڑوں میں تقسیم ہونے سے بچ رہی ہے لیکن یہ وسعتِ نظر ہندو سیاست دانوں میں کہاں تھی۔

وزارتی پلان کی بنیادی خامی

مولانا جو بنیادی طور پر اس منصوبہ کے مخالف نہیں تھے اس بات پر خاص طور پریشان تھے کہ اس میں آزادی کامل کا ذکر نہیں اور انھیں اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں مسلم لیگ ڈومینین اسٹیٹس پر نہ راضی ہو جائے۔ وہ اس خدشہ کے پیش نظر اس کوشش میں تھے کہ مسلم لیگ کو آزادی کامل کی قرارداد سے نہ ہٹنے دیں جس زمانہ میں سر اسٹیفرڈ کرپس ہندوستان آئے تھے اور کانگریس اور مسلم لیگ کے قائدین سے مصروف گفت و شنید تھے تو اسی دوران مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الٰہ آباد میں ہو رہا تھا۔ یہ ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ کے اس اجلاس میں جب یہ قرارداد پیش کی گئی کہ سر اسٹیفرڈ کرپس سے گفت و شنید میں قائداعظم کو تمام اختیارات تفویض کر دیے جائیں تو مولانا نے اسی خدشہ کے پیش نظر اس قرارداد کی مخالفت کی۔

اجلاس الٰہ آباد کا حال

مولانا جمال میاں نے لکھا ہے کہ ۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الٰہ آباد میں جس وقت ہو رہا تھا اس وقت سر اسٹیفرڈ کرپس ہندوستانی لیڈروں سے بات چیت کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے مولانا حسرت کو اندیشہ تھا کہ قائداعظم درجہ نوآبادیات پر راضی ہو جائیں گے۔ مجلس مضامین میں انھوں نے کرپس کی پیش کش کے متعلق اپنی تجویز اجلاسِ عام میں پیش کرنے کے لیے رکھی لیکن قائداعظم نے اسے پیش

کرنے کی اجازت نہیں دی تو مولانا نے قائدِ اعظم کو کامل اختیار دینے والی تجویز میں ترمیم کا نوٹس دیا۔ جب یہ تجویز اجلاس عام میں پیش ہوئی تو مولانا تنہا اس کی مخالفت میں کھڑے ہو گئے اس وقت ۵۰ ہزار سے زیادہ کا اجتماع تھا۔ ہر طرف سے آوازیں آرہی تھیں کہ "نہیں سنیں گے نہیں سنیں گے" مگر مولانا مائیکرو فون پر کھڑے نہایت معصومانہ مگر گرم جوش انداز میں فرمارہے تھے۔

"کیوں آپ کیوں نہیں سنیں گے؟ آخر ہم آٹے کا ہے کے لیے ہیں؟" آخر قائدِ اعظم کھڑے ہوئے اور مجمع سے اپیل کی کہ تقریر کرنا مولانا کا حق ہے اور انھیں اس بات کا موقع ملنا چاہیے کہ وہ آپ کے سامنے اپنے خیالات کو پیش کریں اور آپ کا یہ حق ہے کہ ان کی بات کو رد کر دیں مگر مولانا کو اپنے خیالات ضرور پیش کرنے چاہئیں۔ آخر مجمع ہارا اور مولانا جیتے۔ انھوں نے تقریر کی اور وضاحت کے ساتھ اپنا نقطۂ نگاہ پیش کیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس بھرے مجمع میں کوئی ان کا ہم نوا نہیں تھا۔ مولانا نے ویسرائے اور مسلم لیگ کی اس گفتگو میں بھی حصہ لیا جو ویسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کی توسیع سے متعلق تھی اور جس کے نتیجہ میں عارضی حکومت بننے والی تھی انھوں نے جب ویسرائے کی چالاکی کا اندازہ لگایا تو بذریعہ تار قائدِ اعظم کو اپنی رائے سے آگاہ کیا۔ مولانا نے اپنے تار میں لکھا کہ "ویسرائے فلسطین میں برطانوی پالیسی کے عین مطابق کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے بیک وقت تعاون حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ براہِ کرم وہ مایوسی نہ طلب کیجیے جس سے بعد میں عرب دوچار ہوئے لیگ کو اس سلسلہ میں تعاون نہیں کرنا چاہیے اور میدان ہندو مسلم فسادات کو توسیع کونسل کا فیصلہ ماننے کے لیے خالی چھوڑ دینا چاہیے۔ مسلم لیگ کانگریس کی مجوزہ تحریک میں غیر جانب دار رہ سکتی ہے اس کے علاوہ وہ جو بھی اقدام کیا جائے وہ مسلم لیگ کے اس نصب العین کے خلاف ہوگا جو آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام چاہتا ہے۔

پروفیسر عبدالشکور کا بیان

پروفیسر عبدالشکور نے لکھا ہے کہ میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ

میں پاکستان کا موئد ہوں لیکن پاکستان ڈومینین کا قائل نہیں - میں پاکستانی جمہوریت کا علم بردار ہوں اور یہی نکتہ میرے اور قائد اعظم کے درمیان خلیج بن گیا ہے۔
لیکن مولانا ڈسپلن کے اتنے پابند تھے کہ انھوں نے کبھی اس چیز کا اظہار خیال نہ کیا اور جب ۱۹۴۵ء میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یوپی اسمبلی اور مجلس دستور ساز ہند کے ممبر منتخب کیے گئے۔ انھوں نے پارٹی ڈسپلن کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی۔ مولانا عبدالسمیع نصرت موہانی نے کہا ہے کہ جب مسلم دستور ساز ہند میں یوپی سے مسلم لیگی ارکان کی نامزدگی کا مسئلہ درپیش تھا تو یوپی مسلم لیگ کی قیادت کو خطرہ تھا کہ اگر مولانا کو دستوریہ کے انتخاب کے سلسلہ میں مسلم لیگ کا ٹکٹ دیا گیا اور مولانا منتخب ہوگئے تو وہ مسلم لیگ کے ڈسپلن کا خیال نہیں کریں گے۔ اس خدشہ کے پیش نظر مولانا کو یوپی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کی طرف سے تو ٹکٹ دے دیا گیا لیکن اس بات کی کوشش کی گئی کہ مسلم لیگ کا مرکزی پارلیمانی بورڈ مولانا کا ٹکٹ منسوخ کرکے ان کی جگہ بیگم اعزاز رسول کو مسلم لیگ کا ٹکٹ دے دیا جائے۔ مرکزی پارلیمانی بورڈ کے ارکان نواب زادہ لیاقت علی خاں، چودھری خلیق الزماں اور مسٹر حسین امام تھے۔ مولانا کو اس سفارش کا علم ہوگیا اور وہ لکھنؤ سے سیدھے براہ راست دہلی پہنچے اور اسٹیشن سے سیدھے نواب زادہ کی کوٹھی گل رعنا پہنچ گئے جہاں اس وقت ناشتے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مولانا سیدھے لیاقت علی خاں کے پاس چلے گئے اور اپنے اس خدشے کا اظہار کیا۔ نواب زادہ صاحب نے مولانا سے کہا کہ یوپی مسلم لیگ کے قائدین کو خدشہ ہے کہ اگر مولانا مجلس دستور ساز ہند کے ممبر منتخب ہو گئے تو پارلیمانی ڈسپلن کی پروا نہیں کریں گے۔ مولانا نے جواب میں فرمایا کہ جہاں تک آزادی رائے کا تعلق ہے تو میں بلاشبہ اپنی رائے کے اظہار میں کسی گروہ یا گروپ کی رائے کا پابند نہیں لیکن مجھے یہ بتایا جائے کہ جب مسلم لیگ نے کسی مسئلہ پر کوئی رائے قائم کر لی اور کوئی فیصلہ کر لیا تو پھر میں نے کب اس فیصلہ اور پالیسی کی خلاف ورزی کی پھر ڈسپلن کے توڑنے کا خدشہ کس بنیاد پر کیا جا سکتا ہے۔ مولانا کے اس سکت جواب پر یوپی کے مسلم لیگی قائدین خاموش ہوگئے اور مرکزی پارلیمانی بورڈ نے مجلس دستور ساز ہند کے انتخاب کے سلسلہ میں یوپی پارلیمانی بورڈ کے فیصلہ کی

توثیق کر دی اور مولانا مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یو۔پی۔ سے مجلسِ دستور ساز کے رکن ہو گئے

قواعد وضوابط کی پابندی

قواعد وضوابط کے سلسلہ میں مولانا اتنے کٹر مسلم لیگی تھے کہ بڑے بڑے نکتہ رس مسلم لیگی ان کے سامنے عاجز تھے۔ مولانا عبدالقیوم کانبوری فرماتے ہیں کہ ۱۹۴۶ء میں یو۔پی۔ مسلم لیگ کونسل کے ایک اجلاس میں جو محمود آباد ہاؤس میں ہو رہا تھا اچانک نواب محمد اسماعیل خان نے جو یو۔پی۔ مسلم لیگ کے صدر تھے تین ماہ کی چھٹی مانگی جو کونسل نے منظور کر لی اور ان کی جگہ مسٹر رضوان اللہ صوبائی مسلم لیگ کے صدر چن لیے گئے۔ جب یہ انتخاب عمل میں آ گیا تو مولانا نے تجویز پیش کی کہ سید صاحب اپنی مجلس عاملہ منتخب کریں اس لیے کہ نواب اسماعیل خاں کی نامزد کردہ مجلس عاملہ ختم ہو گئی۔ اس پر کونسل کے اجلاس میں ہلچل مچ گئی اور چودھری خلیق الزماں اور دوسرے لیڈروں نے نواب صاحب پر زور دیا کہ وہ رخصت کی درخواست واپس لے لیں۔ چنانچہ نواب صاحب نے ایسا ہی کیا اس پر مولانا نے سید صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ نواب صاحب کو جواب دیں کہ چونکہ آپ کی رخصت کونسل نے منظور کی ہے اس لیے کونسل ہی آپ کی درخواست کی واپسی کی منظوری دے سکتی ہے۔ جب یہ نکتہ مانا گیا تو پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ کونسل کا اجلاس کون طلب کرے۔ چودھری خلیق الزماں کی رائے تھی کہ یہ اجلاس نواب اسمٰعیل خاں طلب کریں اور مولانا کی یہ رائے تھی کہ اب کونسل طلب کرنے کے مجاز صرف سید رضوان اللہ ہیں جب اس مسئلہ پر اختلاف ہوا تو یہ معاملہ قائداعظم کے سامنے پیش کیا گیا۔ قائداعظم نے فرمایا کہ مولانا کی رائے ٹھیک ہے۔ چنانچہ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس سید رضوان اللہ نے طلب کیا اور اس اجلاس نے نواب اسمٰعیل خاں کو اپنی درخواست واپس لینے کی اجازت دے دی۔

اس واقعہ کو پیش کرنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ مولانا یا یو۔پی۔ کے مسلمانوں کو نواب اسمٰعیل خاں کی ذات پر اعتماد نہیں تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ مسلم لیگ کے قواعدِ ضوابط کے بارے میں مولانا کی نقطہ آفرینی کا تذکرہ ہو جائے جس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ جو شخصیت قواعد وضوابط پر اتنی گہری نظر رکھتی ہو اس سے اس بات

کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ پارٹی ڈسپلن کا خیال نہیں رکھے گا۔

امپیریل ہوٹل میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس

جیسا کہ ہندوؤں اور گاندھی کے بارے میں مولانا کی فراست کو آخرکار دنیائے اسلام نے تسلیم کیا اس طرح انگریزوں کے بارے میں بھی ان کی رائے کو مسلم لیگ کے اکابر نے تسلیم کیا لیکن جس واقعہ کی طرف اب اشارہ کیا جا رہا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مسلمانانِ ہند اس وقت تک انگریزوں کی چال بازیوں سے کماحقہ واقف نہ تھے اور اگر واقف ہوتے تو ریڈ کلف ایوارڈ کے سلسلہ میں وہ نقصانات نہ اٹھاتے جس کا سلسلہ پاکستان کے قیام کے بعد بے شمار برس گزر جانے کے بعد بھی جاری ہے۔ یہ واقعہ امپیریل ہوٹل نئی دلی میں مسلم لیگ کونسل کے اجلاس سے تعلق رکھتا ہے جو ۵ رجون ۱۹۴۶ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں قائداعظم نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ وزارتی پلان کو منظور کر لیا جائے۔ مولانا عبدالقیوم کانپوری فرماتے ہیں کہ مولانا اس قرارداد کے سخت مخالف تھے اور انھوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ قائداعظم کو اس قرارداد کی خامیوں اور نقصانات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ مسلم لیگ کو انگریزوں کی چال بازیوں سے ہوشیار رہنا چاہیے جو بیک وقت کانگریس اور مسلم لیگ کو خوش رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مولانا کی تقریر کے دوران ہوٹل پر خاکساروں نے حملہ کر دیا اور مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں بھی انھوں نے گڑبڑ کی کوشش کی مگر مولانا اور قائداعظم کا مکالمہ یا مکالمات بدستور جاری رہے اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ ایک پنجابی نمائندے نے مولانا سے کہا کہ آپ دیکھتے نہیں کیا ہو رہا ہے اور بدستور بحث میں لگے ہیں۔ مولانا نے تو خیر اس مداخلت کا نوٹس نہیں لیا مگر قائداعظم نے اس نمائندے کو ایسی نگاہِ قہر سے دیکھا کہ وہ خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

مولانا سارے ہنگامہ سے بے پروا قائداعظم کو اپنی طرف متوجہ پا کر قرارداد کے خلاف دلیلوں پر دلیلیں پیش کرنے میں منہمک رہے۔ یہاں تک کہ مسلم لیگی ارکان اور رضاکاروں نے خاکساروں کے ہنگامہ پر قابو پا کر صورتِ حال کو درست

کرلیا۔ مولانا سید حسن مثنیٰ مولانا کے کردار پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں کہ "وزارتی مشن نے جب مسلم لیگ اور کانگریس سے بحث وتمحیص کے بعد پورے برصغیر کے لیے ایک مرکز اور برصغیر کے تمام صوبوں کو اے، بی اور سی میں تقسیم کرکے تین خطے بنانے کی تجویز پیش کردی تو دلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ایک ہنگامہ خیز اجلاس میں قائداعظم کی سختی سے گرفت کرنے والے بھی مولانا تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے بھرے اجلاس میں کھڑے ہوکر بڑے تیز لہجہ میں کہا کہ میں چالیس برس مسلسل ہندوؤں کے ساتھ رہا اور ان کے مزاج کو خوب سمجھتا ہوں۔ ان کا مطالبہ ہمیشہ یہ ہوگا کہ بتائیے آپ کم سے کم کیا چاہتے ہیں اور جب آپ کم سے کم پیش کردیں گے تو وہ اس کم سے کم کو زیادہ سے زیادہ کم کردیں گے جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسلم لیگ کا یہ فیصلہ تھا کہ برصغیر میں دو مرکز ہوں اور دونوں ایک دوسرے سے آزاد ہوں۔ پھر آپ نے ایک مرکز کیوں قبول کیا۔"

اس تقریر پر کونسل میں گڑبڑ ہوگئی۔ بعض لوگوں نے مولانا کے خلاف شور مچانا شروع کردیا اور "بیٹھ جائیے، بیٹھ جائیے" کے الفاظ بلند ہونے شروع ہوگئے۔ قائداعظم اٹھے اور حسبِ معمول آرڈر آرڈر کی گرج دار آواز گونجی اور انھوں نے کہا: "نہیں نہیں مولانا کو اپنے خیالات کے اظہار کا پورا پورا حق حاصل ہے۔" چنانچہ کونسل میں امن بحال ہوگیا اور مولانا نے زوردار تقریر کی۔ اس کے بعد قائداعظم نے تقریر کی اور وہ تمام تفصیلات پیش کیں جن کی بنیاد پر مختصر المیعاد اور طویل المیعاد اسکیمیں وجود میں آرہی تھیں اور ان اسکیموں میں جو تحریری ضمانتیں اپنی شرائط کی تکمیل اور عارضی حکومت میں مسلمانوں کی نمائندگی اور عہدیداروں کی خاطرخواہ تقسیم سے متعلق وزارتی مشن سے حاصل کی تھیں کونسل کے سامنے پیش کیں تو کونسل نے مولانا کی مخالفت کے باوجود وزارتی اسکیم کو منظور کرلیا مگر کانگریس کی منظوری حقیقت میں منظوری نہیں تھی اور جب پنڈت نہرو نے صدر کانگریس کی حیثیت سے یہ اعلان کیا کہ دستور سازِ ہند ایک خودمختار ادارہ ہے جو کسی بیرونی حکومت کے فیصلوں کا پابند نہیں اور ہم چاہیں تو وزارتی پلان بدل سکتے ہیں تو مولانا کے خدشات صحیح ثابت

ہو گئے اور قائداعظم نے مسلم لیگ کا اجلاس دوبارہ طلب کر لیا۔ جس نے اپنے اجلاس ۲۷، ۲۸ اور ۲۹ جولائی ۱۹۴۶ء منعقدہ بمبئی میں وزارتی پلان کو رد کر دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنی کتاب انڈیا ونس فریڈم میں لکھا ہے کہ وزارتی پلان کی ناکامی پنڈت نہرو پر ہے اور اگر وہ غلط تقریر نہ کرتے تو تقسیم ملک کی نوبت نہ آتی۔

پاکستان کا دستور تیار کرنے کا مطالبہ

مولانا نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس میں مطالبہ کیا کہ ـ ـ ـ ـ ـــــــ
اب چونکہ پاکستان کا قیام ممکن نظر آرہا ہے۔ اس لیے یہ کونسل پاکستان کا دستور بھی تیار کر دے۔ مولانا نے یہ فقرہ اس قرارداد میں ترمیم کے طور پر پیش کیا تھا جس کے تحت وزارتی پلان کو رد کیا گیا تھا اس لیے قائداعظم نے اس ترمیم کو پیش کرنے کی اجازت نہیں دی ہے اور فرمایا کہ یہ فقرہ خود ایک نئی قرارداد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل مولانا جمال میاں سے سنیے۔ جو اس اجلاس میں خود شریک تھے۔ مولانا جمال لکھتے ہیں کہ "حقیقت الامر یہ ہے کہ مولانا کی سیاسی سرگرمیوں کے مدار کبھی کبھی ان کے خواب اور مکاشفات ہوتے تھے اور جب کبھی کسی معاملہ میں انھیں غیبی اشارہ مل جاتا تھا تو عجب شان جلالی سے وہ اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے۔ ایک واقعہ اس سلسلہ میں درج کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا اس اجلاس میں شرکت کے لیے راقم بھی ہوائی جہاز میں ان (مولانا) کے ساتھ روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں انھوں نے فرمایا کہ "سنیے صاحب پاکستان تو مل گیا اب آئندہ کی فکر کرنی چاہیے"۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کو کیسے یقین ہے کہ پاکستان مل جائے گا۔ فرمانے لگے کہ میں نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے اور حافظ کے دیوان سے تفاول کیا تو بھی نہایت مناسب نکلا اور حافظ کی اس غزل پر میں نے تضمین بھی کر دی ہے اور اسی وقت ڈائری کی مدد سے درج ذیل اشعار سنائے۔

جب کہے خواب میں خود آکے وہ شاہِ خوباں
جب کہ حافظ بھی مصدّق ہو بہ فالِ دیوان

تجھ کو حسرت ہو مبارک سند و مصر و لستاں
بردہ بردار کے تا سجدہ کند جملہ جہاں
طاق ابروئے تو محراب جہاں خواہد بود

دوسرے دن مسلم لیگ کے اجلاس میں وہ تجویز پیش ہوئی جو راست اقدام کے نام سے مشہور ہے۔ اس بات کی خاص بات یہ تھی کہ چونکہ حکومت برطانیہ نے مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان نہیں مانا۔ اس لیے تمام خطاب یافتہ حضرات کو اپنے خطابات واپس کر دینے چاہییں۔ مولانا حسرت نے اس تجویز میں یہ ترمیم پیش کی جس کا مدعا یہ تھا کہ مسلم ممبران مجالس قانون ساز پاکستان دستور ساز اسمبلی قائم کر لیں اور پاکستان کا دستور تیار کریں۔ قائداعظم نے اس ترمیم کو علیحدہ تجویز قرار دیا اور ترمیم کے طور پر اسے پیش کرنے کی اجازت نہیں دی۔ مولانا حسرت کو شدید ہیجان تھا اور وہ بار بار کھڑے ہو کر تقریر کرنے کی کوشش کرتے اور روک دیے جاتے۔ آخر میں ان کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ آپ نے اپنا نظریہ پیش کر دیا ہے۔ اب لوگ نہیں سننا چاہتے تو آپ کیوں مصر ہیں۔ مولانا نے مجھے جواب دیا مجھے کہ مجھے ان لوگوں کی مخالفت سے تعجب نہیں مگر حیرت ہے کہ آپ بھی مجھ سے بیٹھ جانے کو کہہ رہے ہیں، حالاں کہ میں آپ کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔ مولانا کا اشارہ اپنے خواب کی طرف تھا۔" یہ لکھنے کے بعد مولانا جمال میاں فرماتے ہیں کہ مولانا کی وفات تک یعنی ۱۹۵۱ء تک پاکستان کا دستور نہیں بنا تھا اور اس سال کے بعد تیار ہوا۔ اگر مولانا کی ترمیم منظور ہو گئی ہوتی اور یہ کام اسی وقت ہو جاتا تو معلوم نہیں مسلمانوں کی تاریخ اور اس ملک کا سیاسی جغرافیہ کس قدر مختلف ہوتا۔ راقم الحروف کا کہنا ہے کہ اگر پاکستان کا دستور ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کونسل کی ہدایت کے بموجب مجالس قانون ساز ہند کے مسلم ممبران پاکستان کی منتخب دستوریہ کی حیثیت سے بنا دیتے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
(۱۷ مئی ۱۹۷۲ء) کو پاکستان کی ایک عدالت عالیہ میں یہ نہ کہا جاتا کہ اس وقت ملک میں دو دستور نافذ ہیں اور یہ کام عدالت کا ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ ان میں سے کون سا دستور سچا ہے۔ اس ضمن میں مولانا جمال میاں کا وہ انکشاف بھی درج کرنا مناسب ہے جو انھوں نے ۱۳ مئی ۱۹۷۴ء کو یوم حسرت کے ایک اجتماع میں تقریر

کرتے ہوئے کہا کہ مولانا نے وفات سے قبل یہ کہہ دیا تھا پاکستان اور ہندوستان میں ۲۵ سال کے اندر اندر شوشلزم آجائے گا۔ بہرحال وزارتی پلان کی ناکامی کے بعد ہندوستان کی وحدت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پارہ پارہ ہوگئی اور حکومتِ برطانیہ کو ۳ جون کی اسکیم کے ذریعے تقسیم ہند کا اعلان کرنا پڑا اور جیسا کہ سابق صفحات میں آچکا ہے یہ اسکیم بھی ہندوؤں کی تنگ نظری کی وجہ سے عمل میں آئی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے آخری اجلاس منعقدہ امپیریل ہوٹل دہلی مورخہ ۹، ۱۰ جون ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کی برطانوی اسکیم کو منظور کرلیا گیا۔ مولانا نے اس اجلاس میں بھی یہی بات کہی تھی کہ پاکستان کو ایک آزاد اور خود مختار جمہوریہ قرار دینا چاہیے اور اسے دولتِ مشترکہ کا رکن نہیں رہنا چاہیے لیکن حسبِ دستور سابق مولانا کی یہ تجویز منظور نہیں کی گئی اور پاکستان ۱۹۷۵ تک دولتِ مشترکہ کا رکن رہا۔ مولانا نے اپنی تقریر میں تقسیم بنگال اور پنجاب کی بھی مخالفت کی تھی مگر اس بات کو بھی مسلم لیگ کونسل نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ تقسیم ہند کی تجویز کی منظوری کے بعد بعد ۱۱ جون کو اقلیتی صوبوں کے مسلم لیگی ممبرانِ اسمبلی کا ایک جلسہ جناب آئی آئی چندریگر کی کوٹھی پر منعقد ہوا۔ جس میں قائدِ اعظم کی طرف سے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ مسلم لیگی ارکان مجلس دستور سازِ ہند میں شرکت نہ کریں۔ مگر مولانا نے اس حکم کی تعمیل اس لیے نہیں کی کہ ۹ اور ۱۰ جون کی قرارداد کی منظوری کے بعد ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کا رویہ وہ نہیں ہونا چاہیے جو پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کا ہوگا۔

چنانچہ اسی جذبہ کے تحت انھوں نے مجلس دستورِ ہند کے رجسٹر پر دستخط کر دیے۔ اس سلسلہ میں ان کی ذاتی ڈائری کا یہ اقتباس قابل توجہ ہے۔

۱۱ جون ۱۹۴۷ء (دہلی) آج چندریگر کے ہاں مسلم لیگی ممبران صوبجات اقلیتی کی

راجندر پرشاد کے سامنے رجسٹر پر دستخط کر دیے۔

قائد اعظم اور مولانا کے روابط

لیکن قائداعظم سے اختلاف رائے کے باوجود مولانا قائداعظم کا بڑا خیال کرتے تھے چنانچہ ان کی وفات پر وہ اپنے تاثرات کا اپنے روزنامچے میں اس طرح اندراج فرماتے ہیں "۱۲ نومبر ۱۹۴۸ء آج صبح گھر سے نکلنے پر قائداعظم جناح کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی۔ ان للہ وانا علیہ راجعون۔ مرحوم اپنا مقصد پورا کر کے دنیا سے اٹھے۔ ایسی کامیابی بہت کم لیڈروں کو حاصل ہوتی ہے" اسی طرح قائداعظم مولانا کا بہت لحاظ فرماتے تھے اور جناب شمز اصفہانی نے چند برس ہوئے اپنے ایک مضمون میں ذاتی ملاقات کے حوالہ سے بیان کیا کہ کسی موقعہ پر محترمہ فاطمہ جناح مولانا حسرت موہانی پر تنقید کر رہی تھیں تو قائداعظم نے انھیں ٹوکا اور فرمایا کہ مولانا حسرت موہانی بہت مخلص اور دیانت دار قائد ہیں"

تقسیم کے بعد ہندوستان میں قیام

قیام پاکستان کے بعد مولانا نے ہندوستان ہی میں رہنے کو ترجیح دی اور اس بات کی کوشش کی کہ مسلمان ترکِ وطن نہ کریں۔ مولانا کی غیرت ایمان نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے جائیں۔ انھوں نے اس زمانہ میں مسلمانوں میں اس تحریک کی بھی مخالفت کی وہ از خود ذبح گاؤ سے اجتناب کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی طرف سے پست ہمتی کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیے۔ مولانا کو اس زمانہ میں حکومت پاکستان کی پالیسی پسند نہیں تھی لیکن انھوں نے اپنے کسی بیان یا تقریر میں پاکستان پر نقطہ چینی نہیں کی۔ ان کو پاکستان کی بہت سی باتیں ناپسند تھیں مگر وہ ہندوستان میں بیٹھ کر ان پر تنقید اس لیے نہیں کی کہ اس سے ہندوستانی حکومت کی خوشامد کی بو آتی تھی۔ مولانا جمال میاں نے لکھا ہے کہ "تقسیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ان کا وجود بہت بڑا سہارا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں

کی طرف سے اپنی ذمہ داریوں کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ اس زمانہ کے روزنامچوں سے اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں جن سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اتنے بڑے انقلاب کے بعد بھی مولانا اپنی جگہ سے ہٹنے پر تیار نہ تھے۔

۱۹ رستمبر ۱۹۴۷ء: آج شام احمد نبی خاں نے بانس منڈی میں بغرض تبادلۂ خیال میری دعوت کی۔ میں نے مسلمانوں کے لیے لائحۂ عمل کے باب میں تفصیلی گفتگو کر کے جملہ اہلیانِ بانس منڈی کو اپنا نقطۂ نگاہ سمجھا دیا کہ مسلمانوں کو اظہارِ مایوسی کی ضرورت نہیں۔ اگر ضرورت ہو تو انھیں حکومتِ موجودہ کے خلاف گوریلا طریقِ جنگ اختیار کرنا چاہیے۔

۲۳ رنومبر ۱۹۴۷ء: آج صبح نوری صاحب کے ہاں ناشتہ کر کے میں بلی ماراں کی طرف گیا اور اس کے آخری حصے سے جو چاندنی چوک سے بالکل متصل ہے بغور معائنہ کیا۔ چاندنی چوک میں عمل دخل اغیار کا ہے۔ ایک آدھ کے سوا اور کوئی ادھر کا رُخ نہیں کر سکتا۔

۱۱ رد سمبر ۱۹۴۷ء: آج صبح سردار علی ملنے آئے۔ میں نے ان کو تبرک کے بتاشے دیے اور کل اپنی بیوی بچوں کے لیے کل بتاشے لے جانے کے لیے کہہ دیا۔ باریسال کے فضل الحق بھی ملنے کو آئے۔ وہ انڈیا کے مسلمانوں کی مدد کا جذبہ لے کر مشرقی پاکستان سے آئے تھے۔ آدمی مخلص معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا مگر آگاہ کر دیا کہ الحمد للہ کم سے کم یوپی کے مسلمان آپ لوگوں کی مدد کے بغیر بھی اپنی حفاظت کر لیں گے۔

آزاد مسلم کانفرنس

اسی زمانہ میں کانگریسی حکومت کے اشارے پر ایک آزاد مسلم کانفرنس بلائی گئی۔ مولانا آزاد اس میں پیش پیش تھے اور ان کی خواہش تھی کہ مسلم لیگی زعما بھی اس کانفرنس میں شریک ہو کر ذہنیتوں کی تبدیلی کی تلقین کریں اور مسلمانوں کو حالات کے مطابق بدل جانے پر آمادہ کریں۔ یوپی مسلم لیگ نے پانچ اصحاب پر مشتمل ایک وفد مولانا آزاد سے گفت و شنید کے لیے ترتیب دیا۔ اس گفت و شنید

کی داستان مولانا کے ۲۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کے روزنامچے سے پیش کی جاتی ہے۔

آج صبح سے ۱/۲-۱۰ بجے تک ناشتہ خوری اور اخبار بینی سے فارغ ہو کر کل کے فیصلے کے مطابق ہم پانچ نمائندے رضوان اللہ، حسرت موہانی، ذاکر علی، فاروق اور نفیس ۱۱ بجے کے قریب ہی کارلٹن ہوٹل میں ابوالکلام صاحب بات چیت کرنے کو پہنچے۔ مختصر گفتگو کے بعد ہی معلوم ہو گیا کہ میں نے جلسۂ مشاورت میں جو بدگمانی مولانا ابوکلام کی نیت کے بارے میں کی تھی وہ خود ان کی زبانی بھی تحقیق ہو گی۔ مولانا نے صاف صاف اقرار کیا کہ آج کی کانفرنس کا ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ تمام مسلم ادارے سیاسی حیثیت سے ختم ہوں کل فرقہ وارانہ جماعتیں کانگریس میں مدغم ہو جائیں۔ اس پر ہم لوگ یہ کہہ کر چلے آئے کہ ہم لوگوں کی شرکت بالکل بے کار ثابت ہو گی۔ دورانِ گفتگو میں چلتے چلتے میں نے ایک فقرہ ابوالکلام کے متعلق چست کر دیا، جس سے ان کی ساری کارستانیوں پر پانی پھر گیا اور جس سے وہ انتہا درجہ جھنجلائے (مگر جواب نہ بن پڑا) میں نے کہا کہ ۱۸۵۷ء میں میں برٹش گورنمنٹ کی بدگمانیاں رفع کرنے کی غرض سے جس طرح سرسید نے مسلمانوں کو صرف تعلیمی اور سماجی امور پر زور دینے اور سیاسی وفاداری برطانیہ کی تلقین کی تھی بالکل اسی طرح ۱۹۴۷ء میں آپ کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کو بلا مشروط وفاداری سکھاتے ہیں اور اسلامی اداروں کو سماجی امور کے لیے محدود کر دینے کے درپے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

ہندوستانی پارلیمنٹ

ہندوستانی پارلیمنٹ میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب مولانا کے علاوہ کوئی ممبر ایسا نہیں تھا جو مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر سکے۔ مولانا جمال میاں فرماتے ہیں کہ جونا گڑھ اور حیدر آباد پر ہندوستانی افواج کے قبضہ کے بعد تنہا مولانا حسرت کی ذات تھی جس نے ایوانِ پارلیمنٹ میں وہ باتیں کہہ دیں جو کروڑوں مسلمانوں کے دلوں میں تھیں مگر کسی میں جرأتِ اظہار نہیں تھی۔ انھوں نے سردار پٹیل کے انتہائی عروج کے زمانہ میں ان کو مخاطب کر کے کہا کہ تم نے وہی کام کیا جو ہٹلر و لیزلی

اور کلا ٹیموں نے کیا تھا۔ تم نے اپنی طاقت ور فوجوں کے بل بوتے پر کمزور ریاستوں کی آزادیاں چھینی ہیں۔ تم پر اور تمھارے محکمہ پر لعنت ہو" جس وقت مولانا یہ الفاظ ادا کر رہے تھے تو اخبار نویسوں نے دیکھا کہ ہندوستان کا یہ مرد آہن غصہ سے تلملا رہا تھا اور ایک موقعہ پر تو وہ جوش کے عالم میں ایوان میں کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ جواب میں ایک جملہ بھی ادا نہیں کر سکا تھا اسی طرح جب ہندی کو صوبہ یوپی کی سرکاری زبان کے سلسلہ میں صوبائی اسمبلی میں قرارداد پیش کی گئی تو مولانا نے اس قرارداد کی سختی سے مخالفت کی اور فرمایا کہ اگر اردو کے ساتھ ناانصافیوں کا سلسلہ جاری رہا تو وہ اردو کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کریں گے۔ اس طرح جب یو۔پی اسمبلی میں سقوطِ حیدرآباد کے سلسلہ میں ہندوستانی افواج کو مبارک باد دینے کی قرارداد پیش کی گئی تو یہ صرف مولانا کی ذاتِ گرامی تھی جس نے جرأت و ہمت کے ساتھ اس قرارداد کی مخالفت کی۔

سقوطِ حیدرآباد پر اظہار خوشی سے انکار

مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے لکھا ہے کہ "حیدرآباد پر ہندوستان کے غاصبانہ قبضہ کے بعد جب صوبہ کے وزیر اعلیٰ پنڈت گوبند بلبھ پنتھ نے یو۔پی اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی جس پر ہندوستانی حکومت اور ہندوستانی افواج کو سقوطِ حیدرآباد پر مبارک باد پیش کی گئی۔ مسلح افواج کی بہادری اور شجاعت پر اظہارِ تحسین کیا گیا اور حیدرآباد دکن کو ہندوستان کے جسم پر بدنما داغ اور ناسور قرار دیا گیا تھا تو مولانا حسرت موہانی کھڑے ہوئے اور انھوں نے علی الاعلان کہا کہ حیدرآباد جیسی کمزور حکومت پر پولیس ایکشن کے نام پر تم نے لشکر کشی کی اور اسے پیس دیا۔ یہ اقدام قابل مبارک باد نہیں بلکہ قابلِ صد ہزار لعنت ہے۔ اس لیے کہ کمزور کو طاقت کے نام پر کچلنا کسی جمہوری حکومت کا شیوہ نہیں جارح اور سامراجیوں کا کام ہے۔ انھوں نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہندوستانی حکومت کے اس اقدام کو ہندوستانیوں اور تاریخ کے منہ پر کلنک کا ٹیکہ قرار دے کر اپنی حق گوئی کی دھاک بٹھادی اور ان کے اس اعلان سے سارے ایوان پر سناٹا چھا گیا۔ جناب جلیل قدوائی نے لکھا ہے کہ:۔

پاکستان بننے کے بعد آپ نے (مولانا) نے ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد میں ہندوستان ہی میں رہنا پسند کیا اور ہم سب جانتے ہیں کہ مولانا حسرت کی تنہا ذات تھی جو ہر معاملہ میں نہرو، پٹیل، ٹنڈن اور پنتھ جیسے لیڈروں سے برابر کی ٹکر لے سکتی تھی۔ اور لیتی تھی۔ وہ شخصیت جو گاندھی جی اور اس سے بھی پہلے موتی لال اور تلک کے ساتھ کام کر چکی تھی، ہندوستان کے موجودہ لیڈروں کو کیا خاطر میں لاتی۔ یو۔پی اسمبلی اور ہندوستان کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں سارے ایوان کے خلاف ان کی تقریریں سب تا دیر یاد رہیں گی۔

قیام دلی

پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہونے کے بعد بھی مولانا نے بقول مولانا جمال میاں فرنگی محلی، اپنی زندگی بھر کے اصول کو نہ بدلا اور ہمیشہ کی طرح ریلوے کے تیسرے درجے ہی میں سفر کیا۔ دلی میں بھی وہ کبھی اخبار وحدت کے دفتر میں اور کبھی کونسل چیمبرز کے سامنے والی مسجد کے حجرہ میں رہے۔ دستور سازی کے دوران ہندوستان میں سخت فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے اور خود ہندوستانی دارالحکومت فسادات کی لپیٹ میں تھا مگر انھوں نے اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران ان نازک حالات کا کبھی خیال نہ کیا اور ان کے معمولات زندگی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ مولانا تمام خطرات سے بے نیاز ہو کر دلی آتے جاتے رہے اور کبھی حالات کے پیش نظر اپنے پروگرام کو تبدیل نہیں کیا۔

دستور پر دستخط سے انکار

لیکن جب برسوں کی محنت کے بعد ہندوستان کا نیا دستور منظور ہوا اور جب دستور پر دستخط کا آخری لمحہ آیا تو مولانا نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ یہ دستور ہندوستان کی مکمل آزادی کے منافی ہے کیونکہ اس میں ہندوستان کی دولت مشترکہ میں شمولیت کا ذکر ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے سب ہی دعوے دار ہیں لیکن سارے برصغیر میں یہ شرف صرف مولانا کو حاصل ہے

کہ انھوں نے کامل آزادی کے بارے میں زندگی بھر کسی قسم کی مصلحت یا مصالحت کو ترجیح نہیں دی اور آخر دم تک اپنے اس اصول پر قائم و دائم رہے۔

شیخ عبداللہ سے جھڑپ

اسی طرح وہ زندگی بھر ہندوستان میں کانفی ڈریشن کے حامی رہے جس میں صوبوں اور ریاستوں کو داخلی خود مختاری حاصل رہے۔ انھوں نے اپنے اس نظریہ کو پہلے پہل ۱۹۲۱ء میں پیش کیا اور جب ہندوستانی دستور میں کانفیڈریشن کے مقابلہ میں فیڈریشن کی تجویز شامل کی گئی تو مولانا نے اس کی بھی مخالفت کی۔ مولانا دیسی ریاستوں کے بارے میں یہ خیال رکھتے تھے کہ وہ بشرطِ حصولِ آزادی جمہوریہ کانفیڈریشن میں اپنی اپنی جگہ حسبِ حیثیت و اہمیت شامل ہو سکتی ہے۔ شیخ عبداللہ سے بھی اس سلسلہ میں ان کی جھڑپ ہوئی جس سے ان کی ڈائری کے درج ذیل اقتباس سے روشنی پڑتی ہے۔

"۱۶ رجون ۱۹۴۹ء آج کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں نمائندگانِ کشمیر پہلی بار شریک ہوئے۔ میں نے شیخ عبداللہ سے دیر تک بحث کی کہ انھوں نے راجہ کشمیر کی حکمرانی کیوں قبول کی اور اگر تسلیم نہیں کی تو پھر ان کی طرف سے نامزد ہو کر تم یہاں کیوں کر پہنچے۔ میں نے بڑودہ، میسور اور بھوپال کی نسبت بھی پوچھا کہ انھیں کیوں دھوکہ دیا۔"

مولانا جس طرح ہندوستان کے دستور سے مطمئن نہیں تھے، اس سے زیادہ ہندوستان کی آزادی کو آزادیٔ کامل سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کا اندازہ ان کے روزنامچہ کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۵ راگست ۱۹۴۹ء آج یوم آزادی کے سلسلہ میں راجہ جی ہندوستان کے پہلے بھارتی گورنر جنرل راجگوپال اچاریہ کے یہاں شب کی دعوت تھی۔ میں بھی مدعو تھا، مگر موٹر سواری کا انتظام نہ ہو سکا اس لیے نہ گیا۔ علاوہ ازیں حاصل شدہ آزادی کو حقیقی آزادی سمجھنے کا بھی میرے دل کو اطمینان نہیں ہے۔

پاکستان کے معاملات سے دلچسپی اور لاہور میں آخری انٹرویو

مولانا کو آخر وقت تک پاکستان اور اہلِ پاکستان کے معاملات سے بڑی حد تک دلچسپی رہی۔ قیام پاکستان کے بعد جب اوّل و آخری بار پاکستان آئے تو لاہور میں امروز کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے انھوں نے موجودہ سیاسی نظام کی اصلاح کے لیے سود کو ختم کرنے پر زور دیا اور حکومت پاکستان کو مشورہ دیا کہ وہ کمونزم کے اصولوں کو اپنائے۔ ان کا یہ انٹرویو ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۰ کو امروز کراچی میں شائع ہوا جو حسب ذیل ہے:

"ہندوستان کے مشہور شاعر اور مسلمانوں کے راہنما مولانا حسرت موہانی نے کہا ہے کہ موجودہ سیاسی نظام کی اصلاح کے لیے سود خوری ختم کر دی جائے اور کمونزم کے اصولوں کو اپنایا جائے۔ یو۔پی کی مجلس قانون ساز کے رکن اور ہندوستانی آئین ساز مجلس کے سابق رکن مولانا حسرت موہانی آج بذریعہ پاکستان میل کراچی سے لاہور پہنچے وہ حج کرنے کے بعد لوٹے ہیں۔ اردو کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے کہا کہ اردو بھارت میں زندہ رہے گی۔ اگرچہ اس کا مستقبل مخدوش ہے لیکن مکمل طور پر اسے خارج کرنا ممکن نہیں۔ امروز کے نمائندے سے بیت المال کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا حسرت موہانی نے فرمایا کہ پاکستان میں ایک بیت المال لمیٹڈ کی تشکیل ہونی چاہیے۔ اس بیت المال سے تاجروں اور صنعت کاروں کو قرضہ ملنا چاہیے اور اس روپیہ سے وہ جو منافع کمائیں اس کا نصف وہ بیت المال میں جمع کر دیں۔ سود خوری کو عظیم ترین گناہ تصور کرتے ہوئے مولانا نے کہا کہ موجودہ سیاسی نظام کی اصلاح کے لیے پاکستان جیسے ملک کے پُرسکون نظم و ضبط کے لیے ضروری ہے کہ سود خوری ختم کی جائے۔ انھوں نے کہا کہ کمونزم اور مذہب ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہوتے۔ کمونزم ایک سیاسی نظریہ ہے اور مذہب خدا پر اعتقاد رکھنے کا معاملہ ہے۔ کمونزم سے خرابیاں نکالنے کے بعد باقی جو بچ جاتا ہے وہ اسلام ہے۔ مولانا حسرت نے مزید فرمایا کہ سویٹ یونین کے آئین میں تمام مذاہب کو پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ مولانا نے اپنے آیندہ پروگرام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ہندوستانی مجلس قانون ساز کی رکنیت کے لیے کسی مزدور حلقہ سے

انتخاب لڑیں گے لیکن، ؂ ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال۔

لاہور سے کانپور پہنچنے کے بعد مولانا علیل ہو گئے اور اگلے سال ۱۳ مئی کو رحلت فرما گئے اور اس طرح اس ۴۷ سالہ سیاسی زندگی کا اختتام ہو گیا، جس میں کوئی نشیب ہے نہ فراز نہ موڑ ہے نہ رکاوٹ۔ بس ایک ہی منزل، ایک ہی مقصد ایک ہی جذبہ اور اس جذبہ کے لیے ایک مستقل ایثار اور مستقل تگ و دو جو موت سے ہم کنار ہونے کے بعد امر بن گئی۔

بھارت کی حکومت کی جانب سے گاندھی جی کی زندگی ایک فلم تیار کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ برصغیر کی آزادی گاندھی جی کی جدوجہد کی مرہون منت ہے۔ اگر پاکستان کی جانب سے مولانا حسرت موہانی کی حیات اور کارناموں پر مبنی ایک فلم تیار کی جائے تو یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ برصغیر کی آزادی مولانا حسرت موہانی کے ایثار و قربانی کی مخلصانہ کوششوں کی مرہون منت ہے اور اس جنگ میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی قربانیاں بہت زیادہ ہیں۔ برصغیر میں مسلمانوں ہی نے سب سے پہلے آزادی کا نعرہ بلند کیا اور ان ہی کی وجہ سے یہ ملک آزادی کی نعمتوں سے مالا مال ہوا۔

حصّہ پنجم

ضمیمہ الف

مصر میں انگریزوں کی پالیسی

انگریزوں سے بڑھ کر شاید ہی کوئی قوم دوسرے ملکوں پر حکومت کرنے میں مشاق ہو۔ یہ لوگ جس ملک پر تسلط کرتے ہیں پہلے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہاں کے باشندے مطمئن رہیں اور اپنے حکمرانوں کو اعتبار کی نظر سے دیکھنے لگیں۔ اس کے بعد یہ لوگ اپنے ہاتھ دکھاتے ہیں۔ سب سے پہلے کوشش ان کی حکمران جماعت کی یہ ہوتی ہے محکوم قوموں اور ملکوں میں اپنی حالت سنبھالنے کا احساس پیدا نہ ہونے پائے۔ جہاں تک ہو سکے محکوم قومیں آپس میں لڑتی جھگڑتی رہیں اور ہمدرد بنی نوع انسان ان کی باہمی عداوت سے خوب فائدہ اٹھائیں۔ محکوم قوموں کو تباہ کرنے کی جو کوششیں انگلستان نے کی ہیں شاید ہی کسی نے کی ہوں۔ قومی ترقی کے اسباب کو غیر محسوس طریقہ سے روکا کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ مگر ان کی پالیسی اپنا اثر کر گئی۔ لاریب جب ایک حکمران قوم اپنے محکومین کے مستقبل سے متعلق اپنا کوئی خاص مدعا قرار دے لیتی ہے تو ایک نہ ایک دن یہ پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔ مسلمانوں کو سلطنت انگلستان سے ترکی کے بعد سب سے گہرا تعلق ہے۔ اور اگر انگریزوں میں مسٹر آرنلڈ آنجہانی کے خیال کے لوگ پیدا ہوتے رہتے تو غالباً دونوں قوموں کے تعلقات دوستانہ ہو جاتے مگر اس وقت سب سے زیادہ نقصان ہم مسلمانوں کو انگریزوں سے پہنچا ہے۔ سلطنت ترکی پر تباہی کے انگریز ہی بانی ہیں۔ کریٹ اور مقدونیہ کے معاملات میں سب سے پہلے انگریز ہی ثالث بنے ہیں۔ مصر اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ملکی وجود کو تباہ کرنے میں انگریز ہی سرگرم نظر آئیں گے عربی پاشا

جو مصر کی آزادی اور نئی روشنی کا حامی اور نئے خیالات کا لیڈر تھا۔ کیا وہ اس لائق تھا کہ جلا وطن کیا جائے۔ سیلون سے گو وہ مصر میں آ گیا مگر کشتی میں قید ہے اور زندگی کے باقی ایام کو نہایت حسرت اور یاس کی حالت میں دریائے نیل میں بسر کر رہا ہے۔ قاہرہ آنے کا حکم نہیں۔ غریب کی معاش کا نہایت ہی ناکافی بندوبست ہے مصر میں انگریزوں نے ۱۸۹۰ء تک رہنے کا وعدہ کیا تھا اور انگلستان کی عزت کا حلف اٹھایا تھا مگر آج جاتے ہیں نہ کل بلکہ روز بروز قدم جماتے جاتے ہیں۔ اس پر بھی بس نہیں کرتے بلکہ مصر کی قومی ترقی اور اتمٹ منی کو بھی غارت اور تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انگریزوں کے قدم آتے ہی تعلیم میں کمی آ گئی گو آبادی میں تیس لاکھ کا اضافہ ہوا۔ اور آمدنی پہلے کی نسبت بڑھ گئی ہو گی۔ ذیل میں ہم ایک فہرست لکھتے ہیں جس سے تعلیم کو جو نقصان انگریزوں کے قبضہ مصر سے پہنچا ہے واضح ہو جائے گا۔ ۱۸۷۲ء تک معلمین کی تعداد ۱۴۰۸۷ تھی۔ انگریزوں سے پہلے ۱۸۸۹ء تک یعنی انگریزوں کے دخل کے ساتھ ہی ۱۵۷۱۳ رہ گئی۔ اور بالفعل یعنی ۱۹۰۵ء میں کم سے کم ہوتے ہوتے ۲۱۲۰۴ پر آ پہنچی۔ پہلے ملک میں ۹۲ مدارس تھے۔ مگر اب صرف ۵۰ ہیں۔ متذکرہ بالا شمارہ اعداد سے انگریزوں کی نیک نیتی اور قبضے کے مزید اثرات کا خوب پتہ چلتا ہے اور ان کے اس وعدے کی تصدیق ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ فلاحین مصر کی فلاح و بہبود میں صرف کیا ہے کہ ہر قوم ترقی تہذیب و شائستگی کا اندازہ اس کی تعلیمی حالت سے ہوتا ہے۔ اور تعلیم ہی ایسی چیز ہے کہ جس کی بدولت ملک و ملت ذلت و خواری کا جوا اتار پھینکتے ہیں۔ مصر میں باوجود انگریزوں کی تعلیم کے باب میں سد راہ ہونے کے تعلیم پھیلتی جاتی ہے۔ ہر چند کہ کرومر نے فیس بڑھا دی اور سررشتہ تعلیم

کا خرچ کم کر دیا۔ مگر وہ تعلیم کی عام خواہش کو اور آزادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکا۔ پہلے زمانے میں یعنی ہمدردان بنی نوع انسان کی تشریف آوری سے پہلے مصر کے سررشتۂ تعلیم کا خرچ ایک لاکھ پونڈ تھا۔ مگر انگریزوں نے رعایا کی خیراندیشی کے خیال سے اسے گھٹا کر ۲۲۰۰۰ پونڈ کر دیا اور اس میں نصف فیس کی رقمیں بھی شامل ہیں۔ سررشتۂ تعلیم میں ناقابل اور ناواقف لوگ بھرتی کئے جاتے ہیں۔ تعلیم کے انتظامی مناسب کا بندوبست انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ غور کا مقام ہے کہ انگریز مصر کی ضروریات کیا خاک سمجھتے ہیں۔ اور ملکی زبانوں سے نابلد اشخاص تعلیمی مسائل کی مقامی دقتوں کو کیونکر حل کر سکتے ہیں۔ انگریز جنہیں برسوں ہندوستان میں جھک مارتے گذر جاتے ہیں۔ اردو تک ٹھیک ٹھیک نہیں بول سکتے۔ ان سے یہ کیونکر توقع کی جائے کہ ان لوگوں کو مصر کا چند روزہ قیام زبان عربی کا ماہر بنائے گا۔ جس کے نکات اور رموز سوائے اہل زبان کے کوئی شخص چاہے کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو نہیں جان سکتا۔ اس وقت مصر کو تحصیل علم و آزادی کے لئے جدوجہد کرتے دیکھ کر جب ان ہمدردان بنی نوع بشر کا دل کڑھا تو وہاں تعلیم کو روکنے کے لئے چال بازی سے بڑھ کر جبر و تشدد سے کام لینا شروع کر دیا۔ چنانچہ مصر میں یہ تجویز ہو رہی ہے کہ علم و فنون کا درس حسب سابق عربی میں نہ دیا جائے عربی زبان نے اپنی وسعت کی وجہ سے آج تک یورپ کے تمام علوم کو جگہ دی تھی اور مغربی اثر نے اس کی روح کو تازہ کر دیا تھا۔ ملک میں زیادہ تر علوم اسی زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ کوئی ملک ادبی ذخائر سے اس وقت تک مالا مال نہیں ہو سکتا وقتیکہ ملک میں اخذ کی قابلیت نہ ہو اور غیر سرمایہ اس میں جمع نہ ہو جائے۔ انگریزی زبان ہی کی تاریخ کو دیکھئے۔ اگر اس میں فرانسیسی اور لاطینی

علم و ادب کا اثر نہ ہو تو یہ بھی چند وحشی زبانوں کی طرح سے ہوتی

عربی زبان کی یہ ترقی اور اس میں نئی جان پڑتی دیکھ کر کہ ڈنلوپ جیسے مصر کے خیر اندیشوں سے نہ رہا گیا۔ چنانچہ مسٹر ڈنلوپ وزیر تعلیم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ زبان عربی علوم وفنون نہ پڑھائے جائیں۔ انہوں نے اپنی زبان میں لکھا ہے کہ چونکہ عربی زبان اپنے موجودہ زمانے کیلئے ناکافی ہے۔ اور غیر وسیع ہونے کی وجہ سے اس میں علوم مغربیہ کی بامکمل وجہ نہیں ہو سکتی۔ مصر کے ان خود ساختہ ہمدردوں کا دعویٰ ایسا ہے کہ کیا اس کی تردید فضول ہے۔ کیونکہ جس شخص کو عربی زبان سے ذرا سی بھی مس ہے یا جس نے جرمن محققین کی کتابیں پڑھی ہیں وہ ڈنلوپ صاحب کے اس دعویٰ کی صداقت کو خوب سمجھ سکتا ہے کہ اہل مصر کو یورپی زبانوں ہی میں تعلیم دی جائے۔ مگر وہاں نہ صرف تعلیم کا انتظام ناکافی ہے بلکہ اس کے حصول میں بہت سے نقائص بیان کئے جاتے ہیں۔ مدارس کا کورس نہایت بیکار اور لغو ہے۔ اور کسی کو تعلیم مکمل طور پر نہیں دی جاتی۔ مصر میں امریکہ اور فرانس کے آزاد مدارس ہیں مگر ان کی سندیں تسلیم نہیں کی جاتیں لیکن یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ مصر میں علم کی خواہش اور آزادی کے خیالات دن بدن ترقی کرتے جا رہے ہیں اور نوجوان مصری یورپ کے مدارس میں تعلیم کے لئے بکثرت جاتے ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ قومیت کی تعلیم جو مصطفےٰ کامل رحمتہ اللہ علیہ نے اہلِ مصر کو دی ہے وہ ان کے دل میں نت نئے جذبے اور ولولے پیدا کرتی رہے گی اور ایشیا اور یورپ اس سے متور ہوں گے۔ (آمین)"

اردوئے معلی اپریل ۱۹۰۸ء

نوٹ:۔ یہی بات بالکل اردو کے بارے میں بھی جاری ہے۔

ضمیمہ (ب)

اسلامی اشتراکیت اور حسرت موہانی

جنوبی ایشیا کی تحریکات آزادی میں بشمول تحریک پاکستان ایسے بہت سے نامورانِ آزادی کا نام لیا جا سکتا ہے جنہوں نے اپنے خون، اپنے ایثار اور اپنے اخلاص سے ان کی تروتازگی اور حسن و رعنائی میں بے پناہ اضافہ کیا۔ ان میں مجاہدین حریت و انشور صحافی، سیاست داں اور انقلابی سبھی شامل ہیں لیکن ان تحریکات آزادی میں ایسے لوگوں کی مثال مشکل ہی سے ملے گی جنہوں نے جدوجہد آزادی کے کسی بھی موڑ پر فرنگیوں سے مصالحت نہیں کی اور جو ملک و ملت کے عظیم قائد ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ایک سپاہی ہی سمجھتے رہے اور جنہوں نے سیاست کو کوٹھے کی دلالی نہیں بننے دیا اور اپنے دامن کو کبھی بھی داغدار نہیں ہونے دیا۔ ایسے لوگوں میں سید الاحرار حسرت موہانی کا نام سرِفہرست ہے۔ وہ کانگریس میں شامل ہوئے تو اس کے گرم دل کے قائد کہلائے اور اس گروہ میں تلک، آروبندو گھوش، بپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے کے ہمراہ اور پہلو بہ پہلو جدوجہد آزادی کو اپنی گرم رفتاری سے گلنار بنا دیا۔ خلافت میں گئے تو بدیشی مال کے بائیکاٹ کی ایسی زبردست تحریک چلائی کہ گاندھی جی بھی اس سے خوفزدہ ہو گئے جمعیت علمائے کانپور کے سربراہ بھی بنے اور انجمن خدام الحرمین کے رکن بنے تو اپنے مرشد زادے مولانا عبد الباری فرنگی محلی کی آنکھ کا تارا کہلائے اور جب مسلم لیگ سے وابستہ ہوئے تو اس جماعت کے عزت و وقار میں اتنے زبردست اضافے کا سبب بنے کہ اہل وطن نے اس جماعت میں ان کی موجودگی کو اس کی مقبولیت کا سبب گردانا اور کہنے والوں کو یہ بات دہرانا پڑی کہ حضرت سید الاحرار قائد اعظم کو اپنا لیڈر سمجھتے ہیں۔ ان کی انگریز دشمنی کا یہ عالم تھا کہ جب مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے سے ملا تو چشم بینا نے یہ دیکھا کہ ارکانِ وفد میں صرف حسرت موہانی ہی کی ذات ایسی تھی کہ جس نے جنوبی ایشیا میں تاج برطانیہ کے نمائندے سے مصافحے کا اعزاز حاصل کرنے سے گریز کیا اور جب سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے

سلسلے میں مولانا نے یہ محسوس کیا کہ اس کا بائیکاٹ صرف ہندوؤں کے حق میں اور مسلمانوں کے خلاف ہے تو پھر انہوں نے اس ضمن میں سر محمد شفیع اور علامہ اقبالؒ کی پر زور حمایت کی۔ لیکن جب یہ دونوں بزرگ خود ایک وفد لے کر سائمن کمیشن کے ارکان سے ملاقات کے ملتجی ہوئے تو حسرت موہانی نے اس وفد میں شامل ہونا گوارا نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جب بھارتی آئین پر دستخطی کارروائی کا آغاز ہوا تو ارکان دستور یہ میں صرف حسرت کی ذات ہی ایسی تھی جس نے اس دستاویز پر صرف اس لئے دستخط کرنے سے انکار کیا کہ دولت مشترکہ میں شمولیت کے بعد بھارت کی مکمل آزادی پر حرف آتا ہے مولانا حسرت موہانی یوپی کانگریس کمیٹی کے صدر رہے۔ وہ ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر بنے۔ اسی نوعیت کا اعزاز انہیں خلافت کمیٹی اور مسلم کانفرنس میں بھی ملا۔ وہ اور بھی بہت سی سیاسی جماعتوں کے سربراہ رہے۔ وہ کانپور میونسپل بورڈ کے سینئر وائس چیئرمین، یوپی اسمبلی کے ممبر اور مجلس دستور ساز کے رکن رکین رہے لیکن ان تمام اعزازات اور اکرام وافتخار کے باوجود انہوں نے اپنی پوری زندگی خدمت ابنائے وطن میں ایک سپاہی کی حیثیت سے گذاری اور جنوبی ایشیا کی تحریک آزادی کے ایک ادنیٰ کارکن بننے پر بڑی مسرت و خادمانی کا اظہار کیا یہاں تک کہ جب ریشمی رومال کی تحریک میں شرکت وشمولیت کے باعث انہیں دوسری قید فرنگ سے واسطہ پڑا تو ہر چند کہ انہیں اس زمانے میں نظر بندی کی پیشکش بھی کی گئی۔ لیکن انہوں نے نظر بندی پر جیل کو ترجیح دی اور اس ضمن میں مولانا عبدالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جیسی کہ اپنے مرشد زادے مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے مشورے اور ہدایت کو بھی نہایت ادب اور احترام کے ساتھ اپنی پذیرائی سے نہیں نوازا۔ آپ نے اس ضمن میں اپنے مرشد زادے کو جو خط لکھا وہ قابل ذکر ہے۔ اس خط میں جس پر ۱۷ مئی ۱۹۱۶ء کی تاریخ درج ہے اور مولانا عبدالباریؒ کے نام ہے لکھا گیا ہے کہ "میں نظر بندی کو منظور کر کے جبر وستم کے سامنے عاجزی وناچاری کے ساتھ سر جھکانے کی ناقابل برداشت ذلت کو ہرگز گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں" اس خط میں آگے چل کر یہ بھی تحریر ہے کہ: "اپنی ذات کو اس تھوڑی سی تکلیف سے بچانے کے لئے میں اپنے اس اصول کو نہیں چھوڑ سکتا کہ میں تسلیم ستم بشرط امکان ہر حال میں

ناجائز ہے۔" آپ آگے چل کر اپنے اس خط میں لکھتے ہیں کہ "مسٹر محمد علی نے اس باب میں مجھ کو ایک طویل خط لکھا تھا۔ اور جناب نے بھی علی گڑھ کے خط میں تحریر فرمایا تھا کہ ارشادِ نبویؐ کے مطابق نسبتاً سہل راستہ اختیار کرنا مناسب ہے۔ میں نے ان کو اسی وقت لکھ دیا تھا اور اب آپ کی خدمت میں بھی گذارش ہے کہ حضور کے وجود کے ساتھ بنائے اسلام اور قیام اسلام کا ایک ایسا حد درجہ اہم امر وابستہ تھا جس کے لحاظ سے اس ذاتِ مقدس کی حفاظت کے لئے جو کچھ کیا جاتا مناسب تھا۔ لیکن ہر عامی کا وجود ہرگز اتنا اہم نہیں ہو سکتا کہ اس کے لئے بھی وہی عذر قابلِ قبول سمجھے جا سکیں۔ دنیاوی مثال سامنے موجود ہے کہ بادشاہ یا فوج کے جرنیل کے لئے حالتِ جنگ میں بہت سی ایسی باتیں جائز ہوتی ہیں جو ایک سپاہی کے لئے ہرگز جائز نہیں ہو سکتیں اور ظاہر ہے کہ موجودہ جنگ کذب و صداقت میں میری حیثیت ایک معمولی سپاہی سے زیادہ نہیں۔ پس میرے لئے صرف اپنی ذات کی حفاظت کے لحاظ سے پیٹھ دکھانا یا جبر وستم کے مقابلے میں صبر کر کے بیٹھ جانا کسی طرح مباح نہیں ہوتا اگر ایسا ہوتا تو غالباً حضرت امام حسینؓ کی شہادت واقع نہ ہوتی۔ حالانکہ یہ امر مسلّم ہے کہ حضرت امام حسینؓ کی ذاتِ مبارک اس عہد کی افضل ترین ذات تھی جس کی حفاظت کا بہت زیادہ خیال جائز سمجھا جا سکتا تھا۔ بہرحال میری یہ توجیہہ صحیح ہو یا غلط میرا دل کسی طرح بھی اس حکمِ نامعقول کو گوارا نہیں کرتا۔"

مولانا کی کمیونزم سے دلچسپی کا آغاز

مولانا کا مقصدِ حیات فرنگی استعمار سے جنوبی ایشیا کو آزاد کرانا تھا اور یہ مقصد ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہا۔ اس مقصد کے لئے وہ گوریلا جنگ کے بھی حامی تھے اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کے بھی طرفدار۔ وہ جنگِ آزادی کے ایک سپاہی کی طرح جنوبی ایشیا کی جس سیاسی جماعت میں شمولیت کو اپنے مقصد کے مطابق گردانتے۔ وہ اس میں بے چون وچرا شامل ہو جاتے اور اس بارے میں ان کا رویہ ہر قسم کے تضاد اور تکلف سے مبرا تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ کانگریس

پر گاندھی جی کی بالادستی کی وجہ سے یہ جماعت فرنگی تسلط کے خلاف جدوجہد جاری رکھنے پر تیار نہیں تو انہوں نے اس جماعت کی ڈٹ کر مخالفت کی اور جب انہوں نے مسلم لیگ کو جدوجہد آزادی میں عدم سرگرم پایا تو اس جماعت کے بارے میں بھی ان کی یہ خوش فہمی برقرار نہیں رہ سکی۔ وہ جدوجہد آزادی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے ہر قسم کے حربے کو جائز اور درست سمجھتے تھے۔ اس میں عدم تشدد یا تشدد کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ اس نے جب انہیں ان دونوں جماعتوں کے رویے سے مایوسی ہوئی۔ تو ان کے ذہن میں ایک اور پارٹی کے قیام کا خیال جاگزیں ہوا اور انہوں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک وطن عزیز میں ایک ایسی سیاسی جماعت قائم نہیں ہوتی جو ہر ممکن طریقے سے فرنگی اقتدار پر حرب کاری لگانے کی حامی ہو اس وقت تک جنوبی ایشیاء میں آزادی کا سورج طلوع نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ وقت تھا جب روس میں کمیونزم کا آفتاب طلوع ہو چکا تھا۔ اور استعماری طاقتوں کی زبردست مخالفت کی بنا پر جنوبی ایشیا کے نوجوانوں میں کمیونزم کے بارے میں اچھے خیالات پروان چڑھ رہے تھے۔ حسرت موہانی جو جنگ آزادی کے بارے میں گاندھی جی کے عدم تشدد کے فلسفے کے زبردست مخالف تھے۔ اس وقت تک جنوبی ایشیا کے انقلاب پسندوں کے محبوب ترین لیڈر بن چکے تھے۔ اور ۱۹۲۰ء میں قائم ہونے والے ان کے خلاف سودیشی اسٹور کو جنوبی ایشیا کے انقلاب پسندوں اور تحریکات آزادی کے ممتاز قائدین کے ایک اہم ترین مرکز کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ خود سید الاحرار نے تحریک کے ایک ممتاز طالب علم کی حیثیت سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اسلام اور کمیونزم میں بہت سی باتیں مشترک اور مماثل ہیں اور اہی پر کیا منحصر ہے۔ مولانا آزاد سبحانی اور علامہ اقبال کا بھی اس زمانے میں یہی خیال تھا کہ "اگر کمیونزم کے ماننے والے خدا کے وجود کے قائل ہو جائیں تو انہیں اسلام کے قریب لایا جا سکتا ہے۔"

حسرت موہانی جب اسیری کے تیسرے دور سے گذر رہے تھے تو انہیں یروڈا جیل میں انقلاب پسندوں پر مشتمل ایک نئی جماعت کے قیام کے اسباب وعلل کے تفصیلی جائزے کا زیادہ موقع ملا اور اسی دور اسیری میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک نئی انقلابی جماعت بنام نیشنل کمیونسٹ پارٹی قائم کی جائے جو جنوبی ایشیا کو فرنگی تسلط سے

آزاد کرانے کے لئے گوریلا جنگ کا طریقہ بھی آزمائے (بحوالہ ادھیکاری مرتب ڈاکومنٹس آف دی ہسٹری آف دی کمیونسٹ پارٹی آف دی انڈیا جلد دوم صفحہ ۴۷۲) مولانا نے یہ تجویز ۱۹۲۱ء میں یوپی پالیٹیکل کانفرنس منعقدہ آگرہ میں پیش کی اس کانفرنس میں سید الاحرار کا خطبہ صدارت تو کسی جگہ دستیاب نہیں۔ تاہم مدینہ بجنور نے اس پر تبصرہ اور ادارتی نوٹ تحریر کیا تھا۔ اس سے اس کی افادیت اور اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ ادارتی نوٹ میں "مدینہ بجنور" نے ان کے خطبہ صدارت" کو کئی پہلوؤں کی وجہ سے قابلِ توجہ اور غور" قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ "صحیح یہ ہے کہ سارا خطبہ آپ کے خاص سیاسی عقیدے کی تشریح ہے۔ آپ کی رائے ہے کہ ہم کو حریت کامل کے درپے ہونا چاہیئے"۔ اس خطبے میں آپ نے کانگریس کے سیاسی عقیدے پر تنقید کی اور کہا کہ ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرنا چاہیئے آپ کا خیال ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے ہمیں کسی ایک ذریعے پر اکتفا کرنے کے بجائے ہر ذریعے کو اختیار کرنا چاہیئے اور جائز و پرامن ذرائع کے بجائے ہر ممکن و مناسب طریقے کے الفاظ کو استعمال کرنا چاہیئے" اور آپ کا خیال ہے: "بغرض مدافعت اگر کوئی شخص خفیف طرز مدافعت پر اتر آئے تو اسے بھی جائز و پر امن کی حدود میں رہنا چاہیئے"۔ آپ کے خطبۂ صدارت کی بازگشت پنڈت جواہر لعل نہرو کی تحریروں میں ملتی ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر اس سلسلے میں Selected Works of Jawaharlal Nehru کی جلد اول کا صفحہ ۲۰۱ ہے۔ جس میں اس اجتماع کی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے گاندھی جی کو مطلع کیا گیا تھا کہ: "حسرت موہانی ہمارے صدر تھے۔ اور انہوں نے اپنے صدارتی خطبے میں عدم تشدد کے مسلک سے بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا"۔ مولانا حسرت موہانی کو شروع ہی سے گاندھی جی کی قیادت پر اعتماد نہیں تھا اور جناب عتیق صدیقی نے بھی "حسرت موہانی قید فرنگ میں" کے صفحہ ۱۲۲ میں اس بات کی تصدیق کی ہے اور لکھا ہے کہ: "حسرت کو گاندھی جی کی قیادت پر اعتماد نہیں تھا جو اس وقت کانگریس کے ہی نہیں پورے ملک کے مسلمہ لیڈر بن چکے تھے اور ان کی یہ بے اعتمادی روز بروز بڑھتی گئی۔ اور جب یہ بے اعتمادی حد سے بڑھ گئی تو حسرت نے امرتسر کے تاریخی

اجلاس کانگریس میں جو دسمبر ۱۹۱۹ء اور جنوری ۱۹۲۰ء کی ابتدائی تاریخوں میں ہوا، گاندھی جی کے خلاف آواز اٹھائی اور کہا کہ صرف ولایتی کپڑے کے بائیکاٹ سے ہی کام نہیں چل سکتا۔ ہم کو برطانوی مصنوعات کا مکمل بائیکاٹ کرنا چاہیئے۔" گاندھی جی کے مستند سوانح نگار ٹنڈلکر کے بیان کے مطابق "امرتسر کے کانگریس کے اجلاس کے بعد حسرت موہانی گاندھی جی کے سب سے بڑے حریف بن گئے اور انہوں نے کہا کہ ہمیں کوئی ایسا قدم اٹھانے کی ضرورت ہے جو فوری طور پر کارگر ثابت ہو ہمیں کوئی زود اثر اور مؤثر طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیئے۔ جس کا اثر فوری طور پر ظاہر ہو۔" ٹنڈلکر مہاتما انگریزی۔ جلد اول صفحہ ۳۲۳) اور یہی بات انہوں نے خلافت کانفرنس میں بھی کہی جو انہی دنوں امرتسر میں ہی منعقد ہوئی تھی جس کا خود گاندھی نے اپنی خودنوشت سوانح "تلاش حق" میں ذکر کیا ہے۔

آزادیٔ کامل کا مطالبہ مولانا کی گاندھی سے دوسری ٹکر ۱۹۲۱ء کے آخری ہفتہ میں ہوئی ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک یادگار ہفتہ تھا۔ اس ہفتے میں کانگریس خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس احمد آباد میں منعقد ہوئے۔ ترک موالات اور خلافت کی تحریکات کے بیشتر لیڈر گرفتار ہو چکے تھے۔ اس لئے خیال تھا کہ دسمبر کی سردی احمد آباد کے اجتماعات کی کارروائی پر غالب رہے گی۔ لیکن حسرت نے ان سیاسی جماعتوں کے اجتماعات میں حریت کامل کا نعرۂ مستانہ بلند کر کے وہ گرمی پیدا کی جس سے گاندھی جی اور حکیم اجمل خان جیسے آزمودہ لیڈروں کو بھی پسینہ آگیا۔" کانگریس کے اس اجلاس میں سبھاش چندر بوش بھی تھے جو آگے چل کر اس جماعت کے صدر بھی بنے۔ اور انہوں نے گاندھی جی سے وہ ٹکر لی جس کے نتیجے میں کچھ عرصے کے لئے گاندھی کو کانگریس کی قیادت سے الگ ہونا پڑا۔ انہوں نے اس سلسلے میں اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلمبند کئے ہیں: "احمد آباد کانگریس میں ایک دلچسپ واقعہ اس وقت پیش آیا جب صوبۂ یوپی کے ایک ممتاز اور مسلمان لیڈر حسرت موہانی نے کھلے اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ کانگریس کے آئین میں ترمیم کر دی جائے۔ اور مکمل آزادی کو کانگریس کا نصب العین

قرار دے دیا جائے۔ انہوں نے یہ ترمیم بھی پیش کی کہ ہندوستان کو جمہوریہ
ریاستہائے متحدہ ہندوستان " کے نام سے یاد کیا جائے۔ انہوں نے اجلاس
میں بڑی مدلل تقریر کی اور حاضرین پر اس کا جو اثر ہوا اس سے گمان ہوتا تھا کہ
ان کی قرارداد بھاری اکثریت سے منظور کر لی جائے گی لیکن گاندھی نے اس
قرارداد کی مخالفت کی اور ایوان نے اسے مسترد کر دیا۔ لیکن یہ تجویز کانگریس
کے اگلے اجلاسوں میں پیش کی جاتی رہی بالآخر ۱۹۲۹ء لاہور کانگریس کے اجلاس میں
یہ تجویز قبول کر لی گئی۔ لاہور میں یہ قرارداد کسی اور نے نہیں گاندھی نے پیش کی
تھی۔ (سبھاش چندر بوش و انڈین اسٹرگل صفحہ ۲۹) اور اسی وجہ سے مولانا نے اس
کے بارے میں اخبار "مستقل" میں بھی خدشات کا اظہار کیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس
نے ۱۹۲۹ء میں مکمل آزادی کی جو قرارداد منظور کی تھی اس کے پیچھے گاندھی جی
کی کوئی نہ کوئی سیاسی چالاکی ضرور موجود ہے۔ بام فورڈ نے اپنی مشہور تصنیف
"Histroy of the Non-cooperation and Khilafat Movements" کے
صفحہ ۲۷ میں احمد آباد کانگریس کے اجلاس کے موقع پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے
کہ حسرت کی یہ قرارداد کانگریس کے اجلاس میں مسترد تو ہو گئی لیکن اس حقیقت کو
نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے کہ گاندھی کی پرزور اپیل کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا ورنہ اس
سے قبل بھاری تعداد میں لوگ حسرت کی قرارداد کے حق میں تھے اور اس کا ثبوت
اس سے بھی ملتا ہے کہ گاندھی کی زبردست مخالفت کے باوجود جس میں ان کا
یہ فقرہ بھی شامل ہے کہ مسٹر حسرت کی قرارداد ہمیں اتنے گہرے پانی میں لے جانا
چاہتی ہے جس کی گہرائی اتھاہ ہے Indian annual Register 1921 - Page No. 55, 56
اس کی حمایت میں آندھرا، بنگال اور سی پی کے تمام نمائندوں نے ووٹ دیا اور یوپی
کے تمام نمائندوں نے، ماسوا تین کے، اور تمام سکھ نمائندوں نے ماسوائے ایک
کے اس کی حمایت کی۔ اس کے علاوہ دہلی اور بمبئی کے بعض نمائندوں نے بھی آزادی کامل
کی حمایت میں ووٹ دیئے۔ گاندھی جی نے اپنی تقریر میں صرف مولانا حسرت موہانی کی
قرارداد کی مخالفت ہی نہیں کی بلکہ ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رامیہ نے اپنی تصنیف
THE HISTORY OF CONGRESS میں گاندھی جی کی تقریر کا وہ حصہ نقل کیا جس میں

انہوں نے کانگریسی قائدین کو مولانا کی بر زور حمایت پر سرزنش کی اور کہا کہ ان لوگوں نے اس قرارداد پر جن جذبات کا اظہار کیا ہے اس پر انہیں افسوس ہے اور انہیں اس بات کا بھی غم ہے کہ وہ لوگ غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ دراصل گاندھی جی کے لئے یہ قرارداد ایک بم کے گولے سے کم نہیں تھی۔ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ "اجلاس کے پنڈال سے باہر مسلمانوں کی قیام گاہ کے سامنے ایک شامیانے میں مغرب کے بعد خاص مسلمانوں کا جلسہ تھا۔ حکیم صاحب (اجمل خان) وغیرہ موجود تھے۔ گاندھی جی خاص طور پر مسلمانوں کے لئے کچھ کہنے آئے تھے تو اتنے میں میں نے دیکھا کہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی سے بھاگتے گھبرائے ہوئے والنٹیئرز آئے اور نہایت اضطرابی کیفیت میں کہا کہ جلدی چلیے۔ سبجکٹ کمیٹی میں حسرت موہانی صاحب نے ہندوستان کے استقلال کی تجویز پیش کردی ہے اور اسے کسی طرح واپس نہیں لے رہے ہیں۔ فضا میں ایسا معلوم ہوا کہ کوئی غیبی گولہ آپڑا ہو چنانچہ گاندھی جی بھی گھبرائے ہوئے جلسے سے اٹھ کر سبجکٹ کمیٹی میں چلے گئے۔" لیکن مولانا حسرت موہانی کی قرارداد کی کانگریس کے اجلاس احمد آباد کی نامنظوری کی وجہ صرف گاندھی کی مخالفت ہی نہیں تھی۔ جناب عتیق صدیقی نے لکھا ہے کہ "احمد آباد کانگریس کے منتخب صدر چترنجن داس (سی۔ آر۔) اجلاس سے پہلے گرفتار کر لئے گئے تھے۔ ان کی جگہ حکیم اجمل خان نے صدارت کے فرائض انجام دیئے تھے۔ اور وہ بھی اس قرارداد کے خلاف تھے۔

داس کو بھی گاندھی جی کے عدم تشدد کی پالیسی اور ان کی اعتدال پسندی سے جو مسلمانوں کو سراسر دھوکہ دینے کے مترادف تھی۔

اتفاق نہیں تھا۔ انہوں نے اگر اجلاس کی صدارت کی ہوتی تو ممکن تھا کہ حسرت موہانی کی قرارداد کو ان کی حمایت حاصل ہوگئی ہوتی۔" اگر ایسا ہوتا تو جنوبی ایشیا کی سیاست پر سے گاندھی جی کی بالادستی کا طلسم پاش پاش ہو گیا ہوتا اور ہماری آج کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔

بہر حال سید الاحرار اس اجلاس کی اس کارروائی سے بالکل ناامید نہیں ہوئے بلکہ اس اجلاس میں گاندھی جی کے رویے کی وجہ سے، وہ ہندوستان کی آزادی کے حوالے سے، ان کے اور زیادہ مخالف ہو گئے۔ چونکہ احمد آباد میں اس وقت

کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ساتھ خلافت کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بھی منعقد ہو رہے تھے۔ اس لئے مولانا نے اپنی قرارداد خلافت کانفرنس میں بھی منظوری کے لئے پیش کر دی لیکن وہاں بھی یہ قرارداد پذیرائی کی سند حاصل نہ کر سکی۔ قاضی عبدالغفار نے لکھا ہے کہ: "جب مولانا حسرت موہانی نے خلافت کانفرنس میں یہ قرارداد پیش کی تو بہت سخت کشمکش پیدا ہوئی۔ سبجیکٹ کمیٹی میں یہ قرارداد کثرت رائے سے منظور کر لی گئی۔ لیکن حکیم اجمل خاں یہ نہیں چاہتے تھے کہ جو تجویز کانگریس نے منظور نہیں کی۔ وہ خلافت کانفرنس میں منظور کر لی جائے۔ چنانچہ خلافت کانفرنس کے اجلاس میں جب یہ تجویز پیش کی گئی تو انہوں نے صدارت کے اختیارات سے کام لے کر اسے پیش کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ان کے اس طرز عمل پر ملک کے بہت سے گوشوں میں مسلمانوں کے انتہا پسند حلقوں میں بہت اعتراضات کئے گئے"۔ (حیات اجمل صفحہ ۲۷۰) مولانا حسرت موہانی اپنی قرارداد کے بارے میں گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کے طرز عمل سے مطلق مایوس نہیں ہوئے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں، جس کے وہ خود صدر بھی تھے، یہی قرارداد مولانا آزاد سبحانی کے ذریعے پیش کرائی۔ اس کی تائید مولانا کے ایک اور معتقد سردار علی صابری نے کی لیکن پہلے کی طرح یہ قرارداد مسلم لیگ میں بھی اسی سلوک کی مستحق ٹھہری البتہ مولانا نے اپنی صدارتی اختیارات کو استعمال کر کے اس قرارداد کو جو سبجکٹ کمیٹی میں نامنظور ہو گئی تھی۔ کھلے اجلاس میں اس شرط پر پیش کرایا کہ اس پر رائے شماری نہ ہو (شریف الدین پیرزادہ (Foundation of Pakistan) جلد اول صفحہ ۵۷۶)، لیکن جو وجوہات وہ اس قرارداد کے ذریعے اہل وطن کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے اور انہیں ہندوستان کی کامل آزادی کے لئے رضامند کرنا چاہتے تھے۔ وہ بات انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہہ دی اور فرمایا کہ: ہندوستان میں ایک جمہوری حکومت قائم کی جائے۔ جو ہر طرح آزاد ہو اور جس کا یکم جنوری ۱۹۲۲ء سے آغاز ہو اور اسے مملکت متحدہ ہندوستان کے نام سے یاد کیا جائے اور اس مقصد کے حصول کے لئے تمام ممکن اور معقول ذرائع استعمال کئے جائیں۔ حتیٰ کہ اگر

حکومت مارشل لاء کا اعلان کر دے تو اس صورت میں ہم کو متفرق ٹولیوں میں منتشر ہو کر حکومت کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مارشل لا کا اعلان ہو جانے کے بعد عدم تشدد کے اصول سے کام نہیں چل سکتا۔ ایسی صورت میں مجبور ہو کر ہمیں مختلف جماعتوں میں منتشر ہو کر گورنمنٹ کا اسلحہ سے مقابلہ کرنا پڑے گا"۔ مولانا کی رائے میں دو ایک گورنمنٹ کو بدلنے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو اسے تلوار کی مدد سے تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اور یہی صورت تمام دنیا میں رائج ہے۔ یا پھر یہ ہو کہ ہم اس حکومت کے جواب میں اپنی حکومت علیحدہ قائم کر لیں۔ اس گورنمنٹ کی علیحدہ سپاہ ہو، اس کی پارلیمنٹ بھی ہو اور اسی قسم کے اور محکمے بھی ہوں۔

(مدینہ بجنور" مورخہ ۵ جنوری ۱۹۲۲ء) مولانا نے اس ضمن میں گوریلا طرز جنگ کی اصطلاح استعمال کی تھی اور ہام فورڈ نے اپنی تصنیف کے صفحہ میں یہی اصطلاح مولانا سے منسوب کی ہے "مرقع اجتماعات احمد آباد" کے مرتب زاہد نعمانی قاضی نے بھی یہی لکھا ہے کہ:" مولانا نے اپنے خطبے میں گورنمنٹ کی جانب سے اعلان مارشل لاء کے جواب میں گوریلا طرز جنگ یعنی ٹکڑیاں بنا کر لڑنے کی تجویز پیش کی تھی اور یہی بات کلام پاک کی ایک آیت میں کہی گئی ہے کہ:

"جہاں تک تم ان کو پاؤ قتل کر دو"

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے قیام کا فیصلہ

اس پس منظر میں ان کی تیسری قید فرنگ کے دوران جو گوریلا جنگ کی حمایت کی پاداش میں ظہور پذیر ہوئی اور جس کی وجہ سے آل انڈیا مسلم لیگ کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اس کے اکتیس (۳۱) سالانہ اجتماعات میں پیش کئے جانے والے خطبات صدارت میں سے ایک خطبہ سرکاری طور پر ضبط کیا گیا۔ مولانا نے اپنے ایام اسیری کے دوران غور و خوض کے بعد گوریلا طرز جنگ اختیار کرنے کے لئے ایک نئی پارٹی کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اس بات کا اشارہ جیل سے رہائی کے بعد ان کے اس بیان سے ملتا ہے۔ جو روزنامہ "ہمدم" لکھنؤ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۲۳ء کو شائع ہوا تھا۔ مولانا نے کہا تھا کہ "میرا پروگرام ہمیشہ سے امپیریلزم کو تباہ کرنیکی کوشش

پرمبنی رہا ہے اور یہی کوشش آئندہ بھی جاری رہے گی اور جو پارٹی بھی اس پروگرام کو روبہ عمل لائے گی اس کے ساتھ میں تہہ دل سے شریک اور اس کا ہمدرد رہوں گا۔" سید الاحرار کے اس بیان کا مطلب تو یہی ہے کہ وہ ایک نئی پارٹی کے قیام کے خواہاں تھے جو امپیریلزم کی تباہی کے سلسلے میں ان کی امداد و اعانت کرے۔ لیکن دوسری بات یہ ہے کہ ان کی سیاسی زندگی ہمیشہ امپیریلزم کی تباہی ہی پر مرکز اور مرکوز رہی جس کے باعث جنوبی ایشیا کی مختلف سیاسی تحریکات سے مختلف اوقات میں ان کی وابستگی کی وجہ اچھی طرح سمجھ میں آجانا چاہیئے۔ اور ان کے سیاسی کردار کو ایک مستقل سیاسی عمل اور ایک مقررہ منزل کی جانب مسلسل سفر کا باعث سمجھنا چاہیے جو امپیریلزم کی تباہی کا ہی راستہ دکھاتا ہے اور اسی وجہ سے وہ اس باب میں جنوبی ایشیا کے تمام سیاسی قائدین میں ممتاز اور منفرد نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنی طویل سیاسی زندگی کے کسی بھی موڑ پر امپیریلزم سے کسی طور پر بھی مصالحت کو گوارا نہ کیا۔ جناب عتیق صدیقی لکھتے ہیں کہ حسرت کی احمد آباد کی سرگرمیوں کا تجزیہ کرنے کے بعد ہام فورڈ کو ایک ایسی پارٹی کے آثار نظر آتے تھے جو اپنے نصب العین کے حصول کے لئے تشدد کے ذرائع بھی استعمال کرنے کے حق میں تھی۔ ہام فورڈ کا یہ تجزیہ غلط بھی نہیں تھا حسرت نے جب پوری شدت اور ایمان و ایقان کے ساتھ (احمد آباد کانگریس، خلافت کانفرنس

سالانہ اجلاس مسلم لیگ بابت دسمبر ۱۹۲۱ء میں حریت کامل کی جو قرارداد پیش کی یا کرائی تھی) اور اس کے حصول کے لئے گوریلا جنگ کے ذرائع استعمال کرنے کے عزم کا اظہار کیا تھا تو جب بھی ان کے ذہن میں ایک نئی پارٹی کے قیام کی اسکیم ضرور رہی ہو گی۔ کیونکہ ان سے زیادہ اور کون اس حقیقت سے واقف نہ رہا ہو گا۔ کہ گاندھی جی اور ان کے فلسفے کو اس وقت جو مقبولیت حاصل تھی۔ اس کے پیش نظر ملک کی کوئی بھی پارٹی ان کی اس اسکیم کو ہاتھ میں لینے کی کوشش اور ہمت نہ کرے گی۔ دو سال کی سزا بھگتنے کے بعد ۱۹۲۴ء میں رہا ہوتے ہی انہوں نے جو پہلا بیان دیا۔ اسے اگر بین السطور میں پڑھا جائے تو اس میں بھی ایک نئی پارٹی کے قیام کے جراثیم ضرور نظر آئیں گے۔" جناب عتیق صدیقی

نے آگے چل کر ایک نئی پارٹی کے قیام کے بارے میں ادھیکاری کی کتاب (Documents of the history of the communist party of India) کی جلد دوئم کے صفحہ ۲۰۷ کے حوالے سے مولانا کی کوششوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ: "حقیقت یہ ہے کہ یروودا جیل سے نکلنے کے بعد حسرت نے ایک نئی پارٹی کی داغ بیل ڈالنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں اور پھر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی دستاویزات سے ہماری معلومات میں ایک قابل قدر اضافہ بھی ہوتا ہے کہ ۱۹۲۳ء میں بعض مزدور لیڈروں کے ساتھ مل کر حسرت نیشنل کمیونسٹ پارٹی کے قیام کے در پے تھے۔" اور اسی پارٹی کے قیام کے سلسلے میں لفظ "کمیونسٹ" کے استعمال سے انقلاب روس کے متعلق ان کی خوش فہمی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں عتیق صدیقی نے مزید روشنی ڈالی ہے کہ: "اگرچہ واضح طور پر ہمیں اس کا کوئی علم نہیں کہ نیشنل کمیونسٹ پارٹی کے قیام کا تصور ان کے ذہن میں کیسے اور کیونکر پیدا ہوتا ہے تاہم اس کے محرکات کا پتہ لگانا دشوار نہیں انقلاب روس اور اس کی کامیابیوں سے وہ کلی طور پر واقف تھے اور اس کی طرف ان کا جو رویہ تھا اس کا اندازہ ایک دلچسپ واقعے سے ہوتا ہے۔

عدم تحریک کے ابتدائی زمانے میں ہندوستان پر افغانستان کے حملے کی پھلجڑی انگریزوں نے چھوڑی تھی۔ کسی نے اس سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر سے سوال کیا تو انہوں نے جو جواب دیا اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ افغانستان کے حملے کی حالت میں مسلمانوں کو افغانستان کا ساتھ دینا چاہیے۔ اس بیان کو ملک کے بچوٹی کے طبقے نے خوب اچھالا اس طرح کہ ملک میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور متعدد اجتماعات منعقد ہوئے۔ اسی نوع کی ایک میٹنگ سر تیج بہادر سپرو نے بھی بلائی جس میں حسرت بھی شریک تھے۔ انہوں نے غالباً ارادی طور پر بحث کا رخ سوویت روس کی جانب موڑ دیا۔ اور بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ "افغانستان میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ روس پر حملہ کرے۔ یہ کہیے کہ روس نے اگر

ہندوستان پر حملہ کیا تو کیا ہوگا؟" اس پر تیج بہادر سپرو نے سوال کیا کہ اچھا یہ بتائیے کہ اگر ایسا ہوا تو آپ کیا کریں گے؟ مولانا نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ: "میں تو شاعر ہوں قصیدہ لے کر حاضر ہو جاؤں گا اور ان کا خیر مقدم کروں گا۔" اس جواب سے جب سر تیج بہادر سپرو مطمئن نہیں ہوئے تو فرمایا کہ "مولانا وہ لوگ کانپور میں آپ کی دکان لوٹ لیں گے۔ آپ ان لوگوں کو کیوں بلانا چاہتے ہیں؟" تو مولانا نے جواب دیا کہ بلاسے ان کی دکان لٹ جائے۔ ان کا ملک تو آزاد ہو جائیگا اس لئے کہ کمیونسٹ جہاں بھی گئے ہیں انہوں نے ملکوں کو آزاد کیا ہے۔ انگریزوں کی طرح غلام نہیں بنایا ہے۔" یہ مکالمہ قاضی عدیل کے ایک طویل مضمون میں موجود ہے جو انہوں نے حسرت کے بارے میں لکھا ہے۔ اور جس سے سوویت روس کے بارے میں ان کے ذہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ تو خیر ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ ہام فورڈ کے بقول مئی ۱۹۲۱ء میں اودھ خلافت کانفرنس میں بھی جس کی صدارت شیخ مشیر حسین قدوائی کر رہے تھے نہایت قابل اعتراض تقاریر کی گئی تھیں جن میں بیرونی حملہ آوروں کی اعانت کی طرف اشارے تھے اور بالشویکیوں کی فتح کے خیر مقدم کا رجحان پایا جاتا تھا۔ اور مولانا حسرت موہانی بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔ بلکہ انہوں نے تو اس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ: "اگر پرنس آف ویلز نے اپنا سفر ہند ملتوی نہیں کیا تو وہ جہاں بھی جائے گا ہڑتال کرا دی جائے گی۔" (مولانا جمال میاں فرنگی محلی "مقدمۂ کلیات حسرت موہانی"۔ مکتبۂ جدید لاہور) کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے قیام سے متعلق حسرت کی کوششوں پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے جناب عتیق صدیقی نے لکھا ہے: کہ "احمد آباد کے اجتماعات ۱۹۲۱ء میں حسرت نے حریت کامل کی قرارداد جب پیش کی تھی اور اس کے حصول کیلئے گوریلا جنگ کا جو نسخہ تجویز کیا تھا۔ اس وقت بھی ان کے ذہن میں انقلاب روس اور اس کے جلو میں ہونے والے واقعات بھی رہے ہونگے انہیں اس بات کا بھی یقین رہا ہوگا کہ ہجرت کر کے افغانستان جانے والے

کچھ لوگ افغانستان کی سرحد پار کر کے سوویت وسطی ایشیا جا پہنچے ہیں اور اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے سوویت حکومت کی امداد حاصل کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے واقف رہے ہوں گے کہ تاشقند میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۲۱ء میں بائیں بازو کے انقلابی ہندوستان میں پیدا ہو چکے تھے جو انقلاب روس سے متاثر ہو کر آگے آئے تھے۔ لیکن خود ہندوستان میں ان کی سیاسی حیثیت صفر کے برابر تھی ۔"

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا قیام:۔ مولانا کے معتمد خصوصی سردار علی صابری مرحوم اسنے جو مولانا کی سرپرستی میں ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کے قیام میں سرگرم تھے اور انہوں نے اس ضمن میں ہندوستان میں ہونے والے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے اجلاس کا جو آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے وہ جناب عتیق صدیقی اور ادھیکاری کی کتاب کی جلد اوّل کے صفحہ ۳۸۱ میں مہیا ہونے والے بیان سے کہیں زیادہ مفصّل ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ایشیا میں پہلے پہل قائم ہونے والی کمیونسٹ پارٹی سرتاسر مولانا حسرت موہانی کی ذہنی علمی اور عملی کوششوں کی آئینہ دار تھی۔ اور ۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۲۵ء تک خلافت سودیشی اسٹور بائیں بازو کے انقلاب پسندوں اور ہندوستان کی جملہ تحریکات آزادی کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اور جب مولانا نے یرودا جیل سے رہائی کے بعد ملک میں ایک نئی پارٹی کے قیام کو عملی شکل دی تو یہ نئی پارٹی تمام تر انہی کی کوششوں کا آئینہ دار تھی جس کا تاشقند میں قائم ہونے والے چند سرپھروں کی قائم کردہ پارٹی سے کوئی رابطہ نہیں تھا جو فرنگیوں کے خوف سے وطن واپس ہونے کے خیال سے بھی خائف تھے اور ہندوستان لوٹنے کے بعد اپنے آپ کو کمیونسٹ کہلانے میں

بھی خوف محسوس کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ وطن واپسی کے بعد اپنا گھربار چھوڑ کر مولانا کے دامن میں پناہ حاصل کرنے میں اپنی عافیت جانتے تھے۔ سردار علی صابری اپنے مضمون شائع شدہ "انجام" کراچی مورخہ ۸ جنوری ۱۹۵۲ء میں لکھتے ہیں کہ: خلافت سودیشی اسٹور برسر زمین یا کھلے بندوں کام کرنے والے سیاسی لیڈروں کے علاوہ زیر زمین یا چوری چھپے کام کرنیوالوں کا بھی اڈہ تھا۔ جیوتی باسو، بھوتی ورما، یش پال، شوکت عثمانی، بلبھ دھرتیواری جن کی غداری کے سبب مقدمۂ کاکوری سازش کے بہت سے ملزم گرفتار ہوئے اور بہت سے انقلابی اور انقلاب پسند جن میں اول الذکر دو افراد سزا کاٹ کر واپس آئے تھے اور کئی افراد نے کئی کئی سال قید و بند کے مصائب برداشت کئے تھے، صرف یہی نہیں کہ خلافت سودیشی اسٹور میں رہتے تھے۔ بلکہ ان میں دو چار حضرات تو دن رات پڑے رہتے تھے۔ ان کے تمام مصارف اسٹور کے مینیجنگ ڈائرکٹر مولانا حسرت موہانی کے حساب میں خلافت سودیشی اسٹور برداشت کرتا تھا۔ اسی اسٹور میں اگست ۱۹۲۴ء میں یرودا جیل سے رہائی کے بعد، جس کا ذکر جناب عتیق صدیقی نے اپنی کتاب میں صفحہ نمبر ۱۰ پر کیا ہے۔ اور جس کا ذکر ہم اوپری سطور میں کر بھی چکے ہیں مولانا کی کوششوں سے خلافت سودیشی اسٹور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی داغ بیل ڈال دی گئی اور سردار علی صابری کے متذکرہ بالا مقالے کے مطابق سید الاحرار نے کامریڈ ستیہ بھگت کی قیادت میں جن کو سردار علی صابری کے الفاظ میں "سید الاحرار کے خاص معتقد ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور کمیونسٹ پارٹی قائم کی، اور مولانا بھی کبھی ان کے خلوص اور قوت عمل کی تعریف بھی کرتے تھے" سردار علی صابری کے خیال میں کامریڈ ستیہ بھگت پیٹ کے پجاری تھے۔ مہاتما لینن اور مہاتما اسٹالن کی تعریفوں کے راگ الاپا کرتے تھے۔ کمیونزم کا پروپیگنڈہ بھی ہم نوجوانوں میں خوب کرتے تھے لیکن کافی بے تکلفی کے باوجود اپنا راز کسی کو نہیں بتاتے تھے

اسی مقالے میں سردار علی صابری یہ بھی انکشاف کرتے ہیں کہ: "اس زمانے میں کامریڈ ستیہ بھگت کے پاس کمیونزم سے متعلق اچھی کتابوں پمفلٹوں اور رسالوں کی بہتات ہوتی تھی لیکن سردار بھگت سنگھ، بھوتی ورما یا میں اتنی بے تکلفی کے باوجود کبھی یہ معلوم نہیں کر سکے کہ وہ کس ذریعے سے کمیونسٹ لٹریچر حاصل کرتے ہیں۔ اور ہم نے ایک بار بالکل اتفاقیہ طور پر ان کے پاس روس کے جو دو تین طلائی روبل دیکھے تھے اس کے بارے میں بھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انہوں نے یہ روبل کس طرح حاصل کئے تھے" مولانا نے جب کامریڈ ستیہ بھگت کو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا صدر مقرر کیا تو یہ کوئی اچانک فیصلہ نہ تھا مولانا نے سردار علی صابری کے بقول، کامریڈ سے نہ صرف طویل مذاکرات کئے بلکہ اس ضمن میں ہونے والی مشاورت میں کئی دوسرے حضرات اور انقلابی بھی شریک تھے جن کے بارے میں عتیق صدیقی کا خیال ہے کہ وہ مزدور لیڈر تھے۔ یہ پارٹی جس ماحول میں قائم ہوئی اس پر ادھیکاری نے کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے تاہم سردار علی صابری نے اپنے مقالے میں جس کا اوپری سطور میں ذکر ہو چکا ہے، کافی تفصیلی روشنی ڈالی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ "آج سے باسٹھ سال قبل کمیونزم کا نام لینا بھی خطرناک تھا۔ کانپور میں کوئی پریس کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے فارم تک چھاپنے کے لئے تیار نہ تھا۔ مولانا نے کافی کوشش اور ذاتی اثر و رسوخ سے یہ فارم خفیہ طور پر ایک مسلمان چھاپے خانے، جس کا نام "اسٹار پریس" تھا، میں چھپوائے اور اسی انداز میں ممبر سازی کی گئی اور خلافت سودیشی اسٹور میں باضابطہ طور پر پارٹی قائم کی گئی۔ کامریڈ ستیہ بھگت جنرل سیکرٹری چنے گئے اور فاؤنڈیشن کمیٹی کے ممبروں میں سید الاحرار حسرت موہانی، بیگم حسرت موہانی، واحد یار خاں، رام پرشاد مصرا، شمس الدین خاور اور سردار علی صابری شامل تھے۔ اس کے بعد صابری صاحب لکھتے ہیں کہ: "کمیونسٹ پارٹی کا قیام صرف حکومت کے لئے ہی نہیں بلکہ کانگریس کے لئے

بھی بم کا گولہ ثابت ہوا اور ہم لوگوں کی بھی سخت نگرانی ہونے لگی حکومت اور کانگریس کی متفقہ اور متحدہ مخالفت کی وجہ سے ہمیں دفتر قائم کرنے کے لئے سارے شہر میں کہیں مکان نہ ملتا تھا۔ آخرکار آنجہانی پنڈت رام پرشاد مصرا نے اپنی مسٹن روڈ والی بلڈنگ کا کمرہ خالی کر دیا اور جس دن دفتر کا افتتاح ہونے والا تھا اس دن سارے شہر میں ایک خوف اور دہشت کا سماں تھا۔ پولیس پوری سڑک پر پہرہ دے رہی تھی۔ فوج کو خبردار کر دیا گیا تھا اور شہر کے سارے اہم مقامات کی ناکہ بندی ہو چکی تھی۔ خود مسٹن روڈ مسلح اور لٹھ بند جوانوں سے پٹی پڑی تھی نو دس بجے دن کے قریب سید الاحرار نے اپنے دست مبارک سے دفتر پر لال جھنڈا لہرایا اور ہندوستان میں شاید پہلی بار ایک پارٹی کی حیثیت سے تھرڈ انٹرنیشنل کا ترانہ (اٹھو بھوک کے شکار) گایا گیا۔" پارٹی کا دفتر قائم ہو جانے کے بعد سردار علی صابری کے بقول "اس کے ممبروں میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا اور کئی شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہوگئیں اور ۱۹۲۵ء کے وسط تک اس نے ایک خاص منظم جماعت کی حیثیت حاصل کرلی۔ اسوقت پارٹی کا مرکزی دفتر کانپور میں ہی تھا اور کامریڈ ستیہ بھگت جنرل سیکرٹری اور انہیں قوی ہیکل راجپوت اور جان پر کھیل جانے والے انقلاب پسند جگدمبا اور ڈانگے کی حمایت حاصل ہو چکی تھی۔ ادھر جب انڈین نیشنل کانگریس نے طے کیا کہ کا سالانہ اجلاس کانپور میں ہو تو مولانا نے طے کیا کہ اس موقع پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی پہلی کانفرنس بھی کانپور میں ہی منعقد کی جائے چنانچہ صابری صاحب کے الفاظ میں اکتوبر کے اواخر اور نومبر کے شروع میں یہ فیصلہ کر لیا گیا اور ہرچند کہ ایک ماہ کی قلیل مدت میں سرمایہ کی فراہمی آسان نہ تھی لیکن مولانا کی پرخلوص کوششوں سے پندرہ بیس ہزار روپے فراہم ہو گئے۔ ممبروں کو دعوت نامے جاری ہو گئے اور کانگریس پنڈال کے قریب گرین پارک (جہاں آج کل کانپور کا کرکٹ اسٹیڈیم واقع ہے) کمیونسٹ پارٹی کا کافی عریض اور خوشنما پنڈال تعمیر کرایا گیا۔"

ادھیکاری کی کتاب (Documents of the history of the communist party of India)
کی جلد اول میں یہ تسلیم کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حسرت پہلی کمیونسٹ
کانفرنس کے صدر بنے اور عتیق صدیقی نے اپنی کتاب "حسرت موہانی قیدِ فرنگ
میں" کے صفحے ۱۲۷ میں فرمایا ہے کہ: "حسرت پہلی کمیونسٹ کانفرنس کے
صدر ہی نہیں بلکہ اس کے روحِ رواں بھی تھے۔ اور ان ہی کوششوں کی
وجہ سے اس کا انعقاد ہوا تھا۔ یہ کانفرنس ۲۵ دسمبر ۱۹۲۵ء میں ہوئی۔ حسرت
نے اس موقع پر جو خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اس کا مطالعہ حسرت کے مطالعے
کے سلسلے میں بہت ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس کا متن اردوئے معلّیٰ
کی اشاعت بابت اپریل، مئی، جون، ۱۹۲۶ء سے اخذ کر کے پیش کیا جا رہا ہے
جس کا عنوان "پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس (کانپور) میں حسرت موہانی کا
خطبۂ استقبالیہ" ہے۔

۱۔ شکریہ اور دعا: دوستو! استقبالیہ کمیٹی کی جانب سے میں آپ سب کا
تہِ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں اور سب کو اس دعا میں شریک کرنا چاہتا
ہوں کہ ہندوستان میں حقیقی قوت اور مساوات کی جو تحریک آج باقاعدہ طور
سے شروع کی جا رہی ہے اس کو کامیابی حاصل ہو اور بہت جلد یہ تحریک
سارے ملک میں پھیل کر ہندوستان کی واحد سیاسی اور اقتصادی تحریک بن جائے۔

۲۔ کمیونزم کے نام سے گھبرانے کی بنا غلط فہمیوں پر ہے۔ کمیونزم کی تحریک
کاشتکاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے۔ تحریک کے اصول اور اغراض و مقاصد سے
جمہور اہلِ ہند عموماً اتفاق کرتے ہیں البتہ بعض صریح غلط فہمیوں کی بنا پر کمیونزم
کے نام سے بعض کمزور اور وہمی طبیعت کے لوگ گھبراتے ہیں۔ حالانکہ یہ
غلط فہمیاں سب سرمایہ داروں اور دوسرے بدخواہوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔
مثلاً بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کمیونزم اور خونریزی و فساد لازم و ملزوم ہیں۔
حالانکہ حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم لوگ عدم تشدد کو صرف
ضرورت اور مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی طرح اس کو
ہر حالت میں بطور اصول لازم قرار نہیں دیتے۔ نیز بعض احمق یا شریر

لوگ یہ بھی کہتے پھرتے ہیں کہ کیمونزم اور "جوترا سویرا" دونوں ایک ہی چیز ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جائیداد اور ملکیت کی دو قسمیں مقرر ہیں۔ ایک ذاتی جس کو انگریزی میں "پرسنل" کہتے ہیں مثلاً گھڑی چھڑی، لوٹا، بستر، کپڑے اور مکان وغیرہ۔ دوسری شخصی۔ جس کو انگریزی میں "پرائیوٹ" کہتے ہیں مثلاً زمین، کارخانے وغیرہ، کیمونسٹ اصولوں کا اطلاق ذاتی جائیداد پر نہیں ہوتا، صرف شخصی جائیداد پر ہوتا ہے۔

۳۔ ہمارے اصول :۔

تفصیل کا موقع نہیں۔ مجملاً یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارے اصول میں سرمایہ کاری اور شخصی جائیداد کی مطلق گنجائش نہیں۔ زبان عوام میں یہ بات یوں بھی ادا کی جا سکتی ہے کہ زمین، ہوا اور پانی کی طرح عطیہ خداوندی ہے جس پر کسی کی ملکیت مقرر نہیں کی جا سکتی۔ البتہ انسان اس کو حسب ضرورت اپنے فائدے کے لئے استعمال کر سکتا ہے اور اس باب میں بدنظمی کو روکنے اور اپنی آزادی و آرام قائم رکھنے کی غرض سے ہر مقام کے لوگ کل معاملات کا انتظام جمہوری اصولوں پر مقرر کر سکتے ہیں اسی کا نام سوویت حکومت ہے۔

۴۔ ہمارے اغراض ومقاصد :

ہماری پارٹی کا تفصیلی لائحہ عمل جو سوویت آئین سے ملتا جلتا ہے ہماری اس پہلی کانفرنس میں پیش ہوکر پاس ہوگا، ہمارے اغراض ومقاصد یہ ہیں

(۱) ہندوستان میں "سوراج" یعنی آزادی کامل جائز ذریعوں سے قائم کرنا۔

(۲) سوراج کے قائم ہونے پر یہ دیکھنا کہ اس سوراج کی ہیئت سوویت ریپبلک ہو جہاں کیمونزم کے کل اصولوں پر عمل کیا جائے۔

(۳) سوراج کے قائم ہونے تک کاشتکاروں اور مزدوروں کی فلاح وبہبود اور آزادی کی ہر ممکن کوشش کرنا اور اس ضمن میں ہندوستان کی ہر سیاسی جماعت کے ساتھ اس حد تک اشتراک عمل کو جائز رکھنا جس حد تک وہ ہمارے

مذکورہ بالا مقاصد کی تائید کرے

(۴) کمیونزم کے اصولوں کی اشاعت کا سامان کرنا اور جمہور کو ان کا ہم خیال بنانا تاکہ سوراج کے قیام کے ساتھ فوراً ان پر عمل شروع ہو سکے۔

(۵) ہماری جماعت صرف ہندوستان کی جماعت ہے۔ اس موقع پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ کم از کم فی الحال ہماری جماعت کا دائرہ عمل صرف ہندوستان تک محدود ہے۔ دیگر ممالک کی جماعتوں سے ہمارا تعلق صرف ہمدردی اور ہم خیالی کا ہے۔ اس راہ میں ہم ان سب کے عموماً اور تھرڈ انٹرنیشنل کے خصوصاً ہمعصر ضرور ہیں ماتحت نہیں۔ نہ وہ ہم کو کوئی عملی مدد دیتے ہیں اور نہ وہ ہماری کوئی مالی اعانت کرتے ہیں۔

کمیونزم اور مذہب:

بد باطن لوگ کمیونزم پر ایک بے جا تہمت یہ لگاتے ہیں کہ وہ لازمی طور پر مذہب کا دشمن ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ مذہب کے معاملے میں انتہا درجے کی رواداری کو مناسب سمجھتے ہیں۔ جو شخص ہمارے اصولوں کو مانے وہ ہمارے فرقے میں داخل ہے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو یا بدھ، مذہبی شخص ہو یا لا مذہب بالفاظ دیگر ہم ہر مذہب کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک لا مذہبی بھی ایک مذہب ہے۔

۷۔ کمیونزم اور اسلام:

ہمارے بعض مسلمان لیڈر بلا وجہ کمیونزم کو اسلام کے خلاف بتاتے ہیں۔ حالانکہ حقیقتِ حال اس کے بالکل برخلاف ہے خلاً کم از کم سرمایہ داری کے خلاف اسلام کا فیصلہ شاید کمیونزم عقیدے سے بھی زیادہ سخت ہے اور فریضۂ زکوٰۃ کا منشاء بھی یہی ہے کہ خلقِ خدا میں جب تک ایک شخص بھی بھوکا رہے اس وقت تک مالداروں کو

عیش کرنے کا کوئی حق نہیں۔ قرآن پاک میں نماز کے بعد سب سے زیادہ زور زکوٰۃ پر دیا گیا ہے اور خلیفہ اوّل نے تو زکوٰۃ سے انکار کرنیوالوں کے خلاف جہاد کا حکم دیا تھا۔ اصل سرمایہ پر ٹیکس لگانے کا مسئلہ ہنوز ممالک یورپ میں زیر بحث ہے لیکن اسلام میں اس کا رواج ابتدائے عہد سے ہی جاری ہے اس لئے زکوٰۃ کا تعین سالانہ منافع کے لحاظ سے نہیں کیا جاتا بلکہ کل سرمایہ کا چالیسواں حصّہ قرار پایا ہے۔ علاوہ بریں سود کے کمل حرام ہونے کا بھی یہی سبب ہے کہ سود خور صرف اپنے سرمایہ سے بغیر محنت کے فائدہ اٹھاتا ہے اور یہ بات اسلام اور اللہ کے اسی طرح منافی ہے جس طرح کمیونزم کے خلاف ہے۔

(۹) کمیونزم سیاست کی بہترین اور آخری شکل ہے۔ غرض کہ جس حیثیت سے بھی دیکھئے معلوم ہوگا کہ کمیونزم پالیٹکس کی آخری ترین اور بہترین شکل ہے اور اس لئے ہمیں اگر اپنے فرسودہ پروگرام کو ترک کرکے کوئی راہ اختیار کرنا ہے تو اسی کو کیوں نہ اختیار کریں جو بہترین ہے۔"

جناب عتیق صدیقی لکھتے ہیں کہ: "حسرت کی خطبۂ استقبالیہ کی چند خصوصیات قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ اردو میں پڑھا گیا، دوسرے ان کے سابقہ خطبات کے مقابلے میں یہ نسبتاً زیادہ مختصر تھا۔ اس کی تیسری اور سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس سے کمیونزم کے فلسفے سے حسرت کی واقفیت کی حدود کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔" اردو کے معلیٰ میں اس خطبے کے شائع ہونے سے قبل ہی کانفرنس کے دفتر نے اس کا انگریزی ترجمہ اشاعت کے لئے جاری کر دیا تھا۔ یہی ترجمہ تمام وکمال انڈین اینول رجسٹر جلد دوم بابت ۱۹۲۵ء میں نقل کیا گیا اور اس کا بنگالی ترجمہ قاضی نذر الاسلام کے بنگلہ ہفت روزہ "لنگل" کی ۷ جنوری ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں اور کامریڈ سنتوکھ سنگھ کے پنجابی ہفت روزہ "کرتی" کے شمارے میں بھی کمیونسٹ کانفرنس کی کارروائی کے ساتھ

شائع کیا گیا۔ حسرت نے اس پہلی کمیونسٹ کانفرنس کو ہندوستان میں حقیقی اخوت و مساوات کی تحریک کے آغاز سے تعبیر کرتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ بہت جلد یہ تحریک سارے ملک میں پھیل کر ہندوستان کی واحد سیاسی اور اقتصادی تحریک بن جائے گی۔ حسرت نے ارادی طور پر کمیونزم کا فلسفہ بیان کرنے سے اس خطبے میں احتراز کیا تھا اور کہا تھا کہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں مجملاً یہ سمجھ لیجئے کہ یہ مزدوروں اور کاشتکاروں کی تحریک ہے اور ہم عدم تشدد کو صرف ضرورت اور مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں اور ہمارے اصول میں سرمایہ داری اور شخصی جائیداد کی مطلق گنجائش نہیں۔ لوگ اپنے کل معاملات کا انتظام جمہوری اصولوں پر خود کر سکتے ہیں۔ اسی کا نام سوویت گورنمنٹ ہے۔ حسرت کو اس کا بھی کلی طور پر احساس تھا کہ مسلمانوں کو کمیونزم کے فلسفے اور سوویت روس کے بارے میں شدید غلط فہمیاں ہی نہیں ہیں بلکہ وہ کمیونزم کو اسلام کے منافی اور سوویت روس کو اسلام دشمن گردانتے ہیں۔ ان کا یہ خیال بھی غلط نہیں تھا۔ کیونکہ اس دور کے مسلم اخبارات اسی نوع کے خیالات شائع کرتے تھے اس کی اچھی مثال خود پہلی کمیونسٹ کانفرنس ہے۔ لکھنؤ کے ممتاز روزنامے "ہمدم" میں اس کانفرنس سے متعلق کوئی خبر تو شائع نہیں ہوئی۔ لیکن اس کی اشاعت مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۵ء میں اسی کانفرنس سے متعلق ایک ادارتی نوٹ ملتا ہے کہ: "۲۶ دسمبر کو کمیونسٹ کانفرنس کا پہلا اجلاس تلک نگر کانپور میں مسٹر سنگا ویلو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صدر استقبالیہ نے اپنی تقریر میں کمیونزم کے خلاف بعض غلط فہمیوں کی تردید کی اور اسے سیاسیات کی بہترین اور تازہ ترین صورتحال بتایا۔ اس کانفرنس میں کانگریس اور خلافت کا کوئی ممتاز کارکن شامل نہیں تھا" اس ادارتی نوٹ میں صدر کانفرنس کا نام تو ظاہر کیا گیا لیکن صدر استقبالیہ کا نام مصلحتاً ظاہر نہیں کیا گیا۔ حالانکہ وہ کانگریس اور خلافت کے اہم رکن تھے۔ اور اس ادارتی نوٹ میں سارا زور اس بات پر صرف کیا گیا کہ اس

کانفرنس میں کوئی ممتاز کانگرسی یا خلافتی شریک نہیں ہوا۔

حسرت موہانی بحیثیت اشتراکی مُسلم:-

ان حالات میں حسرت کی اپنے استقبالیہ خطبے میں کمیونزم اور سوویت یونین کے بارے میں مسلمانوں کی شکوک رفع کرنے کی کوشش بے محل نہیں تھی۔ پھر حسرت نے اسلام اور کمیونزم کی مماثلت کے بارے میں جو باتیں کہی تھیں، جناب عتیق صدیقی کے بقول آگے چل کر انہی خیالات کا اظہار واضح الفاظ میں علامہ اقبال نے بھی کیا ہے۔ اور ۱۹۳۰ء میں تو یہاں تک کہہ دیا کہ "کمیونزم میں اگر خدا کا تصور داخل کر دیا جائے تو کمیونزم مشرف بہ اسلام ہو جائے گا"۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے عتیق صدیقی کی کتاب "اقبال جادوگر ہندی نژاد" صفحہ ۱۰۱ تا ۱۱۹) حسرت ہوں یا اقبال، دونوں کمیونزم کو اسلام کے قریب تر گردانتے تھے اور سید الاحرار نے اس کی اس لئے حمایت کی تھی کہ اس اصول کے ماننے والے ان کی طرح حصول آزادی کے لئے تشدد کی راہ اختیار کرنے پر تیار تھے اور انہوں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان کو اگر فرنگی تسلط سے آزاد کرانا ہے تو ۱۹۲۱ء کے تجربات کی روشنی میں انہیں ملک کی مروجہ پارٹیوں پر تکیہ کرنے کے بجائے ایک نئی پارٹی قائم کرنا ہوگی۔ اسی بنا پر انہوں نے نیشنل کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل میں سرگرمی سے حصہ لیا اور اسے اہل وطن کی بھاری اکثریت کے اختلاف کے باوجود قائم کیا۔ وہ مروجہ طور پر کمیونسٹ نہیں تھے۔ وہ تو اقبال کی طرح اسلام کے ایک سچے شیدائی تھے۔ اور اسلام پر مکمل ایمان رکھتے تھے۔ یہ بات خود ادھیکاری کی متذکرہ بالا کتاب کی جلد اوّل کے صفحہ ۱۱۸ پر موجود ہے۔ جس میں مولانا کے ایک بیان کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے اپنے الفاظ میں بتایا گیا تھا کہ: "میں نہ تو کمیونسٹ ہوں اور نہ سوشلسٹ۔ میرا پروگرام فی الحال ایشیا سے انگریزوں کا استحصال

ہے۔ یورپی سرمایہ داری کا میں بدترین دشمن ہوں۔ اس بات سے مجھے کمیونسٹوں سے مکمل اتفاق ہے۔ اور ہم سب ایک دوسرے کے حلیف ہیں" یہی وجہ ہے کہ مارکسیی کمیونسٹ ابتدا ہی سے ان کے خلاف ہو گئے عتیق صدیقی کے مطابق ان کی ان تشریحات سے اور کمیونزم کو اسلام کے قریب تر گردانے کی وجہ سے کمیونسٹ حلقوں میں ان کے بارے غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ اور وہ نکتہ چینیوں کا نشانہ بنے (بحوالہ "حسرت موہانی قید فرنگ میں" صفحہ ۱۳۰) خاص طور پر وہ مارکسیی کمیونسٹ جنہوں نے ہندو عقائد سے کنارہ کشی اختیار کر کے کمیونسٹ فلاسفی کو بطور ایک عقیدے کے قبول کیا تھا۔ ان میں ایم۔ این۔ رائے جو بین الاقوامی کمیونسٹ انٹرنیشنل سے وابستہ تھے۔ اسلام کو کمیونزم کے فلسفے سے مستثنیٰ قرار دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حسرت کے خطبے سے ان مسلمان کامریڈوں کو بھی دھچکا پہنچا تھا جو اسلام سے عدم واقفیت کی بنا پر کمیونزم کو ایک نئے عقیدے اور مذہب کے طور پر قبول کر چکے تھے بلکہ مسلمان کمیونسٹوں کا رویہ تو مولانا کے حوالے سے ہندو کمیونسٹوں کے مقابلے میں شدید تر تھا اور ان میں نہایت واضح اور شدید رد عمل کامریڈ مظفر احمد کا تھا، جو اس کانفرنس میں شریک تھے اور اخبار "لنگل" (قاضی نذر الاسلام) سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اس اخبار میں اس کانفرنس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مسلمانوں کو کمیونزم کی طرف راغب کرنے کی کوششوں میں حسرت موہانی نے کمیونزم کے مقابلے میں اسلام کو برتر مقام دیا ہے۔ یہی بات تفصیل کے ساتھ ادھیکاری کی مذکورہ بالا کتاب کی جلد دوم کے صفحات ۱۳، ۵۱۶، ۹۱ اور ۹۲۵ میں موجود ہے۔ آگے چل کر انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح بنام "Myself and the Communist Party of India" میں بھی صفحہ ۲۰۸ میں حسرت کے خطبے پر تنقید کرتے ہوئے انہیں رجعت پسند گردانا تھا۔ ان حالات میں یہ بات حیرت ناک نہیں ہے کہ مولانا اور مارکسیی عقائد کے کمیونسٹوں کے درمیان یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکا اور اس کانفرنس کے بعد جب

اگلے سال ۲۰ دسمبر ۱۹۲۶ء کو اس کی سینٹرل ایگزیکٹو نے اپنے پہلے جلسے میں جس کا ذکر ڈاکٹر تاراچند نے "ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ" جلد چہارم کے صفحہ ۲۰۰ میں کیا ہے اور کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ میں ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء کی اہمیت اور سرگرمیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ۱۹۲۶ء کو اس پارٹی کی تنظیم کا نقطۂ آغاز قرار دیا۔ عہدیداروں کا اس جلسے میں جو انتخاب کیا گیا۔ اس میں حسرت کے حصے میں کوئی عہدہ نہیں آیا۔ اگرچہ اس جلسے میں کامریڈ آزاد سبحانی کو نیا صدر منتخب کیا گیا البتہ علاقائی آرگنائزروں کے چار ناموں میں سے ایک نام حسرت موہانی کا تھا۔ (ادھیکاری۔ "کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی تاریخ جلد سوم صفحہ ۲۹۴) جناب عتیق صدیقی لکھتے ہیں کہ حسرت جس مزاج کے انسان تھے اس کے پیشِ نظر یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ اس حوصلہ شکن اور احسان فراموش طرزِ عمل کا انہوں نے کوئی اثر نہ لیا ہوگا لیکن اس سے غالباً انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہوگا کہ کمیونزم اور اسلام میں جو مماثلت انہیں نظر آئی ہے وہ شاید حقیقی نہیں رہا اس سے مادہ پرست، کمیونسٹ اور شدید رجحان رکھنے والے مسلمان متفق نہیں ہیں، اور ان کو اس بات کا احساس بھی ہو گیا ہوگا کہ خطبۂ استقبالیہ میں جن خیالات کا اظہار انہوں نے کیا ہے وہ ان کے ہمسفروں کے لئے قابلِ قبول نہیں نیز یہ کہ ان خیالات کو لے کر وہ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ زیادہ دور تک نہیں جا سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایک ماخذ کے مطابق ۱۹۲۷ء سے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ان کے ساتھ اسی قسم کا حوصلہ شکن طرزِ عمل کمیونسٹ ادیبوں اور دانشوروں نے بھی رکھا۔ مولانا نے جب ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں معمولی سا یا رسمی دعوت نامہ موصول ہونے پر بلا اطلاع دئیے بلکہ منتظمین کے توقع کے خلاف شرکت کرتے . . . . اور تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ادب کو سامراجیوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنا چاہئے اور غریبوں کو سوشلزم اور کمیونزم کی تلقین بھی کرنا چاہیے (بحوالہ "ہماری زبان"

سجاد ظہیر علی گڑھ بابت ۱۹۴۷ء تو ان مغربی نوجوانوں کو یہ تقریر پسند نہیں آئی۔ جب ۱۹۴۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس حیدر آباد میں عریاں نگاری کے خلاف مولانا نے قرار داد کی مخالفت کی تو جناب عتیق صدیقی کے بقول انہوں نے سجاد ظہیر اور کانفرنس کے دوسرے منتظمین کے لئے مشکل صورتحال پیدا کر دی۔ (”حسرت کا رنگ تغزل“۔ نگار لکھنؤ حسرت نمبر۔ صفحہ ۹۹)۔ مولانا نے اسلام کے بارے میں اپنے پختہ عقائد کی بنا پر ۱۹۲۷ء میں کمیونسٹ پارٹی سے قطع تعلق توکر لیا لیکن کمیونزم کے بارے میں ان کے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ انہوں نے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء کے درمیان کمیونسٹ فلسفے سے متعلق اپنے اخبار ”مستقل“ میں مضامین لکھے۔ ان میں کمیونزم کو اسلام کے قریب گردانا گیا۔ انہوں نے ”اردوئے معلیٰ“ میں بھی کمیونزم پر متعدد مضامین لکھے۔ مثلاً اردوئے معلیٰ“ بابت مئی جون ۱۹۳۶ء میں ”روس میں نئی پود کی ترقی“ ”سوشلزم اور مولانا ابوالکلام آزاد“، ”سوشلزم کیا چاہتا ہے؟“ ”اسلام اور سوشلزم“ چینی مسلمان اور کمیونسٹ اقتدار کے موضوعات پر مضامین لکھے گئے۔ اس طرح اردوئے معلیٰ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۳۶ء میں ”پنڈت نہرو اور سوشلزم“ کے عنوان سے ایک معلوماتی مضمون شائع کیا۔ در اصل وہ حریت کامل کے دلدادہ تھے۔ اور پرنسپل عبدالشکور کے الفاظ میں آزادئ کامل کو اپنا بنیادی نصب العین قرار دیتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جب بھی انہوں نے کسی جماعت کو اپنا ہمنوا پایا تو اس سے منسلک ہو گئے۔ اور جب کبھی انہیں اس بات کا خیال آیا کہ کسی بھی سیاسی جماعت سے وابستگی ان کی زندگی کے اس اہم بنیادی مسلک سے ہم آہنگ نہیں تو اس سے الگ ہو گئے وہ کانگریس میں گئے تو انہوں نے وہاں بھی آزادئ کامل کا نعرہ لگایا۔ وہ مسلم لیگ کے عہدہ ہوئے تو اس کے سالانہ اجلاس میں آزادئ کامل اور اس کے حصول کے لئے گوریلا جنگ کا راستہ اختیار کرنے کی تجویز پیش کی اور جب ان دونوں جماعتوں کے ارباب اقتدار سے مایوس ہوئے تو

پھر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا قائم کی۔ خلافت کمیٹی میں گئے تو بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تجویز پیش کی اور جب انہوں نے جمعیت علمائے ہند کانپور کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد مورخہ ۸ اور ۹ اگست ۱۹۲۱ء کی صدارت کی تو اس کے خطبۂ صدارت میں آزادیٔ کامل کا نعرہ لگایا۔ اور دوسری جمعیت علمائے ہند کی آزادی کی مخالف روش کی مذمت کی اور کہا کہ جمعیت علمائے ہند دہلی آزادی کے نصب العین سے دستبردار ہو کر فنا ہو چکی ہے مگر الحمدللہ کہ علمائے کانپور لکھنو و بدایوں وغیرہ کی جماعت اب بھی اپنے عہد پر قائم ہے اور انشاءاللہ قائم رہے گی۔ بعض معترضین کے پست حوصلے کی جانب سے اس اعلیٰ نصب العین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب فی الحال وہاں تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو اس کا ذکر ہی بیکار ہے۔ ہم کہتے ہیں ذکر تو بیکار نہیں بلکہ بہت ضروری ہے اس لئے کہ اگر نصب العین ہر وقت پیش نظر نہ رہے تو اس کے فراموش ہونے کا اندیشہ ہے اور جب وہ ۱۹۳۶ء میں پھر آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو اس شان سے کہ اس جماعت کے نصب العین کو بدلوا دیا اور کامل آزادی کو اس جماعت کا مطمح نظر قرار دلوا دیا۔ یہی جذبہ تحریک پاکستان میں ان کی شمولیت کا باعث بنا اور پروفیسر عبدالشکور کی کتاب "حسرت موہانی" کے صفحہ ۵۸ کے مطابق انہوں نے فرمایا کہ "میں پاکستان کا مؤید ہوں۔ لیکن میں پاکستان ڈومینین کا قائل نہیں بلکہ پاکستان میں جمہوریت کا علمبردار ہوں اور یہی نکتہ میرے اور قائد اعظم کے درمیان خلیج پیدا کر رہا ہے"۔ وہ ہندوستانی ڈومینین کے بھی قائل نہیں تھے۔ اور اسی بنا پر انہوں نے بھارتی آئین پر دستخط نہیں کئے۔ عتیق صدیقی لکھتے ہیں کہ حسرت جس پارٹی میں رہے اس کے لئے کسی نہ کسی منزل پر وہ دردسر بنے۔ یہاں تک کہ انجمن ترقی پسند مصنفین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہی

جس طرح انہوں نے ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کے اجتماعات میں حریت کامل کی قرارداد پیش کر کے دکانگریس، خلافت اور مسلم لیگ کے اجتماعات میں) گاندھی جی اور حکیم اجمل خاں کے لئے نازک صورت حال پیدا

کردی تھی۔ اسی طرح ۱۹۴۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ حیدر آباد دکن میں سجاد ظہیر اور دوسرے کرتا دھرتاؤں کے لئے مشکل صورتحال پیدا کر دی تھی۔ لیکن اس دردسری میں خود سید الاحرار کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سیاست ہو یا صحافت، ادب ہو یا شاعری ہر شعبۂ حیات میں وہ اصول پسندی کے قائل تھے۔ اب اگر جنوبی ایشیا کی سیاسی اور ادبی جماعتیں ادب اور سیاست کے مسلمہ اصولوں سے انحراف کریں تو حضرت سید الاحرار کی اصول پسندی ضرور ان کی راہ میں حارج ہوگی۔ اسی لئے سید الاحرار کا یہ قول کہ سیاست کوٹھے کی دلالی ہے غلط نہیں، جس میں صرف حسرت موہانی کا دامن سیاہ نہیں ہوا وہ اصولوں کے قائل تھے اور کامل آزادی کو اپنا مطمح نظر سمجھتے تھے اس طرح وہ استحصال کے بھی خلاف تھے اور ان کا خیال تھا کہ اسلام استحصال اور سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ان کی مزدور دوستی کی بنیاد میں بھی اسلامی جذبہ تھا اور اسی وجہ سے وہ اشتراکیت کے حامی بنے اور انکی شاعری میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے۔ مثلاً ان کے یہ اشعار اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔

؎ نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہیگی	نہ حکام کا جور بے جا رہے گا
؎ زمانہ وہ جلد آنیوالا ہے جسمیں	کسی کا نہ محنت پہ دعویٰ رہے گا
؎ دستور کے اصول مسلم ٹھہر چکے	شاہی بھی دام غلبۂ جمہور ہو چکی
سرمایہ دار خوف سے لرزاں ہیں کیوں نہ ہو؟	معلوم سب کو قوت جمہور ہو چکی
تحریک حریت کو جو پایا قرین حق	ہر حال میں معاون تحریک ہم رہے
تکمیل علاج دنیوی کو حسرت	ہے خواہش حسن عاقبت بھی لازم
درویشی و انقلاب مسلک ہے میرا	صوفی مومن ہوں اشتراکی مسلم
لاریب کہ یہ نہج بیت مال اسلام	فی الجملہ ہے آئین سوویت قائم

؎ معیشت میں بہ ہر سو رنگ فطرت ہے جہاں میں ہوں
اخوت ہے جہاں میں ہوں، سوویت ہے جہاں میں ہوں
مقام فرد ہے محفوظ ہے خوز جماعت میں
نمایاں ہر طرف وحدت میں کثرت ہے جہاں میں ہوں

اصول اشتراک آئین بیت المال سے مشتق
اساس کارِ جمع و خرچ ملت جہاں میں ہوں
خلافت ہو کہ حرمت کامیابی سعیٔ انسان کی
نظام اجتماعی کی بدولت ہے جہاں میں ہوں
بری ہے فکریاں ہر فرد کی لوث عقیدت سے
مسلم اقتدار علم و حکمت ہے جہاں میں ہوں
رواج بربریت ہے مذاہب کے تعصب میں
فضائے امن و صلح و آدمیت ہے جہاں میں ہوں
بلا تائید محنت کچھ بھی افزائش جو ہو حسرت
وہ دولت کیلئے اک طوق لعنت ہے جہاں میں ہوں

حریت کامل سے محبت، استحصال سے بغاوت اور اسلام سے محبت ان کی زندگی کے بنیادی عناصر تھے اور اس لئے ہمیں ان کی زندگی میں خواہ وہ سیاسی ہو یا مذہبی، ادبی ہو یا ذاتی کوئی تضاد اور ٹکراؤ نہیں نظر آتا ..... وہ مسلم لیگ میں رہتے ہوئے بھی اشتراکی تھے اور اشتراکیت کی حمایت کے باوجود ایک سچے اور پکے مسلمان تھے۔ ایسے مسلمان جنہیں ملک کے تمام حلقوں اور طبقوں میں یکساں عزت اور احترام حاصل تھا۔ اگر پنڈت گوبند بلبھ پنتھ کو جو تقسیم سے قبل یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے، یہ بات ناگوار تھی جس کا ذکر انہوں نے یوپی اسمبلی کے ایک اجلاس میں بھی کیا تو مولانا کے نزدیک بیک وقت کمیونسٹ اور کمیونلسٹ ہونا عیب کی بات نہیں تھی۔ اس لئے کہ وہ ایم۔ این۔ رائے کے الفاظ میں اسلام کو کمیونزم پر حاوی سمجھتے تھے۔ قائد اعظم کو بھی اس اصول پسندی اور اسلام سے محبت کی بنا پر سید الاحرار کی بڑی قدر تھی اور یہی چیز خود ہندوستانی سیاست میں ان کے عزت و وقار کا باعث تھی اور اس کا مظاہرہ بھارت کی مجلس دستور ساز میں پہلے پہل شرکت کے موقع پر پورے ایوان کیطرف سے کیا گیا۔ جناب عتیق صدیقی لکھتے ہیں کہ ”حصول آزادی کے بعد ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں جب وہ پہلی بار تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو

پورے ایوان نے تالیاں بجا بجا کر ان کا پر جوش خیر مقدم کیا۔ اس وقت آئین ساز اسمبلی کے نائب صدر ایچ۔ بی مکرجی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے حسرت کے پرتپاک خیر مقدم کو دیکھ کر کہا تھا کہ انہیں یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ یہ ایوان اس ملک کے تمیش مولانا کی عظیم الشان قربانیوں کو بھولا نہیں ہے۔ موصوف پہلے شخص تھے جنہوں نے مادر وطن کے لئے کامل آزادی کا مطالبہ کیا تھا اور عزت و احترام کی یہی کیفیت ان کی رحلت کے موقع پر بھی برصغیر پاک و ہند میں یکساں طور پر دیکھی گئی۔ جس پر حسرت کا یہی مقطع صادق آتا ہے۔

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرت کا
وہ وضع پارسا اسکی، وہ عشق پاک باز اس کا

یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے وہ ارکان جنہوں نے ۱۹۲۵ء میں اپنے بانی کو فراموش کر دیا تھا۔ اب بھی یہی پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ حسرت موہانی اشتراکی تھے، کمیونسٹ تھے حالانکہ خود حسرت نے اس کا انکار کیا ہے۔ حسرت حریت کامل کے دلدادہ، استحصال کے مخالف، اسلام کے سچے شیدائی اور رسول اکرمؐ کے سچے عاشق تھے اور انہوں نے اپنی طویل سیاسی زندگی میں ہر اس جماعت کا ساتھ دیا جس نے ان مقاصد کے حصول کے سلسلے میں ان سے تعاون کی خواہش کی مگر یہ تعاون صرف مقاصد کے حصول کے لئے ہی تھا اس لئے کہ جب سید الاحرار نے یہ دیکھا کہ جس پارٹی میں وہ شامل ہیں۔ وہ ان کے مقاصد سے روگردانی کر رہی ہے تو وہ اس سے فی الفور الگ ہو گئے اور یہی بات کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کے پانچ سالہ تعاون پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے۔

مولانا حسرت موہانی ایک ایسی پارٹی قائم کرنا چاہتے تھے جو حصول آزادی کے لئے اگر ضرورت پڑے تو تشدد کا راستہ بھی اختیار کرے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اشتراکیت کو ایک نیا مفہوم دینے کی کوشش کی اور یہ مفہوم اسلامی اصولوں کے عین مطابق تھا۔ لیکن اس وقت مغربی خیالات رکھنے

والے نوجوان روسی مارکسیسی عقائد کو کمیونزم کی اساس قرار دیتے تھے۔ بعد میں ماؤزے تنگ نے چین میں اور ہوچی من نے ویتنام میں ان نظریات میں اپنے داخلی عوامل کی بنا پر تبدیلیاں کیں۔ چین اور ویتنام میں انقلاب کی بنیاد کسان تھے۔ مولانا حسرت موہانی کمیونزم کو اسلام کے قریب تر گردانتے تھے اور جیسا کہ پہلے بھی مذکور ہو چکا ہے کہ وہ اس فلسفے کو اسلامی اصولوں کی نئی تشریح قرار دیتے تھے۔ جس کا ایم۔ این۔ رائے نے بھی اعتراف کیا اگر بھارتی کمیونسٹ مولانا کو اپنا حقیقی لیڈر سمجھ لیتے جس کا مظاہرہ وہ اس صدی کی تیسری دہائی کے ابتدائی چند سالوں میں کرتے رہے تو مولانا میں ہندوستان کا ماؤ اور ہوچی من بننے کی پوری صلاحیت تھی اور یقیناً وہ کمیونزم کو وہ شکل وصورت عطا کر سکتے تھے جو ہندوستانی عوام کے نزدیک قابل قبول ہوتی اور ہندوستان نجانے کب حقیقی اسلامی بالشویک انقلاب کے دور سے گذر چکا ہوتا۔ جنوبی ایشیاء کے نوجوان کمیونسٹوں نے ۱۹۲۶ء میں مولانا کے اصولوں، ان کی اسلام پسندی اور بالشویک نظریات پر اسلام کی بالادستی کے خلاف بغاوت کر کے خود اپنا اور اپنی تحریک کا نقصان کیا۔ اس لئے کہ انہوں نے مولانا حسرت موہانی سے تو گلو خلاصی حاصل کر لی مگر خود اپنی صفوں سے گذشتہ ۶۵ سال کے دوران کوئی حسرت موہانی جیسا عظیم مفکر، قائد مصلح اور لیڈر نہیں ابھر سکا جو ہندوستان میں کمیونسٹ تحریک کے سمبل کے طور پر لینن، اسٹالن، ماؤزے تنگ اور ہوچی من کی صف میں شامل ہونے کی اہلیت رکھتا۔ بعد کے دور میں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مولانا کا نام استعمال کرنے سے جنوبی ایشیا کی کمیونسٹ تحریک کو وہ فائدہ نہیں پہنچ سکا جو وہ مولانا کو اپنا قائد تسلیم کئے بغیر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ وہی تحریک کامیاب ہوتی ہے جس کا قائد اپنے ملک میں خود اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر عزت اور استحکام کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ لینن کو روس میں اور ماؤزے تنگ کو چین میں جو عزت حاصل تھی۔ وہ ان کے ایثار، اخلاص، افکار اور قربانیوں کی بدولت تھی۔ اور ان کی وجہ سے ہی ان ممالک میں کمیونسٹ

تحریکات کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں. اگر بھارتی کمیونسٹ مولانا کے افکار و نظریات سے بغاوت نہ کرتے تو وہ لینن، ماؤ، ہوچی من کی فکر کے قائد حسرت موہانی کے سائے میں جنوبی ایشیا کو ایک عظیم کمیونسٹ انقلاب سے روشناس کرانے کی ان کوششوں میں کامیابی حاصل کر سکتے تھے جو وہ مولانا کیخلاف بغاوت کر کے ۶۵ برس میں بھی حاصل نہ کر پائے ہیں۔

ضمیمہ (ج)

سفرنامہ عراق

محترمہ نشاط النسا بیگم نے مولانا حسرت موہانی کے تعلق سے بڑے اہم خطوط لکھے ہیں۔ جن میں سے اکثر سید الاحرار حصہ اوّل و دوم ازدواجی زندگی کے باب کی زینت بن چکے ہیں اور بیگم صاحبہ نے ویسے بھی مولانا کی تمام نگارشات کو منظم شکل میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ لیکن سفرنامہ عراق ان کی وہ واحد تصنیف ہے جس نے انہیں ادیبوں کی صف میں شامل کیا ہے۔ یہ سفرنامہ عراق بھی خطوط کی شکل میں ہے جو انہوں نے اپنے سفر کے دوران اپنی بیٹی نعیمہ بیگم کو لکھے اور جنہیں بعد میں مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلّی میں قسط وار شائع کر کے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا ہے۔ ذیل میں یہ سفرنامہ پیش کیا جاتا ہے۔

خانقاہ حضرت غوث پاک

بغداد شریف یوم جمعہ ۱۳ ذیقعدہ ۱۳۵۴ھ

عزیزہ سلیما۔ اللہ سے امید ہے کہ تم سب بخیریت ہوں گے۔ پرسوں کچھ حال لکھا تھا۔ بوشہر سے جہاز صرف سامان اتار کر ۴ بجے روانہ ہوا اور دس گھنٹے میں آبادان رات کو پہنچا۔ کنارے لنگرانداز ہوا یہ مقام بہت ہی بارونق اور آباد ہے خوب بجلی کی روشنی مکانوں میں اور چہل پہل ہے۔ یہاں تیل مٹی کا بکثرت ہے بے شمار کارخانے ہی کارخانے سامنے نظر آتے ہیں۔ یہاں جہاز صرف تیل لینے ہی کو ٹھہرتے ہیں۔ بہر حال دو بجے سے بڑے بڑے لیمپ جیسے تم نے دیکھا ہوگا کہ سمندر سے پانی لینے کے ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے بھوتروں پر کئی کئی لگا دیئے گئے ہیں اور دو بجے صبح تک خوب تیل لیا گیا۔ جگہ جگہ بھوترے بنے ہیں اور علیحدہ علیحدہ

جہاز تیل لیتے ہیں۔ یہاں تیل صاف کیا جاتا ہے۔ جہاز آٹھ بجے روانہ ہو گیا۔

ابادان کے کئی مسافر اترنے والے تھے مگر وہاں سواریاں نہیں اتارتے۔ بلکہ ایک گھنٹے بعد بصرہ شہر آیا۔ وہاں لانچ اور کشتیوں میں لوگ گئے اور پھر وہاں سے ابادان موٹروں میں اپنے اپنے گھر گئے ہوں گے۔ حالانکہ ابادان میں سامنے ہی لوگوں کے گھر بنے ہوئے ہیں۔ مگر وہاں کسی کو نہ اتارا۔ دریائے دجلہ شروع ہو گیا۔ بہت گہرا اور بہت دور تک چلا گیا ہے۔ بغداد بلکہ اس کے آگے تک پانی اس کا زردی مائل گدلا رنگ گنگا سا ہے۔ پاٹ بھی بہت بڑا ہے۔ اتنا کہ جہاز چلتے ہیں۔ کھجوروں کے باغ ہی باغ نظر آتے ہیں۔ بصرہ میں سامان اتارتے دو بج گئے۔ بہت سے لوگ وہاں بھی اتر گئے۔ ہم ہی لوگ اور چند آدمی رہ گئے جو بصرے میں اترنے والے تھے۔ ایک گھنٹے میں بصرہ آ گیا۔ محمرہ میں بصرہ تک خوب صورت بنگلے اور مکانات دجلہ کے کنارے باغات سے گھرے ہوئے بہت اچھے معلوم ہوتے تھے۔ جہاز کنارے لنگر انداز ہوا۔ ہم لوگوں نے سامان ٹھیک کر لیا ڈاکٹر پہلے آیا۔ سب کے ٹیکے اور پاسپورٹ دیکھے۔ مولانا کے چیچک کا ٹیکہ نہ تھا۔ ان کو خوف تھا کہ ڈاکٹر اعتراض کرے گا اور قرنطینہ کرے یا کیا کرے۔ مگر میرا اور رضوان کا پاسپورٹ ایک ہی میں تھا البتہ اس کے ساتھ چیچک اور ہیضے کے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ علیحدہ علیحدہ تھے مولانا نے میرا اور رضوان کا سرٹیفکیٹ جو چیچک اور ہیضہ دونوں کا تھا پہلے رکھا اس کے بعد اپنا جو صرف ہیضہ کا تھا پھر خوش رنگ کے ڈاکٹر نے میرا اور رضوان کا جلد جلد دیکھ کر باقی دو کو بغیر دیکھے ہم چاروں کو پاس کر دیا۔ اب تسلیم احمد رہے ان کے چیچک کے ٹیکوں میں یہ اعتراض تھا کہ بارہ دن کی میعاد پوری ہونی چاہیئے اگر کم ہو گی تو بارہ دن کے انداز سے پورے کرنے کے لئے قرنطینہ میں روک لیں گے تسلیم احمد کا

پاسپورٹ اور سرٹیفکیٹ کراچی کا تھا جس کے صرف چھ دن ہوئے تھے
اس لئے وہ چھ دن کے لئے روک لئے گئے۔ اب وہ بہت
پریشان۔ مگر منور صاحب شیعہ جو ہمارے ہمسفر ہیں۔ انہوں نے نواب
صاحب خیرپور سے سفارش کی جو ہمارے ساتھ کراچی سے فرسٹ
کلاس میں تھے۔ باورچی وغیرہ ان کے ساتھ ہیں، ایک وقت مولانا
کی دعوت کی تھی۔ نواب صاحب نے ڈاکٹر سے کہا سنا۔ خیر ان کو بھی
چھوڑ دیا گیا۔ پاسپورٹ ملنے پر ۴ بجے کے بعد جہاز پر سے اترے
ایک ایک چیز بسترے، بکس، پوٹلیاں وغیرہ سب دیکھتے ہیں۔ تمباکو کی سخت
نگرانی ہے۔ سب سے زیادہ مجھ کو اپنی تمباکو کی فکر تھی کہ کس طرح بچے۔
خیر اللہ کا نام لے کر چلے۔ اب وہ دو نئے دہلی والے جو کراچی سے
بجائے جدہ جانے کے ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔ ان کا کل سامان
خوب نو چاکھسوٹا گیا۔ اب ہم سب کی باری تھی کہ خفیہ پولیس والے آگئے
ایک نے تو صاف ظاہر کر دیا کہ ہم کو مولانا کی پہلے سے خبر تھی
اس کے سبب سے جو بڑے میاں کراچی سے ہمارے ساتھ تھے ان
کے لڑکے جو نجف میں ڈاکٹر ہیں۔ وہ اسٹیشن جہاز پر مل گئے، انہوں
نے مال وغیرہ سب لکھوا دیا، اور ہم سب تلاشی سے بچ گئے۵ بجے
ریل چھوٹنے والی تھی اس کی بھی فکر تھی کہ جلد نجات ہو تو روانہ
ہوں۔ خیر بغداد شریف جانے والا میل ۵ بجے چھوٹا۔ اس میں ہم سب
نے اپنا سامان جلد رکھوا دیا اور اطمینان سے بیٹھ گئے۔ ڈبہ سب
خالی پڑا تھا۔ مگر چھوٹی بنچیں دو دو آدمی بیٹھنے والی ہیں۔ میں نے اور
رضوان نے انہیں پر بستر لگائے اور دوسری طرف مولانا نے اوپر
بستر لگایا۔ رات بھر خوب سوئے۔ علی الصبح اٹھے۔ فجر کی نماز پڑھی اور
بغداد شریف آگیا۔ اترے اس وقت تک ترشح ہو رہا تھا۔ بڑا معرکہ
ہوا تیز آندھی سی اور اس قدر تیز تھی کہ خدا کی پناہ۔ خیر تین گاڑیاں
کرائے پر کی گئیں۔ اور ہم سب سوار ہو کر درگاہ شریف آئے

وہاں عرب تمام کمرہ تکیوں گدیوں سے ٹھیک موجود تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہاں سردی سے بچنے، کے لئے بیٹھے اس کے بعد صاحب سجادہ جو بڈھے ضعیف آدمی ہیں مکان سے موٹر پر آئے۔ ان سے مولانا ملے اور احاطہ خانقاہ شریف کے اندر دوسری منزل پر ایک حجرہ ٹھہرنے کے لئے لیا۔ عورتیں ان حجروں میں نہیں ٹھہر سکتی تھیں۔ مگر مولانا کے کہنے سے مجھے بھی رہنے دیا۔ اب ہم اس میں ہیں۔ اس وقت یکایک خوب پانی برسا اور اولے پڑے، آج جمعہ تھا سب نے نماز عشاء پڑھی۔ اس کے بعد دروازہ مزار شریف کا کھلا۔ عورتوں کے ساتھ میں بھی اندر گئی۔ اپنی خوش قسمتی پر رونا آتا تھا۔ تم سب کے لئے دعائیں مانگیں۔ اب کل لکھوں گی۔

از باب الشیخ بغداد شریف

یوم شنبہ یکم ذیعقعد سنہ ۵۷ھ مطابق ۱۱ فروری سنہ ۳۹ء

عزیزہ سلما! کئی دن کے بعد آج وقت ملا۔ روزانہ کہیں نہ کہیں جانا ہوتا تھا ہفتہ کی صبح کاظمین شریف گئے۔ وہاں حضرت امام موسیٰ کاظم کا مزار بہت بڑی درگاہ ہے۔ دور سے پھاٹک نہایت مطلاً، محلاً نظر آتا ہے۔ سنہرے کھمبے، قبے، چاندی کی قد آدم جالی۔ خوب لانبی چوڑی بنی ہے۔ اس پر کارچوبی پردے پڑے ہیں اور اونچی ضریح رکھی ہے۔ حضرت امام کے مزار پر دعا تریاق کا حکم رکھتی ہے میں نے تو سب کی صحت و سلامتی، عاقبت دین و دنیا وغیرہ وغیرہ کی دل سے دعائیں مانگیں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ شیعہ عورتوں کا ہجوم بہت تھا۔ جالی کی طرف گھوم رہی تھیں۔ ہم لوگوں کو بھی حنفی نے سلام خوب دیر تک پڑھایا۔ وہاں سے دوپہر کو واپس آئے۔ مولانا اور تسلیم احمد کونسلیٹ چلے گئے۔ پاسپورٹ کے انتظام کے لئے واپس ہوتے ہوئے ہم لوگوں نے کپڑوں کا بازار دیکھا۔ یہاں کے بازار اس قدر کشادہ اور بکثرت ہیں کہ چلتے چلتے دیکھتے انسان تھک جائے مگر سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ ریشمی کپڑوں سے بھری پڑی دکانیں

کے کی وضع کی بٹی ہوئی ہیں اس طرح اونی و سوتی چھینٹیں بھی بکثرت ہیں،
کہ چلتے چلتے انسان تھک جائے مگر سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ جاپانی مال بھی بہت
ہے۔ کھلونوں کی دکانیں بھی ہیں۔ جاپانی ربڑ وغیرہ کے جوتوں کی بھی دکانیں
ہیں۔ جوتے بہیں کی دکانوں میں بنائے جاتے ہیں مولانا نے احرام کے لئے
ایک جوڑا شامی ۱۲ روپے میں کل خریدا ہے۔ ہاں تو پہلے دن میں نے
رضوان کے لئے ایک نیلے رنگ کا نیا سوئٹر خریدا ہے۔ خوب لمبا چوڑا ہے
یہاں سردی بہت سخت ہے۔ بارش بھی اکثر تھوڑی تھوڑی ہوتی رہتی ہے۔
ہوا بھی کسی وقت بہت چلنے لگتی ہے۔ یہاں دو دکانوں میں سلے ہوئے کوٹ
مردانے اور زنانے ہوتے ہیں۔ بچوں کے لئے بھی بکثرت ٹنگے رہتے ہیں۔
خوش رنگ بھی ساتھ ہیں۔ اس کو سوئٹر کی ضرورت تھی مگر انتخاب ایک
مخمل کا زنانہ کوٹ کیا گیا۔ لیکن خوش رنگ نے اسے پسند نہ کیا۔ مجبوراً اس
نے لے لیا۔ اچھا ہے۔ پاک کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ مردانہ
ہے۔ خدا معلوم کیسا ہے۔ میں تھک گئی تھی۔ اس لئے واپس آ گئی۔ گوشت
کی دوکانیں اور میوے کی دکانیں بھی بہت زیادہ ہیں۔ اس پر سرخ
شیریں بڑے بڑے دانے خوب ہیں۔ مولی، گاجر، میٹھے، نیبو، کھٹے، کیلا
غرض کہ سب چیزیں۔ کیک کی دوکانیں بے انتہا بڑی بڑی ادھر تک
مختلف قسم کے چاکلیٹ اور بسکٹ سے بھری رہتی ہیں۔ یہاں صبح سے دوپہر
تک بالائی بھی لوگ بہت موٹی تہہ میں خرید لیتے ہیں اچھی ہوتی ہے۔ میں تو
روز صبح دو پیسے کی چار پیسے کی منگواتی ہوں۔ رضوان بھی۔ روٹیاں تکے
کی سی نہاری بہت خوب اچھی گرم گرم اس کی ملتی ہے۔ صبح کو یہاں پھاٹک
پر ایک عورت چنے لاتی ہے۔ ایک پیسے کے بہت سے ملتے ہیں۔ سفید
اور بہت بڑے۔ لوبئے کے دانے بڑے بڑے روز میں کھاتی ہوں۔
کلیجی و کباب وغیرہ، ہوٹل میں جگہ جگہ بہت ہیں۔ ان میں کھانا سستا
اور ہر قسم کا ملتا ہے۔ دودھ بھی دو سیر پرسوں منگوایا تھا۔ خوب گرم
اچھا ہے۔ گوشت گائے کا بھی بہت ہے۔ بھینس کا بھی، ملائی وغیرہ ان

کی بنتی ہے۔ دنبے کا گوشت اور بکری کا آج کل گراں ہے آٹھ آنے سیر
بچھلی بھی بکثرت بازاروں میں ملتی ہے۔ پنیر اور کھویا بھی ملتا ہے۔ ترکاریاں
بھی سب ملتی ہیں۔ سڑکیں چوڑی چمکدار، ٹھنڈی سڑک کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔
مگر ذرا بھی بوندیں پڑتی ہیں تو پھسلن زمین پر ہو جاتی ہے۔ سوکھنے پر دیج
سڑکیں سخت سیمنٹ کی سی ہو جاتی ہیں۔ بگھیاں جن کو یہاں ارلجانہ کہتے ہیں۔
ان میں چار آدمی بیٹھتے ہیں۔ کرایہ بے حد سستا ہے ٹرام بھی کہیں ایک
منزلہ، دو منزلہ بھی۔ مگر تعجب ہے کہ ان میں بھی دو عراقی گھوڑے لگے ہوتے
ہیں۔ خوب تیز، ہمارے یہاں تانگہ فر فر چلتا ہے۔ مال کے بڑے بڑے چھکڑے
بے انتہا وزن کے۔ ان میں بھی گھوڑے لگے ہوتے ہیں۔ مگر گھوڑے یہاں کے
بے حد مضبوط اور طاقتور ہوتے ہیں۔ دجلے پر پل بنا ہے اس طرح سے کہ جیسے
نیچے برابر برابر ناٹ کی طرح بوجھے کی کشتیاں پانی میں لنگر انداز ہیں۔ انہی پر لمبا
چوڑا پل قائم ہے۔ ارلجانہ نہیں جاتا۔ موٹریں بے حد بے شمار ہیں۔ بازاروں میں
ہر طرف دوڑ دھوپ اور آدمی کا ہجوم ہر وقت نظر آتا ہے۔ مٹھائیوں کی
دوکانیں بھی بہت ہیں۔ یہاں خاص و عام امیر و غریب ایک ہی پوشش ہے
یعنی کوٹ پتلون، ٹائی بوٹ، عراقی سیاہ ٹوپیاں اور اس پر سے اوور کوٹ بھی
خوب گورے گورے خوب صورت انسان ہیں۔ بچے بھی اسی طرح سفید روئی کے
گالے، چوڑے چوڑے چہرے، تندرست موٹے تازے۔ یہاں پردہ نہیں ہے
البتہ پرانی وضع کی کچھ عورتیں عرب کا سا نقاب باہر ڈال لیتی ہیں۔ مگر پنڈلیاں
اوپر تک کھلی۔ موزے باریک لیڈی شو۔ باقی عورتیں عموماً ہیچ برہنہ فراک
برہنہ چاک اوپر سے بڑے بال بنے ہوئے۔ سب کے چہروں پر زلفیں
آٹھ آٹھ انگل کی ادھر گالوں پر لٹکتی ہوتی ہیں۔ کسی کے چوٹی لانبی اور کسی کا
جوڑا پیچھے بندھا ہوا۔ ورنہ اکثر کے بال کٹے ہوئے۔ بے حد حسین اور گداز بدن
سرخ سفید ناک، نقشے درست، بے تکلف اسکولوں اور بازاروں میں
گھومتی پھرتی ہیں۔ یہاں سنیما بھی بہت ہیں۔ لوگ خوش حال اور آسودہ حال بمبئی
کا سا نمونہ ہے۔ بازار دہرے، بمبئی کی طرح پٹے پڑے ہیں۔ ہر طرف

چہل پہل رہتی ہے مگر مغرب کے وقت سے دوکانیں بند ہونے لگتی ہیں اور آٹھ بجے تک سب بازار بند ہو جاتے ہیں۔ دروازے دوکانوں لہردار چادریں اس قسم کے ہیں کہ جب چاہو اوپر چڑھا لو۔ مولانا دوپہر سے گئے شام کو واپس آئے۔ کسی کے ہاں دعوت تھی۔ وہیں کھانا کھا لیا۔ کام کچھ نہ ہوا۔ یہاں قاعدہ ہے کہ ہر حاجی سے سوسو روپے کی نقد ضمانت جمع کرا لیتے ہیں اور بغداد سے ایک پاس پورٹ حجاز، شام، فلسطین و مصر کا دس روپے لے کر دیتے ہیں، اگرچہ قواعد میں ایسا کہیں نہیں لکھا ہے چنانچہ مولانا نے کونسلیٹ میں خوب بحث و مباحثہ کیا۔ جب ہندوستان سے عراق و حجاز کے دو جگہ کا پاسپورٹ لاتے ہیں تو ہم سے یہاں حجاز کا نیا پاسپورٹ کیوں طلب کیا جاتا ہے۔ ہم دس دس روپے ہرگز بیکار خرچ نہیں کرینگے علاوہ بریں فلسطین وغیرہ مقامات کے لئے تو ہندوستان میں اطلاع حکومت کی طرف سے مل گئی تھی کہ وہاں جانا ہو تو نقد ضمانت جمع کرانی ہوگی مگر حجاز کے سوسو روپے مانگے جائیں گے اس کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ ہمارے لئے اس مزید رقم کا جمع کرانا ناممکن ہے۔ نتیجہ اس دن یہ نکلا کہ برٹش گورنمنٹ کو تار دے کر جواب منگوایا جائے۔ دوسرے دن اتوار تھا اس لئے تعطیل تھی۔ سب کام بند۔ طے پایا کہ صبح سے سامرہ بغرض زیارت جانا چاہیئے۔ راستہ میں امام اعظم ابوحنیفہ اور حضرت یوشع پیغمبر کے مزار بھی ہیں۔ چنانچہ دو ارابانہ گاڑیاں کی گئیں۔ راستہ میں اتر کر امام ابوحنیفہ کے مزار پر فاتحہ پڑھا۔ دروازہ بند تھا۔ قفل کھولنے والا اس وقت موجود نہیں تھا۔ اس لئے باہر ہی سے فاتحہ پڑھا۔ اس کے بعد حضرت یوشع کے مزار پر حاضر ہوئے بڑا سا حجرہ ہے۔ قبر شکستہ ہونے کے سبب جیسے بڑی لمبی چیز ہوتی ہے۔ اسی طرح کے صندوق میں چاروں طرف سے بند تھی اور سبز غلاف پڑا تھا۔ حضرت جابر صحابی رسول، حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے مزارات پر فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد کاظمین پہنچ کر وہاں سے بذریعہ موٹر سامرہ جانے کا ارادہ تھا مگر اتفاق سے اس دن دوپہر تک کوئی موٹر لاری نہ ملی۔ مجبوراً بغداد واپس آنا پڑا۔

یہاں کاظمین میں خاندان واجد علی شاہ اور اودھ کے ایک لکھنوی نواب زمانہ دراز سے رہتے ہیں۔ ان کی پیدائش یہیں کی ہے مگر اردو لکھنؤ کی سی، میاں بیوی اور ان کی ہندی خادمائیں خوب بولتی ہیں۔ عراقی عربی زبان یہاں سب ہندیوں کو آتی ہے۔ اس طرح بغداد کے باشندے سب کچھ نہ کچھ اردو بول لیتے ہیں۔ اور مطلب تو خوب سمجھتے ہیں۔ انگریزی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ شریف حسین کے پوتے نوجوان شاہ غازی اس وقت بادشاہ عراق ہیں۔ وہاں تو ہمارے ہمسفر منور صاحب جب پہلے کربلا آئے تھے تو انہی نواب صاحب کے ہاں ٹھہرے تھے۔ جن کا ذکر اوپر گذرا۔ نواب صاحب کا مکان سامنے تھا۔ منور صاحب ان سے ملے۔ ان کے بھتیجے سے موٹر کے لئے کہا۔ اسی اثنا میں مجھے اور اور خوشرنگ کو زنانے میں ٹھہرنے کے لئے بھیج دیا۔ یہاں کے بڑے بڑے بنگلہ نما ہوتے ہیں۔ نواب صاحب کا ذاتی مکان بھی دو منزلہ سہ منزلہ تھا۔ ایک ملاقات کا کمرہ آراستہ تھا۔ اور بھی کئی بڑے بڑے ہال تھے۔ یہاں بمبئی سے آئے ہوئے ہرے پان ڈھولی ملتے ہیں مگر کتھا ویسا ہی کلکے کی طرح مٹی کا سا بے مزہ۔ بیگم صاحبہ پان دے رہی تھیں۔ مگر میرے پاس کانپور کے پان تھے۔ میں نے نہیں کھایا۔ خوش رنگ نے کھایا۔ ان سے بیگم صاحبہ لکھنؤ کے حالات پوچھتی رہیں۔ خود اپنی باتیں اور پوچھنے پر عراق کے حالات سب بیان کرتی رہیں۔ بڑی لڑکی اور بڑا لڑکا ایک چھوٹی لڑکی سب اسکول میں تھے۔ ادھیڑ عمر کی ہیں خوب موٹی تازی گوری گوری خیر نواب صاحب کے بھتیجے کو بھی موٹر کی تلاش میں کامیابی نہ ہوئی اور ہم سب بغداد واپس آئے۔ سہ پہر کو یہاں دو صاحب ہندی و پنجابی آئے اور مولانا کو مع ساتھیوں کے سینما کی دعوت دی۔ ہم لوگ بعد مغرب سب کے سب گئے۔ میں اوپر زنانے میں چلی گئی۔ مرد سب نیچے رہے۔ آدھ گھنٹے کے بعد تماشا شروع ہوا۔ اس میں موجودہ شاہ غازی کی تاجپوشی کا جلوس دکھایا گیا۔ شروع سے آخر تک لاتعداد موٹروں کی دوڑ دھوپ پبلک کا ہجوم شاہ غازی اپنے گھوڑے پر سواروں کی فوج کا معائنہ اور سپاہیوں کو خود بخود سلام کرتے رہے۔ پھر موٹر پر شاہی مکان کو چلے گئے۔ وہاں سے برآمدے میں کھڑے ہو کر

شاہی فرمان سنایا۔ اس کے بعد پھر موٹریں آئیں اور
کرتے رہے۔ آخر میں بس گھوڑ دوڑ۔ اور فوج کا تماشا
کوئی سین نہ تھا۔ تماشا دیکھ کر سر تھک گیا۔ البتہ بالکل آخر میں
میں کشتی ہوئی۔ خوب گورے گورے، موٹے موٹے اور مضبوط
کو آخر کار پچھاڑ ڈالا۔ بس ختم، واپسی میں سارا بازار بند۔ کہ
سو رہے۔ تیل لائن میں بڑی دقت سے ذرا سا مل سکا۔ سینما
سے دہلی کی ایک ماں اور بیٹی بیٹھیں تھیں۔ میاں ان کے سوا
اور بڑی لڑکی سال بھر سے آئی ہوئی ہیں۔ باپ نے لڑکی کا
ایک تین بچوں کے باپ کے ساتھ کر دیا جن کی پہلی بیوی
ہندوستانی تھیں۔ لڑکے چھوٹے چھوٹے ہندوستان میں ہی
میں دونوں ماں بیٹیاں ملنے بھی آئی تھیں۔ اپنی مصیبت
کے میں اپنے لئے دعا مانگنے کو کہا۔ ایک دینار جو تیرہ
ہے۔ سنا میں دیا تھا کہ دو بکرے ایک اپنے ایک اپنے
جس کا انتقال ہو گیا ہے قربان کر دیئے جائیں اور باقی
دی جائے دو شنبہ کی صبح کو پھر انتظام شروع ہوا۔ مقا
سے عبور کر کے گاڑیوں میں بیٹھ کر گئے۔ ہمارے صا
دین کے مزارات ہیں۔ چنانچہ پہلے حضرت جنید بغدادی کے
مسجد بھی ہے۔ اندر بڑا صندوق، جیسے اور سب مزاروں
صندوق قد آدم اونچے لمبے چوڑے ان پر کارچوبی غلاف
نے فاتحہ پڑھی۔ نزدیک ہی دوسرا صندوق حضرت سری س
اور دو رکعت نماز نفل مسجد میں پڑھ کر واپس آئے۔ ذبید
کا قبہ بھی نظر آیا تھا۔ دور ہی سے فاتحہ پڑھ لیا تھا۔ پھر
دور خرابہ کرخ میں حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے
یہ سب قادری سلسلے کے بزرگان دین ہیں۔ سب جگہ سے
مولانا راستہ سے معہ تسلیم احمد کے کونسلیٹ چلے گئے کہ

فیصلہ ہو جائے تو کل نجف اشرف۔ کربلائے معلیٰ اور کوفہ کی زیارت کرتے ہوئے
مدینہ شریف روانہ ہو جائیں۔ ہم لوگ بازار دیکھنے چلے گئے خوش رنگ کیلئے
ایک سوئیٹر سوتی لمبا چوڑا دس آنے کا لیا۔ موزے دو آنے کے۔ رضوان نے
دستانے ۳ آنے کے لئے۔ منور صاحب نے موزے دستانے لئے۔ میرا ارادہ تھا کہ
نفیسہ و انیسہ کے لئے بھی کچھ کپڑا چھینٹ کی قسم کا جو یہاں بہت مشہور ہے۔
خریدوں گی۔ مگر دو چار جگہ پوچھنے پر قیمت کچھ ٹھیک معلوم ہوئی۔ مجھے پیاس اور
رضوان کو بہت لگی تھی۔ اسی لئے جلد واپس آئے۔ شام کو عقید السلام کیطرف
سے مولانا کی اور سب کی دعوت تھی۔ ایک اور جگہ چار بجے جانے کی۔ ایک اور
جگہ صرف مولانا کی اور نسیم احمد کی دعوت تھی۔ شام کو انجمن میں ایک جلسہ بھی
تھا۔ خیر ہم سب عصر کے وقت دعوتوں میں چلے۔ میرا ارادہ نہ تھا مگر مولانا نے
کہا جلسہ میں چلو تو میں بھی ساتھ ہو گئی۔ اب باہر نکلنے پر سب لوگ جلسے میں
چلے گئے اور مجھے نہ لے گئے کہ یہاں عورتوں کے جانے کا قاعدہ نہیں۔ آپ زنانے
میں تشریف لے چلیے وہیں دعوت تھی۔ معلوم نہ تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ کہا جائے
اجنبی کی طرح بیٹھی رہوں گی۔ دعوت کا حال بھی معلوم نہ تھا کہ میری بھی ہے اور
نہیں ہے۔ اندر گئی وہاں ان کی بیوی اور دو لڑکیاں تھیں ایک انیسہ کے برابر
ایک دو مہینہ کی۔ انعام سے بڑی موٹی تازی بڑھیا خادمہ بھی تھی۔ یہ لوگ بریلی
کے باشندے ہیں۔ میاں بھی ان کے انجمن کے ممبر یا شاید سیکرٹری ہیں۔ ان کی
بیوی کو بھی میں نے سینما میں دیکھا تھا۔ بات چیت مختصر ہوئی تھی۔ یہاں عصر سے
عشاء تک بیٹھنا پڑا۔ خود بیچاری دعوت کے انتظام میں تھیں۔ ذرا ذرا دیر آکر
بیٹھتیں اور چلی جاتی تھیں۔ کمرہ میں تنہا میں اور ایک چھوٹی لڑکی جس کو یہاں
کے دستور کے مطابق جس طرح تم نے مدینے میں مولانا عبدالباقی صاحب کے
یہاں بچے کو لپٹا کسا دیکھا۔ اسی طرح وہ بھی بندھی ہوئی لیٹی تھی۔ لمبی لمبی علیحدہ
جھولے میں لکڑی کا پالنا پڑا سا اس میں گدے تکیے رضائی و کمبل اوڑھے سو رہی
تھی۔ پیشاب پاخانے کے وقت اس کا لنگوٹ کھول کر صاف کرتے ہیں اور پھر
لپیٹ کر کس کر باندھ دیتے ہیں۔ دودھ سب کے سامنے گریبان سے نکال کر

بچے کو پلایا اور لٹال دیا۔ بچہ مردہ سا لیٹا پڑا رہتا ہے۔ یہاں یہی دستور ہے کہ پیدا ہوتے ہی بچے کو نہلا دھلا کر خوب گرم گرم کپڑوں سے جکڑ کر بند کر کے بالکل الگ جھولے یا کھٹولے میں سلاتے ہیں۔ ماں بچے کو اپنے پاس کسی وقت بھی نہیں سلاتی بلکہ بالکل الگ پڑا ہے۔ اور ماں آزادی کے ساتھ دوسرے پلنگ پر رہتی ہے۔ صرف دودھ پلایا اور پیشاب و پاخانے کی خبر لے لی۔ یہاں کے بچوں کی عادت ہو جاتی ہے۔ میرے سامنے ماں آئیں اور لڑکی کا لنگوٹ بدلا۔ پیشاب کرایا اور پیار کیا مگر ذرا دیر کے بعد وہ رونے لگی میں نے بہت چمکارا ماں کام سے چلی گئی تھیں۔ ماں آئیں اس کو پھر بڑے رومال میں لپیٹ لپیٹ ہاتھ پاؤں کر کے باندھ کر ڈال دیا۔ چپ ہو گئی۔ ٹک ٹک دیکھتی رہی اور کچھ دیر کے بعد سو گئی۔ ماں باتیں کرتی رہی۔ اچھے اخلاق کے لوگ ہیں۔ پندرہ بیس آدمیوں کی دعوت تھی۔ مغرب کی نماز پڑھی۔ عشاء کی نماز کے بعد مولانا جلسے سے آئے تو کھانا کھلایا گیا۔ کھانے میں۔ پلاؤ میں بجائے گوشت کے بکثرت کشمکش پڑی ہوئی تھی۔ علاوہ بریں قیمہ۔ گوشت، آلو، بڑے بڑے ٹکڑے گوشت کے تلے ہوئے۔ اچار وغیرہ۔ آخر میں فیرنی جو بہت عمدہ تھی۔ بعد کو سنترے وغیرہ چائے کا بھی سلسلہ رہا۔ اس کے بعد سب واپس آئے۔ کل بھی کونسلیٹ میں پاسپورٹ کا تصفیہ نہ ہو سکا ورنہ کل منگل کو روانہ ہو جاتے۔ سامان بالکل بندھا تھا۔ رات کو سامان کھول دیا گیا۔ اس وقت سب کے بستر لگائے گئے۔ آج صبح سے تماشا ہو رہا ہے کہ پاسپورٹوں کا قصہ ختم ہونے پر بعد ظہر چل دیں گے۔ آج پھر بستر باندھے گئے اور مولانا تسلیم احمد، منور صاحب ناشتہ کر کے کونسلیٹ روانہ ہو گئے۔ دیکھئے کیا خبر لاتے ہیں۔ اسی وقت آلو کا بھرتہ اور نمک مرچ کے برابر بالائی وغیرہ منگواتے رہتے ہیں۔ یہاں سردی بہت ہے۔ بدلی رہتی ہے۔ دھوپ بھی نکل آتی ہے۔ سب سے پہلے دن بازار سے ہم نے رضوان کے چیچر کے ساتھ ایک عراقی ٹوپی بھی لی۔ ایک احسان ایک ندیم ایک ناصر ایک شمع کے لئے بھی یہاں کی یادگار کے طور پر خریدی تو تو آنے ملی ہیں۔ انیس نفیسہ کے لئے انشاء اللہ واپسی میں یا مدینے سے کچھ لیں گے ہر وقت یہاں سامنے حضرت غوث پاک کا گنبد نیلے رنگ کا نظر آتا ہے۔ اس پر

پچی کاری۔ پتھروں کی رنگ برنگی پھول پتیاں بنی ہوئی ہیں۔ مسجد سے ملا ہوا ایک بہت بڑا ہال ہے۔ اس کے اندر لکڑی کے منقش دروازے لگے ہوئے ہیں۔ جن میں پیتل کے قفل پڑے رہتے ہیں۔ نماز فجر کے بعد نقیب الاشرف جو بہت ضعیف ہیں ان کے بجائے ایک صاحب (جو انہیں کے کوئی ہوتے ہیں) آتے ہیں اور باہر کے قفل کچھ پڑھتے ہوئے کھولتے ہیں۔ اور زائرین اندر جاتے ہیں۔ دروازہ کھلنے تک سامنے سڑک تک مزار شریف نظر آتا ہے۔ اندر چاروں طرف چاندی کی موٹی موٹی جالی ہے۔ قد آدم بلند اوپر سے بھی ڈھالو جالی کی چھت اونچی سی ہے اس کے اندر بہت بڑا صندوق یا ضریح ہے۔ جس پر ہر طرف نہایت موٹے موٹے کارچوبی کے غلاف پڑے ہیں۔ غلاف پر کتبے، کلمے۔ بسم اللہ، اور آیتوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ پھول پتیاں، سرخ سبز مخمل پر نہایت دلکش بنی ہوئی ہیں۔ ہم سب جالی کو چومتے دعائیں مانگتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں۔ طواف بھی کر لیتے ہیں۔ فجر کے علاوہ ظہر اور عصر کے وقت بھی روضۂ مبارک کا دروازہ اسی طرح کھلتا ہے۔ احاطہ خانقاہ کے بیچ میں بہت بڑا مینار ہے۔ اس پر دو گھڑیاں اور بڑے بڑے گھنٹے اوپر لٹک رہے ہیں، جو ہر وقت خوب بجتے رہتے ہیں۔ عرب کی طرح یہاں بھی وقت کا شمار غروب آفتاب سے ہوتا ہے مثلاً عشاء کی نماز دو بجے۔ فجر کی نماز دس بجے اور پھر اس کے بعد ظہر کی پگڑی باندھتے ہیں خصوصاً باب الشیخ کے لوگ جو بغداد کا ایک محلہ ہے جیسے لکھنؤ میں فرنگی محل۔ اس محلہ میں حضرت غوث پاک کا مزار ہے۔ دوسرے محلوں میں شیعہ بھی ہیں اور شاید سنیوں سے زیادہ نجف، کربلا اور کاظمین میں تو شیعہ ہی شیعہ تھے۔ یہاں عیسائی اور یہودی بھی ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم عورتوں کے پہننے کے لباس میں صرف اسی قدر فرق ہے کہ مسلمان لڑکیاں برہنہ سر اور ٹیڑھی مانگ نکالے فراک گون موزے پہنے پنڈلیاں کھلی نظر آتی ہیں۔ یہودی اور نصرانی عورتیں بھی بالکل اسی طرح رہتی ہیں۔ بس ورنہ صورت شکل اور کسی بات میں فرق نہیں

از مدینہ طیبہ مکان عبد الباقی صاحب
یوم شنبہ ۲ ذی الحجہ مطابق ۲۵ فروری ۱۹۳۶ء

عزیزہ سلمہا۔ آج دوسرے ہفتے لکھنے کی نوبت آئی۔ فرصت

ہی نہیں ملی۔ کربلا، نجف اشرف، مدینہ آنے کی کشمکش رہی۔ کوشش کرتے کرتے آخر کار مولانا کو سو سو روپے نہیں جمع کرانا پڑے پاسپورٹ بھی نیا نہیں بنوانا پڑا اور دس دس روپیہ پاسپورٹ کے بھی۔ میرے رضوان، مولانا منور رضا، اور امیر اللہ کے نہیں دینا پڑے۔ البتہ تسلیم احمد کو سو روپیہ ضمانت کے بھی جمع کرنا پڑے۔ اور پاسپورٹ بھی نیا لینا پڑا۔ اس لئے کہ ان کے پاس ہم لوگوں کی طرح کا حجازی پلگرس پاس نہ تھا۔ بلکہ پکا پاسپورٹ تھا جو انہوں نے کئی سال قبل سائیکل پر حج کرنے کے وقت لیا تھا۔ خیر ہم لوگ ۲۳ فروری کو دوپہر کے وقت بغداد سے روانہ نجف ہوئے۔ کربلا راستہ ہی میں ہے۔ مغرب سے قبل اسی دن وہاں اترے اور رات بھر قیام کیا۔ کربلا میں ایک بھی سنی نہیں ہے۔ تمام شیعہ ہی شیعہ ہیں۔ لکھنؤ کے امام باڑے کا سا نقشہ ہے۔ مثلاً بجلی شیشوں سے بہت بڑی عمارت جگمگا رہی تھی۔ بیچ میں حضرت امام حسینؓ کا مزار شریف ہے۔ چاندی کی جالیاں۔ اندر فریم صندوق نما اسی کے بغل میں علیحدہ علیحدہ حضرت علی اکبر کا مزار اور حضرت علی اصغر کی چھوٹی سی قبر ہے۔ سلام مجاور نے پڑھایا۔ وہاں سے نکلے۔ علیحدہ کچھ فاصلے پر حضرت عباس علمبردار کا مزار نہایت روشن اسی طرح سے جگمگا رہا تھا۔ وہاں بھی فاتحہ پڑھا۔ حضرت امام ہی کے روضہ کے اندر ایک جگہ کونے میں قتل گاہ بھی ہے۔ قبر کی طرح، نیچے گڑھا۔ اوپر سے جالی لگی زمین دوز لکڑی کا تختہ بند تھا کھول کر دکھایا۔ طبیعت بے قابو ہوگئی۔ فاتحہ ہر جگہ پڑھا۔ واپس بازار ہوتے ہوئے آئے۔ بازار اچھا ہے۔ بغداد کے نمونے کا اوپر سے پٹا ہوا دوکانیں کپڑے کے بساط خانے کی اور سب چیزوں کی ہیں۔

چنانچہ وہاں سے ہم نے تین جوڑے موتی کی چوڑیاں خریدیں۔ نعیمہ نفیسہ اور انیسہ کے لئے سجدہ گاہ بھی ایک درجن شیعہ حضرات کے دینے کے لئے کچھ استعمال شدہ سجدہ گاہ کربلا سے حاصل کر لئے۔ خاک شفا کی ۲۰ تسبیحیں بھی خریدیں۔ راستہ میں ایک جگہ دودھ خوب گرم تھا۔ ہم سب لوگوں نے گرم گرم نانیں اور کباب سیخ کے لے کر کھائے۔ مزے کے تھے اور دودھ

دو دو پیسے کا بہت سا عمدہ لے کر پیا۔ چائے بھی پی اور قیام گاہ پر آکر سو گئے۔ مغرب کی نماز کربلا میں ایک جگہ چٹائی پر پڑھی۔ شیعہ حضرات ہم سب کو تعجب سے دیکھتے رہے۔ حرم کربلا کے اندر حضرت قاسم کا بھی مزار ہے۔ دیگر شہداء کے بھی مزار ہیں۔ گنج شہیداں وہاں سے ذرا دور ہے۔ راستہ میں کربلا پہونچنے سے ذرا پہلے پسران حضرت مسلم بن عقیل کے مزار ہیں۔ ان پر بھی فاتحہ پڑھا۔ کچھ دور پر حضرت عون و حضرت محمد صاحبزدگان حضرت جعفر طیار کے مزاروں پر بھی فاتحہ پڑھا۔ عجب قسم کی طبیعت میں افسردگی پیدا ہوئی۔ حرم میں ہر وقت شیعوں کا بڑا ہجوم رہتا ہے اور عورتوں کے رونے دھونے کی چیخ و پکار بھی رہتی ہے۔ بہر حال صبح کو اسی موٹر میں نجف اشرف روانہ ہوئے۔ ڈرائیور کی خاص موٹر تھی۔ اس کی بیوی اور تین چار بچے بھی نجف تک ساتھ آرہے تھے اس لئے وہ موٹر بہت اچھی طرح لایا۔ کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔ ریگستانی راستہ ہے۔ پختہ سڑک تو نہ تھی مگر راہ ہموار تھی۔ چار گھنٹہ میں نجف پہونچ گئے کئی میل دور سے سونے کا قبہ اور لمبے لمبے ستون سونے کے نظر آنے لگے۔ ذرا دیر میں پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے ایک مکان میں اتارا۔ یہاں بھی ایک سُنی نہیں ہے کل شیعہ۔ مکانات رہنے کے لئے اور مسافروں کے ٹھہرنے کے لئے سب شیعہ حضرات کے تھے۔ ایک صاحب عبداللطیف نامی سُنی مشہور تھے۔ انہی کے مکان پر ہم کو اتارا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی سُنی بنے ہوئے تھے واللہ اعلم ہم کو اس بارے میں کچھ زیادہ تحقیق و تفتیش کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس مکان میں ہم کو بڑا آرام ملا۔ بڑے بڑے علیحدہ کمرے۔ پاخانے، پانی۔ روشنی کا انتظام اچھا کٹنے کی طرح۔ یہ لوگ بھی ایک وقت دعوت کرتے ہیں۔ چنانچہ رات کو سالن روٹی وغیرہ لائے۔ لمپ۔ لالٹین سب موجود۔ گدے تک عرب کی طرح لگے ہوئے جو فرسٹ کلاس کے لئے ہوتے ہیں۔ جمعہ کو نجف میں رہے۔ مگر یہاں ایک مسجد بھی ایسی نہیں جس میں کوئی سُنی مسلمان نماز جمعہ پڑھ سکے۔ ایک مسجد ہے بھی تو اس میں قفل پڑا بند رہتی ہے۔ حرم میں کسی وقت بھی شیعوں کے علاوہ اور کوئی نہیں پڑھ سکتا کہ جگہ ہی نہیں ملتی۔ ہم سب اپنی جائے قیام ہی پر نماز پڑھتے تھے۔

نجف میں نماز جمعہ کے لئے کسی مسجد کا نہ ہونا بڑے افسوس کی بات ہے منور رضا تو ہر وقت وہاں اپنی نمازیں پڑھ آتے تھے۔ ہم لوگ صبح کو نماز پڑھنے کے بعد حاضر حرم ہوئے اور فاتحہ پڑھ کر چلے آئے۔ یہاں کا خزانہ بھی بہت بڑا مشہور ہے ہیرے جواہرات کے ڈھیر کئی دن تک تولے گئے مگر ذخیرہ کم نہ ہوا اور پورے خزانہ کا اندازہ نہ ہو سکا۔ آخر کار اسی طرح بند کر دیا گیا۔ کربلا کی طرح یہاں بھی ہر وقت نالہ و شیون کا ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ شیعہ حضرات کا ہجوم بکثرت نمازوں اور دعاؤں میں مصروف عورتیں سب کالے برقعوں میں بے تکلف طواف کرتی اور روتی چلاتی رہتی ہیں۔ کربلا کی طرح یہاں کی جالیوں میں بھی تمام تاگے، چھلے باندھے نظر آتے ہیں، بجلی کی روشنی بکثرت، جھاڑ، فانوس بے حساب، یہاں کربلا سے بھی زیادہ نادر شاہ نے تمام عمارت سونے چاندی کی بنوائی ہے۔ دروازے پر ایک موٹی موٹی سونے کی لمبی زنجیر بھی لٹک رہی ہے۔ اس کو بھی پکڑ کر لوگ بوسہ دیتے ہیں اور اور جالی سے لپٹ کر مرد عورتیں سب روتے رہتے ہیں۔ یہاں سے نکل کے باہر بہت بڑا قبرستان ہے۔ بہت پرانا جس میں تمام شہدا صحابہ، سادات اور علما کی قبریں ہیں پرانی پرانی، اسے وادی اسلام کہتے ہیں، حضرت ہود اور حضرت صالح علیہ السلام پیغمبروں کے مزار ہیں۔ ان پر فاتحہ پڑھ کر واپس آ گئے۔ کھانے پینے اور دیگر ضروریات سے فرصت کر کے اب یہاں سے مدینہ جانے کے لئے موٹروں اور لاریوں کے ٹکٹوں کا جھگڑا نکلا۔ رضوان کے ٹکٹ کے لئے بغداد میں پوچھا گیا تو کہا کہ یہاں آدھا ٹکٹ نہیں ملتا۔ نجف میں ملے گا۔ اس لئے کہ موٹر کمپنی کا صدر دفتر نجف میں ہے۔ لیکن اب یہاں اس کا پورا ٹکٹ مانگتے ہیں۔ رضوان کے سوا باقی سب لوگوں نے نجف سے مدینہ تک کا ٹکٹ آمد و رفت ۱۰۰ دینار فی ٹکٹ کے حساب سے بغداد ہی کے دفتر سے خرید لیا تھا مگر یہاں آ کر ایک بڑی دقت پیش آئی۔ وہ یہ کہ ہمارے ٹکٹوں میں بغداد کے دفتر موٹر کمپنی نے پانچواں قافلہ درج کر دیا تھا۔ اس لئے خیال تھا کہ ۱۵ فروری بروز شنبہ مدینہ روانہ ہو جائیں گے۔ مگر نجف کے دفتر والوں نے ایک حیلہ یہ پیدا کیا کہ موٹروں کا قافلہ علیحدہ اور لاریوں کا علیحدہ نمبر وار روانہ ہو گا۔ اور سنیچر کے دن صرف چار نشستوں والی موٹروں

یا آٹھ نشستوں والی ٹیکسیوں کا قافلہ جائے گا اور وہ قافلہ چہارم قرار پائے گا
اور لاریوں کا قافلہ پنجم۔ چھ دن کے بعد روانہ ہو گا اور وہ ایسے تنگ وقت
میں مدینہ پہونچے گا کہ حج کے لئے وہاں سے فوراً بغیر رکے جانا ہو گا۔ اگر جلد
جانا ہے تو موٹر کے فی کس ۸۰ دینار یا ٹیکسی کے فی کس ۳۰ دینار کے حساب سے
نئے ٹکٹ لو یا لاریوں کے ٹکٹ ۴۰ یا ۴۰ دینار اور دیکر بدلواؤ ورنہ پڑے رہو
چنانچہ دلی والوں نے جنہیں جانے کی عجلت تھی چار چار دینار زیادہ دے کر
ٹکٹ بدلوائے۔ اب مولانا پریشان کہ اتنا روپیہ کہاں آئے کہ رضوان کا ٹکٹ
پورا لیا جائے اور اس کے لئے ۴۰ دینار خرچ کئے جائیں۔ اور تسلیم احمد بھی
گویا مولانا کے ہی ساتھ ہیں۔ ان کا، مولانا کا اور میرا یہ تین ٹکٹ لاری کے
فی ٹکٹ چار دینار کے حساب سے زیادہ دے کر ٹیکسی کے بنوائے جائیں۔ خیر
خدا خدا کر کے خدا کے فضل و کرم سے رضوان کا ٹکٹ آدھا ہوا اور بجائے سنیچر کے
اتوار کو جانا طے ہوا۔ قافلہ موٹروں اور گاڑیوں دونوں کا قرار پایا۔ موٹریں دس
۵ آگے رہیں گی اور لاریاں پیچھے ہوں گی۔ اطمینان ہوا تب اس کے بعد رائے
ہوئی کہ کوفے جانا بھی ضروری ہے۔ نجف سے کوفے ٹرام میں چلے اور دو گھنٹہ
میں پہونچ گئے۔ ۱۰، ۱۲ میل ہے کوفے کی آبادی ایک قصبے کی سی ہے۔ معمولی مکانات
اور گلیاں۔ بازار بھی ویسا ہی پٹا ہے۔ ضرورت کی سب چیزیں موجود ہیں یہاں کے
بنے ہوئے جوتوں کی دکانیں بغداد، نجف، کربلا، ہر جگہ بکثرت ہیں۔ بہر حال اترے
منور صاحب جن کے مکان میں ٹھہرے تھے۔ نجف سے ساتھ آئے تھے۔ جامع
مسجد کوفہ کے اندر لے گئے۔ بڑا وسیع احاطہ ہے۔ اس کے اندر جگہ ۸،۱۰ بڑے
بڑے پتھر کے محراب اور چبوترے بنے ہوئے ہیں۔ سب کے نام بتائے۔ سب پر
فاتحہ پڑھتے چلے۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چبوترہ۔ پھر حضرت نوح کی
وہ طوفانی جگہ جہاں سب سے پہلے طوفان شروع ہوا اور دنیا غرق ہو گئی۔ یہ ایسا
گول حلقہ بنا ہے۔ نیچے گہرائی ہے۔ اس کے بعد امام زین العابدین، امام حسین
حضرت جبرئیل، حضرت آدم، حضرت نوح اور کئی پیغمبروں کے حلقے تھے جن کے نام
اس وقت یاد نہیں آتے۔ اس کے بعد مسجد کے اندر بھی ایک چبوترہ بنا ہوا اور

ایک در ہے پتلا سا جس میں لکڑی کا دروازہ لگا ہے۔ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت گاہ ہے۔ اسی مقام پر ابن ملجم شقی نے حضرت علیؓ کو بحالت نماز زہر آلود خنجر سے زخمی کیا تھا۔ ہم سب نے بھی وہاں دو رکعت نماز پڑھی دوسرے دروازے سے باہر نکل کر کچھ دور پر حضرت مسلم کا روضہ ہے ذرا اور آگے چل کر چھوٹی جالی کے اندر حضرت علی کی صاحبزادی یا کسی اور کا مزار تھا۔ پھر اور آگے چل کر سامنے حضرت ہانی کا مزار ملا۔ اس پر بھی فاتحہ پڑھ کر اپنی جائے قیام پر شام تک واپس آ گئے اور اتوار کو صبح چلنے کی تیاری ہونے لگی۔ بازار سے آلو بہت سے لائے گئے۔ دو روپیہ کی روٹیاں بھی آئیں۔ پتلی پتلی دو دو پیسہ نان ملتا ہے۔ بالائی دو روپیہ کے قریب آئی۔ بہر حال رات بھر سامان سفر ہوتا رہا۔ صبح کو لاری جو خوب عمدہ تھی۔ نئی مضبوط، ۴۴ سیٹوں والی ۱۲ آدمیوں کے بیٹھنے کے لئے طے ہوئی مگر سوئے اتفاق سے کہ بیچ کی سیٹ جو میں چاہتی تھی۔ وہ مولانا وغیرہ کی غفلت سے نہ ملی۔ پہلے سے عراقی چار عورتیں دو مرد آگے بیٹھ گئے۔ میں حرم میں فاتحہ پڑھنے چلی گئی تھی۔ وہاں سے تسلیم احمد ساتھ تھے۔ وہ بازار میں روٹیاں لینے لگے۔ اس میں دیر ہو گئی ورنہ میں جلد جا کے قبضہ کر لیتی۔ خیر پیچھے کی سیٹوں پر ہم ساڑھے چھ آدمی بیٹھے۔ سب سامان اوپر بندھوایا۔ اور فضول سامان بغداد ہی میں چھوڑ آئے تھے مگر پلنگ کوئٹہ کا پورا ایک بڑا بنڈل کرسیاں وغیرہ۔ دہلی والوں کو بھی ہماری ہی وجہ سے لاری ہی میں جگہ مل گئی انہوں نے جلدی جلدی روانہ ہونے کے لئے مجبوراً لاری کی بجائے موٹر کر لی تھی اور ۴۰،۴۰ دینار زیادہ جمع کر دیئے تھے۔ اب انہوں نے بھی دوڑ دھوپ کر کے اپنے دینار واپس لئے۔ مگر ان کی لاری بہت خراب ملی تھی۔ بے سیٹوں کی سپاٹ۔ نماز ظہر کے بعد باقی حال لکھوں گی۔ وضو کر کے حرم جا رہی ہوں۔

سفر نامہ بجانسی:۔ مولانا نے لکھا ہے کہ بیگم صاحبہ اپنا سفر نامہ یہاں تک ہی قلمبند کر پائی تھیں کہ ان کی صحت نے جواب دے دیا اور اس ضمن میں مزید خط خط نہ لکھ سکیں۔ البتہ مولانا نے ان الفاظ میں اس سفر نامہ کو مکمل کیا۔ "یہاں تک

لکھنے کے بعد مدینہ منورہ ہی میں بیگم حسرت کی طبیعت بہت علیل ہو گئی اور وہ خط نامکمل رہ گیا۔ مدینہ سے مکہ تک کا سفرِ حج اور اس کے بعد پھر مدینہ ہو کر ہندوستان تک واپسی کا بقیہ حال میں اپنے روزنامچہ کی مدد سے بالاجمال درج کئے دیتا ہوں کہ خدا خدا کرکے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد صالح آفندی قائم مقام حاکم نجف سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے سب حال سن کر کمپنی والوں کو بلوایا اور حکم دیا کہ کل ہی والے قافلے میں بھجواؤ اور رضوان کو بھی آدھا ٹکٹ پانچ دینار میں دو۔ چنانچہ ہم لوگ ۱۰ فروری ۱۹۳۶ء کو لاری میں نجف سے روانہ ہو کر ۵ دن میں مدینہ بخیریت پہنچ گئے اور وہاں سے ۲۷ فروری ۱۹۳۶ء کو بغرض حج مکہ روانہ ہوئے۔ نجف سے مدینہ تک عراقی لاریوں میں بڑے آرام سے سفر طے ہوا۔ عراقی لاریاں گدے دار بہت اچھی ہوتی ہیں اور ان کے شوفر بھی نسبتاً نیک اور خوش خلق ہوتے ہیں۔ ہم نے شیخ عبداللہ سلیمان وزیر مالیہ حجاز سے تار دے کر مدینہ سے مکے تک اس عراقی لاری سے جانے کی اجازت منگائی تھی۔ ورنہ اگر یہ قاعدہ مقرر حجازی لاریوں میں جانا ہوتا جس کو لاری کے بجائے چھکڑا کہنا زیادہ صحیح ہو گا تو بیگم حسرت کا حج زیادہ دشوار ہو جاتا۔ ۲۹ فروری ۱۹۳۶ء مطابق ۷ ذی الحجہ کو مکہ پہنچے اور حج کے لئے عرفات تک اسی عراقی لاری میں ہی جانا آنا ہوا۔ فریضہ حج ادا کرکے ۴ مارچ ۱۹۳۶ء سے ۱۰ مارچ ۱۹۳۶ء تک مکہ میں قیام رہا۔ مکے سے ۱۰ مارچ کو روانہ ہو کر ۱۱ مارچ کو مدینہ پہنچ گئے اور وہاں ۲۱ مارچ تک قیام کیا۔ ۲۵ مارچ کو واپس نجف پہنچے اور ۲ محرم کو کربلا میں دوبارہ حاضری دے کر ۴ محرم کو بغداد شریف پہنچے اور اسی دن شام کو بذریعہ ریل بصرہ روانہ ہو گئے۔ ۲۸ مارچ ۱۹۳۶ء مطابق ۴ محرم کو میل میں روانہ ہو کر ۲ اپریل کو کراچی اور ۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو کانپور واپس پہنچ گئے۔ قیام مدینہ، سفرِ حج اور واپسی سفر ہندوستان کے حالات بھی بہت ضروری اور دلچسپ ہیں لیکن افسوس کہ مدینہ سے بیگم حسرت کی طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ پھر ان کو لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ البتہ سال گذشتہ یعنی ۱۹۳۵ء کے سفرِ حج کا پورا حال ان کے سفرنامہ حجاز میں موجود ہے جو علیحدہ کتاب کی شکل میں شائع ہو گا۔ (لیکن افسوس کہ یہ بھی نہ ہو سکا۔ اور سفرنامہ عراق یہیں پر ختم ہوا۔

مکتوبِ مولانا محمد علی بنام مولانا حسرت موہانی

چھنڈواڑہ

۲۶ اپریل ۱۹۱۶ء

برادرِ واجب الاحترام!

السلام علیکم، ۸ اپریل کے محبت نامہ کا جواب آج دیتا ہوں اور محجوب ہوں کہ اس تاخیر کا باعث سوائے اس کے کچھ بیان نہیں کر سکتا کہ اس عرصہ میں برابر غم و غصہ کا شکار رہا۔ میں تو بڑے بڑے معاملات میں آج کے عارضی فیصلوں کا قائل نہیں اور ان تمام ہنگاموں کو "شر رخس سے زیادہ نہیں سمجھتا"۔ ۸ اپریل کے فیصلہ پر کیا "بندۂ دام فریب ہوں گا" مگر دوستوں کی موت اس زمانہ میں بھی جب کہ موت کا بازار گرم ہے۔ دو چار آنسو بطورِ خراج کے وصول کر ہی لیتی ہے اور ۸ اپریل کو میرے چند عزیز ترین دوست تذراجل ہو گئے۔ اس لئے میرا غم و غصہ بے جا نہیں۔ مگر موت جسمانی نہیں۔ اس لئے کہ میں تو اس کا قائل ہی نہیں ہوں۔ بہت سے مُردوں کو جن کی ہڈیوں کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ "علی احیاء" میں شامل کرتا ہوں۔ مگر ان جیتی جاگتی کٹھ پتلیوں کو جو قومی اسٹیج پر نچائی جاتی ہیں اور نچائی جا رہی ہیں مُردوں سے بدتر سمجھتا ہوں کیونکہ موت ان کے جسموں کو نہیں آئی، بلکہ ان کی رُوحوں کو۔ تم تو پہلے ہی کہہ چکے ہو کہ؎

محروم ہوں، مجبور ہوں بے تاب و تواں ہوں
مخصوص ترے غم کا مزا میرے لئے ہے

مگر جس چیز کا صحیح معنوں میں اجارہ تم کو اس دربار سے مل گیا ہو، اس میں شرکت کے دعویٰ کی مجھ سے جرأت نہیں ہو سکتی۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ میں بھی کسی قدر محروم و مجبور ہوں۔ اس پر بھی میں نے انصاری کو راہِ راست پر استقامت کی جس طرح مجھ سے ہو سکا، ترغیب دی اور امید کی کہ میری اس دعا کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا کہ "ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا" میرا خط (جو ان کو بھیجا گیا تھا) کوئی معمولی تحریر نہ تھی۔ اس میں فگارِ دل کے متعدد ٹکڑے منسلک تھے۔ مگر برادرم! آخرش یہی معلوم ہوا کہ جس دنیا میں ہم لوگ رہتے ہیں وہ اس دنیا

سے بہت مختلف ہے جہاں ہمارے عزیز بس رہے ہیں۔ ہمارے تمام خیالات تمام اندازے، تمام تخمینے فضول اور غیر متعلق ہیں۔ میں نے غالب کے ایک مصرع پر جو غزل لکھی تھی اس میں ایک شعر تھا۔ ؎

تقوے کے بعد خوف کہاں حسرتیں پھر کہاں
عالم ہی اک جدا ہے وہ رنج و محن کہاں

تقوے کا دعویٰ کرتے بھی ڈر لگتا ہے اور یہ سب جھوٹا فخر ہوگا اگر میں کہوں کہ میں متقی اور خدا ترس ہوں۔ مگر باوجود بار بار اشتباہ اور کم از کم چھوٹی موٹی تکلیفوں کے اب تک اس وعدۂ الٰہی کو سچا جان رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ وہ پورا بھی ہو رہا ہے کہ "سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب" اس لئے باوجود فاسق و فاجر اور بندۂ حرص و ہوا ہونے کے اپنے دیرینہ احباب کی دنیا سے ایک الگ دنیا میں پاتا ہوں اور گو اس دنیا کو اس پرانی دنیا سے بدرجہا بہتر جگہ پاتا ہوں اور خوش ہوں کہ اس کی سرحد میں داخل ہو رہا ہوں۔ تاہم پرانے تعلقات دامن گیر ہوتے ہیں اور گو خود پیچھا چھڑا لیتا ہوں۔ تاہم دامن کے ٹکڑے اس خارستان گلستان منظر میں ٹنگے رہ جاتے ہیں جن کے لئے آنسوؤں کا ایک چھوٹا موٹا قافلہ رواں ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ اصرار سے زیادہ ہمت والے نہ نکلے۔ اب انہی کی نہیں بلکہ خود حریت کی جگ ہنسائی ہو رہی ہے۔ مگر اس کا زیادہ رنج نہیں۔ رنج پرانے دوستوں کی رفاقت چھوٹنے کا ہے۔ غالب نے سچ لکھا تھا کہ ؎

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

مگر اچھا ہوا یہ جھوٹا سہارا بھی گیا۔ اب ایک سہارا باقی ہے اور وہ ہمیشہ کافی تھا اور اب بھی ہے۔ غالب کی غزل کا ایک شعر پچھلے کئی برسوں سے دل میں کھب چکا ہے

چاک مت کر جیب بے فصل گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے

اس پر ایک نامکمل غزل قافیہ کو محدود کر کے میں نے بھی لکھی تھی۔ جس کا ایک شعر ہے۔

ایک ہی در کا بھکاری ہوں مجھے
اک فقط تیرا سہارا چاہیئے

گو لکھنے کو تو لکھ گیا۔ خود اب جا کر کہیں اس کا مفہوم سمجھا ہوں اور پھر سورۂ یوسفؑ پڑھتا ہوں تو اس آیۂ کریمہ کا مطلب اب سمجھ میں آتا ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فرعون کے جام بردار سے اس کی رہائی کے وقت کہا تھا کہ کبھی ہمارا بھی ذکر اپنے آقا سے کر دینا کہ مفت ظلم ہوتا ہے اور وہ بھول گیا اور اس طرح چند سال اور حضرت یوسفؑ مبتلائے زنداں رہے۔ جب ایسے برگزیدہ پیغمبر کے لئے بھی فرعونوں کی یاد دہانی داخل شرک نہیں تو کم از کم مذموم سمجھی گئی اور اس وحدہٗ لاشریک کو اس میں بھی استعانت غیر اللہ کا شائبہ معلوم ہوا تو پھر ہمارے تمام تعلقات تو شرک جلی ٹھہرے۔ اقامت الصلوٰۃ میرا ایمان اجماع امت پر میرا اعتماد۔ تاہم بعض اوقات اس تنگ و تاریک بُت کدہ میں عبادت اپنی نجات کے لئے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے جہاں ایک وقت میں ایک ہی عبادت کرنے والا اپنے معبود کے حضور میں کھڑا ہو کر اپنی بندگی کا اظہار کر سکتا ہے۔ خوف ہوتا ہے کہ کہیں اپنے مذہب کی وسیع و فراخ مساجد میں نماز کے ساتھی اور خود امام بھی مجھے کفر و شرک کی طرف نہ گھسیٹ لے جائیں اور دوسروں کی اصلاح تو گئی خود اپنی نجات سے مایوس ہونا پڑے۔ سب کچھ ہو ہوا کر اب یہی رہ گیا ہے کہ اپنی جان بچانے کی کوشش کروں اور مدرسہ کو چھوڑ کر پھر خانقاہ میں اعتکاف کر لوں۔ بجائی دعا کرو کہ اگر اپنی نجات کے متعلق خوف و ہراس میں کمی ہو تو کم از کم دوسروں کے متعلق یہ بے اعتباری باقی نہ رہے۔ اگر یہی حالت رہی تو کہیں کا نہ رہا۔ البتہ جب تمہارا خیال آتا ہے اور تم سے بھی زیادہ بہن کا جو نہ تمہارے ناموس کو بلکہ ہم سب کے ناموس کو اس طرح ہمت و جرات کے ساتھ سنبھالے ہیں اور صمات و ساکت نہیں بلکہ کلمۂ حق کو باآواز دہل سب کو سنا رہی ہیں تو یہ بے اعتباری دور ہوتی ہے اور جس طرح خدا سے میں مایوس نہیں ہوں اسی طرح اس کے بندوں سے مایوسی بھی قرین کفر معلوم ہوتی ہے مگر یہ لوگ تو اسٹیج کی کٹھ پتلیاں نہیں ہیں وہی غریب اور کمزور لوگ ہیں جن سے اسلام کی ابتدا ہوئی تھی یہ حضرات تو ان کے متعلق بدگمانی بہت پہلے سے تھی چنانچہ میں نے متعدد بار ان "آزادوں" کے مضمون کو

غزلوں میں باندھا۔ مثلاً ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے لئے — میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

یا

ہیں اتنے لاف شوق پہ مرعوب حسن بھی
یہ طائفہ عجیب ہے اک مرد و زن سے دُور
ہے بعد کربلا سے بھی، قبرِ یزید بھی
اور جانتے یہ ہیں کہ نہ ہوں بختن سے دور

یا

دشمنوں سے گر تلطف ہے تو کچھ — دوستوں سے بھی مدارا چاہیئے

(حافظ تلطف کو دوستوں کے لئے اور مدارا کو دشمنوں کے لئے لازمی گردانتے تھے

ہم دوستوں کے لئے مُبادا — یہ سب کچھ لکھ تو دیا ہے اور آج بھی اس طرح

لکھ رہا ہوں کہ گویا ہم ہی ابناء اللہ اور احبار اللہ ہیں۔ مگر برادرم ان حیرت انگیز انقلابوں کو دیکھ کر خوف ہوتا ہے کہ کہیں بڑا بول آگے نہ آئے بنی اسرائیل کا وہ واقعہ یاد آتا ہے جس کا قرآن کریم میں مذکور ہے۔ "خود مسلمانوں نے بعض اوقات اس خیر القرون ہی میں بھی سنّت بنی اسرائیل کی تقلید کی تھی۔ چنانچہ منخزمین اُحد سے کہا گیا تھا کہ "ولقد کنتم تمنون الموت من قبل ان تلقوہ فقد رأیتموہ و انتم تنظرون۔" دُعا کرو کہ یہ حال اپنا بھی نہ ہو۔ بلکہ آخر تک ایمان اور عملِ صالح پر قائم رہیں۔ تمہاری دُعا ضرور مقبول ہوگی اس لئے کہ اوّل تو آلِ رسولؐ، پھر تقلید سنّتِ یوسفی سے مشرف ہو چکے ہو۔ اب چونکہ تم نے مجھے بھی اپنے زمرہ میں جو ابرار اور اخیار کا ہے شامل کر لیا ہے، اور خود لکھ چکے ہو کہ

ع خوش اسی حال میں جو سر بھی ہے آزاد بھی ہے

خیر یہ تو ہوا۔ میں نے لکھا تھا کہ تم پیشن گوئی کرتے ہو کہ جمہور کی خواہش کے خلاف حامیانِ استبداد ایک ذلیل یونیورسٹی قائم کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہونگے ارے بھائی اس میں پیشن گوئی ہی کیا ہے۔ تم تو ان کے متبع ہو جو خوابوں کی صحیح تعبیریں بیان فرمایا کرتے تھے اور اس طرح مجلس سے نکل کر تخت تک پہنچ

گئے۔ میں کہ اس مقام سے بہت دور ہوں یہ تو میں بھی جانتا تھا اور سال گذشتہ ہی میں سب کو جتلا چکا تھا کہ عزیزان من صدمہ یونیورسٹی کا نہیں ہے بلکہ قوم کی بیکسی اور تمہاری خواری وخرابی کا۔ اور رہی یونیورسٹی تو سن لو کہ اسے ہم بنائیں گے ہم نہ تمہارے قوم فروش اور کالج فروش کیونکہ ہم سے کسی نے حتمی وعدہ کر لیا ہے۔ اور وہ وعدہ کا سب سے پکا بھی ہے کہ "ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنون" اگر خوف ہے تو اس شرط کا کہ "ان کنتم مومنون" سو خدا سے دعا ہے کہ ہم کو ایمان پر قائم رکھے اور ان بزرگوں کی تقلید کی توفیق عطا فرمائے۔ جن کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ "فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما استکانوا واللہ یحب الصابرین" اگر ہم ایمان پر قائم رہے تو پھر سنت اللہ میں تو تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمارا انعام کہیں نہیں گیا ہے۔ وہاں تو ملے ہی گا، مگر بعیانہ یہیں مل جائے گا۔ کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ:

"فاتٰھم اللہ ثواب الدنیا وحسن ثواب الآخرۃ واللہ یحب المحسنین۔"

اس پر میں نے لکھا ہے کہ ؎

انعام کا عقبیٰ کے تو کیا پوچھنا لیکن
دنیا میں بھی ایمان کا صلہ میرے لئے ہے

اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ تمہارے دونوں دیوان پڑھ چکا اور نہایت غور سے پڑھے اور بار بار پڑھے۔ ارتقائے سخن ظاہر ہے۔ اب اگر یہ لکھتا ہوں کہ

ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

تو اس کے صریح معنی یہ ہوئے کہ جو سختیاں الہ آباد، جھانسی، پرتاب گڑھ اور فیض آباد میں جھیلنا پڑیں ان سے زیادہ کا مستدعی ہوں۔ مگر یہ بھی ہو تو جانتا ہوں کہ تم زیادہ کے بھی متحمل ہو گے۔ اس لئے کہ وہ خود کسی نفس پر اس کی سکت سے زیادہ تکلیف کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ اور

ع جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا ملتا ہے

غم واندوہ کے لئے لکھا گیا ہے۔ تم میری غزلیں منگواتے ہو۔ اچھا بھیج دونگا

مگر بھائی تم شاعر تھے، میں شاعر نہ تھا۔ البتہ عنایت ایزدی نے تمہیں تین دیوانوں والا بنا دیا تو اس قسم کی عنایت نے مجھ سے بھی تین چار غزلیں لکھوا دیں پہلے بھی تک بندی کر لیتا تھا مگر کاغذ کے پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی۔ اب کچھ بو باس آنے لگی ہے، سو بقول تمہارے ع

ترے غم کو نہ دے کیونکر دعا دل

اس وقت صرف نظربندی کی پہلی غزل لکھے بھیجتا ہوں۔ بہن کو کل خط لکھوں گا۔ (یہ خط بیگم حسرت موہانی کے نام تھا جو مولانا حسرت موہانی کی ازدواجی زندگی میں شامل کر دیا گیا ہے) تم میری افسردگی کا ذکر کر کے میری طرف سے معافی مانگ لینا ورنہ وہ ناراض ہی رہیں گی کہ جواب کیوں نہ دیا۔

تمہارا مرید با عقیدت

محمد علی

ALL-INDIA MUSLIM LEAGUE

FOURTEENTH SESSION

AHMEDABAD, DECEMBER 30, 1921

The Fourteenth Annual Session of the All-India Muslim League opened at Ahmedabad on December 30, 1921, under the presidency of Moulana Hasrat Mohani, in a specially erected *pandal*. The attendance was large. Mr. Abbas Tayabji, Chairman of the Reception Committee, welcoming the delegates, traced the history of the Muslim League, and concluded that after the great help of the Hindus on the Khilafat question, and after finding that the League and the Congress had the same object in view, he thought the League should cease to be a separate and distinct body.

PRESIDENTIAL ADDRESS OF MAULANA HASRAT MOHANI

After the welcome address, Maulana Hasrat Mohani delivered his presidential address in Urdu, of which the following is the English translation.

Gentlemen, while thanking you for electing me to preside over this session of the All-India Muslim League, I wish to say in all sincerity that the importance of this session of the League, in which the fate of Hindustan is to be decided, required the choice of a person abler than myself, such as Maulana Mohammad Ali, Dr. Kitchlew or Maulana Abul Kalam Azad, to preside over its deliberation; but, unfortunately, the Government has forcibly taken away the first two gentlemen from us. I expressed my inability to accept the responsibility. Consequently, as the proverb goes, "if thou dost not accept it willingly, it will be forced on thee", this great duty was placed on my weak shoulders. I wish to discharge it to the best of my ability. Success is in the hand of God.

The Aims of the League

The present condition of the League appears to be very weak indeed; but this does not in the least derogate from its real importance, for it was the All-India Muslim League which actually realized the first and the most essential condition of Indian independence, Hindu-Muslim unity; and now that it has been achieved, it is the duty of the League to maintain it also. Besides, it is on the platform of the League that all sections of political opinion amongst the Musalmans, extremists or moderates, have so far been, and in future, too, will probably be, brought together. Before going into the causes of the weakness of the League, it will be better to enumerate the aims and objects of the League. These are (1) the attainment of *Swaraj* by the people of India by all peacefull and legitimate means; (2) to protect and advance the political, religious and other rights and interests of the Indian Musalmans; (3) to promote friendship and union between the Musalmans and other communities of India; (4) to maintain and strengthen brotherly relations between the Musalmans of India and those of other countries.

The first of these is also known to be the creed of the Congress. Therefore, so long as the word *Swaraj* is not defined in consonance with Muslim desire, and the means for its attainment are not amplified, it is only natural that Muslim interests in the League should be meagre. The third object, Hindu-Muslim unity, is the common object both of the League and the Congress. The fourth object, the unity of the Muslim world, which has been, along with other questions, connected with the Khilafat, has been specially taken up by the Khilafat Committee. There remains only the second object, that is the protection of the special interests of the Musalmans. As to this, so long as a much greater and more important object, that is, the attainment of *Swaraj* still remains unachieved, people would rather direct their united efforts against the common enemy than look after their special interests. They will be attended to when the time comes for it. As if these causes were not sufficient in themselves to decrease the influence of the League, its rules and regulations were, unfortunately, so framed that, while public opinion has developed at a rapid pace, most members of the League have not moved an inch from their first position. As a result, the League remains nothing more than an old calendar. It is very necessary to remove the causes of the weakness of the League and to remove them immediately; for in proportion as we approach nearer and nearer to the goal of *Swaraj*, the need of the League will be felt more and more, because questions of special Muslim rights will rise again with greater importance when India is free.

Our first duty, therefore, should be to reduce the fee for the membership of the League and thus increase its members, who will choose their League representatives every year. The members to the Council of the

Provincial and the All-India Muslim Leagues should be chosen, as in the case of the Congress, every year.

An Indian Republic or a United States of India

But the most pressing necessity of all is a change in the first object of the League to suit changed Muslim conditions. Everyone of us knows that the word *Swaraj* has been definitely left vague and undefined in the creed of the Congress. The object of it has been that, if the Khilafat and the Punjab wrongs are settled on the lines of our demands, then *Swaraj* within the British Empire will be considered sufficient; otherwise efforts will be directed towards the attainment of complete independence. But, gentlemen, from the Muslim point of view, it is not enough that we should stand for complete independence alone. It is necessary to decide upon the form that it should take; and in my opinion it can only be an Indian Republic or on the lines of a United States of India.

Besides this, the term 'peaceful', which defines and restricts the scope of the legitimate means for the attainment of *Swaraj* in the Congress creed, is opposed to the nature and religious aspirations of the Musalmans. Therefore, in the creed of the League, the words 'possible' and 'proper' should be substituted for the words 'legitimate' and 'peaceful'. I will explain the matter in detail. The Musalmans should understand clearly that they derive a two-fold advantagr from the establishment of an India Republic: firstly, the general benefit which they will undoubtedly share along with their Indian brethren as citizens of a common State; secondly, the special advantage which the Musalmans will derive from it is that, with every decline in the prestige and power of the British Empire, which to-day is the worst enemy of Muslim countries, the Muslim world will get breathing time and opportunity to improve its condition. Gentlemen, in spite of the present Hindu-Muslim unity, many serious misunderstandings and suspicions still exist between these two great communities of Hindustan, and it is of primary importance that we should grasp the true nature of these misunderstandings. The Hindus have a lurking suspicion that given an opportunity, the Musalmans will either invite their co-religionists from outside to invade India or would, at least, help them in case they invaded to plunder and devastate Hindustan. These misunderstandings are so deep-rooted and widespread that, so far as my knowledge goes, no Indian statesman has escaped them, except the late Lokamanya Tilak. On the other hand, the Musalmans suspect that on the achievement of self-government, the Hindus will acquire greater political powers and will use their numerical superiority to crush the Musalmans. Gentleman, it is quite clear that these misunderstandings can only be overcome by a conciliatory discussion and mutual and intimate understanding; and it is an essential condition of this mutual understanding that the third party should not come between them.

Hindus and Muslims

The generality of Musalmans, with few exceptions, are afraid of the numerical superiority of the Hindus, and are absolutely opposed to an ordinary reform scheme as a substitute for complete independence. The primary reason for this is that in a merely reformed, as contrasted with an independent government, they will be under a double suspicion: first, a subjection to the Government of India, which will be common to Hindus and Musalmans; secondly, a rejection by a Hindu majority, which they will have to face in every department of Government. On the other hand, if the danger of the English power is removed, the Musalmans will only have the Hindu majority to fear. Fortunately this fear is such that it will be automatically removed with the establishment of the Indian Republic; for while the Musalmans, as a whole, are in a minority in India, yet nature has provided a compensation in the fact that the Musalmans are not in a minority in all provinces. In some provinces, such as Kashmir, the Punjab, Sind, Bengal and Assam, the Musalmans are more numerous than the Hindus. This Muslim majority will be an assurance that in the United States of India, the Hindu majority in Madras, Bombay and the United Provinces will not be allowed to overstep the limits of moderation against the Musalmans. Similarly, so long as a completely liberated India does not come into the hands of the Hindus and Musalmans themselves, the Hindus will always be suspicious that, in case of a foreign invasion, the Musalmans would aid their co-religionist invaders; but on the establishment of the Indian Republic, which will be shared in common by Musalmans and Hindus, there will be no possibility of such a suspicion, for no Musalman would desire that the power of even a Muslim foreigner should be established over his country.

The Mopla Rebellion

Gentlemen, I have just stated it as a necessary condition of the Hindu-Muslim compromise that the third party, the English, should not be allowed to step in between us. Otherwise, all our affairs will fall into disorder. Its best example is before you in the shape of the Mopla incident. You are probably aware that Hindu India has an open and direct complaint against the Moplas, and an indirect complaint against all of us, that the Moplas are plundering and spoiling their innocent Hindu neighbours; but possibly you are not aware that the Moplas justify their action on the ground that, at such a critical juncture, when they are engaged in a war against the English, their neighbours not only do not help them or observe neutrality, but aid and assist the English in every possible way. They can, no doubt, contend that, while they are fighting a defensive war for the sake of their religion and have left their homes, property and belongings, and taken refuge in hills and jungles, it is unfair to characterize as plunder their commandeering of money, pro-

visions and other necessaries for their troops from the English or their supporters. Both are right in their complaints; but so far as my investigation goes, the cause of this mutual recrimination can be traced to the interference of the third party. It happens thus: whenever any English detachment suddenly appears in a locality and kills or captures the Mopla inhabitants of the place, rumour somehow spreads in the neighbourhood that the Hindu inhabitants of the place had invited the English army for their protection, with the result that after the departure of the English troops, the neighbouring Moplas do not hesitate to retaliate, and consider the money and other belongings of the Hindus as lawful spoils of war taken from those who have aided and abetted the enemy. Where no such events have occurred, the Moplas and Hindus even now live peacefully side by side; Moplas do not commit any excesses against the Hindus, while the Hindus do not hesitate in helping the Moplas to the best of their ability.

'National Parliament

I have wandered far from my purpose. I meant to emphasize that, in the first clause dealing with the aims and objects of the League, the word *Swaraj* should be defined as complete independence in the cause of an Indian republic. Otherwise, there is a danger that in the presence of a third party, self-government within the British Empire, instead of being beneficial, might actually prove injurious. The second amendment necessary is that the methods for the attainment of *Swaraj* should be amplified. In the place of 'peaceful' and 'legitimate' means 'possible' and 'proper' should be permitted. Thus, on the one hand, the opportunity of joining the League will be given to those who do not honestly believe in non-co-operation as the sole path of salvation, recognizing the possibility of other methods and adopting them also. On the other hand, the amendment will remove the complaint of those who believe that non-co-operation cannot, under any circumstances, remain peaceful to the last, and who, while subscribing to the creed of the Congress, and to the first clause of the section dealing with the objects of the League, as a matter of policy and expediency, refuse to admit it as a faith for all times and circumstances—or to remain non-violent even in intention.

Gentlemen, there are only two possible means of replacing one government by another. One is the destruction of an existing government by the sword and the establishment of another in its place—a method which has been followed in the world thus far. The second alternative is to sever all connections with the present government, and to set up a better organized government parallel to it, and to improve and develop it till the old order is dissolved and the new takes its place. Friends, to achieve this object, we must immediately set up, on a separate and permanent foundation, our courts, schools, arts, industries, army, police—and a national parliament. Non-violent non-co-operation can only help to paralyse government, it cannot maintain

it. The question now is, can such a parallel government be established only through non-violent non-co-operation—of course, provided the rival government does not interfere with its establishment—a condition which is obviously impossible. The rival government will certainly interfere. We might contend that we will proceed on with our work silently and quietly and in spite of governmental interference, as is being done at present. A stage will, however, be reached ultimately, when action on peaceful lines will become absolutely impossible; and then we shall be forced to admit that a parallel government can be started, but not continue to the last through peaceful means.

Governmental Policy

Examples of Government repression are before your eyes. First, it attempted, through the Karachi trials, to prevent the Musalmans from openly proclaiming the articles of their faith. When the people, undaunted by this decision of the Government, preached throughout the length and breadth of India that it was unlawful to serve in the army, the Government slowly overlooked these activities, fearing that a mere repetition of the Karachi resolution might lead to disaffection in the Army. And in order to divert the attention of the people from these activities, it suddenly, but deliberately declared the enrollment of volunteers unlawful, so that it might get an opportunity of striking at the non-co-operators. Like moths that gather to sacrifice their lives around a lighted candle, the advocates of civil disobedience swarmed forward to break this declaration of Lord Reading and cheerfully went to jail in their thousands. This is undoubtedly an example of self-sacrifice and self-effacement which will rightly move Mahatma Gandhi to ecstasy; but we detect another truth hidden in this demonstration of happiness and joy. It reveals to our eyes the last stages of both the repression of the Government and the patience of the people. The people are, no doubt, prepared gladly to bear and suffer the hardships of a few days of imprisonment; but on the declaration of martial law, the non-violent non-co-operation movement will prove totally insufficient and useless. Amongst the Musalmans, at least, there will hardly be found a man who will be prepared to sacrifice his life uselessly. A man can only have one of two feelings in his heart when faced by the barrel of a gun: either to seek refuge in flight or to take advantage of the law of self-preservation and despatch the adversary to hell. The third alternative of cheerfully yielding up one's life to the enemy, and considering it to be the one real success, will remain confined to Mahatma Gandhi and some of his adherents and fellow-thinkers. I, on my part, fear that in general the reply to martial law will be what is commonly called guerilla warfare . . . The responsibility lies with the representatives of the Musalmans.

Consequently, as representatives of the Musalmans, the members of

the All-India Muslim League should consider it their duty either to refrain from adopting non-co-operation as their creed, or to free it from the limitation of keeping it either violent or non-violent; for it is not in our power to keep non-co-operation peaceful or otherwise. So long as the Government confines itself to the use of chains and fetters, non-co-operation can remain as peaceful as it is to-day; but if things go further and the Government has recourse to gallows or machine guns, it will be impossible for the movement to remain non-violent.

The Duty of Muslims

At this stage, some people would like to ask how it is that, while the Hindus are content to adopt non-violent non-co-operation as the means for attaining independence, the Musalmans are anxious to go a step further. The answer is that the liberation of Hindustan is as much a political duty of a Musalman as that of a Hindu. Owing to the question of the Khilafat, it has become a Musalman's religious duty as well.

In this connection, I should like to say just one word. The glories of Ghazi Mustapha Kemal Pasha and the conclusion of the recent Franco-Turkish Treaty might create an idea in some people's minds that the evacuation of Smyrna by the Greeks is certain, and the restoration of Thrace to the Turks, if not certain, is within the bounds of possibility. Consenquently, they might entertain the hope that the struggle in the Near East is coming to a close. I want to warn all such people that the claims of the Musalmans of India are founded more on religious than political principles. So long as the Jazirat-ul-Arab (including Palestine and Mesopotamia) are not absolutely freed from non-Muslim influence, and so long as the political and military power of the Khilafat is not fully restored, the Musalmans of India cannot suspend their activities and efforts.

Muslim Demands

As regards the Khilafat, the Muslim demands are these: (1) that in the pursuance of the promise of Mr. Llyod George, Thrace and Smyrna, along with the city of Symrna (Izmir), should remain under purely Turkish control, so that the political status of the Khilafat-ul-Muslimeen which is essential for the Khilafat, should suffer no diminution; (2) all non-Turkish control should be removed from Constantinople, the shores of Marmora and the Dardanelles, in order that the Khilafat at Constantinople may not be under non-Muslim control, which is essential for the Khilafat; (3) all naval and military restrictions imposed on the Khilafat should be removed, as otherwise, the Khalifa would have no power to enforce his orders ; (4) the Jazirat-ul-Arab, including the Hedjaz, Palestine, and Mesopotamia, should be free from all non-Muslim influence, and not be under British mandate; as it was the death-bed injunction of the Prophet. It should be noted that in the fourth demand, we wish

the English to give up their mandate over Mesopotamia and Palestine, and to remove their influence from the Hedjaz. As to the questions of whether the Arabs will acknowledge the Sherit of Mecca or the Sultan of Turkey as their Khalifa, or whether the Arab Government of Hedjaz, Mespotamia and Palestine will be independant or under the suzerainty of the Khalifa, these will be decided by the Musalmans. We do not want non-Muslim advice and assistance.

A Congress-League Compact

In my opinion, gentlemen, the most pressing necessity of Hindustan is the immediate conclusion of a definite compact between the Congress and the League. The Congress should not enter into any negotiations with the Government concerning *Swaraj* (1) until the minimum Muslim demands with regard to the Khilafat are satisfied; (2) on the other hand, the Muslims should definitely bind themselves to the assurance that, even though their demands with regard to the Khilafat are satisfied, the Musalmans of India will stand to the last by the side of their Hindu brethern for the attainment and preservation of Indian independence. Such a compact is all the more necessary because there are sings that the enemies of Indian independence—and we have to confess with regret that a number of deceitful Indians are working with the foreigners — are concentrating all their efforts on wrecking Hindu-Muslim unity and creating distrust and misunderstanding between the two communities. On the one hand, the Musalmans are being enticed by false hopes with regard to the Khilafat question. On the other, some showy toys of political concession are being prepared as a gift for the Hindus, even before the stipulated period of 10 years. It is intended that in their simplicity, the Musalmans should consider the return of Smyrna, etc., as the satisfaction of their Khilafat demands, and slacken their efforts for the attainment of *Swaraj;* while the Hindus should be misled into taking a further instalment of reforms for *Swaraj* itself, or at least, its precursor, and begin to consider the Khilafat an irrelevant question. There can be only one solution for all these problems. Hindus and Musalmans, after mutual consultation, should have Indian independence declared by Mahatma Gandhi, so that in future the English may have no possibility of deceiving, nor India of being deceived. After the declaration of independence, the Congress and the League will have only one object left: that is the preservation of *Swaraj*. January 1, 1922, is the best date for the purpose, because we would thus have fulfilled the promise that we made to attain *Swaraj* within this year—and the people of India will achieve success in the eyes of God and man.[1]

---

1. Sources: (a) Sankaran Nayar, Sir C.: *Gandhi and Anarchy*. Govt, Printing Press, Madras. (b) *The Indian Annual Register*, 1922, appendix I, p. 68.

مولانا حسرت موہانی میموریل سوسائٹی

C/9-ST بلاک اے۔ متصل جامع مسجد نارتھ ناظم آباد - کراچی
فون:۔ ۶۷۸۳۰۸ - ۶۸۶۱۴۹

حسرت موہانی میموریل ہال اینڈ لائبریری